نمبر ۱۸۵۲
رجسٹرڈ
۱۱۵
جامعہ ملیہ اسلامیہ
جامعہ
جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی وادبی رسالہ
نمبر ۱
بابت ماہ جولائی ۱۹۳۳ء
جلد ۲۱
مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
1927.
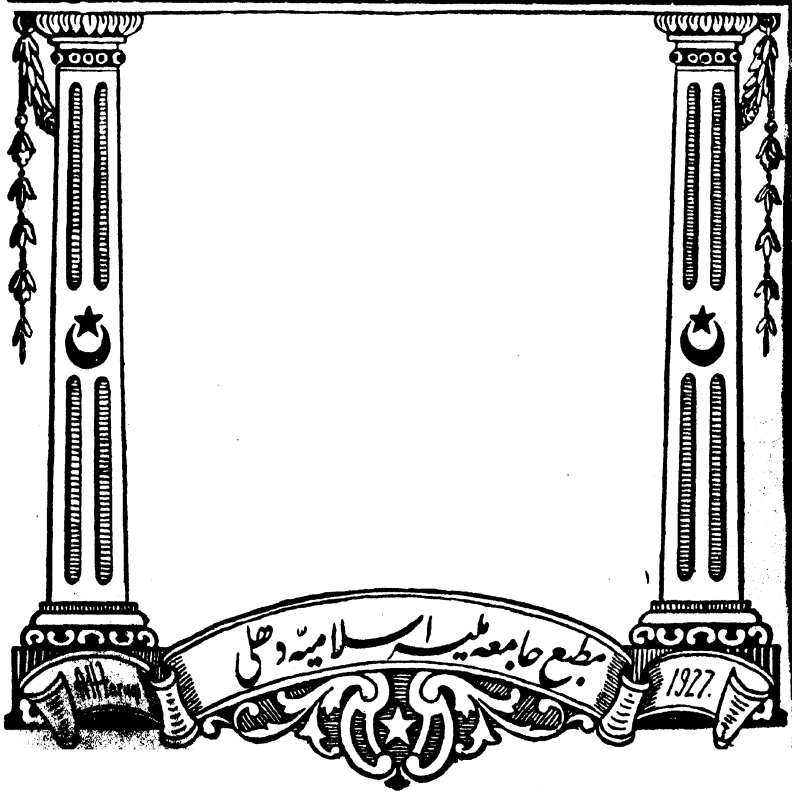
# فہرست

## مطبوعاتِ جامعہ دہلی

### مذہب، تاریخ، سوانح عمریاں، ادب، ڈرامے، بچوں کی کتابیں

## مذہب

**نفسیات مذہب** مقالہ اردو اکاڈیمی، مذہبی جذبہ نفس انسانی میں کن کن شکلوں میں نمودار ہوتا ہی اس کا دوسرے جذبات سے کیا ہی اور اس کا اثر مجموعی نفسی زندگی پر کس صورت میں اور کس حد تک پڑتا ہی، از پروفیسر سید وہاج الدین صاحب۔ قیمت ۸ر

**سیرۃ نبوی اور مستشرقین** مستشرقین یورپ اسلام اور پیغمبر اسلام پر شیریں اور مغالطہ زا انداز میں جو اگلا کرتے ہیں، اس کتاب میں مدلل جواب دیا گیا ہی۔ قیمت ۱۲ ر

**تاریخ القرآن** قرآن حکیم پر نہایت ہی جامع کتاب ہے طبع دوم۔ از مولانا محمد اسلم صاحب جیراجپوری قیمت عہ ر

**بیان** الفرقان فی معارف القرآن کا دوسرا حصہ، سورۂ آل عمران کی مکمل تفسیر قیمت ۱۲ ر

**صراط مستقیم** سورۂ انفال و توبہ کی تفسیر فلسفۂ جنگ جہاد فتح و کامرانی کے قوانین و ضوابط۔ قیمت دو روپے۔

**عبرت** احسن القصص یعنی سورۂ یوسف کی تفسیر نصیحت آمیز اور عبرت انگیز نتائج کا مرقع۔ قیمت ایک روپیہ۔

**برہان** سورۂ نور کی مکمل تفسیر۔ امت اسلامیہ کے لئے ایک لائحہ عمل۔ قیمت ایک روپیہ عہ ر

**سبیل الرشاد** سورۂ حجرات کی تفسیر ہے اس میں علمی مسائل کی فلسفیانہ تشریح عقل کی روشنی میں کیگئی ہی۔ قیمت ۱۰ ر

**ذکریٰ** پارۂ عم کی تفسیر جس میں ان تمام چھوٹی چھوٹی سورتوں کی تفسیر ہی جنھیں ہم نماز میں پڑھتے ہیں۔ قیمت ۱۲ ر

**محجوب الارث** مولانا محمد اسلم صاحب کا یہ رسالہ محجوب الارث اولاد کے متعلق ہی۔ اس میں بتایا گیا ہی کہ اولاد کبھی محجوب الارث نہیں ہو سکتی قیمت ۴ر

**الوراثۃ فی الاسلام** فن وراثت پر عربی میں یہ ایک آسان رسالہ ہے۔ قیمت ۸ر

**ذکرے** ولادت نبوی پر مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ معرکۃ الآرا مضمون ہے اس کی قدر الہلال کے مطالعہ کرنے والے حضرات کرسکتے ہیں۔ قیمت ۸ر

**بشریٰ** اسلام میں خدا کا تخیل صرف جبار و قہار ہی نہیں بلکہ رحمٰن و رحیم بھی ہے۔ از سید سلیمان ندوی قیمت ۶ر

**الورد والریحان** بچوں کے لئے چند قابل حفظ احادیث کا انتخاب ہے تاکہ وہ آنحضرت صلعم کے اس مختصر کلام کو بآسانی یاد کرسکیں۔ قیمت دو آنہ۔

**ہمارا دین** اس میں ارکان خمسہ اسلام کی خوبیاں عام فہم اور سلیس اردو میں لکھی گئی ہیں قیمت ۲ر

## تاریخ

**تاریخ مغربی یورپ** ہسٹری آف ویسٹرن یورپ کا ترجمہ ہے جس میں وہاں کی معاشرت علم و ہنر اور سیاسی اداروں کی بتدریج ترقی کو دکھایا گیا ہے۔ قیمت ڈھائی روپے عہ؎

**تاریخ ہند قدیم** کے۔ ایم پانیکر کی کتاب کا ترجمہ ہے جسے موصوف نے جامعہ کے شعبہ تصنیف تالیف کی درخواست پر لکھا تھا۔ قیمت ۸ر

**تاریخ الدولتین** خلافت بنی امیہ اور بنی عباس کے عہد حکومت کی مختصر اور جامع تاریخ۔ قیمت عہ

**تاریخ نجد** نجدیوں کے مذہبی عقائد، سیاسی حالات اور طرز معاشرت پر مکمل کتاب ہے۔ قیمت عہ ر

**تاریخ الامت** ابتدا سے لیکر خلافت عثمانیہ تک اسلام کی مستند تاریخ۔ قیمت مکمل عہ

۱۔ حصہ اول سیرۃ الرسول قیمت عہ

۲۔ حصہ دوم خلافت راشدہ۔ عہ

۳۔ حصہ سوم خلافت بنی امیہ۔ عہ

۴۔ حصہ چہارم خلافت عباسیہ عہ

۵۔ حصہ پنجم خلافت عباسیہ بغداد عہ

۶۔ حصہ ششم خلافت عباسیہ مصر۔ عہ

۷۔ حصہ ہفتم۔ خلافت عثمانیہ۔ عہ ر

## سوانح عمریاں

**سیرت محمد علی** مولانا محمد علی کی مکمل سوانح عمری ضخامت ۷۰۰ صفحہ کے قریب متعدد تصاویر قیمت سے

**تلاش حق** گاندھی جی کے خود نوشت زندگی کے حالات اور تجربات - ۲ جلدیں مع متعدد تصاویر ایک روپیہ قسم اول دو روپے۔

**ٹالسٹائی** روس کے قائد اعظم، مشرق کے مصلح اور انسانیت کے شیدائی، ٹالسٹائی کے حالات۔ قیمت ۳ر

**جمال الدین** اخوت اسلامی کا پرجوش داعی جس نے ہندوستان، ایران، مصر اور فرانس میں بڑے بڑے کام کئے ۸ر

**اورنگ زیب** اورنگ زیب پر اعتراضات کے جواب اور من گھڑت تاریخ کا کچا چٹھا قیمت ۸ر

**حیات حافظ** لسان الغیب خواجہ حافظ کی زندگی

کے حالات اور اُن کی شاعری پر مفصل تبصرہ۔ قیمت عہ

**حیات جامی** فارسی کے مشہور شاعر مولانا نورالدین جامی کے حالات اور ان کے تصوف پر بحث۔ قیمت ۸ر

**ضیاء الدین برنی** عہد تغلق کے نامور مورخ ضیاء الدین برنی مصنف تاریخ فیروز شاہی کے حالات اور اس کی تاریخ پر تبصرہ۔ قیمت چھ آنے ۶ر

**سیرۃ عمرو بن العاص** نامور فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص کی زندگی کے حالات۔ قیمت عہ ر

**خادمات خلق** یورپ اور امریکہ کی چند پاک سیرت خواتین کے حالات جنھوں نے اپنی زندگی قوم پر وقف کر دی تھی۔ قیمت ۱۰ر

## ادب

**سیر المصنفین** اُردو کے تمام مصنفین کے حالات ادب اُردو کی دل پسند تاریخ۔ قیمت ۱عہ

**کیمیاگر** چند مختصر افسانوں کا مجموعہ قیمت ایک روپیہ۔

**نیرنگ** ۱۲ ادبی مضامین اور ایک تاریخی ڈرامہ ہے۔ قیمت عہ

**مضامین رسالہ جوہر** جامعہ ملیہ کا قلمی رسالہ جوہر کے مضامین کا مجموعہ۔ قیمت ایک روپیہ

**لیلۃ القدر** مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک مضمون ہے۔ قیمت ار

**دیوان غالب** (جرمنی) اس میں غالب کا خود نوشتہ مقدمہ غزلیات، قصائد اور رباعیات ہیں۔ پاکٹ سائز سہ رنگی تصویر۔ عہ، ع

**مرقع غالب** (جرمنی) کمرہ کی زینت کے لئے عمدہ چیز ہے، غالب مرحوم کی سہ رنگی تصویر۔ دو قسم کے اشعار الگ الگ درج ہیں۔ قیمت ۸ر

**دیوان شیدا** (جرمنی) مسیح الملک حکیم اجمل خاںؒ کے فارسی اور اُردو کلام کا مجموعہ، مرحوم کی اجازت پر مکتبہ جامعہ نے خاص طور سے جرمنی میں طبع کرایا۔ قیمت عہ

**کلام جوہر** مولانا محمد علیؒ جوہر کے جدید اور قدیم کلام کا مجموعہ ہے اور شروع میں مولانا عبدالماجد دریاآبادی کا مقدمہ ہے۔ قیمت ۸ر

**انتخاب میر** سعدی ہند میر محمد تقی میر علیہ الرحمہ کے چھ دواوین سے یہ انتخاب تیار ہوا ہے قیمت ۱۲ر

**انتخاب سودا** مرزا محمد رفیع سودا میر کے ہمچشم ہیں یہ مجموعہ اُن کے اچھے کلام سے تیار ہوا ہے قیمت ۱۲ر

**انتخاب حسرت** حسرت کے تمام دواوین کا عطر ہے۔ قیمت ۱۲ر

**جواہر ملیہ** دس تاریخی ملی نظموں کا یہ مجموعہ ہے۔ دلچسپ اور نتیجہ خیز ہے، یہ نظمیں درس میں داخل ہیں قیمت ۳ر

**نالۂ شبیر** مشہور صاحب قلم شیخ شبیر حسین قدوائی کے پاکیزہ کلام کا مجموعہ ہے۔ قیمت ایک روپیہ

**کلام شبیر** یہ شیخ صاحب کے کلام کا دوسرا حصہ ہے لوازم حسن، لوازم عشق وغیرہ چند اچھی نظمیں ہیں قیمت ایک روپیہ۔

## چند اچھے ڈرامے

پردۂ غفلت عہ، گناہ کی دیوار ۸ر
کھیتی ۶ر، صید زبون ۱۰ر
ہمزاد ۶ر

## متفرق

**قوم کی آواز** گاندھی جی کی وہ تقریریں جو موصوف نے سنہ ۱۹۳۱ء میں قیام انگلستان کے دوران میں کی تھیں، تازہ اشاعت تقریباً چار سو صفحات قیمت عہ

**آزادی** مشہور سیاست داں مل کی کتاب لبرٹی کا ترجمہ۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

**مالیات عامہ اور ہماری افلاس کے اسباب** غریب مزدور، ہندوستان کی موجودہ اقتصادی حالت پر مالیات عامہ کے اثرات ۲۲۵ صفحات قیمت ۸ر

**مشاہدات سائنس** سائنس پر بارہ مختلف مضامین، از سید محمد عمر حسنی قیمت عہ

اسلامی تہذیب ۴ر | قومی تعلیم ۲ر
مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ۴ر | آزادی ہند (ترجمہ) ۳ر
خطبہ مسیح الملک ۴ر | نہرو رپورٹ مکمل عاار

## بچوں کی کتابیں

### تاریخ اسلام کا جدید نصاب

ہمارے نبیؐ جماعت دوم ۳ر
نبیوں کے قصے " سوم ۵ر
سرکار دو عالم " چہارم ۸ر
خلفائے اربعہ " پنجم ۱۰ر

## درسی کتابیں

ہمارے رسول ۵ر | اچھی باتیں ۴ر | بچوں کا قاعدہ ۴ر
رہنمائے قاعدہ ۲ر | مشق خوشنویسی ۲ر | آسان خوش خطی
۴ حصے ہر حصہ ۱ر

## بچوں کے لئے ڈرامے

بچوں کا انصاف ۴ر | اسکول کی زندگی ۴ر | دیانت ۲ر
محنت ۴ر | شریر لڑکا ۴ر

## بچوں کیلئے معلومات بڑھانیوالی کتابیں

دنیا کے بسنے والے ۶ر | تاریخ ہند کی کہانیاں ۳ر
میلاد النبی بروجکٹ ۶ر | باغبانی بروجکٹ ۸ر
اسلامی عقائد ۱۰ر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# جامعہ دہلی

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے؛ پی ایچ۔ ڈی۔

| جلد ۲۱ | بابتہ ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۳ء | نمبر ۱ |
|---|---|---|

فہرست مضامین



---

محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا۔

# عربی اور فارسی شاعری کے امتیازات

## تشبیہ واستعارہ

(۲)

صنائع بدائع پر بھی عربیت کا رنگ غالب ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ فارسی شاعری نے تشبیہات میں اپنی سرحد علیحدہ قائم کی اور اس کی خصوصیات بھی عربی تشبیہات کی نسبت زیادہ ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی غور و توجہ کے لائق ہے کہ فارسی تشبیہات کا زیادہ حصہ نیچرل تشبیہات سے خالی ہے اور اکثر تشبیہات میں بعدِ الفہم بھی پایا جاتا ہے۔ عربی تشبیہات سے انسانی دماغ اور اس کی قوت مدرکہ کو جس قدر قرب وسہولت حاصل ہے فارسی تشبیہات میں اسی نسبت سے بعد و دشواری پائی جاتی ہے۔

عربی تشبیہات کا اکثر حصہ حسی اور مادی ہوتا ہے۔ ابونواس شراب کے بلبلوں کی تعریف میں کہتا ہے۔
ع حصا در علی ارض من الذہب یعنی "بلبلے ایسے ہوتے ہیں جیسے سونے کی زمیں پر موتی کے ریزے پڑے ہوتے ہیں۔" اس مفہوم کو کہ "بادشاہ تمام انسانوں سے باعتبار مرتبے کے افضل ہوتا ہے" کس سادگی سے لکھا ہے " فانّ فی الخمر معنًی لیس فی العنب " یعنی شراب اگرچہ انگور سے بنتی ہے لیکن جو بات شراب میں ہوتی ہے وہ انگور میں نہیں اسی طرح بادشاہ اگرچہ طبقۂ انسان ہی سے ہوتا ہے مگر جو بات بادشاہ میں ہوتی ہے وہ اور انسانوں میں کہاں" کس خوبی اور سادگی سے بادشاہ کی برتری اسی کی ضمن سے ثابت کی گئی ہے، کوئی پیچ اور گھماؤ نہیں۔

صدع الحبیب و حالی — کلا ہما کا للیالی

محبوب کی زلف اور اپنی حالت کی تشبیہ "لیل" سے نہایت سادہ تشبیہ ہے۔

کان مثار النقع فوق رؤسنا — واسیافنا لیل تہاوی کوکبہ

اس شعر کے اندر گرد کی تاریکی میں تلواریں چمکنے کو رات کے ستارے ٹوٹنے سے تشبیہ دی ہے۔ وجہ شبہ کس قدر صاف و سادہ ہے دماغ پر زور ڈالنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

فانظر الیہ کزورق من فضۃ        قد اثقلتہ حمولۃ من عنبر

کشتی پر جب زیادہ بوجھ لادا جاتا ہے تو اس کا اکثر حصہ زیر آب رہتا ہے اور صرف کنارے چمکتے رہتے ہیں، اسی وجہ سے شاعر اس کے کنارے کو ماہ نو سے تشبیہ دیتا ہے۔ شاعر کا خیال اپنی وسعت اور باریکی کے اعتبار سے انتہا سے زیادہ وسیع و لطیف ہے۔ وجہ شبہ تلاش کرنے میں کسی قسم کی دقت و پریشانی اٹھانی نہیں پڑتی۔

فارسی میں ماہ نو کی تشبیہ میں ظہیر فاریابی نے خوب زور طبع صرف کیا ہے۔ معاصرین ظہیر باوجود زور طبع صرف کرنے کے اس کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکے۔

قصیدے کی تمہید اس طرح شروع کرتا ہے کہ "جب شام ہوئی تو میں نے دیکھا کہ لوح لاجوردی پر کسی نے بخط خفی 'ن' لکھ دیا ہے یا دریا میں کشتی بہتی چلی جارہی ہے، یا یونس (علیہ السلام) بطن حوت سے نکل کر کنار آب پڑے ہوئے ہیں۔" اسی طرح کی دو ایک تشبیہوں کے بعد لکھتا ہے کہ "لوگ آپس میں بحث و نزاع کر رہے تھے کہ یہ کیا چیز ہے اور کیسی ہے۔ اتنے میں میں نے عقل کے پاس جاکر دریافت کیا کہ کون سا معشوق ہے جس کے کان کا آویزہ آسمان اتار لایا ہے، یا کسی کے قبا کی بیل تراش لی ہے، یا کسی معشوق کے ہاتھ کا کنگن اڑا لایا ہے۔ اگر جرم کوکب ہے تو اتنا خمیدہ کیوں ہے، اور اگر پیکر ماہ ہے تو اس قدر نحیف و زار کس وجہ سے ہے۔ عقل نے ان تمام تعجبات کا یہ جواب دیا کہ "جو کچھ تو نے اب تک اس کے متعلق خیالات قائم کئے ہیں ان میں سے ایک خیال بھی ٹھیک اور صحیح نہیں۔ اگر تو حقیقت جاننا چاہتا ہے تو غور و توجہ سے سن۔ حقیقت میں یہ بادشاہ کے گھوڑے کا "نعل" ہے جس کو فلک نیلگوں انتہائی فخر و تکبر سے ہر ماہ اپنے سر رکھ لیتا ہے۔"

چوں ہر زمیں طلیعۂ شب گشت آشکار        آفاق ساخت کسوت عباسیاں شعار
پیدا شد از کرانۂ میدان آسماں        شکل ہلال چوں سر چوگان شہریار
دیدم ز زر ریختہ بدیں لوح لاجورد        نونے ست گوئیا بقلم کردہ نگار

روئے فلک چو لجۂ دریا و ماہِ نو　　مانند کشتیئے کہ ز دریا کند گذار

یا بر مثال ماہی یونس میانِ آب　　آہنگ در کشیدن او کردہ از کنار

یا ہمچو یونس آمدہ بیروں ز بطن حوت　　افتادہ بر کرانۂ دریا نحیف و زار

در معرض خلاف جہانے ز مرد و زن　　تو میش در نظارہ و خلقے در انتظار

من با خرد بحجرۂ خلوت شتافتم　　گفتم کہ "اے نتیجۂ الطاف کردگار"

بازیچہ نقش بو العجب دشکل نادرست　　کز کارگاہ غیب ہمی گردد آشکار

آں شاہد از کجاست کہ این چرخ شوخ چشم　　از گوش او بروں کشد ایں نغز گوشوار

گردوں ز جائے کہ در یدست ایں طراز　　گیتی ز ساعدے کہ بود دست ایں سوار

گر جرم کوکب ست چرا شد چنیں دوتا　　ور پیکر مہ است چرا شد چنیں نزار

گفت "آنچہ بر شمردی ازیں جملہ ہیچ نیست　　دانی کہ چیست با تو بگویم باختصار

نعل سمند شاہ جہاں ست کاسماں　　ہر ماہ بر سرش نہد از بہر افتخار"

ایک دوسرے شاعر نے اسی چیز کو اس رنگ سے پیش کیا ہے۔

اے ماہ چو ابروانِ یاری، گوئی　　نے ہمچو کمان شہریاری، گوئی

نعلے زدہ از زرِ عیاری، گوئی　　بر گوش سپہر گوشواری، گوئی

یعنی "اے چاند تو ابروئے معشوق ہے، نہیں نہیں، بلکہ بادشاہ کی کمان ہے یا خالص سونے کا نعل ہے، یا آسمان کے کان کا بالا ہے۔"

اگرچہ ظہیر کی طرح بات پیدا نہ ہو سکی مگر پھر بھی تخیل کے اعتبار سے بہت بلند چیز بیان کی ہے۔
فارسی شاعری میں فطری اور حسی تشبیہات کی بہ نسبت عربی شاعری کے کمی ہے لیکن جو کچھ بھی ہیں وہ اپنی شوخی و نزاکت کے اعتبار سے بہت بہتر صورت میں ہیں۔

دو زلف تابدار او بہ چشم اشکبار من　　چو چشمۂ کہ اندرو شنا کنند مارہا (قاآنی)

چمن ہنوز لب از شیر ابر ناشستہ　　چو شاہداں خط سبزش دمیدہ گرد عذار (ظہیر فاریابی)

حقیقت میں تشبیہ و استعارہ جسم شاعری کے لئے روح کی حیثیت میں داخل ہے۔ انشا پردازی اور عروس شاعری کے حسین چہرے کے لئے اگر کوئی چیز خط و خال ہو سکتی ہے تو وہ صرف تشبیہ و استعارہ ہے بغیر ان دونوں کے اس کے جمال دل افروز میں کشش و کہربائی پیدا نہیں ہو سکتی۔

بہت سے موتے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر اس وقت کسی چیز کو معمولی انداز میں بیان کر دیا جائے تو وہ بالکل بے کیف اور بے مزہ معلوم ہوتی ہیں لیکن اگر اسی چیز کو استعارے اور تشبیہ کے پردے میں بیان کیا جائے تو وہی سادہ چیز تیر و نشتر بن جاتی ہے۔ داغ کا ایک شعر ہے:۔

گیا تھا کہہ کے اب آتا ہوں قاصد کو تو موت آئی　　　دلِ بیتاب واں جا کر کہیں تو بھی نہ مر رہنا

داغ نے دیر کرنے کو موت آنے اور مر رہنے سے تعبیر کیا ہے۔ اگر شعر میں یہ دونوں لفظ نہ ہوتے تو شعر کی اثر انگیزی بالکل جاتی رہتی۔ اس صورت میں یوں بیان کیا جاتا کہ "قاصد نے بہت دیر لگائی، اے دل کہیں تو بھی دیر نہ لگانا"

نظیری کا شعر ہے:۔

تا منفعل ز رنجش بیجانہ بینمش　　　می آرم اعتراف گناہ نبودہ را

اس شعر کی لطافت، دلکشی، کہربائی اور دل آویزی کا نقشہ الفاظ کی مدد سے کھینچنا محال ہے۔ "گناہ نبودہ" کے ٹکڑے نے جسد شعر میں جان ڈال دی ہے۔ اگر مفہوم شعر کو اس اچھوتے انداز سے شاعر بیان نہ کرتا تو اتنی کہربائی ہرگز نہ پیدا ہوتی۔

غالب فرماتے ہیں:۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ　　　ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہوتا

شاعر نے دوسرے مصرع میں طنزاً بطور استعارے کے "دیر پشیماں" کی جگہ "زود پشیماں" کہا ہے اور اسی طنزیہ طرز نے کلام میں جان سی ڈال دی ہے۔ اگر "دیر پشیماں" کہدیا جاتا تو یہ دلکشی نہ پیدا ہوتی۔

تکلیف و مصیبت اور حزن و ملال میں گو کوئی شخص بھی قصداً و ارادتاً تشبیہ و استعارے کا استعمال نہیں کرتا لیکن اس وقت بھی جو بات انسان کی زبان سے بلا قصد و ارادہ نکلتی ہے وہ تشبیہ و استعارے کا پہلو

لے ہوتی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان فطرۃً اس نہج و طریقے پر مجبور ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ کسی شخص کا لڑکا مر جائے تو وہ اس مصیبت کو بلا قصد و ارادہ یوں ادا کرے گا کہ "سینہ پھٹ گیا، آسمان ٹوٹ پڑا، دل چھلنی ہو گیا، پہاڑ گر پڑا!"

یہ امر واقعہ ہے کہ استعارے اور تشبیہ کے استعمال کے لئے ہر انسان بلاتخصیص "علم و جہل" فطرۃً مجبور ہے۔ کلام میں ساری کشش و کہربائیت اس کی معتدل آمیزش سے پیدا ہوتی ہے، بغیر اس کے شاعری کے چہرے پر رنگینی نہیں آتی۔ یہی وہ منتر ہے جس کے ذریعے شاعر لوگوں کے دلوں کو تسخیر کر لیتا ہے اور یہی وہ سحر ہے جس سے شاعر ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کا چولا بدل ان کو شعر بنا لیتا ہے۔ شعر میں وسعت و پہنائی اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی جب تک استعارے اور تشبیہ کی چاشنی موجود نہ ہو۔

بہ برقعِ مہِ کنعاں کہ بود حسن آباد     بہ حجلہ گاہِ زلیخا کہ بود یوسف زار

یعنی "ماہ کنعاں (حضرت یوسف علیہ السلام) کے نقاب کی قسم جو کہ حسن آباد تھا اور زلیخا کی خلوت گاہ کی قسم جو کہ یوسف زار تھی۔"

شاعر نے پہلے مصرعے میں یوسف علیہ السلام کے چہرے کے حسن کو "حسن آباد" سے استعارہ کیا ہے اور دوسرے مصرعے میں زلیخا کے خلوت کدے کو "یوسف زار" کہا ہے۔ "حسن آباد" اور "یوسف زار" کے تشبیہی اضافے نے شعر کے مفہوم میں جذب و کشش اور وسعت و پہنائی انتہا سے زائد پیدا کر دی ہے۔ اگر شاعر اس کو تشبیہ و استعارے کے زور پر بلند نہ کرتا تو یہ مفہوم اس طرح ادا کیا جاتا کہ "یوسف علیہ السلام کے چہرے کی قسم جو نہایت حسین و جمیل تھا اور زلیخا کے حجلہ گاہ کی قسم جو کہ حسن و عشق کے اثر کی وجہ سے روشن ہو گیا تھا" مگر یہ حسین اور وسیع مفہوم کیسے ادا ہوتا کہ "یوسف علیہ السلام کا نقاب ایک ایسی بستی ہے جہاں حسن نے سکونت اختیار کر لی ہے اور زلیخا کا خلوت کدہ گویا یوسف زار بنا ہوا ہے یعنی ہزاروں لاکھوں یوسف اس جگہ موجود ہیں"۔ صرف تشبیہ کی ندرت نے اس شعر کے جسد میں جان ڈالی ہے۔

ہوا جب تیزی سے چلتی ہے تو اکثر نازک شاخیں اور پھول زمین پر گر جایا کرتے ہیں۔ شاعر اس حالت سے تشبیہ کا رنگ پیدا کر لیتا ہے اور شعر میں جان پڑ جاتی ہے۔

باد در کہسار جام لالہ را بر سنگ زد　　گل بہ خندہ گفت آرے این چنین باید ہمی

یعنی کہسار کے اندر ہوا نے لالہ کا پیالہ اٹھا کر زمین پر پٹک دیا اور پھول نے ہنس کر کہا شاباش یہی کرنا چاہیے تھا۔

بعض موقع پر شاعر ایک غیر معمولی دعویٰ کرتا ہے اور پھر اس کو ممکن بنانے کی کوشش کرتا ہے شاعر کو یہ ضرورت صرف تشبیہہ کے زور سے پوری کرنی ہوتی ہے۔ تخیل کی بلند پروازی کے امتحان کا یہ بہت نازک اور اہم موقع ہوتا ہے۔ اگر شاعر کی قوت تخیل فطرۃً بلند اور وسیع ہے تو وہ اس نازک موقع پر ضرور کامیاب ہو جائے گا۔ ورنہ ثبوت دعوے میں اس کا بیان کمزور ہو جائے گا۔ شاعر کے لیے یہ موقع بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کا ہوتا ہے۔ تخیل کی معمولی سی بے اعتدالی کی وجہ سے ثبوت دعوے میں خرابی رونما ہو جاتی ہے اور پھر اس کا دعویٰ قابل سماعت بھی نہیں رہتا۔ اس موقع کے رنگ کو بھی فارسی شاعری نے نہایت خوبی سے ادا کیا ہے۔ شاعر کا دعویٰ ہے کہ "سلاطین میں عشق و محبت کی سوزش اور جلن نہیں ہوتی"۔

چونکہ عشق و محبت کی جلن اور سوزش فطرۃً ہر شخص میں موجود ہوتی ہے، یہ سوزش عام و خاص کی قید سے آزاد ہے۔ اس کوچے میں شاہ و گدا سب ایک ہی لباس میں نظر آیا کرتے ہیں، اس منزل میں "فلاں ابن فلاں" کی کوئی تخصیص نہیں یہ وہ دریائے بے ساحل ہے جس میں فقیر و غنی سب ساتھ ساتھ سفر کرتے ہیں۔ بظاہر شاعر کا یہ دعویٰ سراسر غلط معلوم ہوتا ہے لیکن شاعر تشبیہہ کے ذریعے اس دعوے کو ثابت کرتا ہے اور نہایت خوبی سے ثبوت دعویٰ پیش کرتا ہے۔

کہتا ہے کہ "ہر قسم کے پتھر میں چنگاریاں ہوتی ہیں (پتھر پر ضرب پڑنے سے شرارے پیدا ہوتے ہیں) لیکن الماس اور لعل میں چنگاریاں نہیں ہوتیں"۔ الماس اور لعل پتھر کے اقسام میں بادشاہ کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ اسی طرح بادشاہ وقت بھی عام انسانوں کے مقابلے میں ہر حیثیت سے بلند مرتبہ رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو عشق کی مصیبتوں اور اس کی سوزشوں سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔

بہ سوز عشق شاہاں را چہ کار ست　　(دعویٰ)
کہ سنگ لعل خالی از شرار ست　　(ثبوت)

صرف تشبیہہ کی قوت اور اس کی اثر انگیزی سے شاعر نے ثبوت دعوے کو مضبوط بنا دیا۔ اگر تشبیہہ

سے کام نہ لیا جاتا تو یقیناً پختگی میں کمی رہتی۔

شاعر ایک اور دعویٰ کرتا ہے کہ "بادشاہ دردِ عشق سے بیگانہ ہے" اس کے ثبوت کی اس کو ضرورت ہوئی، قوت متخیلہ میں جنبش ہوئی اس نے شاعر کی حس کو ایک ایسے مقام پر پہنچا دیا جہاں وہ ثبوت دعوے کا سامان اچھی طرح مہیا کر سکتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر اس نے نہایت بے ساختگی اور لطافت کے ساتھ اس کا ثبوت پیش کر دیا۔

زدردِ عشق شہ بیگانہ باشد (دعویٰ)

کہ جائے گنج در ویرانہ باشد (ثبوت)

سارا زور صرف تشبیہی تمثیل نے پیدا کیا ہے ورنہ کچھ بھی نہ تھا۔

تواضع اور فروتنی امیر و غریب، رذیل و شریف سب کے لئے ایک اچھی چیز سمجھی جاتی ہے لیکن شاعر اپنی قوت متخیلہ کے زور پر ایک نیا دعویٰ کرتا ہے۔

تواضع زگردن فرازاں نکوست (دعویٰ)

اس دعوے کو ثابت کرنے کے لئے شاعر نے قانونِ نفسیات پر ایک گہری نظر ڈالی اور اس کے بعد اس کی عقل کی رسائی نے اس حقیقت کو معلوم کر لیا:۔

گدا اگر تواضع کند خوئے اوست (ثبوت)

شاعر کا دعویٰ ہے کہ نااہل کی تربیت سے کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہو سکتا اس کی نااہلی اس کی طبیعت کا خمیر ہوتی ہے لہٰذا اس کا دور کرنا سوائے تضیع اوقات اور کچھ نہیں۔ ہاں بیشک اس کی تربیت سے بہت سے فائدے مرتب ہو سکتے ہیں جس کی طبیعت میں دستِ قدرت نے جوہر قابل ودیعت کیا ہو۔

ہیچ صیقل نکو نداند کرد — آہنے را کہ بدگہر باشد (دعویٰ)

چوں بود اصل جوہر قابل — تربیت را درو اثر باشد (دعویٰ)

شاعر اپنے اس دعوے کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ طائرِ تخیل میں جنبش پیدا ہوتی ہے اور حالت پرواز میں عالم رنگ و بو کے واقعات پر نظر ڈالتا ہے اور فوراً چند نظائر اس کی چشم رسا کے سامنے آ جاتے ہیں۔

ان میں سے وہ چند نظیریں اپنے ثبوت دعوے میں پیش کرنے کے لئے منتخب کر لیتا ہے۔

سگ بدریائے ہفتگانہ بشوی (دعویٰ) — چونکہ تر شد پلید تر باشد (ثبوت)

خر عیسیٰ اگرش بہ مکہ برند — چوں بیاید ہنوز خر باشد (ثبوت)

یعنی "کتے کو اگر تمام دنیا کے سمندروں میں غسل دیا جائے جب بھی وہ پاک نہیں ہو سکتا بلکہ جس قدر تر ہوتا جائیگا اسی مناسبت سے نجاست بڑھتی جائے گی۔ اور اگر خر عیسیٰ کو مکہ بھی لے جائیں جب بھی واپسی پر وہ گدھا ہی رہے گا۔ اسی طرح نا اہل کی تربیت سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے پند و نصیحت سراسر بے کار ہے۔"

اسی دعوے اور ثبوت کو ابو شکور بلخی نے دوسرے انداز سے پیش کیا ہے۔

درختے کہ تلخش بود گوہرا — اگر چرب و شیریں دہی مر ورا (دعویٰ)

ہماں میوہ تلخ آرد پدید — از و چرب و شیریں نخواہی مزید (ثبوت)

یعنی "جس درخت کی اصل تلخ ہے اگر اس کو چرب و شیریں غذا بھی دو جب بھی اس میں ثمر تلخ ہی آئیں گے شیریں پھل اس میں نہیں آسکتے۔"

شاعر ایک اور دعویٰ کرتا ہے کہ "اگر بچے کو بحالت طفلی ادب اور لحاظ کی تعلیم نہ دی جائے تو وہ جوان ہو کر بھی بے ادب اور بد تہذیب رہے گا۔" چونکہ حقیقی تعلیم و تربیت ابتدا ہی سے ہوا کرتی ہے اگر ابتدا میں وہ محروم تربیت رہا تو جوانی اور بڑھاپے دونوں میں اس سے آثار حیوانیت ظاہر ہوتے رہیں گے۔

ہر کہ در خردیش ادب نکنی — در بزرگی فلاح از و برخاست (دعویٰ)

شاعر کی تخیلی قوت کس نئے انداز سے ثبوت دعوے کا سامان فراہم کرتی ہے:۔

چوب تر را چنانکہ خواہی پیچ — نشود خشک جز بآتش راست (ثبوت)

یعنی "ہری اور تر لکڑی کو جس قدر اور جہاں سے چاہو خمیدہ کر لو لیکن خشک لکڑی سوائے حرارت آتش اور کسی چیز سے سیدھی یا ٹیڑھی نہیں ہو سکتی۔" بچہ کی مثال بھی بالکل ہری لکڑی کی طرح ہے جس طریقہ پر اس کو تعلیم دی جائے گی وہی رنگ وہ اختیار کرے گا۔

یہ صحیح ہے کہ تشبیہ و استعارے کو شاعری سے اسی قسم کی نسبت ہے جو قالب کو روح کے ساتھ

اور بقول مولانا حالی "یہ سب چیزیں شعر میں جان ڈالنے والی ہیں۔ جہاں اصل زبان کا قافیہ تنگ ہو جاتا ہے وہاں شاعر انھیں کی مدد سے اپنے دل کے جذبات اور دقیق خیالات عمدگی کے ساتھ ادا کرجاتا ہے۔ اور جہاں اس کو اپنا منتر کارگر ہوتا نظر نہیں آتا وہاں انھیں کے زور سے وہ لوگوں کے دلوں کو تسخیر کرلیتا ہے" لیکن ہر چیز میں اعتدال اور میانہ روی استحسان و پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ انسان نے جہاں اعتدال کے دائرے سے قدم نکالا فوراً اس میں لغزش پیدا ہو جائے گی۔ یہی حال تشبیہ و استعارے کا ہے جب تک حسیات کے دائرے میں دماغ کی گردشیں اور جولانیاں رہیں گی اس وقت تک اس کے اندر لطافت اور جذب وکشش کا سمندر موجزن رہے گا لیکن جوں ہی اس دائرے سے تجاوز ہوا پھر عقل کی رسائی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جائے گی۔

تشبیہ و استعارے میں جس قدر بعد ماخذ اور مجازی معنی سے دوری ہوتی جائے گی اسی قدر اس کی لطافت و چاشنی میں صورت خرابی رونما ہوتی جائے گی۔ استعارے اور تشبیہ کی ساری خوبی صرف اس میں ہے کہ اس کے اندر بعد ماخذ وغیرہ نہ ہو۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ فارسی شاعری کی نازک خیالیاں اور جدت طرازیاں اس منزل پر پہنچ گئی تھیں جہاں پر حسیات اور مادیات کی سرحدیں ختم ہوتی ہیں اور سوائے تصورات و وہمیات کچھ باقی نہیں رہتا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شاعر اپنی دماغی اور تخیلانہ موشگافیوں کے جوہر کی نمود کے لئے خیالی اور وہمی گھوڑے دوڑانے لگتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس مقام پر پہنچ کر شاعری پھر شاعری نہیں رہتی بلکہ ایک معمہ اور چیستاں کی صورت اختیار کرلیتی ہے اور پھر اس کے سمجھنے کے لئے مخصوص دماغ اور ذہنیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ وہ اسکول بن جاتا ہے جس میں معلم تو سب کچھ جانتا ہے لیکن متعلم کورا ہی رہتا ہے۔ دماغ تو تشبیہات و استعارات کی باریکیوں میں الجھا رہتا ہے۔ مطالب و مفاہیم کی جانب توجہ کون کرے۔

گو شہار آشیان مرغ آتشخوارہ کرد　　　برق عالم سوز یعنی شعلۂ غوغائے من

اس شعر کے سمجھنے کے لئے پہلے چند باتوں کو بطور مقدمہ یا تمہید سمجھنا پڑے گا۔

(۱) پہلے یہ سمجھئے کہ مرغ آتشخوارہ ایک پرند کا نام ہے۔

(۲) چونکہ آہ و فریاد میں آگ کی طرح گرمی و حدت ہوتی ہے اس لئے آہ و نالے کو شعلے سے تشبیہ دی ہے۔

(۳) مرغ آتشخوار کے رہنے کا مقام آگ ہوتا ہے۔

اس تفصیل اجمال کے بعد شعر کا مطلب سمجھ میں آتا ہے۔

روانی اسپ کی تعریف ملاحظہ ہو:۔

بہ کشوریکہ درو نام تازیانہ برند　　　بہ لوح سنگ نگیرد شبیہہ او آرام

اس شعر کے سمجھنے کے لئے بھی چند باتوں کو مقدمۃ الجیش کی صورت میں قائم کرنا ہوگا۔

(۱) گھوڑے کی روانی کا اثر تصویر میں بھی پیدا ہو گیا ہے۔

(۲) تازیانہ لگانے کی ضرورت نہیں بلکہ تازیانے کا نام لینا کافی ہے۔

(۳) تصویر کے سامنے تازیانے کا نام لینے کی بھی کوئی ضرورت نہیں بلکہ اس ملک میں تازیانے کا نام لے لینا کافی ہے۔

(۴) پتھر پر کندہ ہونے کی حالت میں بھی تصویر میں یہ اثر ہوتا ہے۔

ساغرش پر بادۂ رنگیں چناں آید بہ چشم　　　کز میان آب روشن بر فروزی آذرے

پانی میں آگ کا روشن کرنا محض قوت خیال پر مبنی ہے، خارج میں اس کا وجود ممکن نہیں، بلکہ ایک حیثیت سے قوت خیال پر بھی مبنی نہیں ہو سکتا۔ "لو فرضنا" کے تحت میں داخل کیا جا سکتا ہے۔

اس مفہوم کو کہ "انگیٹھی میں آگ جلائی تو دھواں کم ہو جاتا تھا اور آگ زیادہ ہوتی جاتی تھی" اس رنگ میں ادا کیا ہے۔

بہ باغ شعلہ در دہقان انگشت　　　بنفشہ می درود و لالہ می کشت (نظامی)

یعنی "انگیٹھی کا دہقان شعلوں کے باغ میں بنفشہ کاٹتا جاتا تھا اور لالہ بوتا جاتا تھا" ممکن ہے کہ شاعر کے نزدیک تشبیہ میں لطافت و رنگینی پیدا ہو گئی ہو لیکن سامع کا دماغ مشبہ، مشبہ بہ، وجہ شبہ، اور غرض تشبیہ کے سمجھنے میں چکر کھا جائے گا۔

زگیسو، گہ کمری کرد و گہ تاج　　بداں تاج و کمر شہ گشتہ محتاج

زلف محبوب کے جوڑے کو جو کبھی بندھا ہوتا ہے اور کبھی کمر پر پڑا ہوتا ہے، کمر اور تاج سے تشبیہ دی ہے۔

قلم کی تشبیہ میں بھی جو کچھ زور قلم صرف کیا گیا ہے وہ بھی ملاحظے کے قابل ہے:-

ع - مُشک در جیب، لعل در داماں　　(نظامی)

ع - زلف او خم شدہ در گوش، سخن می گوید

شراب کا پیالہ پیتے وقت لب کی جو کچھ ہیئت ہوا کرتی ہے اس کو حلقے سے تشبیہ دی ہے۔

بہ نوشین لب آں جام را نوش کرد　　زلب جام را حلقہ در گوش کرد

اس خیال کو کہ "محبوب کا تبسم پھول کے شگفتہ ہونے کی حالت سے بہت زیادہ خوشنما اور جاذب نظر معلوم ہوتا ہے" اس قدر دوراز خیال استعارات سے بھر دیا ہے کہ دماغ اس کے سمجھنے میں چکر کھا جاتا ہے:-

تبسمے کہ بہ خون بہار تیغ کشید　　کہ خندہ برلب گل نیم بسمل افتادست

یعنی "تبسم ایک قاتل ہے اس نے بہار کی خوں ریزی کے لئے شمشیر بے نیام کرلی ہے اور اس کا وار خندۂ گل پر ہوا اور خندۂ گل نیم بسمل ہو کر رہ گیا"

خون بہار، تبسم شمشیر اور خندۂ گل کا بسمل ہونا کس قدر بعید المآخذ اور عسیر الفہم استعارات ہیں اسی قسم کے تخیلات شاعری کے خوشنما چمنستان کو خارستان بنا دیتے ہیں جہاں قدم قدم پر دامن فہم و عقل الجھتا رہتا ہے۔

بدر چاچ کے سارے قصائد اسی قسم کے بعید الفہم اور دور از کار استعارات و تشبیہات کا مجموعہ ہیں کسی جگہ "آہوئے مادہ" سے "آفتاب" مراد لیتا ہے اور کسی جگہ "اشک زلیخا" سے "کواکب" کہیں "اعمیٰ" سے "برج عقرب" اور کہیں "آب خشک" سے "پیالہ" اور بعض جگہ "پنج دریا" سے "پانچ انگلیاں" مراد لیتا ہے۔ یہ استعارات اس قسم کے ہیں کہ بیسویں صدی کا دماغ ان کو سمجھنے سے یکسر عاجز ہے۔

بعض تشبیہات و استعارات میں تو اس قدر لطافت و نزاکت پیدا کی جاتی ہے کہ الفاظ کا وزن برداشت کرنا بھی ان کے لئے ناممکن سا ہو جاتا ہے۔ حباب جس طرح چھونے سے ٹوٹ جاتا ہے اسی طرح اگر ان چیزوں کو علاوہ تشبیہ کے الفاظ سے چھوا گیا تو ان کی لطیف و نازک صورت کو صدمہ پہنچ جائے گا۔

ہمہ شب برلب و رخسار و گیسو میزنم بوسہ    گل نسرین و سنبل را صبا درخرمن است امشب

بعض اوقات بے جان چیزوں کو بھی صاحب فہم اور ذی ادراک تصور کرکے ان کی جانب ارادی کاموں کو منسوب کیا جاتا ہے۔

نہ گفت و من شنودم، ہر آنچہ گفتن داشت    کہ در بیان نگہش کرد بر زباں تقدیم

لبش چو نوبت خویش از نگاہ بازگرفت    فتاد سامعہ در موج کوثر و تسنیم (عرفی)

یعنی "اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا لیکن اس کی تمام گفتگو میں نے اچھی طرح سن لی کیونکہ تقریر و مخاطبہ میں اس کی نگاہوں نے زبان سے پیش دستی کی۔ جب لبوں نے نگاہ سے اپنی باری مانگی تو سامعہ کوثر و تسنیم میں ڈوب گیا"۔

دشمن کے خوفزدہ اور مرعوب ہونے کا نقشہ کس قدر گھماؤ سے کھینچا ہے۔ طبیعت میں بجائے انبساط کے انقباض پیدا ہو جاتا ہے۔

زرعشہ باطن خصمت چو جعد حوروشان    شکن بروئے شکن خم بروے خم چیند

اس مفہوم کو کہ "آج کا دن گویا ایک پھول کے مانند ہے جو شگفتہ ہو رہا ہے اور گل کا دن شگفتہ ہو کر مرجھا گیا اور غنچہ بن گیا" کس قدر ٹھوس طریقے سے بیان کیا ہے۔ صرف تشبیہ و استعارے کی پیچیدگی پر اس کی اساس قائم ہے۔ ع "بہ بر شگفتن امروز غنچہ گشتن دے"

غرض یہ ہے کہ استعارات و تشبیہات کو اس وقت تک افادے کے تحت میں داخل کیا جا سکتا ہے جب تک کہ وہ حسیات و مادیات کے دوائرے سے متجاوز نہ ہوں۔ تخیل کی بلند پروازی پر اگر ان کی بنیاد و اساس قائم ہو گی تو پھر یقیناً ان کی افادی حیثیت میں فرق رونما ہو جائے گا اور کنہ مقصود تک طائر فہم کی رسائی بھی نہ ہو سکے گی۔

اس قسم کی غیر مانوس نازک خیالیوں نے حقیقت میں فارسی شاعری کی تشبیہات کو فطری درجے سے گرادیا اور متاخرین کا کلام تو اچھا خاصا چیستاں اور معا بنا ہوا ہے۔ شعر کا سمجھنا "جوئے شیر" لانے سے کسی طرح کم نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ہر چیز کی ابتدا میں عموماً سادگی اور سچائی کارفرما ہوا کرتی ہے لیکن جوں جوں اس میں صنعت کاریوں اور دماغی کاوشوں کو دخل ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس میں دقت نظر اور اشکال پسندی بڑھتی جاتی ہے۔ انسانی دماغ کا اندازیہ ہے کہ وہ آخری درجے میں پہنچ کر خود بخود تسہیل میں اشکال پیدا کرلیتا ہے، سادگی سے ہٹ کر صنعت کاریوں کے انداز زیادہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اصول نفسیات کے اعتبار سے انسانی دماغ کی ساخت میں رنگینی اور گل کاری کے اثرات کو بہت کچھ دخل حاصل ہے۔

**دور اول کی سادگی** انسان کی فطرت چونکہ تدریج پسند ہے۔ وہ ہر چیز میں تدریجی ارتقائیت کو استحسان و پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے۔ اس کی یہ فطرت مخصوص شعریت کے ضمن میں بھی تمام و کمال موجود ہے۔ جب شاعری نے نہاں خانۂ دماغ سے باہر قدم نکالا تو اس وقت اس کی حالت اس کم سن بچے کی طرح تھی جو اپنے مطالب کو سیدھے سادے الفاظ میں ادا کرتا ہے۔ نہ تو اس کو فصاحت و بلاغت کی پروا ہوتی تھی اور نہ لطافت و نزاکت سے کچھ واسطہ۔ اختصار و اجمال کی خوبیوں سے اس کے کان آشنا نہیں ہوتے۔ شاعری کا ابتدائی عہد اسی قسم کی سادگی اور سچائی کا سرمایہ دار تھا، نہ تو اس کو تکلفات و تصنعات سے کوئی واسطہ تھا اور نہ تلمیحات و کنایات سے زیادہ تعلق۔ پیچ اور گھماؤ سے نفرت تھی تشبیہ و استعارے کا ذکر ہوتا تھا لیکن نہ اس قدر کہ طبائع پر گراں گزرے۔ یہ سب چیزیں نہایت سامنے کی ہوتی تھیں۔ ہر زبان میں شاعری کے ارتقا کا یہی معیار رہا ہے۔ کسی قوم کی شاعری اس قاعدے کے مستثنیات میں داخل نہیں ہو سکتی۔ فارسی ادبیات کے دور سادہ میں "دل" کو "چوب در آتش افتادہ" سے استعارہ کرتے تھے۔

احوال دلم مپرس کاں بے چارہ چوبے ست در وفتادہ آتش، دل نیست

یعنی "میرے دل کا حال نہ پوچھو! وہ ایک لکڑی ہے جس میں آگ لگ گئی ہو" لیکن اسی مفہوم کو متاخرین کے یہاں بھی ملاحظہ کیجئے۔ اس عہد میں دل ترقی کرتے کرتے "چوب در آتش افتادہ" سے صرف پارۂ آتش بن جاتا ہے۔

ع یک پارہ آتش است کہ دلش نام کردہ اند

عروض کے قواعد کا بھی چنداں لحاظ نہیں کیا جاتا تھا صرف اظہار جذبات کا نام شاعری تھا۔ "ظ" "ذ" اور "ث" "د" کو ہم قافیہ باندھا کرتے تھے جیسے "احتیاط" "اتحاد" اور "حدیث" "شنید"۔ انتہا یہ تھی کہ صحت الفاظ کی بھی پروانہ تھی، "سقیم" کو "سقم" اور "ابلہ" کو "ابلاہ"، "ہرگز" کو "ہرگیز" بلا روک ٹوک لکھا کرتے تھے۔ انگلیوں کو "قاقم کی دم" اور پشت دست کو "شکم قاقم" سے تشبیہہ دیتے تھے۔

پشت دستش چوں "شکم قاقم" نرم　　چوں "دم قاقم" کردہ سرانگشت سیاہ

چہرے اور زلف کی تشبیہہ میں کہتے تھے کہ "برف پر کالا کوا بیٹھا ہوا ہے":

بر روئے برف زاغ سپید انگاہ کن　　چوں زلف بر رخ بتم آں شمسہ سیاہ

سرد ہوا کے موسم میں جو برف کے گالے سے اڑا کرتے ہیں ان کی تشبیہہ بھی ملاحظہ کیجئے۔

بہ ہوا در نگر کہ لشکر برف　　چو کند اندرو ہمی پرواز

راست ہمچوں کبوتران سفید　　راہ گم کردگان زہیبت باز

یعنی "ہوا میں ذرا غور تو کرو! برف کا لشکر اس میں کیسا اڑ رہا ہے، ٹھیک اسی طرح جیسے سفید کبوتر باز کے خوف سے اپنا راستہ بھول جایا کرتے ہیں"۔

روئے وموئے تو نامۂ خوبی است　　چہ بود نامہ، جز سفید و سیاہ

یعنی "تیرا چہرہ اور زلف حسن کی ایک خوشنما کتاب ہے اور کتاب میں سوائے سیاہ و سفید کے اور کچھ نہیں ہوتا"۔ غنچہ اور پستہ چونکہ سامنے کی چیزیں ہیں اور دماغ کی رسائی میں کوئی دقت و پریشانی اٹھانی نہیں پڑتی اس لئے قدما کے سیدھے سادے طور میں دہن کو غنچہ اور پستہ سے تشبیہہ دیا کرتے تھے لیکن جب متاخرین کی نازک خیالیوں اور دقت آفرینیوں کا دور آیا تو پہلے اس کو "ذرہ" بنایا پھر "جوہر فرد" اور آخر میں سرے سے معدوم کر دیا۔

ع خورشید رو، ذرہ دہاں، تاریک مو، روشن رواں

ع خندۂ جوہر فرد است دلیل تقسیم

ع پیدا لب و نہاں دہاں، ایں نوش تن آں نوش جاں

زلف کو متقدمین کے عہد میں سنبل، صلیب، خوشۂ انگور اور کمند سے تشبیہ دیا کرتے تھے:۔

ع زلف بکشا تا دگر راہب نگوید کاں صلیب

گرفتہ زلف گرہ گیر درمیان دو لب    چو خوشۂ عنب اندر میانۂ عناب

لیکن متاخرین کی جدت پسندیوں اور ان کی اختراعات نے اس کو "تسلسل" اور "دام نظر" کی حد تک پہنچا دیا۔

کمر کی تشبیہ میں بھی اور باتوں کی طرح سادگی پائی جاتی ہے۔ متقدمین کے دور میں شاخ سے تشبیہ دیتے تھے، پھر ترقی کر کے ہلال کہنے لگے۔

متاخرین کا دور جب اپنی تمام دکمال رعنائیوں کے ساتھ آیا تو ان کی طبائع کی تراش خراش نے اس معاملے میں بھی نئی نئی راہیں پیدا کیں۔ محسوسات سے گذر کر خیالی دنیا کی بنیادیں قائم کی گئیں۔ "شاخ" اور "بال" کے بجائے "تار نظر" اور "رگ گل" نظر آنے لگے، کہیں اس کو تخیل موہوم اور لطیف خیال اور کہیں باریک مضمون سے تعبیر کیا گیا حتیٰ کہ آخر میں بچاری سرے سے غائب ہی ہو گئی۔

متاخرین کے عہد میں "مدح" نے انتہائی مذموم شکل اختیار کر لی تھی۔ اپنے ہی جیسے بلکہ اپنے سے بھی زیادہ ذلیل و بے حس، عیش پسند اور کاہل انسانوں کو فلک نشیں، تقدس پناہ، ظل اللہ بنا دیا گیا تھا، سر پر کی مکھیاں اڑانے کی طاقت نہ تھی، میدان جنگ کی صورت کبھی دیکھی نہ تھی، شمشیر کو بے نیام دیکھ کر ارتعاشی کیفیت پیدا ہو جایا کرتی تھی، لیکن خدا کی سیدھی سادی مخلوق کو خوفزدہ کرنے کے لئے اس مہمل انسان کو اس صورت سے پیش کیا جاتا تھا۔

بگاہ کینہ کز تنہا نشیند از بر توسن    بد اندیشش چناں داند کہ یک عالم سوار آید

نگاہ خشم مژگانہائے او در چشم بد خواہاں    چو تیر تہمتن در دیدۂ اسفندیار آید

چہ پایہ خصم ملک و دیں کہ کرد ساز رزم کیں    کہ ساختی بہر زمیں زلاشہ شاں مزارہا

ظلم و تعدی اور جور و ستم کی کوئی ایسی شکل نہ تھی جو حاکم وقت کی جانب سے مجبور و لاچار مخلوق پر روا

نہ رکھی جاتی ہو لیکن اس کو اس خوبصورت اور بہتر انداز میں پیش کیا جاتا تھا کہ (نعوذ باللہ) عدل خداوندی کی بھی اس کے سامنے کوئی حیثیت نہیں :۔

زبیم عدل او خسپند جہاں کس فتنہ بیداری ۔۔۔ بچشم فتنہ پنداری خواص کو کنار آمد

گیتی چو مہدی عہد او نظم جہاں از جہد او ۔۔۔ وزعدل او در عہد او مہتاب کتاں پرورد

بدطینی، بدمزاجی، بدخلقی اور ترش روئی میں بادشاہ وقت اپنی مثال آپ ہے۔ بدخوئی کی وجہ سے ہر شخص مصیبت بر دوش ہے۔ تمام مخلوق اس کی بدمزاجی سے عاجز آچکی ہے لیکن خوشامدی شاعر اس کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کرتا ہے گویا وہ مکارم اخلاق اور محاسن طینت میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ کبھی اس سے کوئی ایسی بات صادر ہی نہیں ہوتی جس پر بدخلقی اور بدمزاجی کا اطلاق کیا جا سکے۔

ہر خصلت و ہنر کہ گزید از جہاں خرد ۔۔۔ در طینت تو تعبیہ کردست کردگار (ظہیر فاریابی)

خصائل جمیل تو بدہر ہر کہ بنگرد ۔۔۔ وجود کائنات را دگر بہیچ بشمرد (قاآنی)

مداح او با خویشتن گر راند از خلقش سخن ۔۔۔ جائے بطبعش ذوالمنن ہر ہشت رضواں پرورد ( " )

حدیث خلق او از خامہ چوں در نامہ بنویسم ۔۔۔ سراسر نقش دیوانم چو نقش قندھار آید ( " )

ع بہشت عدن آیتے ز خلق مشکبوئے تو ( " )

حاکم وقت سو رندوں کا ایک رند ہے۔ صبح سے شام تک بجز مے نوشی اور لہو و لعب دوسرا کوئی کام نہیں۔ حرم سرا میں لالہ رخ اور مہر افروز مہ وشوں کی کوئی تعداد معین نہیں کی جا سکتی۔ دربار آتش افروز لالہ رنگ اور نرگس چشم مغبچوں سے بھرا ہوا ہے لیکن مطلب آشنا شاعر اس کو مخلوق کے سامنے اس طرح پیش کرتا ہے گویا "ہزاروں زاہدان شب زندہ دار" اس کے زہد و اتقا پر نثار ہیں :۔

دیں بیا ہید بذات تو و ذات تو پناہ ۔۔۔ بخداوند تبارک و تعالیٰ آورد (سلمان ساوجی)

ع سجدہ درگہ او نور جبیں می بخشد

غرض یہ ہے کہ متاخرین کے دور میں اس صنف کو اس بری طرح پامال کیا گیا جس سے عام انسانوں کو اپنی ہستی کی عزت و ذلت کا احساس ہی مٹ گیا تھا، خداوند قدوس کے قہر و غضب کا خیال

دل سے مٹ سکتا تھا لیکن کیا مجال کہ بادشاہ کی مطلق العنان ہستی کے قہر و غضب کا خیال ایک منٹ کے لئے بھی دل سے محو ہو جائے لیکن متقدمین کے سادہ دور میں یہ بات نہ تھی۔ ان کے انداز بیان میں سادگی اور واقعیت ہوتی تھی۔

ہمت بلند باید کردن کہ تو ہنوز بر پایۂ تختیں از نردبانیا

متاخرین کے دور میں ایسی سچی اور صحیح بات کہنے کی کس کو ہمت تھی۔

دیگر باتوں کی طرح عشقیہ خیالات میں بھی سادگی پورے طور سے موجود تھی۔ جس قدر سچے جذبات دل میں پیدا ہوتے تھے ان کو تشبیہ و استعارے کی نزاکتوں سے بچا کر ظاہر کیا کرتے تھے۔ اظہار جذبات میں تصنع اور تکلف کا گمان بھی دل میں نہیں آتا تھا۔ عاشقانہ جذبات کے اظہار کا یہ عالم تھا۔

ہمہ جز قصد جفا می نکنی حاجتم ہیچ روا می نکنی
نکنی بر من بے چارہ سلام ور کنی جز بہ ریا می نکنی

قدما ضعف و ناتوانی کے مضمون کو مبالغے میں بھی بھولے پن سے ادا کرتے تھے۔

یک موئے بدزدیدم از زلفت چوں زلف زدی اے صنم ابشانہ
چونانش بہ سختی ہمی کشیدم چوں مور کہ گندم کشد بہ خانہ
با موئے بہ خانہ در شدم، پدر گفت منصور کدام است ازیں دوگانہ

یعنی جب تونے بالوں میں کنگھی کی تو میں نے تیری زلف کا ایک بال چرا لیا۔ میں اس کو بہ مشکل اس طرح کھینچتا تھا جس طرح چیونٹی گیہوں کا دانہ اپنے بل میں لے جاتی ہے۔ بال لے کر جب میں گھر پہنچا تو میرے والد نے کہا کہ "ان دونوں میں کون مظفر و منصور ہے" لیکن متاخرین کے دور میں اسی مضمون کو اس رنگ میں ادا کیا گیا ہے۔

تنم از ضعف چناں شد کہ اجل جست و نیافت نالہ ہر چند نشاں داد کہ در پیرہن است

یعنی "میں اس قدر نحیف و زار ہو گیا ہوں کہ موت نے ہر چند مجھ کو تلاش کیا لیکن میں نہ ملا حالانکہ نالہ بار بار بتا رہا تھا کہ میں پیرہن میں ہوں"

**نازک خیالیاں پیدا ہونے کی وجہ**

فارسی شعرا کی نازک خیالیاں اور جدت پسندیاں حد انتہا پر پہنچنے کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ جس طرف بھی نظر اٹھاتے تھے اس طرف ان کی آنکھیں لہلہاتے ہوئے سبزے اور صاف و شفاف قدرتی آبشاروں سے دوچار ہوتی تھیں۔ اگر ایک طرف بنفشہ و سنبل کے صحرا نظر آتے تھے تو دوسری طرف ان کی نظریں یاسمن و نرگس کی خوشنمائیوں اور دلفریبیوں سے کیف اندوز ہوتی تھیں۔ ان کی نظروں کے سامنے تمام دنیا کے کیف آور مناظر جمع تھے۔ وہ اپنی نزاکتِ طبع اور نازک خیالی کے باعث محبوب کی زلف معطر کو بنفشہ اور سنبل کی لٹ سے، نیم باز اور مخمور آنکھوں کو نرگس خوابیدہ سے، خط عارض کو سبزۂ نو دمیدہ سے، دندان آبدار کو در شبنم سے، ذقن کو سیب سے، کمر کو رگ گل سے، دہن کو غنچے سے اور چہرے کو گلستان سے تشبیہہ دیتے تھے۔

انشا — سیاسی اور اصولی انحطاط، X ما جی اثر، پریشانی و انتشار، درباری، حد درجہ کی سرپرستی اور حکومت

اے خوش آں روز کہ آں سیب ذقن سبز شود — ہر چہ می گفتمت اے عہد شکن سبز بود

دور پرچیں کردی از سنبل گرد یک گلستاں گل — وزاں پرچین پرچینم نژندو ناتواں کردی

لیکن عرب کا سادہ فطرت شاعر زیادہ سے زیادہ معشوق کی زلف کو رسی سے، کمر کو زنبور کی کمر سے اور انگلیوں کو مسواک سے تشبیہہ دے سکتا ہے۔ عربی شاعر کی نظریں ان کیف آور مناظر سے آشنا نہ تھیں۔ انھوں نے نرگس و یاسمن و سنبل و بنفشہ اور سرو وغیرہ کا نام تک نہ سنا تھا، ان کے کان آبشاروں کی دلکش صداؤں سے آشنا نہ تھے۔ جو چیزیں کبھی کسی نے دیکھی سنی نہ ہوں، ان کے اثر و کیفیات سے واقف ہونا مشکل بات ہے۔ اگر عرب کی مقدس زمین بھی ان چیزوں کو اپنے آغوش میں لیے ہوتی تو اس کی شاعری بھی اس جنت ارضی کے خوشنما سرمایے سے خالی نہ ہوتی۔ اس کے پاس تو تشبیہات و استعارات کی پیچیدگیوں کے بجائے سامنے کی نہایت سادہ مگر دلکش چیزیں ہیں۔

وفرعٍ یزین المتن اسود فاحم — اثیث کقنو النخلۃ المتعثکل

یعنی "وہ اپنی زلفیں اپنے عاشقوں کو دکھاتی ہے اور وہ زلفیں بسبب اپنی درازی کے زینت کمر ہیں، اور ایسی گھنی ہیں جیسے خوشہ اور کوئلے کی طرح سیاہ ہیں۔" اس شعر میں معشوقہ کی سیاہی زلف کو کوئلے سے تشبیہہ دی ہے اور بالوں کے گھنے پن کو خوشۂ خرما سے۔ دونوں تشبیہیں سامنے کی اور نیچرل ہیں۔ دماغ کو

متحرک کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

وتعطو برخص غیر شثن کانہ اساریع ظبی او مساویک اسحل

محبوبہ اپنی نرم و نازک انگلیوں سے (جو نرمی و رنگ میں موضع "ظبی" کے کرموں کی طرح ہیں، اس کے علاوہ جو باریکی اور سیدھے پن میں درخت اسحل کی مسواکیں ہیں) چیزوں کو اچھی طرح گرفت میں لے لیتی ہے۔" اس شعر کے اندر معشوقہ کی انگلیوں کو نرمی و نازکی میں موضع "ظبی" کے کرموں سے تشبیہ دی گئی ہے اور طول و استقامت میں درخت "اسحل" کی مسواک سے۔ دونوں تشبیہوں سے عربی رنگ اور اس کی خصوصیت بیک نظر ظاہر ہو جاتی ہے۔

وتضحی فتیت المسک فوق فراشہا نؤوم الضحیٰ لم تنتطق عن تفضل

مشک کے ریزے چاشت کے وقت معشوقہ کے بستر پر پڑے رہتے ہیں اور چاشت تک وہ مست خواب رہتی ہے اور وہ اچھے کپڑے پہن کر کمر میں پٹکا نہیں باندھتی کیونکہ یہ خادمہ کا کام ہے اور وہ مخدومہ ہے جس کی خدمت کے لئے بہت سی چھوکریاں حاضر ہیں۔ بستر پر مشک کے ریزوں کا پڑا رہنا صرف عربی تخیل ہے۔ ایرانی تخیل مشک کی جگہ نرگس و یاسمن اور لالہ و نسریں کا ذکر کرتا۔ ایرانی محبوب کی تعریف میں یہ بات داخل نہیں کہ وہ چاشت تک پڑا سوتا رہے۔ چمنستان ایران کا نرم و نازک محبوب صبح خیزی کا عادی ہوتا ہے، صبح کی کیف آور اور انبساط آگیں نسیم سے لطف اندوزی اس کا روزانہ کا مشغلہ ہوتا ہے۔ سبزۂ خوشرنگ کی صبائیت کے اثر کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں ڈورے پڑے رہتے ہیں، چمنہائے رنگین اس کی مستقل تفریح گاہیں ہوتی ہیں، صبح کے وجد آفریں وقت میں صحن گلزار سیکڑوں پری پیکر اور نازک اندام حسینوں کو اپنی آغوش میں لئے اٹھکھیلیاں کرتا ہوتا ہے۔

توگوئی ساحت بستاں بہشت عدن را ماند زبس غلمان و حور آنجا قطار اندر قطار آید

باغ کے ہر گوشے سے بربط و طنبور اور چنگ و نے کی آوازیں آتی ہوتی ہیں۔ ایک طرف اگر نے نوازی ہوا کرتی ہے تو دوسری جانب مے گساری۔

زہر سوئے نوائے ارغوان و چنگ و نے خیزد زہر کوئے صدائے بربط و طنبور و تار آید

یکے ایں جانواز دنے، یکے آں جاگسار مے — صدائے ہائے ہوئے ہے زہر سوئے ہزار آید

غرض یہ ہے کہ صبح کے وقت گلزاروں میں معشوقوں کا ایک مجمع سا ہوتا ہے اور ایک عجیب مدہوش کن تفریح کا سامان نظر آتا ہے۔ ع ہر جا جشنے و جوشے ہر گلے قدح نوشے۔

عاشقانِ خستہ جگر بھی اس سرور آگیں کیف سے لطف اندوز ہونے کے لئے قصدِ چمن کرتے ہیں اور اس صہبا اثر منظر سے ان کے دل و دماغ میں سروری کیفیت پیدا ہو جایا کرتی ہے اور حالتِ رقص میں طرح طرح کی سرمستیاں ظاہر ہونے لگتی ہیں۔

یکے بر لالہ پا کوبد کہ ہے ہے رنگ مے دارد — یکے از گل بوجد آید کہ بخ بخ بوئے یار آید
یکے بر سبزہ می غلطد یکے در لالہ می رقصد — یکے گاہے رود از ہش یکے گہ ہوشیار آید
یکے بر کف نہد لالہ کہ ترکیب قدح دارد — یکے بر گل کند تحسیں کزو بوئے نگار آید
یکے با دبرہ سادہ بصحن بوستاں گردد — یکے با ساغر بادہ بطرف جوئبار آید

ساحتِ عرب اپنی سنگلاخی کی وجہ سے ان وجد آفریں اور کیف بیز مناظر سے خالی ہے۔ اس کا رنگ تخیل مائل بہ سادگی ہے۔

وتبسم عن ألمى كأن منوراً — تخلل حر الرمل دعص له ند

وقتِ تبسم میری محبوبہ کے دندانِ آبدار ایسے چمکتے ہیں جیسے "بابونہ" کی شاداب کلیاں جو خاص تودۂ ریگ پر ہوتا ہے" تودۂ ریگ کی قید اس وجہ سے لگا دی کہ وہ آب باراں سے قدرے تر رہا کرتا ہے اور ایسی جگہ کی کلیاں بہ نسبت اور جگہ کے کچھ شاداب ہوا کرتی ہیں۔ عرب میں دندانِ تابندہ کو بابونہ کی کلیوں سے تشبیہ دیتے تھے، لیکن ایران کا بہار پروردہ اور رنگیں مزاج شاعر نہایت جوش و خروش اور مستی کے عالم میں کہتا ہے:۔

ع عقدِ ثریا در لبش، سی ماہ اندر غبغبش

كأن البرين والدماليج علقت — على عشر او خروع لم يخضد

یعنی" وہ ایسی نازک اندام ہے کہ پازیب، کنگن اور بازو بند جو وہ پہنے ہوئے ہے بسبب نزاکت جسم

ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا وہ آنکھ اور ہڈی پہنائے گئے ہیں۔ معشوق کی نزاکت جسمی کو آنکھ اور ہڈی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اس صحرائی تشبیہ میں نیچرل رنگ ضرور ہے لیکن انبساط دل اور شگفتگی دماغ کے سامان نہیں ہیں۔

وعینان کالماویتین اشکنتا بکہفی حجاجی صخرۃ قلت مورد

یعنی "اس کی دونوں آنکھیں اپنی درخشندگی کے اعتبار سے گویا دو آئینے ہیں اور وہ دو خمیدہ ہڈیوں میں جڑے ہوئے ہیں (خمیدہ ہڈی سے ابرو کے نیچے کی ہڈی مراد ہے) اور وہ دونوں ہڈیاں اپنی سختی میں اور وہ دونوں آنکھیں اپنی درخشانی میں اس پتھر کی طرح ہیں جو کسی قدر گڑھے میں ہو اور اس میں کسی قدر صاف و شفاف پانی چمکتا ہو۔" اس شعر میں دونوں آنکھوں کو آئینے سے تشبیہ دی گئی ہے اور وجہ شبہ صفائی و شفافی ہے اور استخوان ابرو کو سنگ سخت سے اس میں وجہ شبہ استحکام و مضبوطی ہے۔ لیکن ایران کی بہار آفریں اور انبساط آگیں سرزمیں کا شاعر اپنی رنگیں مزاجی کے باعث آنکھ کو نرگس شہلا سے تشبیہ دیتا ہے اور اس کے اندر کچھ اس انداز سے وجد آفریں کیف و اثر بھرتا ہے کہ طبیعت خود بخود اس کی کربائی کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ اس تشبیہ میں وہ اس قدر گلکاریوں اور رنگینیوں سے کام لیتا ہے کہ گلزار طبع کا پوشیدہ سے پوشیدہ گوشہ شگفتہ اور فرحت آثار بن جاتا ہے۔

لب مے آلود، دہان پرشکر، نرگس مست اے سلماں! کس روز بدینساں دارد

چونکہ عربی شاعر کے سامنے نرگس شہلا کی خوابیدگی اور مخموریت کی کوئی مثال نہ تھی اس لئے اس کی تشبیہ میں فطری سادگی ہے، رنگینی و شوخی سے کوئی واسطہ نہیں۔ ایرانیوں سے اگر ربط ضبط ہوتا تو نوبت ممکن تھا کہ آمد و رفت اور تعلقات کی بنا پر ان کے اندر بھی کچھ ایرانی سرمستیاں اور رنگینیاں پیدا ہو جاتیں۔ ایران چونکہ اس وقت آسمان تمدن کا ایک درخشندہ ستارہ سمجھا جاتا تھا، اس کا طریق معاشرت بلند تھا، انتظام و انصرام کے لحاظ سے بھی وہ بہت آگے بڑھا ہوا تھا اور عرب تہذیب و تمدن کے اصول و مبادیات سے بھی آشنا نہ تھے، بجائے مدنیت کے بدویت کا رنگ غالب تھا اس وجہ سے ایرانی ان کو نفرت، حقارت اور ذلت و خواری کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ایران کے دروازے ان کے لئے بند تھے۔

سرزمین ایران اس سرے سے اس سرے تک چمنستان و سنبلستان بنی ہوئی تھی، زمین کا چپہ چپہ چمن زار اور گوشہ گوشہ بہارستان معلوم ہوتا تھا۔ اگر ایک طرف طاؤس کی سریلی آواز سنائی دیتی تھی تو دوسری جانب بلبل کی چہک نغمۂ گوش بنی رہتی تھی۔ اگر ایک طرف سبزے کی لہک جان نکالے لیتی تھی تو دوسری طرف خوشبو کی لپٹ مشام جان کو معطر کرتی رہتی تھی۔ ہر قدم پر آبشاروں کی صدائیں فردوس گوش اور سبزۂ طاؤس رنگ جنت نظر کا لطف دیتا تھا۔ تمام ملک تختۂ زمردیں بنا ہوا تھا، نسیم صبح گاہی کا ایک جھونکا دلوں میں کیف و سرور کا دریا موجزن کر دیتا تھا۔

فیضے عجب دریں گل صبح از صبا رسید     بیروں کشیم رخت کہ دورت صفا رسید    (کلیم)

بنوعے آتش گل در گرفت است     کہ بلبل رفت و در آب آشیاں کرد    ( " " )

یعنی " پھولوں کی وجہ سے باغ میں اس طرح آگ لگ گئی ہے کہ بلبل نے جا کر پانی میں گھونسلے بنا لیے ہیں۔"

بصورت بید مجنوں آبشار ست     رطوبت برگ را از بس رواں کرد

یعنی " بہار کی وجہ سے اتنی رطوبت بڑھی ہوئی ہے کہ بید مجنوں پانی کا جھرنا معلوم ہوتا ہے۔"

درچمن باد سحر بوئے تو سودا می کرد     گل بہ کف داشت زر و غنچہ گرہ وامی کرد

"باغ میں باد صبا محبوب کی خوشبو فروخت کر رہی تھی اس لئے گل کے ہاتھ میں زر تھا۔"

یہ انھیں چیزوں کا اثر ہے کہ جن کی وجہ سے ایرانی شاعر بہاریہ مضامین باندھنے میں تمام دنیا سے گوئے سبقت لے گیا ہے۔ اس کے منہ سے جو لفظ بھی نکلتا ہے وہ رندی و مستی کا ایک چھلکتا ہوا جام معلوم ہوتا ہے۔ بہاریہ میدان میں پہنچ کر شاعر کی رنگین طبیعت میں رندانہ جولانیاں اور امنگیں ترقی کر جاتی ہیں۔ وہ خود بھی اس نشے میں مدہوش ہو جاتا ہے اور دوسروں پر بھی اس نہ اترنے والے نشے کا اثر ڈالتا ہے اور ان کو بھی اپنی طرح سرخوش و سرشار بنا لیتا ہے۔

دفتر حسن بہار ست کہ در عہد تو شست     برگ گل نیست کہ از باد، در آب افتاد است

" یہ جو پانی میں نظر آ رہا ہے پھول کا پتہ نہیں ہے بلکہ ملکۂ بہار نے حسن محبوب دیکھ کر اپنے حسن کا دفتر پانی میں دھو ڈالا ہے۔"

بار دیگر بر شاک گلبن بے برگ و بار  افسر زریں بر آرد ابر مروارید بار

یعنی "پھول کی خشک ٹہنی کو موتی برسانے والے بادل نے پھر تاج زریں پہنا دیا"

سپاہ ابر نیسانی بہ صحرا رفت از دریا  نثار لولوئے لالہ بہ صحرا برد از دریا

یعنی "ابر نیساں کی فوج دریا سے نکل کر صحرا میں چمکتے ہوئے موتی نثار کرنے کو لاتی ہے۔"

یہی وہ نشاط انگیز اور کیف آور چیزیں ہیں جن کی آمد کی وجہ سے انسان پر وجد و کیف کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ یہی وہ سرور بخش اور انبساط آگیں موسم ہوتا ہے جس میں چمنستان ایران کا باشندہ کیف و سرمستی کے بے پایاں سمندر میں غواصی کرنے لگتا ہے اور جس وقت اس کی آنکھیں دفتر حسن سے اکتساب لطف میں مشغول ہوتی ہیں اس وقت وہ بے ساختہ پکار اٹھتا ہے۔

چیزے دگر مگوے ہمیں گو کہ در چمن  سبزہ خوش است و آب خوش و جو ئبار خوش

جب اس کیف میں زیادہ صہبائیت پیدا ہوتی ہے تو پھر دل و دماغ وارفتہ ہوش ہو جاتے ہیں۔ اس منزل پر پہنچ کر استفہامی یا استعجابی صورت باقی نہیں رہتی بلکہ جرأت کے انداز پیدا ہو جاتے ہیں۔

ساقیا! بزم طرب ساز کہ از بلبل و گل  کار و بار چمن امروز بہ مرگ است و بساز

اعتدال ہوا کی کیفیت کے سامنے اعجاز عیسوی بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

ز اعتدال ہوا حکم جانور گیرد  اگر بنوک قلم صورتے کنند نگار

یعنی "ہوا کے اعتدال کا یہ عالم ہے کہ اگر نوک قلم سے کوئی صورت نقش کر دیں تو اس میں بھی جان پڑ جائے گی۔"

زمانہ ایست کہ بر قفل اگر نسیم وزید  بسان غنچہ اش از انبساط خنداں کرد

یعنی "آب و ہوا کی اثر انگیزی اس درجے پر پہنچی ہوئی ہے کہ جب وہ قفل سے لگ جاتی ہے تو وہ اس کے اثر کی وجہ سے غنچے کی طرح کھل جاتا ہے۔"

لیکن عربی زمین اگر ایک طرف صحرا و بیابان اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے تو دوسری جانب پہاڑ اور کھنڈر، بنفشہ و سنبل اور لالہ و سوسن کے بجائے خار مغیلاں نظر آتے ہیں۔ وہاں کی بہاریں زیادہ سے زیادہ نخلستانی حصے کو شمار کیا جا سکتا ہے۔ لالہ و گل، سوسن و نسرین، بنفشہ و سنبل کا وہاں کوسوں پتہ نہیں۔ زمین

بجائے تختۂ زمردیں ہونے کے گرم ریگ سے تپتی رہتی ہے۔ نسیم جانفزا کے بجائے بادِ صرصر کے تیز اور گرم تھپیڑوں سے سامنا کرنا پڑتا ہے۔ طبیعت میں سکون و اطمینان کی جگہ اضطراب و بے چینی جاگزیں رہتی ہے۔ ریگستان کے گرم ذرے آبلہ پائی کے سامان مہیا کرتے رہتے ہیں۔

سرزمین ایران کا ہر بچہ آنکھ کھولتے ہی عقل و خرد میں مستی پیدا کرنے والے جلوہ فروش مناظر سے ہم آغوش ہو جاتا ہے مگر عرب کی وادی غیر ذی ذرع کا رہنے والا انسان ان عجائب و غرائب سے خواب میں بھی کیف اندوز نہیں ہوتا وہ پہاڑوں، چٹیل میدانوں اور ریگستانی مناظر کی مصوری بہتر انداز سے کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کو سب سے بڑا ملکہ ناقوں کی رفتار اور روانی کی تصویر کھینچنے میں حاصل ہے اس کی تصویر سیکڑوں مختلف انداز سے کھینچتا ہے۔

کانَّ ثبیراً فی عرانین وبلہٖ　　　کبیرُ اناسٍ فی بجادٍ مزمّلِ

یعنی جب کوہ ثبیر پر بڑی بوندوں والی بارش ہوئی تو اس کی مختلف نالیوں سے جھاگ اور پانی بہنے لگا۔ پانی کا بہاؤ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا کوئی بڑا سردار دھاریوں دار کملی اوڑھے بیٹھا ہے۔ پہاڑ کو سردار اور پانی بہنے کی مختلف نالیوں کو دھاریوں سے تشبیہہ دی ہے۔

قفا نبک من ذکری حبیب و منزلِ　　　بسقط اللوی بین الدخول فحوملِ

یعنی اے میرے دوستو! تھوڑی دیر کے لئے اس جگہ ٹھہرو یہ میری محبوبہ کا اجڑا ہوا مکان ہے۔ آؤ ذرا دیر معشوق اور اس کے مکان کی یاد میں آنسو بہالیں جو دخول و حومل کے میدان میں ایک غیر مستقیم تودۂ ریگ پر ہے۔

تریٰ بعر الارام فی عرصاتہا　　　وقیعانہا کانہ حب فلفلِ

یعنی تجھ کو آہوان سفید کی مینگنیاں اس کے صحنوں اور نشیبوں میں ایسی معلوم ہوتی ہوں گی کہ گویا وہ کالی مرچ کے دانے ہیں۔" مطلب یہ ہے کہ اب وہ منزل بالکل ویران ہے اور اس میں سوائے ہرنوں کے اور کوئی نہیں رہتا۔

لخولۃ اطلالٌ ببرقۃ ثہمدِ　　　تلوح کباقی الوشم فی ظاہر الیدِ

یعنی موضع ثہمد کی پتھریلی زمین میں میری محبوبہ خولہ کے کھنڈرات ایسے نظر آتے ہیں جیسے گودنے کے نشان ہاتھوں پر نمایاں ہوتے ہیں۔

جنوح دفاق عندل ثم افرعت　　　لہا کتفاہا فی معالی مصعد

یعنی وہ اونٹنی نشاط و سرور کی وجہ سے کلیلیں بھرتی رہتی ہے، کودنے پھاندنے والی اور سر کی بلند ہے اس کے دونوں مونڈھے ایک اونچے قصر کے برابر ہیں۔

واتلع نہاض اذا صعدت بہ　　　کسکان بوصی بدجلۃ مصعد

یعنی "اس ناقے کی گردن بہت بلند ہے۔ جب وہ اس کو اٹھاتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دریائے دجلہ میں کشتی رواں کا دنبالہ ہے۔"

فارسی تشبیہات کی اس اثر انگیزی کے باوجود عرب کی فطری سادگی کا یہ اثر ہے کہ قدمائے ایران کے کلام میں جابجا عربی سادگی کے انداز پائے جاتے ہیں۔"

عربوں کا عام قاعدہ تھا کہ وہ گھونگھر والے والے بالوں کو خوشہ انگور سے تشبیہ دیتے تھے، چنانچہ میر معزی نے جو قدمائے ایران میں شمار کیا جاتا ہے اس شعر میں عربی تشبیہ کو اڑایا ہے۔

گرفتہ زلف گرہ گیر درمیان دولب　　　چو خوشۂ عنب اندر میانۂ عناب

عربی شعرا عموماً معشوق کی زلف کو رسی یا صلیب سے تشبیہ دیتے تھے چنانچہ محمود رواق جس کو تذکرہ نویسوں نے قدما میں شمار کیا ہے۔ اس کے اس مصرعے میں عربی اثر موجود ہے۔

ع　زلف مکشا تا دگر راہب نگوید کا نصلیب

دورِ متوسطین تک یہ اثر بہت کچھ نمایاں رہا ہے۔

رسن زلف تو سر رشتۂ جان من و شمع　　　ماہ خورشید نمایش ز پس پردۂ زلف　(حافظ شیرازی)

(باقی آئندہ)

---

# زکوٰۃ

سورۃ التوبہ پارہ ۱۰ " اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

ترجمہ: "زکوٰۃ کا روپیہ صرف محتاجوں اور مسکینوں کو دینا چاہیئے اور ان کو جو اس کو جمع کریں اور ان کو جن کے دل اسلام کی طرف کھنچیں (مراد ہے نو مسلم سے) ........ الخ"

مذکورہ بالا آیت میں زکوٰۃ کے روپیہ کا مستحق ان لوگوں کو بھی بتلایا گیا ہے جو اس کو جمع کریں اور جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ زکوٰۃ کا روپیہ یکجا جمع کر کے مسلمانوں کی ایک ایسی تنظیم کے ماتحت خرچ کیا جا سکتا ہے جو ان کی ترقی اور بہبودی کی ذمہ دار ہو۔ ہر مسلمان کو علیحدہ علیحدہ یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی زکوٰۃ کا روپیہ اپنی حسب منشا جس طرح چاہے صرف کرے۔ اس طرح زکوٰۃ کا مدعا حاصل نہیں ہوتا اور زکوٰۃ دینے والا اپنے فرض سے سبکدوش نہیں ہوتا کیونکہ وہ اس کا بیجا استعمال کرتا ہے۔ ہر متنفس کے واسطے یہ معلوم کرنا قطعی ناممکن ہے کہ زکوٰۃ کے روپیہ کا کون مستحق ہے اور اسی لئے اسلام نے اس کا جمع اور خرچ کرنا ایک تنظیم کے ماتحت رکھا ہے۔ مثلاً اکثر لوگ نااہل لوگوں کو زکوٰۃ کے روپیہ سے حج کرنے کے لئے بھیج دیتے ہیں یا لنگر خانے جاری کرتے ہیں جس سے زیادہ تر پیٹ بھرے ہی فائدہ اٹھاتے ہیں اور مستحقین محروم رہ جاتے ہیں، یا مسجدیں بنواتے ہیں یا اور ایسے کام کرتے ہیں جن میں ان کا نام ہو اور اس طرح سے زکوٰۃ کا استعمال محض خلاف تعلیم اسلام اور بے جا ہی نہیں ہے بلکہ سخت مضر ہے۔ زکوٰۃ کا مقصد قومی اور ملکی ترقی ہے اور وہ بطور ایک محصول کے مسلمانوں پر فرض کی گئی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ محصول ملکی اور قومی ترقیات کے واسطے ہوتا ہے نہ کہ داین کی حسب منشا صرف کرنے کے لئے۔ جہاں مسلمانوں کی اپنی سلطنت ہے وہاں زکوٰۃ کا روپیہ سرکاری خزانے یا بیت المال میں داخل ہونا چاہیئے کیونکہ ان کی حکومت خود ان کی بہبودی اور ترقی کی ذمہ دار ہے لیکن جہاں مسلمانوں کی اپنی حکومت نہیں ہے وہاں ان کی ایسی جماعت جیسی ہندوستان میں مسلم لیگ تھی

ان کی بہبودی اور ترقی کی ذمہ دار ہے اور اس لئے زکوٰۃ کا روپیہ جمع و خرچ کرنا اس کا حق ہونا چاہئے تھا مگر مسلمانوں نے اپنے مذہب کے زریں اصولوں میں سے کسی ایک اصول کی بھی صحیح طور سے پابندی نہیں کی کیونکہ انھوں نے مذہب کو چند بے معنی رسوم کا مجموعہ تصور کر لیا اور اس کے اصولوں کو مذہب سے خارج کر دیا۔ اگر وہ کاش ایک اصول کی بھی صحیح طور سے پابندی کرتے تو ان کی حالت ایسی ناگفتہ بہ نہ ہوتی جیسی آج ہے۔ آج مسلمانوں میں لاکھوں ہٹے کٹے فقیر اس زکوٰۃ کے بیجا مصرف کی بدولت پیدا ہو گئے ہیں جن کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور جو اپنی تمام عمر سستی اور کاہلی میں بسر کرتے ہیں اور ان کو کبھی اپنی حالت کے سنبھالنے کا خیال تک نہیں آتا۔ بھیک پر ایک عرصے سے بسر اوقات کرنے کے باعث ان میں نہ تو غیرت باقی رہی ہے اور نہ ذریعہ معاش تلاش کرنے کی ہمت و قابلیت۔ اس طرح مسلمانوں میں کاہلی اور افلاس روز بروز ترقی پذیر ہیں اور اس کا جو ضرر رساں اثر مسلمانوں کی قومی زندگی پر پڑ رہا ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ مسلمانوں کے تمام قومی کام مثلاً مدرسے، بنک، شفاخانے، یتیم خانے، کتب خانے، خیراتی کارخانے، مختلف قسم کی انجمنیں، اور دوسرے رفاہِ عام کے کام اول تو نظر ہی نہیں آتے اور جو موجود ہیں وہ بدترین حالت میں محض اس وجہ سے پڑے ہوئے ہیں کہ زکوٰۃ کا روپیہ منشائے الٰہی کے خلاف ہر شخص اپنی حسب منشا صرف کر رہا ہے اور مسلمانوں میں سستی اور کاہلی کی عادتیں پیدا کر رہا ہے، مفت خوروں کی تعداد بڑھا رہا ہے اور ان میں عیاشی کو ترقی دے رہا ہے۔ افسوس ہے کہ اسلام کے ایسے زریں اور بیش قیمت اصول کا ایسا بدترین استعمال ہو رہا ہے اور اس پر لوگوں کا یہ اعتقاد ہے کہ ہم نیکی کر رہے ہیں اور بہشت خرید رہے ہیں۔ زکوٰۃ کے روپیہ کے صرف کرنے کا تو مسلمانوں کو علیحدہ علیحدہ حق ہی حاصل نہیں ہے، یہ تو قوم کی امانت میں خیانت کرنا ہے۔ زکوٰۃ کا مدعا دولت کو مساویانہ طور پر تقسیم کرنا، نسل انسانی کی مجموعی خوشحالی کو بڑھانا اور انسانی تکالیف کو کم کرنا ہے۔ نسل انسانی کی خوش حالی اس زمانے میں بھوکوں کا پیٹ بھرنے سے نہیں بڑھ سکتی بلکہ ان کو خود اپنا پیٹ بھرنے کے قابل بنانے اور ان میں اپنی حالت کو ترقی دینے کا خیال پیدا کرنے سے بڑھ سکتی ہے۔ اس لئے کسی غریب، محتاج یا ضرورتمند کی زکوٰۃ یا خیرات کے روپیہ سے فوری کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کی ضرورت اپنے طور پر پوری کر دینا ہرگز مفید اور بار آور ثابت نہیں ہو سکتا اور اس لئے ثواب میں داخل نہیں ہو سکتا کیونکہ اس طرح سے تو افلاس

میں بلاوجہ اضافہ ہوتا ہے سستی اور کاہلی پھیلتی ہے اور مصیبتیں بڑھتی ہیں بلکہ زکوٰۃ یا خیرات اس وقت میں مفید اور بار آور ثابت ہو سکتی ہے اور اس کا مدعا اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب اس سے مدرسے، یتیم خانے اور ایسے صنعتی کارخانے اور تجارتی کاروبار جاری کئے جائیں جہاں غریب اور محتاج تعلیم پاکر یا کام سیکھ کر خود محنت کرکے اپنی روزی پیدا کرنے کے قابل ہوں اور ان کی محنت بھی بار آور ہو۔ اس کے علاوہ اسلامی سیونگس بینک اور بیمہ کمپنیاں وغیرہ مخصوص طور پر انھیں لوگوں کے واسطے قائم ہوں تاکہ ان میں عیاشی اور فضول خرچی سے باز رہنے، روپیہ پس انداز کرنے اور دور اندیشی سے کام لینے کی عادتیں پیدا ہوں۔ یہ تمام کام ہر شخص علیحدہ علیحدہ نہیں کر سکتا اس لئے لازمی طور پر زکوٰۃ یا خیرات کا روپیہ ایک تنظیم ہی کے ماتحت جمع اور خرچ کرنا زکوٰۃ یا خیرات کے مقصد کو پورا کر سکتا ہے اور اسلام کے اس ایک ہی اصول کے صحیح استعمال سے مسلمانوں کی حالت سنبھل سکتی ہے اور ان کا تنزل ترقی سے بدل سکتا ہے۔ بعض لوگ اس مقام پر یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ زکوٰۃ ایک مذہبی فرض ہے اور کلام مجید میں یہ حکم آیا ہے کہ ہر مسلمان کو زکوٰۃ دینی چاہئے لہٰذا ایک مسلمان کا اتنا ہی فرض ہے کہ وہ اپنے مال کی ہر سال زکوٰۃ نکال دے اور جو کچھ زکوٰۃ حساب سے نکلتی ہو وہ غریبوں اور محتاجوں کی امداد پر صرف کر دے خواہ کسی طریقے سے کرے اور خواہ اس کی یہ امداد قوم کے لئے مفید ہو یا مضر۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ اس آیت کے یہ الفاظ کہ "زکوٰۃ کے روپیہ کے وہ لوگ بھی مستحق ہیں جو اس کو جمع کریں" یہ ثابت کرتے ہیں کہ زکوٰۃ کا روپیہ ایک تنظیم کے ماتحت جمع اور خرچ ہونا چاہئے زکوٰۃ دینے والے کو اس کے خرچ کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ کلام مجید نے جو باتیں مسلمانوں پر فرض کی ہیں وہ انھیں کے فائدے کے واسطے ہیں، خدا کا اس میں کوئی فائدہ یا نقصان نہیں ہے۔ آپ زکوٰۃ ادا کریں یا نہ کریں اس کی ذات قطعی بے نیاز ہے۔ کلام مجید نے تو زکوٰۃ کا ایک زریں اصول ہمارے ہی فائدے کے لئے ہم کو بتلایا اور اس کو ایک تنظیم کے ماتحت جمع اور خرچ کرنے کی تعلیم بھی اسی لئے دی تاکہ اس کا صحیح استعمال ہر ملک اور ہر زمانے کی ضروریات کے مطابق کیا جا سکے اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ انسانی زندگی کی ضروریات ہر ملک اور ہر زمانے میں بدلتی رہتی ہیں۔ لہٰذا آج زکوٰۃ یا خیرات کا اپنی موجودہ ضروریات کے مطابق صحیح استعمال کرنا بالکل منشائے الٰہی کے مطابق ہے۔ اب یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ حالت میں جبکہ

ہندوستان کے مسلمانوں میں بدقسمتی سے اس قسم کی کوئی مرکزی یا مقامی تنظیم بھی موجود نہیں ہے جو ان کی قومی ترقی اور بہبودی کی ذمہ دار ہو کیونکہ لے دے کر جو ایک ٹوٹی پھوٹی مسلم لیگ تھی وہ بھی فرقہ بندیوں اور خود غرضیوں کی نظر ہو گئی تو مسلمان اپنا زکوٰۃ کا روپیہ کس کو دیں۔ حقیقت میں یہ ایک ایسا سوال ہے کہ جس کا کوئی حل ہمارے پاس اس وقت موجود نہیں مگر چونکہ یہ ایک مذہبی فرض ہے اور مسلمانوں کو زکوٰۃ ضرور ادا کرنی چاہیئے اس لئے دوسرا بہترین طریقہ اس کے لئے یہی ہو سکتا ہے کہ ہر شخص اپنی زکوٰۃ یا خیرات کا روپیہ اپنے ان مختلف مقامی یا بیرونی اداروں کو دے جن کو وہ اپنی دانست میں یہ سمجھتا ہو کہ وہ قومی خدمات انجام دے رہے ہیں لیکن فقیروں کو شاہ صاحبوں کو زائرین یا مجاوروں کو خیرات یا زکوٰۃ کا روپیہ دینا محض بے کاری نہیں ہے بلکہ ملکی اور قومی مفاد کے منافی ہے اور اس لئے تعلیم اسلام کے خلاف ہے۔

---

# یقین

آپ کا نام انعام اللہ خاں اور یقین تخلص ہے۔ آپ دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی آپ کا خاندان نہ صرف زہد و تقوے میں شہرت پذیر تھا بلکہ امارت میں بھی ممتاز تھا۔ آپ کے والد ماجد کا نام شیخ اظہر الدین خاں ہے۔ اگرچہ تذکرہ نویسوں نے کوئی تاریخ پیدائش نہیں لکھی لیکن آپ کے دیوان کے دیباچہ نگار کی رائے میں آپ کی تاریخ پیدائش سنہ ۱۱۴۰ھ ہے اور تاریخ وفات سنہ ۱۱۶۹ھ۔ آپ مرزا مظہر جان جاناں کے شاگرد تھے اور آپ نے اپنے استاد کی تعریف میں چند شعر بھی بعض بعض غزلوں میں لکھے ہیں۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ آپ اپنے باپ کے ہاتھ سے قتل کئے گئے لیکن تذکرہ نویسوں میں وجہ قتل کے متعلق بعید اختلاف ہے بعضوں نے قیاسات سے کام لیا ہے اور بعضوں نے بغیر سمجھے بوجھے محض نقل پر اکتفا کیا ہے۔ مگر بات یہی صحیح معلوم ہوتی ہے کہ یقین کے قتل کی کوئی وجہ معلوم نہیں ہوئی۔

آپ افیون بھی کھاتے تھے اور اس بری عادت کی وجہ سے آپ کا رنگ و روغن جاتا رہا تھا بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یقین نے کچھ نہیں لکھا بلکہ مرزا مظہر جان جاناں نے تمام دیوان لکھ دیا ہے۔ ہمیں بذات خود اس سے انکار ہے اور ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ استاد اپنے عزیز شاگرد کے لئے بھی ایک پورا دیوان خود لکھنے کی کیوں زحمت اختیار کرے۔ علاوہ ازیں رنگ کلام بھی مرزا مظہر جان جاناں کا نہیں معلوم ہوتا۔ یقین کو محض بدنام کیا گیا ہے ورنہ اس قصے کی کوئی اصلیت نہیں۔

**کلام پر تبصرہ** آپ نے ایک سو ستر غزلیں پانچ پانچ شعروں کی لکھی ہیں اس لئے آپ کے اشعار کی مجموعی تعداد آٹھ سو پچاس ہوتی ہے۔ انجمن ترقی اردو نے جو دیوان مرتب کرایا ہے اس میں سوائے غزلوں کے اور کوئی صنفِ کلام موجود نہیں ہے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے دیگر اصنافِ سخن کا بھی ذکر کیا ہے مگر وہ کلام اب ہمارے سامنے موجود نہیں ہے لہذا ہم اس پر کوئی رائے بھی ظاہر نہیں کر سکتے۔

غزلوں کے متعلق بھی بعض بعض تذکرہ نویسوں نے مبالغہ سے کام لیا ہے۔ مؤلف "گل رعنا" نے

تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ:-

"اگر یقین جیتے رہتے تو میر ہوں یا مرزا کسی کا چراغ ان کے سامنے نہیں جل سکتا تھا۔"

نہیں معلوم مولوی عبدالحی مرحوم نے یہ رائے کیونکر قائم کی۔ کم از کم میر تو وہ شخص ہے جس کا جواب آج تک پیدا نہیں ہو سکا۔ یقین نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ہرگز یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ شخص غزل گوئی میں بے نظیر ہے میں تو میر صاحب کا صرف ایک شعر پیش کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ یقین کے تمام دیوان میں سے ایک شعر یا ایک مصرع ہی ایسا نکال دیجئے۔ یقین کی رسائی ایسے بلند مضامین تک اگر وہ اور بھی زندہ رہتے ہرگز نہ ہوتی۔ ان کا انداز بیان خوب ہے لیکن تخیل معمولی ہے۔ ممکن ہے کہ اس زمانے میں یہ ایک نئی بات ہو کیونکہ اس وقت محض ایہام گوئی کا رواج تھا۔ بہرحال میں یہ ماننے کے لئے تیار ہوں کہ یقین کے انداز بیان میں جدت ہے۔ میر صاحب فرماتے ہیں:-

سرسری تم جہان سے گزرے ۔۔۔ ورنہ ہر جا' جہان دیگر تھا

اب انصاف سے کہیے کہ ایسے بلند خیالات کا شائبہ بھی یقین کے دیوان میں پایا جاتا ہے؟ اگر ایک شعر بھی تمام دیوان میں بلند ہوتا تو ہم اس سے اندازہ کر سکتے کہ شاید چالیس پچاس برس کی عمر تک پہنچنے میں میاں یقین بھی علوئے تخیل سے کام لیتے۔ مگر وہاں تو بہت معمولی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے البتہ انداز بیان خوب ہے اور اس زمانے کے لحاظ سے ضرور قابل تعریف ہے۔

مرتب دیوان یقین نے یقین کی چند غزلیں حاتم، میر، سودا، درد اور تاباں کی غزلوں کے بالمقابل پیش کی ہیں۔ ہم بخوف طوالت ہر ایک شاعر کے کلام سے یقین کے کلام کا موازنہ نہیں کر سکتے۔ البتہ مثال کے طور پر صرف درد کے دو شعر پیش کرتے ہیں جن کے قافیے یقین کے یہاں بھی بندھے ہیں۔

| یقین | درد |
|---|---|
| سبھی مرتے ہیں خوش قدّی پہ جی دیتے ہیں شادی پر | گلستان جہاں کی وید کیجو چشم عبرت سے |
| تکلف برطرف یہ نوحہ گر بندہ ہے ماتم کا | کہ ہر اک سرو قد ہے اس چمن میں نخل ماتم کا |

یقین کے یہاں یہ خیال بندھا ہے کہ سب لوگ خوشی پسند کرتے ہیں مگر میں رنج کو پسند کرتا ہوں

وجہ ظاہر نہیں کی کہ کیوں ایسا ہے۔ مثلاً غالب نے کہا ہے:

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج　　مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

مشکلوں کا آسان ہونا کس خوبی سے دکھایا ہے۔ یہاں یہ بات نہیں۔ اب آپ کے قیاس پر شعر کا مطلب منحصر ہے۔ سمجھ لیجئے کہ دل ہاتھ سے جاتا رہا ہے اور میاں یقین اس کا ماتم کر رہے ہیں اور یہ غم جانگزا ان کو نہایت مرغوب ہے۔ یا یہ کہ لوگوں کو تو خوشی پسند ہے مگر ہم تو ہمیشہ رنجور ہی رہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خیال بہت معمولی ہے البتہ انداز بیان قابل تعریف ہے۔

دردؔ نے اپنے شعر میں اس خیال کو ظاہر کیا ہے کہ دنیا جو بہت خوبصورت معلوم ہوتی ہے اس میں تکلیف ہی تکلیف ہے۔ جو لوگ بظاہر خوش نظر آتے ہیں وہ بھی مبتلائے رنج ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اس کائنات کا نہایت غور سے مطالعہ کیا ہے اور نہایت خوبی کے ساتھ اپنے عمیق مطالعہ کا نتیجہ ایک شعر کے اندر رکھ دیا ہے۔ یقین کے شعر کو دردؔ کے شعر سے کوئی نسبت نہیں۔

| درد | یقین |
|---|---|
| چمن میں باغباں سے صبح کو کہتی تھی یہ بلبل | شکوہِ حسن سے آنسو ہمارے سوکھ جاتے ہیں |
| گلوں کے منہ پہ یوں پڑھتی ہے دیدہ دیکھ شبنم کا | یقیں سورج کے آگے کب اثر رہتا ہے شبنم کا |

یقین نے ایک معمولی خیال پیش کیا ہے اور تشبیہ بھی معمولی ہے۔ کہتا ہے کہ جس طرح دھوپ میں شبنم خشک ہو جاتی ہے اسی طرح ہمارے آنسو اس آفتاب حسن کے آگے سوکھ جاتے ہیں یعنی معشوق کے دبدبہ حسن کی وجہ سے ہم اس کے سامنے نہیں رو سکتے۔

دردؔ کے یہاں بھی تشبیہ تو معمولی ہے لیکن وجہ جدت طراز ہے۔ کسی شاعر نے آج تک یہ خیال ظاہر نہیں کیا کہ گل جیسی نازک شے پر شبنم کا پڑنا گستاخی میں داخل ہے مزید براں عاشق یعنی بلبل کی زبان سے اس خیال کا ادا ہونا نہایت پر لطف ہے۔ ہمارے نزدیک دردؔ نے اس قافیے کو بھی یقین سے بہت بہتر باندھا ہے۔

یقین اپنے کلام کے لحاظ سے اچھے شاعر ضرور ہیں لیکن ان کے جوانمرگ ہونے نے ابوالفضل

کا یہ فقرہ جو اس نے عرفی کے لئے لکھا ہے "غنچۂ استعدادش ہنوز ناشگفتہ پژمرد" اپنے لئے موزوں کرلیا ہے۔
یقین کا شمار ہرگز استادان فن میں نہیں کیا جا سکتا۔ وہ صرف دوسرے درجے کے شاعروں میں ممتاز جگہ پانے
کے مستحق ہیں اور یہ بھی صرف اس وجہ سے کہ وہ بلحاظ زمانہ متقدمین میں داخل ہیں۔ اس وقت اردو شاعری
عالم طفولیت میں تھی۔ جس کسی شاعر نے بھی زبان کی صفائی اور خیالات کی عمدگی پر اپنا عزیز وقت صرف کیا ہے
وہ سب ہمارے شکریے اور اعزاز کے مستحق ہیں۔ آپ کے کلام میں اگرچہ قدیم اور متروک الفاظ بدستور موجود
ہیں لیکن ان کا استعمال بار بار نہیں ہوا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مختصر مجموعۂ کلام ہونے کی وجہ سے متروک
الفاظ کو بار بار استعمال کرنے کی نوبت نہ آئی ہو۔ بہرحال آپ کا کلام صفائی زبان اور خیالات کی برجستگی کے
لحاظ سے ضرور عمدہ ہے۔ تشبیہات اور استعارات بھی آپ کے کلام میں بکثرت ہیں۔ بعض شعر درد اور اثر سے
بھی پر ہیں۔ بامزہ بھی ہیں لیکن اگر کوئی آپ کے کلام کو سوز و گداز سے مملو بیان کرے تو میں ہرگز یہ تسلیم کرنے
کے لئے تیار نہیں۔ گنتی کے چند اشعار ہیں جو پر درد ہیں۔ البتہ آپ نے اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ بھرتی
کے شعر غزل میں داخل نہ کئے جائیں چنانچہ آپ نے ہر غزل میں صرف پانچ اشعار لکھے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے
کہ آپ کے یہ منتخب اشعار بھی سب کے سب اچھے نہیں ہیں تاہم اتنے سبک اور رکیک بھی نہیں جو پر گو شاعروں
کے یہاں پائے جاتے ہیں۔

اب ہم ذیل میں قارئین کرام کو تذکرہ نویسوں کی آرا سے بھی روشناس کرتے ہیں جو انھوں نے یقین
کے کلام کی نسبت ظاہر کی ہیں:۔

میر تقی میر:

"یقین شاعر ریختہ صاحب دیوان ازبس کہ اشتہار دارد محتاج بہ تعریف و توصیف
نیست۔۔۔۔۔ بر و پوچ چندے کہ بافتہ است کہ ما و شما نیز می توانیم بافت۔ ایں قدر
برخود چیدہ است کہ رعونت فرعون پیش او پشت دست بر زمیں می گزارد۔۔۔۔ بعد
از ملاقات ایں قدر معلوم شد کہ ذائقۂ شعر فہمی مطلق ندارد۔"

ہم تو بہت خوش ہوئے کہ یقین نے میر کی بد دماغی کو بھی مات کر دیا خواہ وہ سخن فہم تھے یا نہ تھے۔

فتح علی گردیزی جو یقین کے دوست تھے:

"شہباز خیالش بعید معنی بلند پرواز است و ہمای اندیشہ اش بر قلۂ قاف سخن بہ پر فشانی ممتاز۔ بے اغراق ریختہ گوئی را بر طاق بلند گزاشتہ و تخم معنی در زمین سخن کاشتہ و آنچہ از طبعش سر زدہ از فرط شیوع و حسن قبول در تمام ہندوستان بر افواہ و السنہ جاری شدہ"

قیام الدین قائم:

"صدر نشین بزم شعرائے متاخرین......... و مصرع از زباں ہائے خامۂ سحر طرازش بایں ہمہ لطف و خوبی می تراود کہ بمجرد استماع در دل عشاق قطرات خوں شدہ از دیدہ فرو می چکد۔"

لچھمن نرائن شفیق اورنگ آبادی:

"یقین یکتائے عصر و یگانۂ زمانہ است۔"

قدرت اللہ شوق:

"مشق سخن او بپایۂ استادی رسیدہ بود اما اجلش مہلت نداد۔ ہر قدر کہ دیوانش مرتب است ہمہ انتخاب و از درد خالی نیست۔"

میر حسن:

"اشعارش بسیار نمکیں و موثر اند سخن او خالی از دردمندی نیست۔"

قطب الدین باطن:

"فن شعر میں کامل۔"

کریم الدین:

"تمام قسم کے اشعار میں ماہر و آگاہ کامل۔"

نساخ و سید علی حسن خاں:

"شاعر پر درد و بامزہ۔"

مرزا علی لطف:

"کلام مرغوب طبع اور اشعار جاں خراش دل وجاں"

خواجہ حمید الدین اورنگ آبادی:

"یقین کا کلام متین ہے"

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ:

"کلامش سیر نمک است حلاوت دلخواہ دارد"

مصحفی:

"در دورۂ ایہام گویاں اول کسے کہ ریختہ را شستہ و رفتہ گفتہ ایں جوان است"

دیوان یقین میں جو قدیم الفاظ اور متروکات استعمال ہوئے ہیں حسب ذیل ہیں:-

منیں بجائے نہیں ع نام حمد اور مدح کا لینا مجھے انصاف نئیں۔ تجھ حسن بجائے تیرے حسن۔ بسرتی بجائے بھول جاتی۔ آشیاں کرنا بجائے آشیاں بنانا۔ سجن بجائے یار۔ دیوے بجائے دے۔ امتحان کرنا بجائے امتحان لینا۔ ایدھر بجائے ادھر۔ بچارے بجائے بیچارے۔ کسو بجائے کسی۔ کبھو بجائے کبھی۔ راکھا بجائے رکھا۔ جاگہہ بجائے جگہ۔ دیکھ بجائے دیکھ کر۔ کیونکہ بجائے کیوں کر۔ ہو جو بجائے ہو۔ پڑیو بجائے پڑے۔ کیا چاہے بجائے کرنا چاہیے۔ ہموں بجائے ہیں۔ ستی بجائے سے۔ جفا اٹھایا ہوں بجائے جفا اٹھا چکا ہوں۔ کو بجائے کا ع کہ ہوتا ہے جنوں کے شور کو سیر چمن باعث۔ لوہو بجائے لہو۔ رکھیے بجائے خوش ہو۔ دوانہ بجائے دیوانہ ع پھر نہ دی ہم کو کسو نے اس دوانے کی خبر۔ بن بجائے بغیر یا سوائے۔ کیجے بجائے کیجیے۔ خموشی سات بجائے خموشی کے ساتھ۔ زور بجائے بہت۔ میں بجائے میں نے۔ ٹک بجائے ذرا۔ انھوں کو بجائے ان کو۔ باؤ بجائے ہوا۔ لاگی ہے بجائے لگی ہے۔ پھنسا وا بجائے پھنسا ہوا۔ امیدے بجائے امید پر ع الفت میں کس امیدے کیجے دماغ صرف۔ اتی بجائے اتنی۔ نپٹ بجائے بہت وغیرہ وغیرہ۔

لہٰذا یہ خیال کرنا کہ یقین کا کلام قدیم الفاظ اور متروکات سے خالی ہے یا بہت کم قدیم الفاظ استعمال

ہوئے ہیں غلط ہے لیکن یہ صحیح ہے کہ ایک ایک دو دو شعر میں یہ متروکات آگئے ہیں بار بار دہرائے نہیں گئے۔ اسی وجہ سے یقین کا کلام صاف اور خوشنما معلوم ہوتا ہے۔

آپ کے کلام میں بعض نقائص بھی ہیں جن کو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:-

آج کل کے محاورے کے مطابق اس قسم کی فارسی اضافت نہایت معیوب خیال کی جاتی ہے:-

تری آنکھوں کی کیفیت کو مے خانے سے کیا نسبت — نگہ کی گردشوں کو دورِ پیمانے سے کیا نسبت

یہ نہیں ہوتا کسی مرہم سے اس سینے کا داغ — ہو گیا ناسور آخر یارِ دیرینے کا داغ

بدترین تعقید کی مثالیں لیجئے:-

اب جوں سرشک خاک سے سکتا نہیں ہوں اٹھ — آگے میں دل کی آنکھ سے اتنا گرا نہ تھا

کہاں سکتے ہیں چڑھ منہ پر بتانِ ناز و تمکیں کے — کہ ہیں ہم صبر کے بے خرچ مفلس میں دل و دیں کے

گرچہ شیریں شیخ کے ہے وجد میں آنے کا شور — پر قیامت با نمک ہوتا ہے مے خانے کا شور

کوئی کو کوئی باندھا ہے:-

کئی بلبل ان دنوں میں نہ پھنسیو چنانچہ میں — جب تک کہ چھوٹوں، ہو گئی آخر بہار حیف

زیادہ کو زادہ باندھا ہے:-

جو پیتا ہے مرے دل کا لہو، پی لیکن آہستہ — خدا شاہد کہ شیشے سے ہے زادہ یہ سبو نازک

کہیں کو کئیں باندھا ہے:-

بدگماں، زاہد! یقیں سے پاکبازاں پر نہ رکھ — دیکھ کئیں سر پر پڑے گا بے گناہوں کا وبال

شَجَر کو شجْر باندھا ہے:-

ذرا نہیں ہے مری آہ میں اثر افسوس — کسی چمن میں خدا شجر بے ثمر نہ کرے

تذکیر و تانیث میں بھی آج کل کے محاورے کے لحاظ سے اختلاف پایا جاتا ہے:-

تلاش کو مذکر لکھا ہے:-

رات دن خوباں کو ہے دلہائے مفتوں کا تلاش — روز و شب لیلیٰ کو تھا درپیش مجنوں کا تلاش

ایک جگہ ظہور کا قافیہ شور باندھا ہے۔ مطلع ہے:۔

وہ کون دل ہے جہاں جلوہ گروہ نور نہیں
اس آفتاب کا کس ذرے میں ظہور نہیں

لیکن حسن مطلع تحریر فرماتے ہیں:۔

کوئی شتاب خبر لو، کہ بے نمک ہے بہار
چمن کے بیچ دوانوں کا اب کے شور نہیں

بعض مقام پر ردیف غیر ضروری اور بے جوڑ ہوگئی ہے مثلاً:۔

بعد مرنے کے بھی ہوں گور میں غمناک ہنوز
گرد پھرتے ہیں مری خاک کے افلاک ہنوز

غمناک ہنوز میں ہنوز نہ صرف زائد اور غیر ضروری ہے بلکہ بے ربط بھی ہے۔

اگرچہ آپ کے یہاں یہ التزام کیا گیا ہے کہ فحش اور رکیک اشعار داخل دیوان نہ ہوں تاہم بعض اشعار آج کل کی تہذیب کے لحاظ سے ناگوار طبع ہوتے ہیں۔

سُر نہیں دل کے ملاتے ہائے یہ مطرب پسر
بھول جانا چاہئے ان کے خیالوں کے تئیں

اس شعر میں فرق مراتب کا بھی خیال نہیں رکھا گیا۔ آخر حضرت زلیخا ایک نبی کی بیوی تھیں۔

زلیخا یار کو پہلے مزدں سے آشنا کرتی
پھر اُس سے سو طرح پر اپنی حاجت کو روا کرتی

اس سبنتی پوش سے آغوش رنگیں کیجئے
جی میں ہے اس مصرع موزوں کو تضمین کیجئے

موا جاتا ہوں مت اتنا بھی کس کر گوندہ بالوں کو
ٹک اک ڈھیلی تو کر دے جان زنجیر اس دوانے کی

آپ کے یہاں بعض فارسی تراکیب خوب استعمال ہوئی ہیں مثلاً سسی ناحق۔ جواب تلخ۔ قیامت بانک۔ سنبلستان۔ ذوق سیر گل۔ کف خاکستر۔ سرو خراماں۔ گریباں گیر وغیرہ۔

آپ کے کلام میں تشبیہات و استعارات بکثرت ہیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار تحریر کرتا ہوں:

دل ترے کو تازہ کرتا ہے ہمارا خون گرم
لال تر کرتی ہے جیسے پارۂ آہن کو آگ

ہو رہا ہے دل مرا بے ربط منصوبوں میں بند
جس طرح شطرنج کے پیادوں میں گھر جاتا ہے شاہ

ہمیشہ کھینچتا ہوں اشک خوں کو دار مژگاں پر
اگر سولی مری کو دیکھتا منصور، رو دیتا

نئیں اتر سکتی کسی افسوں سے کالے کی لہر
کیونکہ نکلے سر سے اس زلف پریشاں کی ہوا

ایک غزل آپ کے دیوان میں داخل کی گئی ہے لیکن اس کے تین شعر سودا کے دیوان میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مرتب دیوان کا فرض تھا کہ وہ یہ ظاہر کرتے کہ اشعار متنازعہ فیہ کس کے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مرتب صاحب کو یہ خبر ہی نہیں کہ کلیات سودا میں بھی یہ اشعار درج ہیں۔ چونکہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے حسب ذیل دو شعر سودا کے منتخب اشعار میں شمار کئے ہیں اس لئے ہمارا بھی یقین یہی ہے کہ یہ ہرگز یقین کے نہیں:۔

بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے　　اپنا ہی تو فریفتہ ہووے خدا کرے

قاتل ہماری لاش کی تشہیر ہے ضرور　　آئندہ تا کوئی نہ کسو سے وفا کرے

تیسرا شعر حسب ذیل ہے جس میں پہلا مصرع کسی قدر رد و بدل کے ساتھ کلیات سودا میں موجود ہے اور مرتب دیوان یقین نے بڑے شد و مد کے ساتھ محمد صادق خاں اختر کے مشہور قطعہ کے بالمقابل پیش کرکے فرمایا ہے "قطعہ اچھا ہے اور واقعی اچھا ہے مگر یقین نے جو بات دو مصرعوں میں پیدا کردی ہے وہ اس میں نہیں ہے ........ یقین کا یہ شعر میری زبان میں 'بے مثل' اور آج کل کی زبان میں شاہکار ہے۔" افسوس مرتب دیوان کو یہ معلوم نہیں کہ اس تعریف کا مستحق یقین کا حریف سودا ہے نہ کہ جناب یقین۔

گر ہو شراب و خلوتِ محبوب خوب رو　　زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے

یقین کے دیوان میں یہ شعر یوں درج ہے:۔

خلوت ہو اور شراب ہو، معشوق سامنے　　زاہد تجھے قسم ہے جو تو ہو تو کیا کرے

یقین نے جو رد و بدل پہلے مصرع میں کی ہے وہ بھی سودا کے اصل مصرع سے فروتر ہے۔

ذیل میں یقین کے کلام سے بہتر منتخب اشعار درج کئے جاتے ہیں:۔

کون کرسکتا ہے اس خلاقِ اکبر کی ثنا　　نارسا ہے شان میں جس کے پیمبر کی ثنا

یہ کوہ طور سرمہ ہوگیا سارا ہی کیا کہئے　　کوئی پتھر بھی بچ جاتا تو دیوانے کے کام آتا

اڑا دی اس ہوا نے مشت خاک ریگستاں ناحق　　غبار ان کا اگر رہتا تو پیمانے کے کام آتا

خدا دیتا مجھے گر بے سر و سامانی خدائی کی　　تو میں ان بلبلوں کو گلشنوں کا باغباں کرتا

حقیقت میں یہ شعلہ عشق کا ہے برگ گل ورنہ
خلیل اللہ پر آتش کدہ گلزار کیوں ہوتا

برہمن سر کو اپنے پیٹتا تھا دیر کے آگے
خدا جانے تری صورت سے بت خانہ پہ کیا گزرا

موج دریا کی طرح ضبط میں آسکتا نہیں
کوئی کیوں کر کہے احوال پریشاں میرا

گریباں پھاڑ ڈالے رشک سے ہر گلبدن اپنا
نکالوں خاک سے جوں لالہ گر خونیں کفن اپنا

کیوں نہ ہو تر دامنوں کو شست و شو کی آرزو
ریگستاں پر آیۂ رحمت ہے باراں کی ہوا

سر پر سلطنت سے آستان یار بہتر تھا
ہمیں ظل ہما سے سایۂ دیوار بہتر تھا

دام و قفس سے چھوٹ کے پہنچے جو باغ تک
دیکھا تو اس زمیں میں چمن کا نشاں نہ تھا

جو کچھ کہیں یہ تجھ کو یقیں ہے سزا تری
بندہ جو تو بتوں کا ہوا کیا خدا نہ تھا

یہ جیوے ہجر میں، وہ وصل میں بھی جی نہیں سکتا
تکلف برطرف، بلبل کو پروانے سے کیا نسبت

بہار آخر ہوئی ہے اب تو سینے دے گریباں کو
یقیں کرتا ہے کوئی اس قدر دیوانہ پن بس کر

ہم تو اب مرتے ہیں اور بجھتا ہے الفت کا چراغ
دیکھئے کب ہووے روشن پھر محبت کا چراغ

بہت جینے کی تدبیر اہل عرفاں کے نہیں لائق
کہ پینا آب حیواں۔ شان انساں کے نہیں لایق

ناصح سے مجھ کو غم نے کیا شرمسار حیف
سو بار پھٹ چکا یہ گریباں، ہزار حیف

زیارت باغ کی کرتی ہے آنسو سے وضو کر کے
حباب گل ہیں رکھتی ہے عجب صدق و صفا بلبل

چمن میں مجھ سے دیوانے کے لیجانے سے کیا حاصل
دکھا کر گل، جنوں کو شور میں لانے سے کیا حاصل

اس طرح صیاد کب آزاد چھوڑے گا تمھیں
بلبلو دھومیں مچالو یہ گلستاں پھر کہاں

کعبہ میں بھی گیا، نہ گیا ان بتوں کا عشق
اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں

ہیں سو سو التفات تغافل میں یار کے
بیگانگی ہے اس کی کوئی آشنا نہیں

شکوہ جفا کا یار سے کرنا وفا نہیں
بندوں کو اعتراض خدا پر بجا نہیں

وہ کون دل ہے جہاں جلوہ گر وہ نور نہیں
اس آفتاب کا کس ذرہ میں ظہور نہیں

شوق کہتا ہے پکڑ لوں دوڑ کر دامان یار
کیا کروں سستی سے کچھ ہاتھوں میں گیرائی نہیں

کروں کیونکر میں قید زلف سے چھٹنے کی تدبیریں
پڑی ہیں میری ہر انگشت میں جوں شانہ زنجیریں

تماشا کر تصور کو کہ ہر اک اشک میں میرے
تری صورت نظر آتی ہے جوں شیشہ میں تصویریں

دلوں پہ برق سی گرتی تھی جب ہم نالہ کرتے تھے
گئیں کیدھر نہیں معلوم ان آہوں کی تاثیریں

کوئی دن اور کرنے دو جنوں مجھ کو بہاراں میں
عبث سیتے ہو اس کو کیا رہا ہے اب گریباں میں

مجنوں کی خوش نصیبی، کرتی ہے داغ دل کو
کیا عیش کر گیا ہے ظالم دوانہ پن میں،

ہوائے گرم کے لگنے سے کب پتھر پگھلتا ہے
یہ نالے ان بتوں کے دل میں کب تاثیر کرتے ہیں

جو کرنا ہے تو اپنی فکر کرلے، نو بہار آئی
خدا کے واسطے یہ بات دیوانے سے کہہ دیجو

اسیرانِ قفس کی نا امیدی پر نظر کیجو،
بہار آوے تو لے صیاد مت ہم کو خبر کیجو

کیا ہے عشق ہم نے، تجھ سے ہمدم کے بھروسہ پہ
خدا کے واسطے اے آہ، اس دل میں اثر کیجو،

کہا جاتا نہیں کچھ مجھ سے، جو تو کہہ سکے کہیو
مری اس بے زبانی پر نظر اے نامہ بر، کیجو

یہ محرابِ نمازِ بے خودی ہے، زاہد و سمجھو
خدا کے واسطے، مستوں کے پیمانے کو مت چھیڑو

کوئی مجھ سے نہ بولو، میں تو اب مرنے کو بیٹھا ہوں
خلافت دے گیا ہے خودکشی کی کوہ کن مجھ کو

کہاں تاثیر ہے نالے میں، اے مرغِ قفس چپ رہ
عبث صیاد کو ناخوش بھی کیوں کرتا ہے بس چپ رہ

کوئی آوارگی کو چھوڑ، کیوں کر راہ پر آوے
عبث تو شور و شر کرتا ہے اتنا، اے جرس چپ رہ

نمک ڈالا ہے مجھ میں لے ہما شور محبت نے
کہیں کھائے ہیں تو نے اس مزے کے استخواں سچ کہہ

بہار آئی ہے، کیا کیا چاک، جیب پیرہن کرتے
جو ہم بھی چھوٹ جاتے اب، تو کیا دیوانہ پن کرتے

چھٹے اس زندگی کی قید سے اور داد کو پہنچے
وصیت ہے، ہمارا خوں بہا جلاد کو پہنچے

عشق میں راحت نہیں ملتی مگر جوں کوہ کن
جان شیریں دیجیے، تب خواب شیریں کیجیے

شعر خاطر خواہ مجھ سے ہو نہیں سکتا یقیں
جب ہو استعداد ناقص، پیر کامل کیا کرے

جب ہوا معشوق عاشق دلربائی کیا کرے
بندگی کی جس نے خو کی وہ خدائی کیا کرے

چاہنے والے کے مرنے کو کوئی چاہے ہے کب
عشق ہی دشمن ہو مجنوں کا تو لیلیٰ کیا کرے

حق مجھے باطل آشنا نہ کرے
میں بتوں سے پھروں خدا نہ کرے

دوستی بد بلا ہے اس میں خدا
کسی دشمن کو مبتلا نہ کرے

یار گر منظور ہے، دنیا و عقبیٰ سے گزر
منزل مقصود ہے دونوں جہانوں سے پرے

وہ بلبل کیوں کہ ہووے خار و خس سے آشنا جس کا
نسیم گل سے، مارے نازکی کے آشیاں لرزے

شراب تلخ کی لذت کو پوچھو مے پرستوں سے
کوئی نعمت گوارا تر نہیں ہم کو مصیبت سے

جو سر پاؤں پہ رکھ دیجے تو خوش ہو دیں بتاں ہم سے
ولیکن ہائے ہو سکتی ہے یہ جرأت کہاں ہم سے

نہ ڈالو مجھ پہ اے مرغان آزاد اپنے سایہ کو
گرفتار وفا کو کام اب کیا ہے گلستاں سے

بہار آئی بجاؤ عندلیبو! ساز عشرت کے
گئیں حسرت کی وہ راتیں، گئے وہ دن مصیبت کے

خبر کیا پوچھے، مرغ چمن سے آشیانے کی
اسیروں کو توقع کب ہے پھر گلشن میں جانے کی

گئے پکڑے شروع گل میں اور پرواز اول میں
نہ دی فرصت زمانے نے ہمیں دھومیں مچانے کی

کوئی میداں نہ جیتا عشق کا فرہاد کے آگے
کسو نے دم نہ مارا تیشۂ فولاد کے آگے

گلا تو پھٹ گیا نے کی طرح فریاد سے میرا
قیامت دور ہے کس دن ملے گی داد، کیا جانے

بگولا بھی ہماری خاک سے اب اٹھ نہیں سکتا
ہمیں یوں کر دیا پامال اے سرو رواں تو نے

نہ جا گلشن میں، بلبل کو خجل مت کر کہ ڈرتا ہوں
یہ دامن دیکھ کر گل کا گریباں چاک ہو جاوے

گنہگاروں کو ہے امید اس اشک ندامت سے
کہ دامن شاید اس آب رواں سے پاک ہو جاوے

دیار حسن تو خوش ہے ولیکن یہ بڑی مشکل
کہ لٹ جاتا ہے یاں جو کارواں جنس وفا لاوے

مقابلہ میں وفا کے جو یہ جفا ہووے
کہو کسی کا کوئی کیونکہ آشنا ہووے

دیت کا نام نہ لیجے خدا کرے کہ کہیں
مرے جی کے بھی قاتل کا حق ادا ہووے

یہ سب تو کرتے ہیں دعوائے عشق یار کہیں
جو آزمانے پہ آوے بڑا مزا ہووے

نگاہ یار کی کوئی زباں اب تک نہیں سمجھا
یہ وہ باتیں ہیں نازک جن سے آئینہ بھی حیراں ہے

اگر زنجیر میرے پاؤں میں ڈالی تو کیا ہوگا
بہار آنے دو میرا ہاتھ ہے اور یہ گریباں ہے

حسن اور عشق میں ایک طور سے نسبت ہے ضرور<br>چشم بیمار تجھے دی ہے، دل زار مجھے

ہمیں دوزخ سے اتنا مت ڈرا زاہد کہ ظاہر ہے<br>خدا ایسا ستم کب اپنے بندوں پر روا رکھے

سکوت اہل سخن کا بھی نہیں خالی افادے سے<br>قلم کی طرح خاموشی میں یہ رکھتا ہے گویائی

نظر آتا نہیں ثابت، گریباں ایک غنچے کا<br>چمن پر یہ ستم کرتا ہے، لے باد صبا کوئی

اپنے بندوں کو جلا کر خاک کرتے ہیں یقیں<br>ان بتوں کی ضد سے ہو جاؤں مسلماں تو سہی
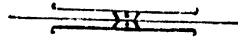
# سلطان عبدالحمید خاں مرحوم کے بعض چشم دید حالات

علامہ اسعد شقیری فلسطین کے باشندے ہیں سلطان عبدالحمید خاں مرحوم کے عہد میں خاص دارالانشاء سلطانی میں ملازم تھے۔ حال میں احمد شوقی مرحوم ملک الشعراء عرب کی تعزیت کی غرض سے جو وفد مصر گیا تھا آپ بھی اس کے ایک رکن تھے۔ مصر میں رسالہ "کل شئی" کے نامہ نگار نے آپ سے شرف ملاقات حاصل کرتے ہوئے سلطان مرحوم کے حالات دریافت کئے۔ علامہ موصوف نے جو واقعات بیان فرمائے ہیں اس کا خلاصہ ہم ناظرین کی دلچسپی کے لئے پیش کرتے ہیں۔

جس وقت سے حضرت سلطان عبدالحمید خاں مرحوم تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوئے اسی وقت سے آپ نے محکمۂ خبر رسانی کی طرف خاص توجہ فرمائی۔ اندرون و بیرون ملک میں کثرت سے جاسوس پھیل گئے۔ یورپ و امریکہ اور اندرون ملک سلطنت عثمانیہ میں کوئی ایسی اہم خبر نہیں ہوتی تھی جس کی اطلاع سلطان کو ان کے جاسوسوں کے ذریعے نہ ہو جاتی ہو۔ اس مقصد کے لئے سلطنت کا بہت زیادہ روپیہ صرف ہوتا تھا۔ یورپ کی سازشیں اور ان کی وزارت خارجہ کے اہم راز ان مصارف و انتظام کی وجہ سے سلطان سے پوشیدہ نہیں رہ سکتے تھے۔ ان جاسوسوں کی ڈاک سلطان کی خدمت میں پیش ہوتی جس کو وہ خود ملاحظہ فرماتے۔ اگر کام کرتے کرتے تھک جاتے تو اپنے کسی صاحبزادے سے سنتے لیکن جب تک کہ یہ روزانہ ڈاک ملاحظہ یا سماعت سے نہ گزر جائے آرام نہ فرماتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یورپ کی سازشیں سلطان کے علم میں ہوتی تھیں اور وہ عین وقت پر اس کا تدارک فرماتے تھے۔

سلطان کی معزولی کے بعد جو کاغذات برآمد ہوئے ان سے معلوم ہوتا تھا کہ سلطان کس قدر بیدار مغز تھے اور کروڑوں روپیہ اس مقصد کے لئے سلطنت کس طرح صرف کرتی تھی۔

قیصر ولیم نے سلطان کے زمانے میں سلطنت ٹرکی کی سیاحت کی۔ یہ سیاحت تاریخی و پولیٹکل حیثیت سے نہایت اہم تھی۔ سلطان نے اپنے جاسوسوں کو جو جرمنی میں متعین تھے حکم دیا کہ قیصر کے محل کے خاص

خاص کمروں کا نقشہ معہ اس کے فرنیچر کے بقیہ کے اوقات کار اور ضروریات کا مکمل خاکہ پیش کیا جائے چنانچہ
اس کی تعمیل ہوئی سلطان نے بالکل اس کی نقل قیصر اور ملکہ کے لئے قسطنطنیہ میں ترتیب دیدی ویسا ہی
فرنیچر اور فرش تھا۔ قیصر اور ملکہ جب شاہی مہمان خانے میں مقیم ہوئے تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی
جب ہر چیز کو مثل اپنے قصر کے ٹھیک اور مناسب جگہ پر جس طرح وہ جرمنی میں چھوڑ کر آئے تھے قسطنطنیہ میں
پایا۔ سلطان اپنے معزز مہمان کو ان خاص کمروں میں چھوڑ کر اپنے محل خاص میں تشریف لے گئے۔ قیصر و ملکہ
سخت متعجب تھے اور دل ہی دل میں سلطان کی اس بیدار مغزی اور دانشمندی کو سراہ رہے تھے۔ جب
دونوں سونے کے کمروں میں گئے تو جس طرح برلن میں خاص ان کے قصر میں مسہریاں بچھائی جاتی تھیں
بالکل اسی طرح یہاں تھیں اور جو سامان جرمنی میں مسہریوں پر تھا بعینہ وہی سامان یہاں تھا۔ دونوں نے
اب خاص طور سے ہر ایک چیز کا معائنہ کیا کہ کوئی چھوٹے سے چھوٹا فرق محسوس کیا جائے لیکن ممکن نہ ہو سکا۔
دیواروں پر جو نقشے اور تصاویر جس ترتیب سے برلن میں آویزاں تھیں اسی طرح یہاں انتظام تھا اور
کچھ فرق نہ تھا۔

ایک مرتبہ سلطان کو اطلاع ہوئی کہ ایک یورپین طاقت اپنے سفیر کو قسطنطنیہ سے محض اس بنا پر
بدلنا چاہتی ہے کہ وہ سلطان کا بہت زیادہ طرفدار اور بہی خواہ ہے اور اس کی جگہ ایک ایسے شخص کا تقرر
عمل میں لایا جائے گا جو سلطان کا مخالف اور دل سے دشمن ہے۔ یہ جدید سفیر سلطان کی خدمت میں
باضابطہ باریاب ہوا۔ اوراق اعتماد پیش کرتے ہوئے رسمی گفتگو کی۔ سفیر کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی۔
سلطان نے سفیر کی بیوی سے کہا کہ کیا آپ ہماری بیگمات سے محل سرا میں ملاقات نہیں کریں گی۔ سفیر کی
بیوی نے اس شاہی اعزاز کا شکریہ ادا کیا اور عرض کی کہ اسی وقت اس کو شاہی محلات میں جانے کی
اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ خود سلطان قصر شاہی میں سفیر مذکور کی بیوی کو لے کر داخل ہوئے۔ سلطان
ان کو بہت سے کمروں کوشکوں سے گزرتے ہوئے محلات کی بعض بعض بیگمات سے ملاقات کراتے ہوئے
ایک بڑے کمرے میں لے گئے اور کہا یہ ہمارا جواہر خانہ ہے کیا آپ ان قدیم جواہرات اور نادر روزگار
چیزوں کو دیکھنا پسند کریں گی۔ سفیر کی بیوی نے نایاب اشیاء کو دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ سلطان نے

جواہر خانہ کھلوایا۔ سفیر کی بیوی کی آنکھیں ان عجائب وغرائب جواہرات اور نفیس سامان کو دیکھ کر چوندھیا گئیں۔ ایک موتیوں کے ہار کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی جو بہت ہی قیمتی تھا اور عرصے تک غور سے اس کی طرف دیکھتی رہی اور اس کی قیمت کا دل ہی دل میں اندازہ کر رہی تھی۔ سلطان نے وہ ہار اٹھایا اور سفیر کی بیوی کے گلے میں ڈال کر کہا کہ یہ ہار آپ کے گلے میں کس قدر اچھا معلوم ہوتا ہے۔ سفیر کی بیوی نے شکریہ ادا کرتے ہوئے ہار گلے سے اتارنا چاہا تاکہ اس کو اس کی اصلی جگہ پر بدستور رکھ دے۔ سلطان نے فرمایا کہ اب یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ ہار پھر اپنی جگہ رکھا جائے۔ یہ آپ ہی کے گلے میں مناسب و موزوں ہے یہ اسی جگہ رہے گا اور بطور شاہی یادگار کے آپ کے خاندان میں اس کو رہنا چاہئے۔ سفیر کی بیوی یہ قیمتی ہار حاصل کر کے بے حد مسرور ہوئی۔ اس ہار کی قیمت کا اندازہ ۱۰ ہزار پونڈ لگایا گیا تھا۔

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے علامہ موصوف نے فرمایا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ سلطان پر اس کے مقربین کا بڑا اثر تھا۔ میری رائے میں تو حقیقت بالکل اس کے خلاف تھی۔ مقربین میں سے ہر شخص سلطان کی دانشمندی اور بیدار مغزی سے واقف و خائف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ چھوٹی سے چھوٹی غلطی اور معمولی سا قصور بھی سلطان سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا اور اس کو بصورت ارتکاب جرم ضرور سلطانی سزا بھگتنی پڑے گی۔ دوسرے ان لوگوں کی کوئی بات یا خواہش سلطان کبھی نہیں سنتا تھا۔ وہ جو کچھ کرتا تھا اپنے جاسوسوں کی اطلاعوں اور رپورٹوں پر کرتا تھا۔

سلطان نے اپنی حفاظت خاص کے لئے ایک باقاعدہ فوج رکھی تھی جس کی تعداد تین ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ سلطان کو ان کی وفاداری پر پورا بھروسا تھا۔ اس کو خیال تھا کہ یہی فوج خطرے کے وقت اس کی جان و آبرو کی حفاظت کرے گی۔ لیکن افسوس اسی جگہ یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی تقدیر برگشتہ ہو گئی اور تدبیر الٹ گئی۔ اس کی سب امیدیں خاک میں مل گئیں اور اس کو اپنے باپ دادا کے موروثی تخت سے بصد یاس و حسرت دست بردار ہونا پڑا۔ یہ مختصر فوج انجمن اتحاد و ترقی کے افسروں کے ہاتھ میں آ گئی اور خلاف امید حفاظت کے لئے ناکافی ثابت ہوئی۔

علامہ موصوف نے ایک واقعہ اپنا خود بیان کیا ہے۔ علامہ موصوف سلطان کے خاص دفتر

میں تھے۔ ایک روز خود سلطان دفتر میں مع دفتر کے افسر اعلیٰ کے تشریف لائے اور ایک قدیم شاہی دستاویز ملاحظہ فرمانا چاہی۔ اس صیغے کے افسر نے عرض کیا کہ وہ دستاویز موجود ہے ابھی پیش کی جائے گی۔ سلطان نے حکم دیا کہ جلد نکال دو۔ افسر نے کنجیاں لے کر تمام ضروری مقامات میں تلاش کیا مگر مطلوبہ دستاویز نہ ملی۔ افسر پریشانی اور گھبراہٹ کی وجہ سے کانپ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ اور آنکھ کام نہیں دیتے تھے۔ سلطان کو کھڑے کھڑے دیر ہو گئی تھی۔ انھوں نے خود میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ تم بیکار کیوں کھڑے ہو کیا تم کو معلوم نہیں کہ مجھے اس کاغذ کی سخت ضرورت ہے تم کیوں تلاش نہیں کرتے۔ میں نے عرض کی حضور عالی میں ابھی پیش کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر میں نے کنجیاں لیں اور تیسرا خزانہ کھولا اور بہت جلد وہ کاغذ نکال لایا۔ مجھے اس کی جگہ بھی معلوم تھی اور میں اس قدر بدحواس نہیں ہوا تھا کہ کاغذ نہ نکال سکتا۔

میں نے کاغذ سلطان کے حضور میں پیش کیا۔ پہلا افسر خوف اور پریشانی سے کانپ رہا تھا۔ اس کے ہوش و حواس درست نہ تھے۔ سلطان نے وہ کاغذ ملاحظہ فرمایا۔ یہ وہی کاغذ تھا جو سلطان کو مطلوب تھا۔ سلطان کاغذ لے کر واپس ہوئے اس افسر سے جو اب تک کھڑا کانپ رہا تھا فرمایا کہ اب تم اس عرب پر غصہ کرنا جس نے تمہارا کام کر دیا۔ پھر مجھ سے ارشاد فرمایا تمہارا کوئی عزیز عکے میں بھی ہے؟ میں نے عرض کیا کہ میری والدہ محترمہ عکے میں تشریف رکھتی ہیں۔ سلطان تشریف لے گئے۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے میری والدہ کے خط سے معلوم ہوا کہ والیٔ عکہ نے ایک کافی رقم مجھے عطا فرمائی کہ یہ سلطان کی جانب سے ہے۔

علامہ موصوف فرماتے تھے کہ سلطان بہت ہی بارعب اور باوقار آدمی تھے۔ ممکن نہ تھا کہ ان کے چہرے پر نظر جمائے کوئی شخص کچھ دیر دیکھتا رہے۔ ان کے ہر وقت کے پاس رہنے والے خادم، اہلکار، محرر، کاتب سب ان سے لرزتے تھے اور سب یہ جانتے تھے کہ سلطان کا محاسبہ نہایت سخت اور اس کا غصہ حد درجہ خطرناک ہے جس سے ہمیشہ بچتے رہنا چاہیے۔

سلطنت میں رسم سلاملیق عرصہ سے مروج تھی۔ سلطان وقت جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کے لئے تشریف لاتے اور فوج بعد نماز ملاحظہ میں فوجی ترتیب و قواعد کے تحت میں گزرتی۔ سلطان جب قصر سے نماز

کے لئے تشریف لاتے، دو رویہ فوج استادہ ہوتی اور واپسی پر بھی یہ فوج اسی طرح موجود ہوتی تھی۔ باقی فوج صف بندی کے نظام کے ساتھ سامنے سے گزر جاتی۔ بعد ان مراسم کے سلطان قصر میں واپس ہوتے تو سفراء دول، علماء، حکماء اور دیگر ممالک کے مشہور سیاح جو اس وقت قسطنطنیہ میں موجود ہوتے حضور میں شرف باریابی حاصل کرتے۔ معمولی مراسم کورنش و آداب کے بعد یہ لوگ جب واپس ہوتے تو عموماً سلطان کی ہیبت و وقار ان کے دل میں جاگزیں ہوتے اور یہ لوگ اکثر یہی ذکر کرتے ہوتے تھے۔

تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوتے ہی سب سے پہلا حکم سلطان نے یہ دیا کہ ان کے چچا سلطان عبدالعزیز مرحوم کے قاتلوں سے انتقام لیا جائے۔ سلطان کو اپنے چچا سے مطلق محبت نہ تھی بلکہ وہ خود اپنی حفاظت ان قاتلوں اور ان کی سازشوں سے کرنا چاہتے تھے۔ جب باقاعدہ عدالت نے مقدمہ کی سماعت کرکے ملزموں کے خلاف پھانسی کی سزا تجویز کی اور منظوری کے لئے سلطان کے حضور میں یہ تجویز پیش ہوئی تو سلطان نے فرمایا کہ مجھے خونریزی سے زیادہ کوئی چیز ناپسند نہیں۔ ان ملزموں میں سے بعض کو حبس دوام اور بعض کو ہمیشہ کے لئے جلا وطنی کی سزا دیدی گئی۔ اس طرح سزا کے بدلنے سے سلطان نے اپنے رحم و کرم کا سکہ رعایا پر بٹھا دیا۔ ملزمین کے اہل و عیال سلطان کی اس عنایت کے شکر گزار ہوگئے اور اس کا اثر بہت اچھا ہوا۔

سلطان کے بعض مصاحبین کی سازش سے استاد اسعد یعنی علامہ موصوف پر ایک مصیبت نازل ہوئی یعنی ان سے سلطان کو ناراض کر دیا گیا اور ان کو دارالسلطنت سے باہر بھیجدیا گیا اور اسی زمانے میں دستوری حکومت کا اعلان ہوگیا۔ ولایت عکہ کی طرف سے علامہ ممدوح نمائندے منتخب کئے گئے۔ جب یہ سب نمائندے سلطان کے حضور میں شرف باریابی حاصل کرنے گئے تو علامہ موصوف بھی تھے۔ ممدوح فرماتے ہیں کہ مجھے دیکھ کر سلطان نے اپنے بعض مقربین سے ارشاد فرمایا کہ یہ شخص (علامہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) تو ہمارا پروردہ نعمت ہے یہ مطلب یہ تھا کہ جو لوگ اس وقت رعایا کے نمائندے آئے ہیں ان میں اکثر خود ہمارے ہی پروردہ اور ہمارے ہی بنائے ہوئے ہیں۔

(ماخوذ)

# انتقام

(ماخوذ)

بڑی تلاش و جستجو کے بعد بالآخر آج جمشید نے اپنی بیوی کو اس کے ساتھ پارک میں دیکھ لیا تھا اور اب وہ ایرک اینڈ کو کی دکان پر کوئی عمدہ سا ریوالور خریدنے میں مصروف تھا۔ اس کے چہرے سے غم و غصہ، رنج اور استقلال ظاہر ہو رہا تھا۔

"میں نے سوچ لیا ہے جو مجھے کرنا ہے" وہ اپنے آپ سے کہہ رہا تھا "خاندان کے ناموس پر بٹہ لگ گیا ہے۔ میری عزت خاک میں مل گئی ہے اور بحیثیت ایک شہری اور باعزت انسان کے مجھے اس سے ضرور انتقام لینا چاہئے۔ سب سے پہلے میں اپنی بیوی کو ماروں گا، اس کے بعد اس کے عاشق کو اور آخر میں خود اپنا خاتمہ کروں گا۔"

اس نے ابھی تک نہ تو کوئی ریوالور منتخب کیا تھا اور نہ کسی کو مارا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں کے سامنے تین لاشیں خاک و خون میں لتھڑی ہوئی زمین پر پڑی تھیں اور ان کے گرد لوگوں کا ہجوم تھا۔ عالمِ تصور ہی میں اس نے اخبارات کے کئی افتتاحیہ مقالات پڑھ ڈالے جن میں اس خوفناک واقعہ پر خوب خوب رائے زنی کی گئی تھی۔

دکاندار ایک موٹا سا آدمی تھا جس کی توند باہر نکلی ہوئی تھی۔ وہ مختلف اقسام کے ریوالور جمشید کو دکھا رہا تھا۔ ایک ریوالور دکھاتے ہوئے اس نے کہا "میری تو یہ رائے یہ ہے کہ آپ اسے خریدئے۔ یہ اسمتھ اینڈ ویسن کے کارخانے کا ہے۔ نہایت ہی عمدہ اور مضبوط ہے۔ اس سے بہتر آپ کو نہیں مل سکتا۔ ڈاکوؤں، چوروں اور عاشقوں کے مارنے کے لئے بہترین ہے۔ چھ سو قدم کے فاصلے سے مار سکتا ہے۔ اس کی ایک گولی سے دو آدمی یک وقت مر سکتے ہیں۔ اور خودکشی کے لئے تو اس سے بہتر کوئی ریوالور ہی نہیں۔"

"اس کی قیمت کیا ہے؟" جمشید نے پوچھا۔

"ایک سو پچیس روپیے۔"

"لیکن اتنی قیمت کا مجھے نہیں چاہیے۔"

"تو پھر میں آپ کو اس سے سستا دکھاتا ہوں۔ ہماری دکان پر تو کئی قسمیں ہیں۔ دیکھیے اس ریوالور کی قیمت صرف پچہتر روپیے ہے۔ لیکن یہ قدیم وضع کا ہے۔ کسی کو مارنے یا خودکشی کے لیے یہ ریوالور کسی کام کا نہیں۔ سب سے اچھا تو اسمتھ اینڈ ولسن کا ہے۔"

"میں کسی کو مارنے یا خودکشی کے لیے نہیں خریدنا چاہتا" جمشید نے اس کی تردید کرتے ہوئے کہا "مجھے تو صرف چوروں وغیرہ کے دھمکانے کے لیے چاہیے۔"

"جی۔ آپ نے ٹھیک فرمایا۔ اور ہمارا تو یہ کام ہی نہیں ہے کہ ہم ہر ایک کے حالات پوچھتے پھریں اور یہ معلوم کریں کہ وہ کس مقصد کے لیے ریوالور خرید رہا ہے۔" دکاندار نے مسکراتے ہوئے کہا "اگر ہم یہ کرنے لگیں تو ہمیں اپنی دکان بند کرنی پڑے گی۔ چوروں کے دھمکانے کے لیے بھی یہ ریوالور ٹھیک نہیں کیونکہ اس کی آواز بہت ہلکی ہوتی ہے۔ اس کے لیے تو مارٹیمر ریوالور اچھا ہے۔ کم خرچ بالانشیں۔ ڈوئیل لڑنے کے لیے اکثر آدمی یہی خریدتے ہیں۔"

"میں اس کو ڈوئیل لڑنے کے لیے کیوں نہ دعوت دوں" یکایک یہ خیال جمشید کے دل میں آیا "لیکن یہ نہایت ہی باعزت جنگ ہے۔ ایسے بدمعاشوں کو تو کتے کی موت مارنا چاہیے۔"

دکاندار نے کئی قسمیں لاکر جمشید کے سامنے رکھ دیں۔ ان میں سب سے اچھا اسمتھ اینڈ ولسن تھا۔ جمشید نے ایک ریوالور اٹھایا اور اس کو دیکھ کر کسی سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے یہ تصور کرنا شروع کیا کہ کس طرح وہ دونوں کو گولی ماریگا۔ اور ان کے سروں سے خون کا فوارہ چھوٹ جائے گا اور کس طرح وہ تڑپ تڑپ کر اپنی جان دیدیں گے۔ لیکن یہ خون اور تڑپنا اس کی تسلی کے لیے کافی نہیں تھا۔ وہ اس سے زیادہ خوفناک منظر دیکھنا چاہتا تھا۔

"میں یہ کیوں نہ کروں" اس نے سوچا "میں اپنے آپ کو اور اس کو مار ڈالوں گا اور اپنی بیوی کو زندہ رہنے دوں گا۔ اس کا ضمیر خود اس کو ملامت کرے گا۔ سارے لوگ اس کو برا بھلا کہیں گے۔ یہ

ملامت اور طعن و تشنیع موت سے بھی زیادہ اس کے لئے اذیت دہ ہوگی۔
اور اس نے تصور کیا کہ کس طرح اس کا جنازہ جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہزاروں لوگ ہیں، اور وہ سب کے سب اس کی بیوی کو برا بھلا کہہ رہے ہیں اور وہ یہ فقرے سن کر مارے شرم و ندامت کے زمین میں گڑی جاتی ہے۔
"میرا خیال ہے کہ آپ کو یہی ریوالور پسند آیا ہے" دکاندار نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا "میں آپ کی خاطر اس کی قیمت میں دس روپے کم کر دیتا ہوں لیکن میرے پاس اور بھی کئی قسمیں ہیں"
دکاندار نے الماریوں میں سے اور کئی ریوالور نکالے اور ان میں سے ایک کو ہاتھ میں لے کر کہنا شروع کیا "دیکھئے اس کی قیمت صرف تیس روپے ہے۔ ان دنوں اس کی قیمت بڑھ گئی ہے کیونکہ آپ کو تو معلوم ہے کہ کسٹم کے محصولات میں اضافہ ہو گیا ہے۔"
جمشید کو اچانک اس خیال سے رنج اور افسوس ہوا کہ وہ مر جائے گا اور اپنی بیوی کی شرم و ندامت اور رنج و تکلیف کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکے گا۔ انتقام میں صرف اس وقت لطف آتا ہے جب کہ اس کا نتیجہ اپنی آنکھوں سے دیکھا جائے۔ اس انتقام سے کیا فائدہ کہ اس کے پھل کو آدمی کھا بھی نہ سکے۔
"بس یہی ٹھیک ہے" اس نے سوچ کر اپنے آپ سے کہا "میں اس کو مار ڈالوں گا۔ اس کے جنازے میں بھی جاؤں گا اور جنازے کے بعد اپنے آپ کو گولی مار لوں گا۔ اگر جنازے سے پہلے ہی گرفتار ہو گیا تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ میری بیوی تو ہر صورت سے زندہ رہے گی۔ گرفتار ہونے میں بھی مجھے فائدہ ہے۔ میں مقدمے میں اس کا چال چلن، اس کا اخلاق اور اس کی عیاری و مکاری سب کھول کر بیان کر دوں گا جس سے سب لوگ حیرت میں رہ جائیں گے۔ اگر میں اپنے آپ کو مار ڈالوں گا تو سارا الزام مجھ پر آئے گا۔ وہ بھی مجھے ہی ملزم ٹھہرائے گی اور پورا زمانہ مجھ پر ہنسے گا۔ اگر میں زندہ رہوں تو....."
ایک منٹ کے بعد اپنے آپ سے وہ یہ کہہ رہا تھا "ہاں اگر میں اپنے آپ کو مار ڈالوں گا تو میں ہی ملزم ٹھہرایا جاؤں گا۔ اس کے علاوہ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں اپنے آپ کو کیوں ماروں اور

دوسری بات یہ کہ اپنے آپ کو مارنا بزدلی کی نشانی ہے۔ بس یہی ٹھیک ہے کہ میں اپنی بیوی کو نہیں ماروں گا لیکن اس کا خاتمہ کر دوں گا۔ اپنے مقدمے میں سب حالات بیان کر دوں گا اور اس کی عزت و آبرو سب خاک میں مل جائے گی جب میرا بیرسٹر اس پر جرح کرے گا۔ مجھے یقین ہے کہ عدالت، اخبارات اور لوگوں کی ہمدردی میری طرف ہوگی۔"

جمشید تو ان خیالات میں محو تھا اور دکاندار برابر نمونے پر نمونے دکھا رہا تھا۔ "جناب یہ انگریزی نمونہ ہے لیکن یہ سب نمونے اسمتھ اینڈ ویسن کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ آپ نے تو غالباً سنا ہی ہوگا چند ہی دنوں کا واقعہ ہے کہ انگریز افسر نے ہمارے ہاں سے اپنی بیوی کے عاشق کو مارنے کے لئے یہی ریوالور خریدا۔ آپ شاید یقین نہ کریں مگر سچ عرض کرتا ہوں کہ گولی اس کے بھیجے میں سے ہوتی ہوئی، لیمپ کی چمنی کو چیرتی ہوئی ایک پیانو پر جا لگی اور وہاں سے اُچٹ کر اس کی بیوی کو بھی زخمی کر ڈالا۔ یہ افسر اب جیل خانے میں ہے اور کچھ شک نہیں کہ اسے کم از کم کالے پانی کی سزا ہو جائے گی۔ مگر کس قدر ظلم ہے۔ سزا کس کو ملنی چاہئے اور ملتی کس کو ہے۔ میرے غم و غصے کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ آجکل لوگوں کے اخلاق کتنے خراب ہوگئے ہیں۔ دوسرے آدمیوں کی بیویوں سے محبت کرنا آجکل ایسا ہی عام ہو گیا ہے جیسے کسی سے سگریٹ لے کر پینا یا کسی کی کتابیں مانگ کر پڑھنا۔"

تھوڑی دیر رک کر اور ادھر اُدھر دیکھ کر اس نے پوچھا "لیکن قصور کس کا ہے؟"

مگر جمشید کچھ اور ہی سوچ رہا تھا "اس کے لئے کالے پانی جانا حماقت ہے۔ اگر مجھے کالے پانی بھیج دیا گیا تو یہی ہوگا کہ میری بیوی کسی دوسرے سے شادی کرے گی اور پھر اپنے نئے شوہر کو بھی دھوکہ دے گی۔ اس صورت میں فتح اس کی ہے ... لہٰذا اپنی بیوی کو میں نہیں ماروں گا اور نہ اپنے آپ کو۔ اور اس کو؟ اس کو بھی نہیں ماروں گا۔ مجھے اس سے اچھی تجویز سوچنا چاہئے۔"

"یہ ایک دوسرا نمونہ ہے" دکاندار نے کہا "اور چند ہی دن ہوئے ہمارے ہاں آیا ہے۔"

لیکن چونکہ جمشید اب فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ کسی کی جان نہیں لے گا اس لئے اب ریوالور خریدنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن وہ شرمندہ تھا کہ اس نے خواہ مخواہ دکاندار کا وقت ضائع کیا۔ "اچھا"

| | |
|---|---|
| سجی ہے کیسی انجمن | کھلے ہیں لالہ و سمن |
| ہر ایک گل ہے خندہ زن | ہر اک نہال ہے مگن |
| جبیں یہ کیوں ہے پُرشکن | خیال کلفت و محن |
| ہے سخت حوصلہ شکن | نہ ہو ملول جانِ من |
| ذرا تو دیکھ یہ پھبن | چمن ہے یا کوئی دلھن |

یہی نہ ہو ترا وطن
خبر بھی ہے تجھے مگر

| | |
|---|---|
| بڑھے ہیں دل کے حوصلے | جو دل میں رنج و حزن تھے |
| وہ آج دور ہو گئے | یہ چاہئے یہاں تجھے |
| کہ شاد اور خوش رہے | جگہ نہ دل میں غم کو دے |
| یہ زندگی کے مرحلے | نہیں ہیں کچھ ترے لئے |

اگر ہیں زندہ ولولے
تو ہر قدم پہ ہے ظفر

| | |
|---|---|
| جو بزم کائنات ہے | یہ عرصۂ حیات ہے |
| قدم کو گر ثبات ہے | عمل یہ التفات ہے |
| تو بس تری نجات ہے | نہ ہار ہے نہ مات ہے |
| نہ فکر واہیات ہے | نہ وجہِ مشکلات ہے |

یہ سب ترے ہی ہات ہے
تجھے نہیں کوئی ضرر!

| | |
|---|---|
| عمل میں ہے اگر کمی | تو ہے فضول زندگی |
| کہ جانِ زیست ہے یہی | اسی کی سب ہے روشنی |

جو آرزو ہے عیش کی — تو کاہلی نہ کر کبھی،
کہ جس نے کی ہے کاہلی — وہ قوم خود ہی مٹ گئی
یہ سب تری ہنسی خوشی
عمل پہ بس ہے منحصر

کہاں ترا وہ جوش ہے — کہاں ترا خروش ہے
جو تجھ کو عقل و ہوش ہے — جو حسِ چشم و گوش ہے
جو تو عمل فروش ہے — تو کس لئے خموش ہے
تو کیوں یہ سست کوش ہے — جو یادِ عیشِ دوش ہے
جو فکر ناؤ نوش ہے
تو اپنا جام آپ بھر!

---

ھ ۳۸۸

# برطانوی اور افغانی معاہدات

**افغانی اور برطانوی تعلقات کی ابتدا**

احمد شاہ ابدالی بانیِ مملکت افغانستان کے بعد اس کا بیٹا تیمور شاہ مسند نشین حکومت افغانستان ہوا۔ عہد تیموری میں افغانستان کی مملکت عہد شباب پر تھی۔ تیمور کے بعد جب شاہ زماں تخت نشین ہوا تو اسی زمانے سے انگریزوں کا افغانستان کے ساتھ سیاسی تعلق سمجھنا چاہیے کیونکہ شاہ زماں شمالی ہندوستان پر حملہ کرنا چاہتا تھا اس وجہ سے انگریزی بر ین کو افغانستان کی طرف سے ایک طرح کا خدشہ پیدا ہو گیا۔

**ایرانی اور برطانوی تعلقات کی ابتدا**

اس خدشے سے محفوظ رہنے کے لئے انگریزوں نے ایرانیوں سے دوستی اور روابط پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مورخین کا خیال ہے کہ ایرانی اور برطانوی تعلقات کی ابتدا ۱۵۶۱ء سے ہوئی مگر اصل تعلق ان دونوں مملکتوں کا اسی زمانے سے سمجھا جاتا ہے جب ۱۷۹۳ء میں سر جان میلکم کی زیر سرکردگی شاہ ایران کے پاس گورنر جنرل ہند کی طرف سے سفارت گئی۔ "افغانی خطرے" سے ہندوستان کو محفوظ رکھنے کے لئے برطانوی اور ایرانی سفرار کے درمیان معاہدہ ہوا جس کا لب لباب یہ تھا کہ:-

(۱) افغانی تاخت و تاراج سے سرزمین ہند کو محفوظ رکھا جائے۔

(۲) ایران میں فرانسیسیوں کا غلبہ نہ ہونے پائے۔

(۳) ایران میں برطانوی تجارت کے لئے تمام سہولتیں مہیا کی جائیں۔

فرانس اور روس کی مشہور و معروف جنگ کے بعد دونوں حکومتوں کے درمیان ایک صلح نامہ ہوا اور اس کے بعد دونوں نے مصمم ارادہ کیا کہ ہندوستان پر حملہ کر کے انگریزوں کو سرزمین ہند سے نکال کر باہر کریں۔

چنانچہ مئی ۱۸۰۸ء میں فرانسیسی سفارت بسرکردگی مانسٹر کسوک ایران میں ایک عہدنامے

کے لئے آئی۔ اس معاہدے کا ماحصل یہ تھا کہ فرانسیسی فوجی افسر ایران کی فوج کو نئی فوجی قواعد سکھائیں گے اور دونوں حکومتیں اپنے متخاصمین کی مدافعت کے لئے ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

ایرانی اور فرانسیسی معاہدے کے بعد انگریزی مدبرین نے ایک نئی چال چلی وہ یہ کہ ایک طرف سرملکم کی جگہ سرہرفرڈ کو ایرانی سفارت پر مامور کیا جس نے ایرانیوں کو اپنے دام فریب میں پھنسا کر فرانسیسیوں کا اقتدار ایرانی دربار سے ایک حد تک مٹا دیا اور از سر نو ایک دوسرا معاہدہ ایران اور انگلستان میں ۱۸۰۹ء میں ہوا جس کا لب لباب وہی تھا جو پہلے معاہدے کا تھا۔

معاہدۂ اول | اسی اثنا میں شاہ زماں کا انتقال ہوگیا اور اس کی جگہ شاہ شجاع تخت نشین افغانستان ہوا۔ لارڈ منٹو گورنر جنرل ہند نے آنریبل الفنسٹن کی سرکردگی میں ایک سفارت افغانستان اس غرض سے روانہ کی کہ شاہ افغانستان سے ایک معاہدہ مودت کرے تاکہ روسی اور فرانسیسی خطرے سے ہندوستان محفوظ رہ سکے۔ یہ سب سے پہلا معاہدہ ہے جو برطانوی اور افغانی مملکت کے درمیان ہوا جس کی تمہید اور شرائط حسب ذیل ہیں:-

اس سازش کی وجہ سے جو روس اور فرانس نے ایران کے ساتھ اس غرض سے کی ہے کہ افغانستان اور ہندوستان پر حملہ کرکے فتح کرلیں - آنریبل الفنسٹن بطور سفیر مختار از جانب لارڈ منٹو گورنر جنرل جو ہندوستان کے برطانوی مقبوضات کے مختار کل ہیں کابل تشریف لائے ہیں کہ حفاظت افغانستان اور ہندوستان کی تدابیر کے لئے اراکین مملکت افغانستان سے گفتگو کریں اور دونوں مملکتوں کے مفاد کے لئے ایک معاہدہ کریں۔ چنانچہ اس تمہید کے بعد حسب ذیل شرائط معاہدہ قرار پائیں۔

(۱) چونکہ فرانس اور روس نے ایران سے سازش کی ہے کہ افغانستان اور ہندوستان کی سرزمین پر قبضہ کیا جائے اس لئے ملازمان شاہ افغانستان کا فرض ہے کہ ان کو آگے بڑھنے نہ دیں اور تمام تر کوشش عمل میں لاکر فرانس اور روس کو اپنے ملک سے خارج کردیں اور ان کو ہندوستان تک آنے نہ دیں۔

(۲) اگر ایران فرانس اور روس نے متفق ہوکر سرزمین افغانستان پر حملہ کیا تو حکومت برطانیہ کا

فرض ہے کہ شاہ افغانستان کی ہر طرح سے مدد کرے - اس کام میں جو کچھ خرچ ہوگا اس کی
متحمل خود حکومت برطانیہ ہوگی اور جب تک ایران، فرانس اور روس کی سازش رہے گی
یہ عہد نامہ بھی قائم رہے گا اور فریقین اس کی تعمیل کرتے رہیں گے۔

(۳) حکومت برطانیہ اور حکومت افغانستان میں دائمی دوستی اور مودت قائم کرنے کی سعی کی
جائے گی اور حکومت افغانستان کا فرض ہوگا کہ کسی فرانسیسی شخص کو اپنے ملک میں داخل
نہ ہونے دے۔

غرض یہ پہلا معاہدہ دونوں حکومتوں نے منظور کر لیا۔ شاہ افغانستان نے اپنی مہر اس عہد نامے
پر ثبت کر دی اور اس طرح گورنر جنرل ہند نے بھی اس کو پسند کر کے منظور کر لیا۔ ۱۸۱۵ء تک اس
معاہدے پر عمل رہا۔ اس کے بعد جب ۱۸۱۵ء میں واٹرلو میں نپولین کو انگریزوں نے شکست دے کر قید کر لیا اور
دوسری طرف روس اور ایران کی طرف سے بھی حملے کا خطرہ کم ہو گیا تو اب اس معاہدے کی شرط دوم
کی رو سے یہ معاہدہ ساقط ہو گیا۔

**معاہدۂ دوم** | زماں شاہ کے بعد اس کے بھائیوں میں تخت کابل کے لئے لڑائیاں ہوتی رہیں۔
۱۸۰۳ء میں شاہ شجاع تخت کابل لینے میں کامیاب ہو گیا لیکن آئے دن ملک بغاوتوں اور سازشوں
کا جولانگاہ بن گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شاہ شجاع نہ مرد میداں تھا اور نہ سیاست داں تھا۔ علاوہ ازیں
بڑھاپے نے اس کے قویٰ کو مضمحل کر دیا تھا جس کی وجہ سے وہ حکومت کرنے کے قابل نہ رہا۔ ملت افغانیہ
میں شاہ موصوف غیر ہر دل عزیز تھا۔ عام طور پر افغانی سردار اس کو نفرت کی نظر سے دیکھنے لگے جس کا نتیجہ
یہ ہوا کہ ۱۸۰۹ء میں تمام افغانستان میں ایک عالمگیر بغاوت رونما ہوئی۔ باغیوں کے سرغنہ وزیر خاں
نے شاہ شجاع کو شکست دی۔ اب شاہ موصوف نے افغانستان چھوڑ کر ہندوستان میں اول اول رنجیت سنگھ
کے ہاں پناہ لی لیکن رنجیت سنگھ نے بجائے خاطر مدارات کے شاہ شجاع کے ساتھ برا سلوک کیا وہ یہ کہ
شاہ موصوف کے پاس جتنے جواہرات تھے وہ سب چھین لئے اور بحالت مجبوری شاہ شجاع نے لدھیانہ
میں انگریزوں کے ہاں پناہ لی اور حکومت انگریزی نے شاہ موصوف کے لئے وظیفہ مقرر کر دیا لیکن

شاہ شجاع نے تخت کابل کا خیال ابھی تک ترک نہیں کیا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک دفعہ تخت افغانستان کے لئے قسمت آزمائی کرنیکی غرض سے انگریزوں اور سکھوں سے ایک معاہدہ کیا۔

اس سے پیشتر ایک معاہدہ شاہ شجاع اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے درمیان ہوا تھا جس میں چودہ[۱۴] شرائط تھیں۔ یہ معاہدہ ایک طرح سے تجارتی تھا اور استحکام مودت کے لئے طے پایا تھا۔ اب چونکہ شاہ شجاع انگریزوں کے ساتھ معاہدہ کر رہا تھا اس لئے سکھوں کے ساتھ بھی اسی سلسلے میں معاہدہ کیا۔ چنانچہ یہ معاہدہ شاہ شجاع، انگریزوں اور سکھوں کے درمیان ہوا جو اٹھارہ شرائط پر مشتمل ہے۔ اس کی خاص خاص شرطیں یہ ہیں جو تینوں حکومتوں کے درمیان طے پائیں:-

(۱) تینوں حکومتوں یعنی انگریز، خالصہ افغانوں میں سے ایک کے دوست سب کے دوست اور ایک کے دشمن سب کے دشمن تصور کئے جائیں گے۔

(۲) شاہ شجاع وعدہ کرتے ہیں کہ تخت افغانستان پر قابض ہونے کے بعد انگریزوں اور خالصہ کی فوجی امداد کے عوض ۲ لاکھ روپیہ ادا کریں گے۔ انگریز اور خالصہ شجاع کی امداد کے لئے پانچ ہزار فوج روانہ کریں گے۔

(۳) شاہ شجاع وعدہ کرتے ہیں کہ بغیر رضائے دولت خالصہ اور برطانیہ کسی اجنبی حکومت سے گفتگو نہ کریں گے۔

(۴) شاہ شجاع اعلان کرتے ہیں کہ وہ امیران سندھ کی مالگزاری سے حکومت انگریزی کے حق میں دست بردار ہوتے ہیں۔

غرض جب یہ معاہدہ مرتب ہوا تو تینوں حکومتوں نے اسے منظور کر لیا اور اسی معاہدے کی بنا پر انگریزی فوج نے براہ درۂ بولان افغانستان پر حملہ کر کے شاہ شجاع کو تخت کابل پر بٹھایا۔ امیر دوست محمد گرفتار ہو کر ہندوستان آیا اور اس کے بعد شاہ شجاع انگریزی تلواروں کے سایے میں افغانستان پر حکومت کرنے لگا لیکن تا بہ کے؟

معاہدہ سوم | ۱۸۴۱ء میں افغانستان میں شاہ شجاع اور انگریزی فوجوں کے خلاف بسرکردگی احمد خاں

ایک زبردست بغاوت ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ افغانوں نے انگریزی فوجوں کو بالکل تہس نہس کر دیا۔ ایک ڈاکٹر بہ شکل خفیہ طور پر بچ کر ہندوستان پہنچا جس نے انگریزی فوجوں کی تباہی کا حال سنایا۔ اسی بغاوت میں شاہ شجاع کا خاتمہ ہوگیا اور تمام افغانستان محمد اکبر خاں کے ماتحت تھا۔ ادھر ہندوستان میں لارڈ آکلینڈ کی جگہ لارڈ ڈالنبرہ گورنر جنرل ہند مقرر ہو کر آیا اور اس کی پالیسی یہ تھی کہ حکومت برطانیہ کو افغانی معاملات میں دخل نہ دینا چاہیے۔ البتہ انگریزی فوج ایک دفعہ افغانستان جا کر اپنے محصورین کو چھڑائے، شہر کابل کو تباہ کردے اور افغانوں کے دلوں پر رعب بٹھا کر واپس آئے۔ چنانچہ اسی مقصد کو سامنے رکھ کر برطانوی افواج ۱۸۴۲ء میں افغانستان گئیں اور کابل کو تباہ کر کے براہ درۂ خیبر واپس ہوگئیں۔

اس کے بعد امیر دوست محمد خاں کو انگریزوں نے رہا کر دیا اور موصوف نے افغانستان پہنچ کر عنان حکومت سنبھالی۔ اس کے بعد امیر دوست محمد خاں اور انگریزوں کے درمیان ایک طویل مراسلت کے بعد ایک معاہدہ ہوا جس کو ہم معاہدۂ سوم کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

یہ معاہدہ ۱۸۵۵ء میں دونوں حکومتوں کے نمائندوں کے ذریعے سے طے پایا۔ انگریزی حکومت کی طرف سے جنرل لارنس چیف کمشنر پنجاب تھے اور حکومت افغانستان کی طرف سے سردار غلام حیدر خاں ولی عہد افغانستان معین تھے۔ اس معاہدے کے حسب ذیل شرائط قابل ذکر ہیں:-

(۱) ایسٹ انڈیا کمپنی اور امیر دوست محمد خاں والی افغانستان اور ان کے ورثا میں ہمیشہ دوستی رہے گی۔

(۲) ایسٹ انڈیا کمپنی وعدہ کرتی ہے کہ امیر افغانستان کے مقبوضات میں دست اندازی نہیں کرے گی۔

(۳) امیر دوست محمد خاں وعدہ کرتے ہیں کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات میں کبھی دست اندازی نہیں کریں گے۔ کمپنی کے دشمنوں کو اپنا دشمن سمجھیں گے۔

معاہدۂ چہارم | ۱۸۵۶ء میں ایران اور برطانیہ میں ہرات پر جنگ ہوئی اور انگریزوں نے خلیج فارس پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت برطانیہ نے امیر دوست محمد خاں کو اپنا دوست بنانا اور مالی مدد دینا ضروری

بال کیا اور امیر موصوف نے بذات خود سر جان لارنس چیف کمشنر پنجاب سے پشاور میں ملاقات کی اور اس
ملاقات کے بعد ۲۶ جنوری ۱۸۵۷ء میں دونوں حکومتوں کے درمیان ایک نیا معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے
کی ترتیب میں امیر دوست محمد خاں نے بذات خود نمائندگی کے فرائض انجام دئے اور انگریزوں کی طرف
سے سر جان لارنس چیف کمشنر پنجاب اور کرنل ایچ ۔ بی ۔ ایڈورڈ کمشنر قسمت پشاور نے نمائندگی کی ۔
معاہدے کی گفتگو پشاور میں ہوئی اور اس کے شرائط حسب ذیل ہیں:-

(۱) چونکہ حکومت ایران نے وعدہ خلافی کر کے ہرات پر قبضہ کر لیا ہے اور اس کا ارادہ ہے کہ
بلخ، قندھار اور کابل وغیرہ پر قبضہ کرے اس لئے از راہ دوستی حکومت برطانیہ امیر
افغانستان سے وعدہ کرتی ہے کہ جب تک یہ جنگ قائم رہے گی ایک لاکھ روپیہ ماہانہ
حکومت انگلشیہ امیر افغانستان کو دیتی رہے گی ۔

(۲) امیر صاحب وعدہ کرتے ہیں کہ اٹھارہ ہزار فوج موجود رکھیں گے من جملہ اس فوج کے
تیرہ ہزار منظم آئینی فوج ہوگی جو تیرہ رجمنٹ میں منقسم ہوگی

(۳) امیر صاحب روپیہ لینے کا انتظام خود کریں اور اپنے علاقے میں اس کے لے جانے کا
انتظام بھی خود کریں۔

(۴) کچھ انگریزوں کے فوجی نمائندے دربار کابل میں مع اپنے اسٹاف کے رہیں گے جو مہم ہرات
کی نگہداشت اور مشورے کا کام کریں گے۔ ان کے جان و مال کی حفاظت امیر افغانستان
پر لازم ہوگی ۔

(۵) امیر افغانستان کا ایک نمائندہ کلکتے میں رہے گا۔

(۶) ایک لاکھ ماہانہ کی امداد ایرانی اور برطانوی جنگ کے اختتام پر ختم ہو جائے گی یا جب
گورنر جنرل چاہیں بند کر دیں۔

(۷) جب ایک لاکھ ماہانہ امداد بند ہو جائے گی اس وقت برطانوی نمائندے بھی ہندوستان
واپس چلے آئیں گے ۔ اگر ضرورت ہوئی تو برطانوی نمائندہ دربار کابل میں رہے گا۔

(۸) اس معاہدے سے پیشتر جو پانچ لاکھ روپے امیر صاحب کو ادا کئے گئے ہیں وہ اس میں محسوب نہیں ہوں گے۔

(۹) یہ عہدنامہ ۱۸۵۵ء منعقدہ پشاور کا ناسخ نہ ہوگا۔ بنابریں امیر افغانستان وعدہ کرتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دوست امیر موصوف کے دوست اور اس کے دشمن امیر موصوف کے دشمن متصور ہوں گے۔

امیر دوست محمد خاں سے یہ عہدنامے کیوں کر ہوئے؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریز اپنی اس پالیسی کی تکمیل کرنا چاہتے تھے جو روس کی مدافعت کے لئے تھی۔ ابتدا میں انگریزوں نے "روسی خطرے" کو روکنے کے لئے مودت کے عہد کئے اور اس کے بعد افغانیوں سے اتحاد کیا۔ ان دونوں قوموں کے معاہدوں کی بنیاد یہ ہے کہ ایرانیوں سے انگریزوں کی دوستی روپیہ سے خریدی گئی تھی اور افغانوں سے بذریعہ جان و مال۔ "روسی خطرے" سے ہندوستان کو بچانے کے لئے انگریزوں نے ابتدا میں ایرانیوں سے اتحاد پیدا کیا لیکن سیاسی رفتار کی تبدیلی کی وجہ سے انگریز مدبرین نے "روسی خطرے" سے محفوظ رہنے کے لئے ایران کو کوئی مضبوط دیوار نہ سمجھا بلکہ بعض انگریز مدبرین کے نزدیک وہ ایک ریت کی دیوار تھی جس کو معمولی حملہ بھی تہ و بالا کرسکتا ہے۔

اب انگریزوں کو ایک ایسی دیوار کی ضرورت تھی جو "روسی خطرے" کو روک سکے اور روسی پیش قدمی کے لئے پیش بندی کا کام دے۔ چنانچہ تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ افغانستان نے ہندوستان اور روس کے درمیان سنگین دیوار کا کام دیا۔

معاہدۂ پنجم | امیر دوست محمد خاں نے ۱۸۶۳ء میں انتقال کیا اور شیر علی خاں کو اپنا ولی عہد مقرر کیا۔ امیر دوست محمد خاں کے بیٹوں میں تخت کابل کے لئے سخت لڑائیاں پیش آئیں اور افغانستان کے مختلف حصوں پر دوست محمد خاں کے مختلف بیٹے قابض ہوگئے مگر انگریز افغانستان کی امارت کا حقیقی وارث امیر شیر علی خاں کو سمجھتے تھے۔ اس کے بعد بھی افغانستان کے سرداروں میں تخت کابل کے لئے لڑائیاں ہوتی رہیں۔ اسی اثنار میں امیر شیر علی کا انتقال ہوگیا اور بالآخر شیر علی کا بیٹا یعقوب خاں کامیاب ہوا اور

اس کے بعد انگریزوں اور یعقوب خاں کے درمیان بمقام گندمک معاہدہ ہوا جس کے شرائط حسب ذیل ہیں :-

(۱) فریقین اس معاہدے کی رو سے صلح اور آشتی پر قائم رہیں گے۔

(۲) امیر یعقوب خاں وعدہ کرتے ہیں کہ اجنبی حکومتوں سے معاملات وغیرہ کرنے میں انگلستان سے مشورہ کریں گے اور اگر افغانستان پر کوئی حملہ ہوا تو انگریز افغانستان کی مدد کریں گے۔

(۳) برطانوی سفیر دربار کابل میں رہے گا اور اس کی حفاظت کے لئے کافی باڈی گارڈ ہوگا۔ علاوہ ازیں انگریزوں کی حفاظت خاص طور پر امیر افغانستان کے ذمہ ہوگی۔

عہد نامۂ گندمک کی رو سے انگریزی اقتدار مملکت افغانستان میں کافی ہو گیا تھا۔ اگر یہ معاہدہ عملی طور پر قائم رہتا تو قندھار اور درۂ خیبر ے یا اہم فوجی مقامات پر انگریزوں کا قبضہ رہتا اور ان کی وجہ سے کابل پر دباؤ رہتا اور "روسی خطرے" پر انگلستان کا مفید اثر پڑ سکتا تھا۔ مگر بعض انگریز مدبرین کی یہ رائے تھی کہ روسی اور برطانوی مفاد اس میں ہے کہ ہندوستان اور روس کے درمیان افغانستان ایک آزاد ریاست رہنے دیا جائے۔ اس پالیسی پر عمل کرتے ہوئے انگریزوں نے افغانستان کی چھیڑ چھاڑ میں کسی قدر کمی کردی اور اس لئے بھی کہ اگر انگریز افغانستان کے کسی ایک ٹکڑے پر قابض ہوتے تو اُدھر بلخ اور ہرات پر روسی قابض ہو جاتے بغاوتوں کی وجہ سے افغانستان میں یعقوب خاں کی حکومت بھی دیر تک نہ رہ سکی۔ آخر ۱۸۸۰ء میں یعقوب خاں قید ہو کر ہندوستان روانہ ہوئے اور ان کے بعد امیر عبدالرحمٰن خاں مسند آرائے افغانستان ہوئے۔

معاہدۂ ششم | افغانی تاریخ گواہ ہے کہ شیر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے بعد جو شخص فوجی اور انتظامی قابلیت افغان قوم میں بدرجہ اتم رکھتا تھا وہ عبدالرحمٰن خاں تھا۔ امیر عبدالرحمٰن خاں ہی کی ذات تھی جس نے انگریزی اور روسی سیاست کا بہ نظر عمیق مطالعہ کیا تھا۔ جن لوگوں نے تزک عبدالرحمٰن پڑھا ہے وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ عبدالرحمٰن خاں افغانستان کو کیا بنانا چاہتا تھا اور برطانوی سیاسی چالوں کو کس طرح سمجھتا تھا اور ان کو کس طرح توڑتا تھا۔ اعلیٰ مدبر اور غیور افغان ہونے کی وجہ سے امیر

موصوف کو انگریزوں سے چند شکایات پیدا ہوگئی تھیں اور اسی طرح انگریزوں کو امیر موصوف سے کسی قدر شکوہ تھا۔ ان شکایات کو رفع کرنے کے لئے لارڈ لینیڈون نے ۱۸۹۳ء میں دفتر خارجہ کے سکریٹری سر مارٹیمر ڈیورنڈ کو کابل روانہ کیا تاکہ امیر افغانستان کے ساتھ افغانستان اور ہندوستان کی مستقل سرحدوں اور ایک دائمی عہد مودت کے متعلق گفتگو کرے۔ چنانچہ یہ وفد ۱۸۹۳ء میں کابل پہنچا اور ایک طویل بحث و مباحثے کے بعد حسب ذیل معاہدہ طے پایا۔

(۱) مشرق اور جنوبی سرحد امیر افغانستان کی حکومت واخاں سے سرحد فارس تک ہوگی۔

(۲) فریقین ایک دوسرے کی حدود میں مداخلت نہ کریں گے۔

(۳) سرحدی لائن کا تعین بعد میں ایک کمیشن کے ذریعے ہوگا۔

(۴) برطانیہ تسلیم کرتا ہے کہ امیر افغانستان اسمار پر قابض رہیں اور امیر افغانستان یقین دلاتے ہیں کہ سوات، باجور اور چترال پر انگریزی اقتدار رہے گا۔

(۵) علاقہ چمن کے بارے میں امیر صاحب اپنا اعتراض واپس لیتے ہیں اور اس علاقے سے برطانیہ کے حق میں دست بردار ہوتے ہیں۔

(۶) حکومت ہند افغانستان کو ایک مضبوط حکومت دیکھنا چاہتی ہے اس لئے براہ ہند اسلحہ جنگ طلب کرنے میں مداخلت نہ کرے گی اور علاوہ ازیں حکومت ہند خود امیر افغانستان کی مدد کرے گی۔ وہ رقم جو حکومت ہند امیر افغانستان کو بطور دوستانہ دیتی ہے وہ چھ لاکھ سے بڑھا کر ۱۲ لاکھ کی جاتی ہے۔

اس معاہدے کے بعد امیر عبدالرحمٰن نے زیادہ تر اپنی اندرونی اصلاحات کی طرف توجہ کی اور افغانستان کو بہت بڑی حد تک منظم کیا اور مختلف کارخانے قائم کئے اور حکومت افغانستان کے ہر شعبے کو منظم کیا۔

امیر عبدالرحمٰن کے انتقال کے بعد امیر حبیب اللہ خاں ۱۹۰۱ء میں تخت نشین کابل ہوا۔ امیر حبیب اللہ خاں نے اپنی حکومت کی پالیسی بذریعۂ اعلان وہی رکھی جو ان کے والد امیر عبدالرحمٰن کی تھی

اور انگریزوں کے ساتھ اسی معاہدے کو برقرار رکھا۔

امیر عبدالرحمٰن نے مملکت افغانستان کو ایک منظم حکومت بنا دیا تھا۔ امیر حبیب اللہ خاں کے لئے کافی موقعہ تھا کہ ملک کو ایک قدم آگے بڑھاتا لیکن حبیب اللہ خاں اپنے والد کے انتقال کے بعد عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے لگا اور ملکی ترقی ایک حد تک رک گئی۔

جنگ عظیم کے زمانے میں ایک جرمن اور ترکی وفد حبیب اللہ خاں کے پاس اس غرض سے آیا کہ افغان قوم ہندوستان پر حملہ کرکے اپنی مکمل آزادی حاصل کرے لیکن امیر حبیب اللہ خاں نے اس مشورے کو نہ مانا۔ بالآخر افغان "نوجوان پارٹی" نے ۱۹۱۸ء میں جلال آباد کے قریب امیر صاحب کو قتل کیا۔

معاہدۂ ہفتم | اس کے بعد امیر امان اللہ خاں تخت افغانستان پر قابض ہوا۔ امان اللہ خاں کو "نوجوان افغان پارٹی" نے تخت پر بٹھایا تھا اور امیر موصوف بذات خود ایک زبردست جذبۂ آزادی اپنے دل میں رکھتا تھا۔ امان اللہ خاں چاہتا تھا کہ ملت افغانیہ اپنے پیدائشی حق یعنی حریت و استقلال سے اسی طرح مستفید ہو جس طرح اور اقوام عالم۔ مزید برآں امیر حبیب اللہ خاں کے عہد میں انگریزی فوجوں نے متعینہ حدود افغانستان سے ۴۰ میل آگے بڑھ کر قبضہ کر رکھا تھا۔ یہ چیز نوجوان پارٹی کو بہت ناپسند ہوئی۔ ان وجوہات اور جذبۂ آزادی نے امان اللہ خاں کو اپنی مکمل آزادی حاصل کرنے کے لئے مجبور کیا چنانچہ ۱۹۱۹ء میں موقع بھی اچھا ملا کہ افغان اپنی آزادی کے لئے کوشش کریں، کیونکہ افواج ہند جنگ عظیم میں لڑ کر تھک گئی تھیں۔ اسی وقت امان اللہ خاں نے استقلال ملی کے لئے انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

افغانی افواج نے انگریزی فوجوں کو شکستیں دے کر مدبرین برطانیہ کو اس بات پر مجبور کیا کہ افغانستان کے استقلال ملی کو تسلیم کریں کیونکہ نوجوان افغان پارٹی یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ افغانستان پر اجنبی تسلط قائم رہے۔ جنگ کے التوا کا اعلان ہوا۔ اس کے بعد برطانیہ کی دعوت صلح پر افغانی نمائندے بسر کردگی سردار اعلیٰ علی احمد خاں راولپنڈی پہنچے۔ حکومت ہند نے افغانی وفد کا

شاندار استقبال کیا۔ دونوں حکومتوں کے نمائندوں میں بحث تمحیص شروع ہوئی۔ دوران بحث میں سردار علی احمد خاں نے نوجوان افغان پارٹی کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے ایک تقریر میں برطانوی نمائندوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"ابتدائے جنگ برطانیہ کی طرف سے ہوئی ہے ایسی حالت میں افغانوں پر مدافعت لازمی تھی۔ اب صلح کی دعوت بھی حکومت برطانیہ کی طرف سے ہوئی ہے۔ ہمارا وفد ہندوستان میں آیا ہے۔ یہ یاد رہے کہ اگر حکومت افغانستان کو برطانیہ کی دوستی کی ضرورت ہے تو برطانیہ کو اس سے کہیں زیادہ افغانستان سے دوستی قائم رکھنے کی ضرورت ہے۔"

گفتگوئے راولپنڈی میں چند ہی امور طے ہونے پائے تھے کہ یہ صلح کانفرنس ملتوی ہوگئی۔ اس کے بعد اپریل ۱۹۲۰ء میں افغانی وفد بسرکردگی وزیر خارجہ سردار اعلیٰ محمود طرزی کوہ منصوری آیا اور گفتگوئے معاہدہ ہوئی۔ اس کانفرنس میں حسب ذیل موضوعات پر بحث ہوئی :-

استحکام استقلال افغانستان، تقرر سفیر افغانستان بہ لندن، مسئلہ الحاق وزیرستان با افغانستان، تقرر قنصل خانہائے بالشویکی بر سرحدات ملحقہ افغانستان اور سہولیات تجارت۔

ان تمام موضوعات پر افغانی نمائندوں نے نہایت جرأت وہمت کے ساتھ "نوجوان افغان پارٹی" کے خیالات کی ترجمانی کی اور انگریزی نمائندوں نے معلوم کر لیا کہ افغانستان اب وہ افغانستان نہیں رہا کہ انگریزی مدبرین کے مکر وفریب میں پھنسے۔

گفتگوئے منصوری بھی ناکام رہی۔ نمایندگان افغانستان واپس چلے گئے۔ ۵ جنوری ۱۹۲۱ء میں برطانوی وفد بسرکردگی سر ہنری ڈابس کابل گیا تاکہ ازسرنو معاہدۂ مودت پر بحث کرکے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔ چنانچہ گفتگوئے کابل میں ایک معاہدہ طے پایا جو چودہ دفعات پر مشتمل ہے جس کی بڑی بڑی شرطیں حسب ذیل ہیں :-

(۱) دولتین برطانیہ و افغانستان ایک دوسرے کی داخلی وخارجی خودمختاری کے حقوق تسلیم کرتی ہیں اور ان کا احترام کرتی ہیں۔

(۲) دونوں حکومتیں ہندوستان اور افغانستان کی سرحدات کے اس خط کو منظور کرتی ہیں جو راولپنڈی میں طے ہوا تھا یعنی مقام تورخم اور دریائے کابل کی تلہٹی جو سلیمان خولہ بند اور پلوسی کے درمیان ہے وہ علاقہ افغانستان میں شامل ہوگی۔

(۳) حکومت برطانیہ اقرار کرتی ہے کہ افغانی سفراء اور وزراء کے دربار لندن میں وہی حقوق ہوں گے جو دوسری حکومتوں کے سفراء کے ہیں۔

(۴) حکومت افغانستان اقرار کرتی ہے کہ قندھار اور جلال آباد میں برطانوی قنصل خانے قائم کرنے کی اجازت دے گی اور برطانیہ وعدہ کرتی ہے کہ ہندوستان میں کراچی، بمبئی، کلکتہ اور دہلی میں افغانی قنصل خانوں کی اجازت دے گی۔

(۵) حکومت برطانیہ اقرار کرتی ہے کہ افغانستان کی ترقی وبہبودی کے لئے کارخانوں کی کلیں، انجن، سامان تلغراف اور ٹیلیفون اور اسلحات جنگ ہندوستان کے راستے سے اس شرط پر لے جانے کی اجازت دے گی کہ اس کو افغانستان کی دوستی کا یقین ہو۔

(۶) دونوں حکومتیں اقرار کرتی ہیں کہ ایک دوسرے کے نمائندوں کی حفاظت کریں گی۔

(۷) جو مال حکومت افغانستان کی فرمائش پر سیدھا افغانستان جانے کے لئے برطانوی ہند کی بندرگاہوں میں پہنچے گا اس پر محصول نہیں لیا جائے گا اس شرط پر کہ افغانی قنصل اس کی تصدیق کردے۔

اس معاہدے کی بقیہ سات دفعات تجارتی ہیں جن کا ذکر باعث طوالت ہوگا۔ دونوں حکومتوں کے نمائندوں نے اس معاہدے کی تصدیق کی۔ یہ معاہدہ ایک طویل گفتگو کے بعد پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس موقع پر دونوں حکومتوں کے حکمرانوں کے پیغامات کا تبادلہ ہوا جس میں شاہ انگلستان اور شاہ افغانستان نے اظہار مسرت کرتے ہوئے ایک دوسرے کی طرف سے دائمی مودت کا یقین دلایا۔

**افغانی اور برطانوی معاہدات پر ایک نظر**

شاہ شجاع سے لے کر عبدالرحمٰن کے عہد تک جتنے معاہدے افغانوں اور انگریزوں کے درمیان ہوئے تھے ان کی شرائط سے ظاہر ہوتا ہے کہ افغان دب کر صلح کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ افغانستان برطانوی اقتدار کے ماتحت تھا۔ لیکن معاہدہ ششم اور ہفتم کی شرائط سے معلوم ہوتا ہے کہ افغانوں کے اندر جذبۂ استقلال و حریت پیدا ہو چکا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی قوم سے دب کر صلح کریں۔ یہ جذبہ معاہدۂ ہفتم سے بخوبی واضح ہوتا ہے کیونکہ ترتیب معاہدہ کے وقت افغانی وفد کے نمایندوں نے نہایت قابلیت و تدبر کے ساتھ بحث کی جس کی وجہ سے انگریز مدبرین کی آنکھیں کھل گئیں۔ افغانی نمایندوں نے اپنے استقلال و حریت کے مطالبے کے لئے ڈٹے رہے۔ آخر برطانوی مدبرین افغانستان کے استقلال تامّی کے تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اب افغانستان بجائے "نیم آزاد سلطنت کے " سلطنت مستقلہ افغانستان" کے نام سے موسوم ہوا۔

"نوجوان افغان پارٹی" کے قائد اعظم سابق امیر امان اللہ خاں کی اس تقریر سے جو انھوں نے تکمیل معاہدہ کے بعد برطانوی وفد کے الوداع کے وقت کی تھی افغانستان کے سیاسی مطمح نظر کا پتہ لگتا ہے۔ امیر موصوف نے دوران تقریر میں فرمایا:-

> "میں دیکھتا ہوں کہ آج دولتین افغانستان و برطانیہ کا معاہدہ ہو گیا ہے اور فریقین نے ایک دوسرے کے خیالات و مطالبات قبول کر لئے ہیں۔ میں تو بچپن ہی سے متمنی ہوں کہ تمام اقوام عالم آزاد ہو جائیں۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ کسی شخص کے حقوق آزادی تلف ہوں بالخصوص اپنے وطن اور اپنی سلطنت کے حق آزادی میں کسی قسم کا خلل گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ میں خیال کرتا تھا کہ دولت برطانیہ ہی وہ طاقت ہے جس نے افغانستان کو اس کے پیدائشی حق سے محروم کیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میرے دل میں سلطنت مذکورہ کی مخالفت کے خیالات بھرے ہوئے تھے۔ میں تو اب بھی افغانستان کی عزت و استقلال کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ بہانے کے لئے تیار ہوں۔"

اس تقریر کے لفظ لفظ سے افغانی قوم کے عزم صمیم کا پتہ لگتا ہے۔ اس چیز نے برطانوی مدبرین پر واضح کر دیا کہ اس چھوٹی سی بہادر قوم کے ساتھ مساوات کا برتاؤ کیا جائے۔ ایک زمانہ تھا کہ بعض مدبرین برطانیہ کو امیر حبیب اللہ خاں ہز مجسٹی کے لئے مترادف فارسی کے الفاظ مراسلت میں استعمال کرنا ناگوار تھے لیکن اب ۱۹۲۱ء میں معاہدہ ہفتم کی رو سے افغانستان کا کلی استقلال تسلیم کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو افراد یا اقوام اپنی عزت و استقلال قائم رکھنا چاہتے ہیں وہ یقین محکم، عمل پیہم کو اپنا دستور العمل بناتے ہیں۔ چنانچہ اس راز کو ملت افغانیہ نے اچھی طرح معلوم کر لیا اور ملت افغانیہ حصول مقصد کے لئے اپنی عزیز جانیں تک قربان کرنے کو تیار ہو گئی۔ ایک مختصر عرصے میں اقوام عالم نے ملت افغانیہ کے استقلال کو مان لیا۔

نوجوان افغانوں نے دنیا پر واضح کر دیا کہ افغان شمشیر زنی اور حکمرانی میں دنیا کی کسی قوم سے پیچھے نہیں ہیں۔ بہت سے مدبرین کا خیال ہے کہ افغان قوم ایک شاندار مستقبل رکھتی ہے اور بہت ممکن ہے کہ یہ قوم آوارہ کوہ و دمن اقوام ایشیا کی رہنمائی کرے۔

---

## ماخذ


فارسی :- تاریخ السراج حصہ اول و دوم

تزک عبدالرحمانی

اردو :- افغانستان جدید

نیرنگ افغان

تاریخ افغانستان

انگریزی :- 1. A short History of India, Burma, Nepal and Afghanistan by J. Tal Boyo Wheeler.

2. The Russo-Indian Questions by Capt. F. French.

# غزل

(حضرت جگر مراد آبادی)

یاد جاناں بھی عجب روح فزا آتی ہے
سانس لیتا ہوں تو جنت کی ہوا آتی ہے

میری جانب نگہ ہوش ربا آتی ہے
پھر وہی ظالم مظلوم نما آتی ہے

جا بھی اے ناصح ناداں نہ کر اس کو بدنام
ان جفاؤں سے تو خوشبوئے وفا آتی ہے

نہیں معلوم وہ خود ہیں کہ محبت ان کی
پاس ہی سے کوئی بے تاب صدا آتی ہے

میں تو اس سادگی حسن پہ اس کی صدقے
نہ جفا آتی ہے جس کو نہ وفا آتی ہے

ہائے کیا چیز ہے یہ تکملۂ حسن و شباب
اپنی صورت سے بھی اب ان کو حیا آتی ہے

مرگ ناکام محبت مری تقصیر معاف
زندگی بن کے مرے حق میں قضا آتی ہے

اٹھ گیا کیا جگر درد بہ دل شعلہ بہ جاں
در و دیوار سے ماتم کی صدا آتی ہے

# تنقید و تبصرہ

## کتب

سوامی دیانند اور ان کی تعلیم۔ اخلاق کی پہلی کتاب۔ نقش آخر (ڈراما)۔
کلیات طغرائی۔ ارکان اسلام۔ نیا میلاد نامہ۔

**سوامی دیانند اور ان کی تعلیم** (از خواجہ غلام الحسنین صاحب پانی پتی۔ مجموعی حجم ۲۹۰ صفحے، تقطیع ۲۲×۱۸/۸ الکھائی چھپائی، کاغذ اوسط درجے کا۔ قیمت غیر مجلد عا، مجلد عہ۔ ملنے کا پتہ:۔ حالی بک ڈپو، پانی پت، پنجاب)

خواجہ غلام الحسنین صاحب کی تعلیم اور مذہبی خدمات سے ملت اسلامی اچھی طرح واقف ہے۔ موصوف نے اپنی ساری عمر اس کام میں صرف کی ہے کہ ایک طرف تعلیم و تربیت، موعظت و ہدایت سے مسلمانوں کے دلوں میں شمع ایمان روشن کی اور دوسری طرف کلام اور مناظرے کے ذریعے اس شمع کو مخالف ہواؤں سے بچایا۔ مناظرے کو ہندوستان کے لوگوں نے اس قدر پست سطح پر پہنچا دیا ہے کہ مہذب لوگ اس کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ مگر خواجہ صاحب نے کمال کیا کہ اس کوچے میں قدم رکھنے کے بعد بھی اپنے دامن کو اس کیچڑ سے آلودہ نہیں ہونے دیا جو لوگ یہاں ایک دوسرے پر پھینکا کرتے ہیں۔ یہ کتاب جس پر تنقید کی جا رہی ہے اس اعتبار سے ہندوستان میں اپنا نظیر نہیں رکھتی کہ لکھنے والا اس شخص کے حالات لکھ رہا ہے جس کی تعلیم کو وہ سراسر غلط سمجھتا ہے اور عمر بھر اس کی مخالفت کرتا رہا ہے مگر ساری کتاب میں ایک لفظ بھی تہذیب و متانت کی سطح سے گرا ہوا نہیں سوائے خود سوامی دیانند کے اقوال کے جو ان کی سخت کلامی کے نمونوں کے طور پر نقل کیے گئے ہیں۔ سوامی جی کی زندگی کے واقعات بڑی کاوش اور تحقیق سے معلوم کیے گئے ہیں۔ جن امور کے متعلق متضاد روایات ہیں ان کے بیان میں مخالف اور موافق باتیں بلا کم و کاست جمع کر دی گئی ہیں اور پھر دیانت داری سے محاکمہ کیا گیا ہے۔ یہ تو

ظاہر ہے کہ کتاب کا مقصد سوامی جی کی تعلیم کی تردید ہے اور اس مقصد کے حصول میں مصنف نے پوری پوری کوشش کی ہے مگر مہذب مناظرے کے آداب سے اول سے آخر تک کہیں انحراف نہیں ہوا ہے۔ سوامی جی کی ذات کے متعلق نکتہ چینی ضرور ہے اور انتہائی سخت گیری سے ہے مگر اسی حد تک کہ ان کی تعلیم کے خلاف استدلال میں مدد ملے۔ ذاتی کاوش یا عناد کی بنا پر یا دوسروں کی دل آزاری کی غرض سے ایک فقرہ بھی نہیں لکھا گیا ہے۔ ہم خواجہ صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں کہ جو مقصد ان کے پیش نظر تھا اس میں وہ پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں اور اس کے علاوہ انھوں نے سنجیدہ اور شائستہ مناظرے کا نہایت پاکیزہ نمونہ ملک کے سامنے پیش کر دیا ہے جس کی سب لوگ نہیں تو کچھ لوگ ضرور تقلید کریں گے کتاب کے ساتھ مشرح اور مدلل مقدمہ، نہایت مفصل فہرست اور آخر میں چند صفحات میں سارے مضامین کا خلاصہ ہے۔ ترتیب مضامین میں بھی یہ کتاب ایک جداگانہ شان رکھتی ہے اور بعض امور کے لحاظ سے ہر مصنف کے لئے قابل تقلید ہے۔

---

**اخلاق کی پہلی کتاب** (مصنفہ سید غلام الحسنین صاحب پانی پتی۔ ملنے کا پتہ:۔ حالی بک ڈپو پانی پت)

اس کتاب کو ایک بہترین معلم کے عمر بھر کے تجربے کا نچوڑ سمجھنا چاہئے۔ اس میں توحید و معرفت کے نکتے اس طرح بیان کئے گئے ہیں کہ چھوٹی سی عمر کے بچوں کے ذہن میں بیٹھ جائیں اور ان کے دل پر نقش ہو جائیں۔

ہر سبق میں کسی ایسی چیز کا بیان ہے جسے بچے روزمرہ دیکھتے ہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں۔ نہایت سہل، شیریں اور پاکیزہ زبان اور سیدھے سادے انداز بیان میں اس کاریگری، حکمت اور حسن ذوق کی تعریف کی گئی ہے جو دنیا کی معمولی سے معمولی چیز کے بنانے میں صرف ہوئی ہے اور اس سے صانع کی ذات اور اس کی صفات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ ہر سبق کے آخر میں اس کا نتیجہ دو چار صاف اور رواں شعروں میں بیان کر دیا گیا ہے جو بچوں کو یقیناً پسند آئیں گے اور بار بار پڑھتے پڑھتے نوک زبان ہو جائیں گے۔ عموماً ان اسباق کا مضمون قرآن مجید کی آیتوں اور حدیثوں سے ماخوذ ہے اس لئے

مسلمانوں کے لئے تو یہ کتاب بہر حال سچے اخلاق اور دینداری کا سرچشمہ ہے لیکن غیر مسلم بھی اپنے بچوں کو پڑھا سکتے ہیں کیونکہ جو اصول اس میں بیان کئے گئے ہیں ان پر دنیا کی ہر متمدن قوم کا مذہب مبنی ہے یا کم سے کم مبنی ہونے کا مدعی ہے۔

---

نقشِ آخر (ڈراما) | از جناب اشتیاق حسین قریشی ام۔ اے ۳۰ × ۲۰/۱۶ ضخامت ۱۱۰ صفحات، کتابت طباعت اور کاغذ متوسط قیمت ۱۲/

جن لوگوں نے جناب اشتیاق حسین صاحب قریشی کے پچھلے ڈراموں معلم اسود، گناہ کی دیوار، ہمزاد اور صیدزبوں کا مطالعہ کیا ہے وہ موصوف سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ آپ نے اردو ڈراموں کی موجودہ خرابیوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے اور نہایت خاموشی وانہماک کے ساتھ اس کام میں مصروف ہیں جس کا ثبوت وہ مفید ڈرامے ہیں جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ آپ ہر سال ایک ڈراما ضرور لکھ لیتے ہیں اور ہر سال وہ اس ڈرامے کو اپنی نگرانی میں نہایت کامیابی کے ساتھ اسٹیج بھی کرتے ہیں۔

زیرِ نظر ڈرامے میں انھوں نے موجودہ مغربی تعلیم کے نقائص دکھائے ہیں۔ قصے کا تعلق غدر کے زمانے سے ہے۔ میر عاشق دلی کے ایک باکمال مصور تھے۔ قلعۂ معلی میں ان کو بہت رسوخ حاصل تھا اور آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ان کو بہت قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کا بڑا لڑکا محسن بہت سعادت مند اور ہونہار نوجوان تھا۔ اس کا تعلق بھی قلعۂ معلی سے تھا۔ دوسرے لڑکے کا نام شبیر تھا جو ابھی چھ سات سال کا تھا۔ یہ تینوں قصے کے خاص افراد ہیں۔ یہ خاندان بہت خوش حال تھا اور اطمینان و فراغت کی زندگی بسر کرتا تھا۔ لیکن غدر کے زمانے میں دوسرے شریف گھرانوں کی طرح یہ خاندان بھی تباہ و برباد ہوگیا۔ صرف ایک ماما، محسن اور شبیر بچ رہے۔

محسن اپنے ایک دوست طاہر کے اصرار سے شبیر کو سرسید احمد کے انگریزی مدرسے میں داخل کر دیتا ہے۔ انگریزی تعلیم کے اثر سے وہ مغربی تہذیب سے اتنا متاثر ہو جاتا ہے کہ اس کی برائیاں بھی اسے اچھائیاں نظر آتی ہیں اور پرانی تہذیب و شائستگی اسے مضحکہ انگیز معلوم ہوتی ہے اور وہ اچھا خاصا ۱۹۳۴ء کا مسلمان

جنٹلمین بن جاتا ہے جس کی روزانہ دلچسپیوں کا مرکز تھیٹر ہیں اور سینما۔

کتاب شروع سے آخر تک دلچسپ ہے۔ مصنف نے زمانۂ غدر سے پہلے کی اسلامی تہذیب و شائستگی کا نقشہ بہت خوبی سے کھینچا ہے۔ غدر کی مصیبتوں کی داستان بھی بہت درد انگیز ہے۔ اور آخر میں وہ بحثیں بھی دلچسپ ہیں جو سرسید احمد خاں کے مدرسے کے سلسلے میں محسن اور اس کے دوست طاہر کے درمیان ہوئی۔ افسوس کہ یہ بحث تشنہ رہ گئی ہے۔ قصے کا آخری حصہ بھی بہت حسرت ناک ہے۔

آخر میں ہم جناب مصنف کو دو ایک فروگذاشتوں کی جانب بھی توجہ دلانا چاہتے ہیں:۔

غدر کی ابتدا کے زمانے میں انھوں نے میر عاشق کے بھائی میر ناصر کی مرزا غالب اور استاد ذوق سے ملاقات کرادی (صفحہ ۱۹) حالانکہ استاد ذوق کا غدر سے بہت پہلے انتقال ہو چکا تھا۔

(۲) شبیر کی تعلیم کے سلسلے میں انھوں نے سرسید احمد کے مدرسے کے قیام کا تذکرہ کیا ہے حالانکہ وہ غدر سے بہت دنوں بعد (غالباً ۱۸۷۵ء میں) قائم ہوا ہے۔ اس زمانے میں تو شبیر جوانی کی عمر کو پہنچ چکا ہوگا۔

زبان میں کہیں کہیں بہت تکلف و تصنع پیدا ہوگیا ہے خصوصاً عورتوں کی زبان میں۔ ایک جگہ آپ نے 'نیند نہ بھرنا' 'نیند پوری نہ ہونے' کے مفہوم میں استعمال فرمایا ہے (صفحہ ۱۲)۔ ہمارے لئے یہ محاورہ بالکل نیا ہے شاید دلی میں بولا جاتا ہو۔ عام طور پر آنکھوں میں نیند بھرنا اس وقت بولا جاتا ہے جب نیند کی وجہ سے پلکیں بھاری ہونے لگیں۔ (محاورہ صحیح ہے۔ اعتراض بے جا ہے۔ مدیر جامعہ)

اسی طرح ایک جگہ میر عاشق فرماتے ہیں "خدا سلطنت کے اس ٹمٹماتے ہی چراغ کو روشن رکھے" ہی کے بے محل استعمال سے فقرے میں کچھ عجیب بھونڈا پن پیدا ہوگیا ہے۔

ان معمولی فروگذاشتوں کو چھوڑ کر کتاب شروع سے آخر تک مفید و دلچسپ ہے۔

---

**کلیات طغرائی** از جناب حکیم فیروز الدین احمد صاحب طغرائی مرحوم امرتسری۔ تقطیع $\frac{20 \times 26}{8}$، حجم ۲۲۰ صفحات کتابت و طباعت بہترین، کاغذ سفید اعلیٰ قسم کا دبیز۔ قیمت ۲؎۔ ملنے کا پتہ: کتب خانہ طغرائی امرتسر۔

یہ حکیم فیروز الدین احمد صاحب طغرائی مرحوم کے کلام کا مجموعہ ہے جسے ان کے انتقال کے بعد ان

کے شاگردوں خصوصاً جناب تبسم ام۔ اے نے نہایت اہتمام و نفاست سے شائع کیا ہے۔ شروع میں جناب تبسم نے حضرت طغرائی مرحوم کے زندگی کے حالات لکھے ہیں۔ پھر ان کے دوسرے شاگرد عرشی امرتسری نے ان کے اردو اور مسٹر ممتاز حسن ایم۔ اے نے فارسی کلام پر تبصرہ کیا ہے۔ اس کے بعد ان کا اردو کا کلام شروع ہوتا ہے۔ پہلے نیچرل اور اصطلاحی نظمیں ہیں، پھر اسلامی نظمیں اور آخر میں اردو غزلیات۔ اس کے بعد فارسی کلام کی بھی تقریباً یہی ترتیب ہے۔

حضرت طغرائی مرحوم فارسی اور اردو کے قادر الکلام اور پختہ مشق شاعر تھے۔ انھوں نے غزل، قصیدے، رباعی اور مخمس وغیرہ غرض تمام اصناف نظم میں طبع آزمائی فرمائی ہے اور اپنی قادر الکلامی کی وجہ سے ہر ایک میں نہایت کامیابی سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ انھوں نے جدید طرز کی نظمیں بھی کہی ہیں اور انھیں نظموں میں ان کی طبیعت کا اصلی جوہر نمایاں ہے خصوصاً اسلامی نظمیں ان کے دلی درد اور خلوص کی آئینہ دار ہیں۔ ان کی فارسی شاعری قدیم طرز پر ہے لیکن اس سے بھی ان کی کہنہ مشقی ٹپکتی ہے۔ کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:۔

تصویر یاس پر انھوں نے ایک نظم لکھی ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

بیان درد دل کرتا ہوں میں اشعار موزوں میں — عجب سانچے میں ڈھل ڈھل کر نکلتی ہے فغاں میری
گلستان جہاں میں نغمہ پیرائے مصیبت ہوں — کرے گی ہمسری کیا عندلیب بوستاں میری

---

عیاں میں آج اپنا سوز پنہاں کر کے چھوڑوں گا — جگر کے آبلوں کو آتش افشاں کر کے چھوڑوں گا
ہنساؤں گا ہر اک بے درد کو میں اپنے رونے پر — ہویدا ارتباط برق و باراں کر کے چھوڑوں گا

"جگنو" پر:۔

چمک دمک ہے گلستاں میں جا بجا کیسی — لگا رہی ہے چکا چوند یہ ضیا کیسی
یہ سحر ہے کہ فسوں ہے عجب تماشا ہے — کبھی نظر میں اندھیرا کبھی اجالا ہے
یہ دور دور دیے کیسے ٹمٹماتے ہیں — بساط سبزہ پہ تارے سے جگمگاتے ہیں
کچھ آج حد سے زیادہ ہے زیب و زینت و فر — عروس باغ نے افشاں چنی ہے ماتھے پر

ہندو مسلم نزاع بڑی نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے چنانچہ ایک موقع پر کہتے ہیں:-

تم آخر پھول ہو گلشن کے اور گلشن تمہارا ہے — نہیں زیبا بکھر کر وجہِ تاراج چمن ہونا
جو لالہ ہے رہے لالہ جو نرگس ہے رہے نرگس — ضروری کچھ نہیں ہے نسترن کو یاسمن ہونا
اس اپنی اپنی رنگت میں ہی تم زیب گلستاں ہو — چمن کا کھلکھلانا ہے تمہارا خندہ زن ہونا

غزلوں کا نمونہ :-

جتنی کماں خمیدہ ہو، جاتا ہے تیر دور — جھکنا غضب ہے اس نگہ شرمسار کا

---

عجب مری ہوس سجدہ سے ہے ضد ان کو — کہ اپنے نقش قدم کو مٹا مٹا کے چلے

---

زمانہ کی آنکھیں بدل جائیں گی — ذرا رحم! آنکھیں بدلتے ہوئے

فارسی کلام بہت کم دستیاب ہو سکا ہے لیکن جو کچھ ہے خوب ہے۔ قلت گنجائش کے سبب ہم نمونے کے لئے صرف چند اشعار نقل کریں گے:-

کشیدم در تمنایش بسی از ہر آرزو دستے — چہ خوش لے ناصح ناداں کہ بردارم از و دستے

---

چناں فلک بسرم راند لشکر اندوہ — کہ پائمال شدم چوں زمین راہ گذر

---

تلطمہائے موج را آماجگاہم روز و شب — گرچہ از دریا چو ساحل برکنار افتادہ ام

---

کیفیت ہائے بر تنگاں مپرس — بادہا از سحاب می ریزد
جنت از سر حد کمال گزشت — از شباہت شباب می ریزد

---

آخر میں ہم یہ ضرور عرض کریں گے کہ اردو غزلوں کے انتخاب میں ذرا اور احتیاط سے کام لیا جاتا تو بہتر ہوتا۔

کتاب کے شروع میں حضرت طغرائی کا فوٹو بھی دیا گیا ہے۔

---

**ارکان اسلام** | یا دینیات کی چوتھی کتاب تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۴۴ صفحات۔ کتابت اعلیٰ، طباعت اور کاغذ متوسط۔ قیمت ۲/ ملنے کا پتہ، مکتبہ جامعہ قرول باغ، دہلی۔

کارکنان جامعہ بچوں کے لئے دینیات کی کتابوں کا ایک سلسلہ لکھ رہے ہیں۔ یہ کتاب اس سلسلے کی چوتھی کڑی[1] ہے اور اس میں اسلام کے ارکان خمسہ روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ وغیرہ کی نہایت سہل اور آسان زبان میں تشریح کی گئی ہے۔ اس موضوع پر بچوں کے لئے جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں یہ ان سب میں ممتاز ہے۔

---

**نیا میلاد نامہ** | از جناب سید اشفاق حسین صاحب ایم۔اے ہیڈ ماسٹر گوڑیائی ضلع رہتک تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۳۰ صفحات۔ کتابت و طباعت اور کاغذ معمولی۔ غالباً جناب مؤلف کے پتے پر ڈاک کے ٹکٹ بھیجنے پر مفت ملتا ہے۔

جناب اشفاق حسین صاحب نے یہ رسالہ میلاد النبی (۱۲ ربیع الاول ۱۳۵۵ھ) کی تقریب میں پیش کیا تھا۔ اس میں شروع میں محفل میلاد کے مقصد، غرض و غایت اور محفل میلاد کے ادب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر صاف و سلیس زبان میں آں حضرت کے پیدائش سے ہجرت تک کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ بیچ بیچ میں نعتیہ نظمیں بھی ہیں۔ محفل میلاد میں بجائے ادھر اُدھر کی غیر مستند کتابیں پڑھنے کے یہ رسالہ زیادہ مناسب اور مفید ہو گا۔

---

[1] اس سلسلے کا پہلا اور دوسرا حصہ ابھی زیر ترتیب ہے۔ تیسرا حصہ اسلامی عقائد اور چوتھا ارکان اسلام کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

# رسائل

## اِصلاح۔ نکات زکوٰۃ

اِصلاح (ماہوار) | ایڈیٹر جناب مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب نگرامی ندوی۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۸، ضخامت ۴۰ صفحات، کتابت وطباعت اور کاغذ متوسط قیمت سالانہ تین روپیہ مقام اشاعت بادشاہ باغ، لکھنؤ۔

یہ ایک دینی تبلیغی اصلاحی ماہوار رسالہ ہے جو مولانا سید سلیمان ندوی اور جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کی زیرنگرانی نکلنا شروع ہوا ہے۔ ایک ہونہار ندوی مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب نگرامی اس کے ایڈیٹر ہیں۔

زیرنظر نمبر اس کا پہلا نمبر ہے۔ اس میں علاوہ شذرات کے کل چھ مضامین ہیں۔ پہلا مضمون ارادۂ اصلاح کے عنوان سے جناب مولانا عبدالماجد نے لکھا ہے اور بہت خوب لکھا ہے۔ دوسرا مضمون مولوی شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی نے انکار حدیث پر لکھا ہے۔ یہ مضمون رسالہ معارف میں بھی باقساط شائع ہوچکا ہے۔ تیسرا مضمون "اسلام میں عبد اور معبود کا رشتہ" خود جناب ایڈیٹر صاحب کا ہے۔ پھر "حدیث دلکش" ایک دلکش مضمون جناب احسن نگرامی نے ارقام فرمایا ہے۔ اس کے بعد منقولات اور قبول اسلام کی خبریں ہیں۔ غرض رسالے میں جتنے مضامین ہیں سب مقصد تبلیغ و اصلاح کے حامل ہیں۔ اور متانت سے لکھے گئے ہیں۔ آج کل مسلمانوں میں جیسی کچھ مذہبی اور معاشرتی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں نیز چند مغرب زدہ نیم تعلیم یافتہ اور برخود غلط حضرات نے مذہب خصوصاً اسلام کے خلاف جو جاہلانہ حملے شروع کردیے ہیں وہ ایک مستقل فتنہ ہیں جن کے سدباب کی ابھی سے ضرورت ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ایک ندوی نوجوان نے اس ضرورت کو محسوس کیا۔ ہم انھیں اس مبارک اقدام پر مبارکباد دیتے ہیں اور ہمیں توقع ہے کہ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کی نگرانی میں رسالہ دن دونی ترقی کرے گا۔

---

نکات زکوٰۃ | از مولانا احمد ایم۔ اے صدر ریاض توحید دہلی۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۳۲ صفحات، کاغذ

کتابت وطباعت معمولی۔

نواب گنج دہلی میں ریاض توحید کے نام سے ایک انجمن قائم ہوئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ احیائے سنت کے لئے نہایت خاموشی سے کام کیا جائے۔ اس کے لئے انجمن کا موجودہ پروگرام یہ ہے کہ ایسے چھوٹے چھوٹے اور مختصر رسالے شائع کر کے عام مسلمانوں میں مفت تقسیم کئے جائیں جن میں اسلامی مسائل کو صحیح روشنی میں پیش کیا جائے۔ اس سے پہلے دو رسالے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ تیسرا رسالہ ہے جس میں زکوٰۃ کے متعلق تمام مسائل آسان زبان میں جمع کر دئے گئے ہیں۔ اس رسالے کی یا اس انجمن کے دوسرے رسالوں کی قیمت کچھ نہیں رکھی گئی ہے بلکہ جو صاحب بیرنگ منگوانا چاہیں انھیں بیرنگ بھیج دئے جاتے ہیں ورنہ ڈاک کے ٹکٹ بھیجنے پڑتے ہیں۔

---

# دنیا کی رفتار

## ہندوستان

جاپان اور ہندوستان | جاپان نے ہندوستان کے بازاروں میں اپنا سستا مال بھیج بھیج کر ہندوستانی اور انگریزی صنعت کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کے تدارک کی تدبیریں ہو رہی ہیں۔ جاپانی کپڑے پر محاصل درآمد بہت بڑھا دئے گئے ہیں لیکن اُدھر جاپان نے بھی ہندوستانی روئی کی خریداری بند کر دی ہے۔ اس معاشی لڑائی کو سمجھوتے سے طے کرنے کی فکر بھی کی جا رہی ہے۔ لندن میں، جہاں ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہوا کرتا ہے، جاپانی اور انگریز نمائندوں میں بات چیت ہو رہی ہے اور خیال ہے کہ عنقریب حکومت ہند سے بھی براہ راست جاپان گفتگو شروع کرے گا۔

ذیل کے اعداد سے ہندوستان اور جاپان کے معاشی تعلقات کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے گا۔

ہندوستان سے جو مال باہر جاتا ہے اس میں سے ۱۹۳۱-۳۲ء میں کوئی ۹ فی صدی جاپان نے خریدا تھا۔ اس سال میں جاپان نے ۱۱ کروڑ روپیہ کی تو روئی ہندوستان سے خریدی تھی یعنی ہندوستان سے جتنی روئی باہر گئی اس میں تقریباً آدھی کی کھپت جاپان میں ہوئی۔ پھر ہندوستان کا خام لوہا کوئی ۶۶ لاکھ کا جاپان نے خریدا یعنی کل برآمد کا نصف۔ جاپان میں جتنا رنگا ہوا چمڑا باہر سے آتا ہے اس میں ۸۰ فیصدی ہندوستان کا ہوتا ہے۔ تلہن کی جاپانی درآمد میں البتہ ہندوستان کا حصہ بہت ہی کم ہے۔ جاپان کوئی ڈیڑھ کروڑ ین قیمت کا تلہن ہر سال خریدتا ہے جس میں سے ہندوستان سے ۸۰ لاکھ ین سے بھی کم کا مال جاتا ہے۔ ان سب چیزوں کی کھپت ابھی جاپان میں بہت کچھ ہو سکتی ہے۔

دوسری طرف جاپانی مال کے لئے ہندوستان کی منڈی بہت اہم ہے۔ ذیل میں جاپانی کپڑے کی درآمد کے اعداد درج کئے جاتے ہیں:۔

| سنہ | درآمد چین میں (مربع گز) | درآمد ہندوستان میں (مربع گز) |
|---|---|---|
| ۱۹۳۰ | ۵۵۲ ملین | ۳۷۴ ملین |
| ۱۹۳۱ | ۳۲۴ " | ۳۶۰ " |
| ۱۹۳۲ | ۲۸۹ " | ۵۹۲ " |

ہندی۔ جاپانی تجارت کے سلسلے میں ایک بات اور پیش نظر رکھنی چاہئے اور وہ یہ کہ پچھلے کئی سال سے جاپان برابر ہندوستانی مال کی خریداری کم کر رہا ہے اور اپنا صنعتی مال زیادہ بھیج رہا ہے جیسا کہ ذیل کے اعداد سے واضح ہوگا۔

| | سنہ ۳۰ء | سنہ ۳۱ء | سنہ ۳۲ء |
|---|---|---|---|
| جاپان کی برآمد ہندوستان کو | ۱۲۹ ملین ین | ۱۰۰ ملین ین | ۱۹۲ ملین ین |
| جاپان میں درآمد ہندوستان سے | ۱۸۰ " | ۱۳۳ " | ۱۱۷ " |

اگر جاپان اور ہندوستان میں کوئی تجارتی معاہدہ ہو تو درآمد و برآمد میں کسی مقررہ نسبت کی ضمانت ہونی ضروری ہے ورنہ جاپان ہمارا مال نہ لے گا اور اپنی سستی مصنوعات سے ہماری نئی صنعتوں کو ختم کر دے گا۔

---

انتقال عدن | حکومت ہند کے محکمۂ سیاسیات نے حال میں ایک مراسلہ شائع کیا ہے اور اس میں وہ دلائل پیش کئے ہیں جن کی وجہ سے حکومت برطانیہ کے نزدیک عدن کا نظم و نسق حکومت ہند سے لے کر برطانوی محکمۂ نوآبادیات کے سپرد کر دینا چاہئے۔ ہمارے محکمۂ سیاسیات نے اس کے ساتھ حکومت ہند کی رائے شائع نہیں کی جس سے معلوم ہوتا کہ اس معاملے میں ہماری حکومت برطانوی خیال کی موافقت کرے گی یا مخالفت غالباً اس کی ضرورت اس لئے نہیں سمجھی گئی کہ اپنے اوپر رائے کی ذمہ داری لئے بغیر معاملے کو مجلس قانون ساز کے آیندہ اجلاس میں پیش کر دیا جائے گا کہ یہ مجلس ہی ہندوستانی "رائے عامہ" کی "ترجمان" ہے۔ اس مجلس کے بہت سے با اثر رکن ملک کے آئندہ دستور اساسی کی ترتیب میں مصروف ہیں غالباً وہ لندن سے واپس نہ ہوسکیں گے اور یہ مجلس آسانی سے فیصلہ کر دے گی کہ عدن محکمۂ نوآبادیات

کے سپرد کر دیا جائے، پھر کسی کو یہ کہنے کی مجال نہ ہوگی کہ ہندوستان کی رائے عامہ کے خلاف ایسا کیا گیا۔

عدن پر انگریزی قبضہ ۱۸۳۹ء میں ہوا۔ ۱۸۳۶ء میں ایک انگریزی جہاز عدن کے قریب تباہ ہو گیا تھا۔ اس کے ملاحوں اور مسافروں کے ساتھ بندرگاہ کے باشندوں نے کچھ بدسلوکی کی۔ اس پر حکومت بمبئی نے سلطان لحج سے جو حکمراں تھا جواب طلب کیا۔ سلطان نے تلافی مافات کا وعدہ کیا اور ساتھ ہی یہ پیام بھیجا کہ اگر تم عدن خریدنا چاہتے ہو تو میں بیچتا ہوں۔ لیکن جب ایک انگریز افسر بیعنامے کی تکمیل کے لئے وہاں پہنچا تو سلطان کے بیٹے نے بیچنے سے انکار کر دیا۔ اس 'گستاخی' کی سزا میں ایک بری و بحری مہم عدن بھیجی گئی اور عدن کو بتاریخ ۱۶ جنوری ۱۸۳۹ء برطانوی ہند سے ملحق کر دیا گیا! اس الحاق کی وجہ سے ہندوستانی تاجروں نے عدن میں قدم جمائے۔ آج ان کے ہاتھ میں عدن کی بہت کچھ املاک ہے، نمک سازی میں ان کا خاصا دخل ہے اور انھوں نے ہر طرح عدن کی ترقی میں مدد دی ہے۔ برطانوی محکمۂ نوآبادیات کے ماتحت علاقوں میں معمولاً جو سلوک ہندوستانیوں کے ساتھ ہوتا ہے وہ ایسا نہیں ہے کہ ہندوستانی آسانی سے وہاں جا کر بسیں۔ اگر ہندوستانی تاجروں کو یہ گمان ہوتا کہ عدن بھی سو سال بعد محکمۂ نوآبادیات کے ماتحت آ جائے گا تو شاید وہ عدن کی تجارت میں اتنا حصہ نہ لیتے۔ زیادہ تر ان ہندوستانی تاجروں کا اثر ہے کہ عدن کی تجارت نے اتنا فروغ پایا۔ ۱۸۳۹ء میں عدن کی آبادی ایک ہزار سے بھی کم تھی۔ آج ۴۵ ہزار سے اوپر ہے۔ مالگذاری ۴۰ لاکھ روپیہ سے اوپر ہے۔ سال میں کوئی ۱۲۰۰ جہاز یہاں سے گذرتے ہیں۔

انتقال عدن کی یہ تجویز کوئی بارہ تیرہ برس پرانی ہے۔ ابتدا اس کی یوں ہوئی کہ عدن کی مجلس تجار نے سنہ ۱۹۲۰ء میں ایک قرارداد منظور کی کہ عدن محکمۂ نوآبادیات کو منتقل کر دیا جائے۔ اس مجلس کے رکن عرب اور ہندوستانی تاجر بھی ہیں۔ لیکن یہ تجویز بلا اطلاع صرف یورپی تاجروں نے منظور کر کے شائع کر دی۔ اس پر کوئی ساڑھے تین سو عرب اور ہندی تاجروں کے دستخط سے ایک اعلان شائع ہوا کہ ہم اس انتقال کے سخت مخالف ہیں۔ اور وائسرائے ہند سے درخواست کی کہ وہ اس معاملے میں ہندوستانیوں کی مدد فرمائیں۔ اس درخواست کی تائید ہندوستان کی رائے عامہ نے بھی زور کے ساتھ کی۔ معاملہ بظاہر رفع

دفع ہوگیا مگر مارچ سنہ ۲۷ء میں کمانڈر انچیف نے مجلس قانون ساز میں اعلان کیا کہ یکم اپریل سے عدن کے فوجی اور سیاسی معاملات برطانوی حکومت نے اپنے ذمہ لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن چونکہ عدن میں زیادہ تر ہماری ہندوستانی رعایا آباد ہے اس لئے بلدیۂ عدن حکومت ہند کے ماتحت رہے گی۔ اس فیصلے کے اعلان سے پہلے مجلس قانون ساز کو رائے دینے کا موقع بھی نہیں دیا گیا۔

نومبر سنہ ۲۱ء میں یہ انتظام بھی حکومت بمبئی سے حکومت ہند کو منتقل کر دیا گیا اور اب تجویز یہ ہے کہ یہ بھی محکمۂ نوآبادیات کے سپرد کر دیا جائے۔

تجارتی اہمیت کے علاوہ عدن ایک بحری اہمیت بھی رکھتا ہے۔ شاید آنے والی وفاقی حکومت ہند پر اس اہم بحری ذمہ داری کا بوجھ ڈالنا قرین مصلحت نہیں سمجھا گیا ہے۔

## ممالک غیر

**معاشی کانفرنس** معاشی زندگی میں مدوجزر تو ہمیشہ ہی ہوتا رہا ہے لیکن سرمایہ داری کے رواج سے پہلے اس کی وجہ اتفاقی حوادث ہوا کرتے تھے مثلاً وباؤں سے آبادی کا کم ہو جانا، قحط یا جنگ سے معاشی زندگی کا شیرازہ بکھر جانا وغیرہ۔ لیکن سرمایہ داری نظام کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کاروبار کا یہ اتار چڑھاؤ اس کا خاصہ ہے اور کم و بیش ایک ہی مدت میں مرفہ الحالی سے لے کر کساد بازاری تک مراحل طے کرتا رہتا ہے۔

آج کل دنیا کی معاشی زندگی جس تکلیف دہ دور سے گذر رہی اور جس کی وجہ سے بے شمار انسان بے روزگار پڑے سڑ رہے ہیں اس سرمایہ داری کی اس مخصوص صفت کا اثر بھی ہے اور کچھ ایسے حوادث و واقعات کا بھی جو اس نظام سے خاص طور پر متعلق نہیں ہیں اسی وجہ سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ جس طرح سرمایہ داری نظام میں کساد بازاری کا زمانہ خود بخود گذر جاتا ہے اور اس کے بعد مرفہ الحالی کا دور آتا ہے اس طرح اس مرتبہ بھی اس مصیبت کا خاتمہ خود بخود ہو جائے گا۔ چنانچہ ساٹھ سے اوپر ممالک کے نمائندے

اس مصیبت سے چھٹکارے کی تدابیر پر غور کرنے کے لئے لندن میں جمع ہیں اور اس اجتماع کی قراردادوں پر ساری دنیا کی نظریں لگی ہوئی ہیں۔ اس کانفرنس کی کارروائی کو قابل فہم بنانے کے لئے ہم ذیل میں ان وجوہ و اسباب کا اجمالی ذکر کرتے ہیں جنھوں نے موجودہ کساد بازاری پیدا کی ہے کہ انھیں کو رفع کر کے اس کا خاتمہ ممکن ہے۔

اس کی ایک بڑی وجہ تو یہ ہے کہ جنگ کے بعد دنیا میں دولت پیدا بہت ہوئی اور اس کو استعمال کرنے والے کم ہو گئے! دولت آفرینی بڑھنے کی دو خاص وجوہ ہیں۔ ایک تو صناعت و زراعت میں عقلی طریق کار کا رواج عام ہوا تاکہ زیادہ سے زیادہ اور سستا سے سستا پیدا کر کے دنیا کے باشندوں کیلئے ڈھیر وہ چیزیں فراہم کی جائیں جن کے لئے وہ جنگ کے زمانے میں ترس ترس گئے تھے۔ جو کارخانے توپیں اور بندوقیں بناتے تھے انھوں نے صنعت کے لئے ملیں اور زراعت کے لئے ٹریکٹر بنا بنا کر معاشی زندگی کے طریق کار میں (خصوصاً زراعت میں) ایک انقلاب سا پیدا کر دیا اور دنیا میں اکثر چیزوں کے ذخائر میں بہت اضافہ ہو گیا۔

دولت آفرینی میں اضافے کی دوسری وجہ یہ ہوئی کہ جنگ کے بعد ہر ملک نے کافی بالذات ہونے کی کوشش کی۔ ہر ایک نے اپنی اپنی صنعت اور اپنی اپنی زراعت کو ترقی دینے اور دوسری ممالک کی مدد سے بالکل مستغنی ہو جانے کی ٹھانی۔ جو چیزیں آسانی سے ملک میں پیدا نہ بھی ہو سکتی ہوں ان کے پیدا کرنے کی بھی کوشش شروع ہوئی۔

عام بات ہے کہ اگر بازار میں چیزوں کی رسد بڑھ جائے اور گاہک اتنے ہی رہیں اور ان کی مانگ بھی نہ بڑھے تو قیمتیں گر جاتی ہیں۔ اور اگر گاہک بھی کم ہو جائیں یا ان کی مانگ گھٹ جائے تو قیمت میں بہت زیادہ کمی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس مرتبہ یہی ہوا۔ ادھر دولت آفرینی بڑھنے سے رسد بڑھی۔ ادھر ایک تو شدید احساس قومیت نے ہر ملک میں "سودیشی" مال کو ترجیح دینے کی تحریک پیدا کی، دوسرے حکومتوں نے دیسی صنعتوں کی تامین کے لئے محاصل درآمد بڑھا کر بین الاقوامی تجارت میں رکاوٹیں ڈالیں، دوسرے جنگ میں ہارے ہوئے ممالک تاوان جنگ کے بار سے دبے ہوئے، قرض مانگیں تو قرض نہ ملے،

بین الاقوامی منڈی میں خریداری سے قاصر ہوگئے! چوتھے مشرقی ممالک خصوصاً چین کے لوگوں کی قوت خرید چاندی کی قیمت گھٹ جانے سے بہت کم ہوگئی۔ غرض متعدد اسباب نے رسد کی افزونی کے ساتھ طلب کو گھٹایا اور اس طرح قیمتوں کو بہت گرا دیا۔

کساد بازاری کی دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ دنیا میں زرِ رائج کی مقدار کم ہوگئی۔ یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ اگر کسی ملک میں روپیہ کی مقدار بہت بڑھا دی جائے اور بازار میں چیزیں اتنی ہی رہیں جتنی پہلے تھیں تو چیزوں کی قیمت بڑھ جائے گی۔ اس کے برعکس اگر چیزیں اتنی ہی رہیں بلکہ بڑھ جائیں اور روپیہ کم ہو جائے تو قیمتیں گھٹیں گی اور یہی ہوا۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ جنگ کے بعد دنیا میں دولت آفرینی یکایک بڑھی لیکن دنیا کے سونے کی بڑی مقدار صرف دو ملکوں یعنی امریکہ اور فرانس کے تصرف میں آگئی۔ اسی زمانے میں دنیا کے اکثر ممالک نے سونے کو اپنے زرِ رائج کا معیار بنا لیا۔ لہٰذا سونے کی مقدار کم ہونے کی وجہ سے یہ اپنے یہاں زرِ رائج کی مقدار نہ بڑھا سکے۔ یعنی چیزیں زیادہ ہوئیں، زر کم، لازم تھا کہ قیمتیں گھٹیں۔

موجودہ معاشی انتشار کی تیسری اہم وجہ یہ ہے کہ جنگ میں دنیا کی جو دولت دھواں بن بن کر اڑی اس کا بوجھ موجودہ نسل پر قرضۂ جنگ کی شکل میں ہے اور دولت آفریں طبقہ جو مذکورہ بالا وجوہ سے اپنے مال کی قیمت یوں بھی حاصل نہیں کر پاتا ان قرضوں کا سود ادا کرنے کے لئے ٹیکس دیتے دیتے مرا جاتا ہے اور جب اشیاء کی قیمت گھٹتی جاتی ہے ان ٹیکسوں کی وجہ سے لاگت بڑھ رہی ہے اور کاروبار کو ناممکن بنائے دیتی ہے۔

چنانچہ معاشی کانفرنس کے سامنے سب سے اہم مسائل یہ ہیں کہ (۱) قیمتیں کس طرح بڑھائی جائیں کہ کاروبار ذرا پنپے اور معیشت کے تن مردہ میں جان پڑے (۲) اس غرض کے لئے ملکوں نے جو دیواریں محاصل کی اپنے چاروں طرف اٹھا رکھی ہیں وہ کس طرح مسمار کی جائیں کہ بین الاقوامی تجارت کا سلسلہ ذرا چل نکلے (۳) دنیا میں زرِ رائج کی مقدار کس طرح بڑھائی جائے اور مختلف ملکوں کے زر میں شرح مبادلہ کس طرح مقرر ہو کہ روز کے اتار چڑھاؤ سے تجارتی کاروبار میں انتشار اور عدم تیقن کم ہو۔ (۴) جنگی

قرضوں کا خاتمہ کرکے معاشی زندگی کی گردن میں جو یہ سنگ گراں لٹک رہا ہے اسے کس طرح ہٹایا جائے۔

اگر سرمایہ داری نظام کی زندگی کے کچھ دن باقی ہیں تو یہ کانفرنس ان مسائل کا حل نکالنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ غالباً جنگی قرضے کالعدم کر دئے جائیں گے، سونے کے ساتھ ساتھ چاندی سے کم سے کم محدود طریقے پر معیار زر کا کام لیا جانے لگے گا اور اس کی قیمت بڑھے گی۔ اس کی وجہ سے زر و اعتبار میں اضافہ ممکن ہوگا اور قیمتیں چڑھیں گی۔ محاصل درآمد کا آہنی نظام یک قلم تو مسترد نہ ہو سکے گا لیکن شرح محاصل میں بہت کچھ کمی ہو جائے گی۔

لیکن اگر قوم پرستی اور خود غرضی کی فتح ہوئی اور کانفرنس میں یہ مسائل طے نہ ہو پائے تو ایک معاشی جنگ ہوگی جس میں ہر ملک دوسرے کا دشمن ہوگا، محاصل کی دیواریں اور اونچی کی جائیں گی، ہر ملک کاغذی زر چھاپ چھاپ کر اپنے زر رائج کی قیمت گھٹائے گا یعنی ملک کے اندر اشیاء کی قیمت بڑھے گی اور پردیسیوں کے لئے شرح مبادلہ کے موافق ہونے کی وجہ سے مال کی خریداری میں فائدہ ہوگا۔ لیکن سب ملک جب یہی کریں گے تو ان کا باہمی مقابلہ سارے نظام معاشی کو درہم برہم کر دے گا۔ اور چونکہ اس وقت دنیا کے سامنے معاشی زندگی کا ایک دوسرا نظام یعنی اشتراکی نظام کم سے کم تجربے کے طور پر آ چکا ہے اس لئے یہ ناکامی ممکن ہے کہ عالمگیر انقلاب کا پیش خیمہ بن جائے۔ یہی خطرہ شاید اس معاشی کانفرنس کو کامیاب کر دے۔

---

**روس اور سرمایہ دار ممالک** ادھر لندن میں دنیا کے سرمایہ دار ممالک اپنے نظام معاشی کی گتھیوں کو سلجھانے میں مصروف ہیں، ادھر روس جس نے اشتراکی معیشت کا عظیم الشان تجربہ شروع کر رکھا ہے کساد بازاری اور قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کے پھیرے سے تو بالکل مستغنی ہے لیکن خود اپنے تجربے کی مشکلات سے دوچار ہے۔ سرمایہ داری اور اشتراکی معاشی نظاموں کی مشکلات کی نوعیت ہر چند کہ بالکل مختلف ہے لیکن ہیں دونوں اس وقت سخت مصیبت میں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ لندن کی معاشی کانفرنس میں ان سطروں کے لکھتے وقت تک سرمایہ دار ملکوں میں سمجھوتے کے بہت کم آثار ہیں لیکن یہ خبر آ چکی ہے کہ روس اور برطانیہ میں تجارتی معاہدہ عنقریب ہونے والا ہے اور شاید یہ خبر بھی جلد سننے میں آئے کہ روس کی موجودہ حکومت کو بڑی لیت و لعل کے بعد امریکہ نے بالآخر

تسلیم کر ہی لیا!

انگلستان اور روس میں تجارتی مزاحمت کی خبر اس لئے اور تعجب خیز ہے کہ ابھی حال میں وہاں ایک انگریزکمپنی کے ۶ ذمہ دار ملازمین پر جو مقدمہ چلا تھا اور اس پر انگلستان میں جس غیض وغضب کا اظہار کیا گیا تھا اسے لوگ ابھی مشکل سے بھولے ہوں گے۔ ناظرین کو یہ بھی یاد ہوگا کہ موجودہ انگریزی حکومت روس سے تجارتی معاملے کو اٹاوا کے معاہدے کے منافی بھی قرار دے چکی ہے اور اسی وجہ سے جب روسی۔ برطانی تجارتی معاہدہ ۱۶ ار اپریل کو ختم ہوا تو بظاہر اس کی تجدید کی کوئی امید نہ تھی۔

روس انگریزوں کی اس بے رخی پر ناخوش تھا ہی، اسے یہ شبہ بھی تھا جس کا اظہار روسی اخبارات میں بلاتکلف ہوتا رہا ہے کہ انگریز جاپانیوں کو اکسا اکسا کر مشرق بعید میں روسی اثر کو کم کرنے کی تدبیریں کر رہے ہیں۔

ادھر انگریزوں کو وہی پرانی شکایات ہیں کہ روس ہمارے مقبوضات میں، خصوصاً ہندوستان میں اپنا تبلیغی کام نہیں روکتا۔ دوسرے یہ کہ انقلاب سے پہلے روس پر جو قرضہ تھا اسے تسلیم نہیں کرتا، اور جو املاک انقلاب کے زمانے میں اور انقلاب کے بعد تلف ہوئی اس کا معاوضہ نہیں دیتا۔ ان شکایتوں کے علاوہ ایک اور قضیہ لینا کی سونے کی کان کا بھی ہے کہ ایک برطانوی شرکت تجارتی کو اس کان کا ٹھیکہ دیا گیا تھا پھر آپ ہی آپ روسی حکومت نے اس معاہدے کو منسوخ کر دیا۔ ہرجانے کا تصفیہ ثالث پر چھوڑا گیا۔ ثالث نے جب ایک کروڑ تیس لاکھ پونڈ ہرجانہ تجویز کیا تو روسی حکومت نے اس فیصلے کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا اور بہت گفت وشنید کے بعد اپنی طرف سے آٹھ لاکھ پونڈ پیش کیے جسے ظاہر ہے انگریزوں نے قبول نہیں کیا۔

لیکن باوجود ان اختلافات کے دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ انگلستان اس کسادبازاری کے عالم میں اپنے ہاتھ سے اتنی بڑی منڈی کس طرح جانے دے اور روس جو جلد سے جلد اپنے ملک میں بڑے صنعتی کارخانوں سے دولت آفرینی کے رائج طریقے کو یکسر بدلنے کے درپے ہے انگلستان کی بنی ہوئی کلوں سے اپنے کو کیسے مستغنی بنا سکتا ہے؟ اور باوجود عقیدۂ معاشی کے بنیادی اختلافات کے اگر ان دونوں میں سمجھوتہ ہو جائے اور سرمایہ دار ممالک آپس میں لڑتے جھگڑتے رہیں تو کیا عجب ہے۔

انگلستان کی طرح امریکہ بھی اب روس سے سمجھوتہ کرنے کی فکر میں ہے۔ اگرچہ اب تک تو امریکہ کسی

طرح روس کی حکومت کو بھی باضابطہ تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ پریسیڈنٹ ولسن نے روسی حکومت کو تسلیم کرنے کے لئے تین شرطیں پیش کی تھیں۔ اول یہ کہ روس اپنے تمام سابقہ قرضے کو تسلیم کرے، دوسرے یہ کہ انقلاب میں جو امریکن املاک تلف ہوئی ہے اس کا تاوان ادا کرے، تیسرے یہ کہ امریکہ اور اس کے مقبوضات میں اپنے خیالات کی نشر و تبلیغ سے باز رہے۔ انھیں شرائط کی تکرار پریسیڈنٹ ہارڈنگ نے کی۔ انھیں کو کولج اور ہوورنے دہرایا۔ لیکن روس نے ذرا توجہ نہ کی۔ اب خود بخود امریکہ میں ایک تحریک ہے کہ روس کی حکومت کو تسلیم کرلیا جائے۔ موجودہ صدر نے اپنی انتخاب والی تقریروں میں برابر اس خیال کی تائید کی اور حال میں اکثر کاروباری حلقوں میں اس کی حمایت ہوئی ہے اور سینٹ کے سامنے اس غرض سے ایک تجویز بھی مشہور سنیٹر بورا نے پیش کردی ہے۔ واقعات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ مزدوروں کی اس اشتراکی حکومت کو تسلیم کرنے کے خلاف امریکہ میں جو کچھ کوشش کی جارہی ہے وہ سب وہاں کی مزدوروں کی جماعت کی طرف سے ہے! نظری عقاید کے مقابلے میں معاشی اغراض کی قوت کا کیسا عجیب مظاہرہ ہے۔

---

# شذرات

شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب آخر جولائی میں حیدرآباد سے واپس تشریف لائے۔ موصوف کے ڈیڑھ مہینے کے قیام میں "ہمدردان جامعہ" کی تحریک کے متعلق بہت کچھ کام ہوگیا۔ حیدرآباد میں "حلقۂ ہمدردان جامعہ" پہلے سے موجود تھا۔ اب اس کے ارکین کی تعداد میں اضافہ ہوگیا ہے اور چندے کی وصولی کا معقول انتظام کر دیا گیا ہے۔ اگست کے آخر میں شیخ الجامعہ صاحب پھر حیدرآباد تشریف لے جائیں گے اس لئے کہ وہاں ابھی بہت کچھ کام باقی ہے۔ حیدرآباد اس زمانے میں ہندوستان کے مسلمانوں کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ تعلیم یافتہ روشن خیال مسلمان جتنی بڑی تعداد میں وہاں موجود ہیں کسی اور شہر میں نہیں اس کے علاوہ جامعہ ملیہ تعلیم کے جن اصولوں کو مدنظر رکھ کر قائم کی گئی ہے اس کے قدردان وہاں کثرت سے ہیں ورنہ برطانوی ہندوستان میں تو ابھی تک لوگوں کو اسی بات کا سمجھانا دشوار ہے کہ اعلیٰ تعلیم مادری زبان میں ہونا چاہئے اور ہوسکتی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ دہلی کے بعد ہمدردان جامعہ کا سب سے بڑا حلقہ حیدرآباد میں بن جائے گا اور علاوہ سلطنت آصفیہ کی امداد کے جمہور کی طرف سے ہمیں معقول مالی اور اخلاقی مدد حاصل ہوگی۔ جامعہ ملیہ کی روح و رواں ملت اسلامی کی توفیق و تائید ہے۔ اسلامی حکومتوں کی امداد خواہ کتنی ہی گراں قدر کیوں نہ ہو جب تک ان کی رعایا کی مدد اس کے ساتھ شامل نہ ہو ہم اسے ملت کی تائید نہیں سمجھ سکتے اور اس سے مطمئن نہیں ہوسکتے۔

---

اکثر جامعہ ملیہ کے سچے ہمدردوں کی طرف سے پوچھا جاتا ہے اور کبھی کبھی خود کارکنان جامعہ کے دل میں یہ سوال اٹھا کرتا ہے کہ کیا ملک کی عملی سیاست سے الگ ہو کر ہمارے ادارے نے اپنے فرائض کو ترک کر دیا ہے؟ اس میں تو کسی کو بھی شبہہ نہیں کہ جامعہ ملیہ کا اصل مقصد یہ ہے کہ غور و فکر، مشاہدے اور تجربے کے بعد مسلمانوں کی قومی تعلیم کا ایک نظام ترتیب دے اور جہاں تک ممکن ہو اسے عمل میں لا کر ایک نمونہ قائم کر دے جس کی تقلید میں حسب ضرورت اور تعلیم گاہیں کھولی جاسکیں اور سارے ملک میں مسلمانوں

کی تعلیم قومی اور ملی مصالح کے مطابق ہونے لگے۔ اگر ایک چھوٹی سی جماعت اتنا بڑا کام اپنے ذمے لے تو اسے اس میں اپنا پورا وقت، پوری توجہ، پوری قوت صرف کرنا پڑے گی تب کہیں مدتوں میں کچھ نتیجہ نکلے گا۔ اسی طرح ہندوستان کی موجودہ سیاست خصوصاً سیاسی آزادی کی تحریک اتنی عظیم الشان چیز ہے کہ اپنے پرستاروں سے فرصت کی چند گھڑیاں نہیں بلکہ زندگی کی کل مدت اپنی خدمت کے لئے طلب کرتی ہے۔ یہ محض ناممکن ہے کہ ایک جماعت ان دونوں کاموں کا بوجھ اٹھا سکے۔

... ... ... ...

جامعہ ملیہ کے کارکنوں کی تعداد تیس سے زیادہ نہیں۔ ان تیس آدمیوں کے ذمے جتنے کام ہیں ان کی تفصیل ہم ذیل میں درج کرتے ہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ دوسری تعلیم گاہوں میں ان میں سے ہر ایک کام کے لئے کتنے اشخاص کی ضرورت ہوتی ہے۔

| کام | |
|---|---|
| کنڈرگارٹن کی تعلیم مکتب کے دو درجوں میں | اس کام کے لئے کم از کم ۲ اشخاص کی ضرورت ہے |
| پرائمری اسکول کے چھ درجوں کی تعلیم | 〃 〃 〃 ۱۰ 〃 〃 〃 |
| ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے چھ درجوں کی تعلیم | 〃 〃 〃 ۱۲ 〃 〃 〃 |
| کالج کی معمولی اور امتیازی ڈگری کی تعلیم | 〃 〃 〃 ۱۲ 〃 〃 〃 |
| درجہ ہائے خاص کی تعلیم | 〃 〃 〃 ۴ 〃 〃 〃 |
| اسکول کے کھیل اور ورزش کی نگرانی | 〃 〃 〃 ۱ 〃 〃 〃 |
| کالج کے کھیل اور ورزش کی نگرانی | 〃 〃 〃 ۱ 〃 〃 〃 |
| چار اقامت خانوں کی نگرانی (علاوہ ان نگرانوں کے جو اپنا زائد وقت اس کام میں صرف کرتے ہیں) | 〃 〃 〃 ۱ 〃 〃 〃 |
| تعلیم بالغان مدرسہ شبینہ وغیرہ کی نگرانی (علاوہ آنریری مدرسوں کے) | 〃 〃 〃 ۱ 〃 〃 〃 |
| دفتر ہمدردان جامعہ کی نگرانی (علاوہ کلرکوں کے) | 〃 〃 〃 ۱ 〃 〃 〃 |

| | | | |
|---|---|---|---|
| مسجل کا کام (علاوہ کلرکوں کے) | اس کام کے لئے کم از کم | ۱ | شخص کی ضرورت ہے |
| صدر محاسب کا کام ( " " " ) | " " " | ۱ | " " " |
| اسکول اور کالج کے پراکٹر کا کام | " " " | ۱ | " " " |
| رسالۂ جامعہ کی ادارت | " " " | ۱ | " " " |
| پیام تعلیم کی ادارت | " " " | ۱ | " " " |
| اردو اکادمی کی نگرانی | " " " | ۱ | " " " |
| مکتبہ جامعہ ملیہ کی نگرانی | " " " | ۲ | " " " |
| مطبع جامعہ ملیہ کی نگرانی | " " " | ۱ | " " " |
| شیخ الجامعہ کا کام | " " " | ۱ | " " " |
| صدر مدرس کا کام | " " " | ۱ | " " " |
| سکریٹری مجلس تعلیم ملی کا کام | " " " | ۱ | " " " |

اس طرح جامعہ ملیہ کے کل کاموں کو جو اس وقت ہو رہے ہیں اچھی طرح چلانے کے لئے ۵۰ اشخاص کی ضرورت ہے مگر صرف ۳۰ خدا کے بندوں نے یہ سارا بوجھ اپنے سر پر اٹھایا ہے یعنی اوسطاً ہر شخص دو آدمیوں کا کام کر رہا ہے۔ جو لوگ جامعہ کے اندرونی حالات سے واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کے اکثر ارکان پر مالی پریشانیوں وغیرہ کے علاوہ کام کا بار اتنا ہے جس کا برداشت کرنا ہر ایک کا کام نہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ اگر ان معدودے چند لوگوں میں سے دو ایک تھک کر بیمار ہو جاتے ہیں تو ان کا کام بھی باقی کارکنوں پر تقسیم ہو جاتا ہے اور سمند ناز پر ایک اور تازیانے کا کام دیتا ہے۔ گرمیوں میں دو مہینے کی تعطیل ہوتی ہے مگر اس سے بعض تو اپنے کام کی نوعیت کی وجہ سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے اور بعض اس زمانے میں کاسۂ گدائی لے کر چندے کے لئے نکل جاتے ہیں اور موسم کی گرم جوشی کے ساتھ ارباب دول کی سرد مہری کا لطف اٹھاتے ہیں۔

... ... ...

ان سطروں سے مراد نہ تو فریاد کرنا ہے اور نہ داد چاہنا بلکہ دوسروں کے اور اپنے دل سے اس

شبہے کو دور کرنا مقصود ہے کہ جامعہ ملیہ کے لوگ ملک کی سیاسی آزادی کی تحریک میں شرکت کرسکتے ہیں مگر نہیں کرتے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جامعہ کے لوگوں کے دل حب وطن اور حریت کے جوش سے معمور ہیں، ان میں سے بعض من چلے قومی خدمت کی راہ میں اپنی موجودہ قربانی کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ ذوق درد کے تقاضے سے ان آبلہ پاؤں کو رشک کی نظر سے دیکھتے ہیں جو سیاست کی پرخار راہ میں مستانہ وار قدم بڑھائے چلے جارہے ہیں، پھر بشری کمزوری کی وجہ سے ان کا دل یوں بھی معلمی کی روکھی پھیکی، خاموش، گمنام زندگی سے اکتا کر لیڈری کو ڈھونڈھتا ہے جس میں حرکت، جوش، ہیجان، عام شہرت، نقد عزت کے چٹخارے موجود ہیں۔ مگر مسلمانوں کی تعلیم کو سیدھی راہ پر لگانے کا کام انھیں اس قدر اہم معلوم ہوتا ہے کہ اسے ایک بار ہاتھ میں لینے کے بعد کسی طرح چھوڑ نہیں سکتے۔ وہ اپنے دل کو یہ کہہ کر تسکین دے لیتے ہیں کہ سیاست اور آزادی کی عملی تحریکوں کا دارومدار جن چیزوں پر ہے یعنی حب وطن، قومی غیرت، ملی حمیت، خدمت کا جذبہ، جفاکشی کی عادت یہ چیزیں تعلیم ہی کے ذریعے سے پیدا ہوتی ہیں اس لئے جو راہ انھوں نے اختیار کی ہے وہ کتنی ہی دور و دراز ہو لیکن آزادی کی منزل تک پہنچنے کی یقینی راہ ضرور ہے۔

... ... ...

آج ہر طرف سے یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی، معاشرتی غرض ہر قسم کے قومی اداروں کو ایسے کام کرنے والے نہیں ملتے جو باوجود علمی اور عملی قابلیت کے مال و دولت، جاہ و منصب، نام و نمود سے بے نیاز ہو کر قلیل معاوضے پر اپنی زندگی ان کی خدمت کے لئے وقف کردیں۔ اگر جامعہ ملیہ ایسے نوجوان معقول تعداد میں پیدا کردے تو یہ اس سے بدرجہا مفید ہے کہ اس کے تیس کارکن اپنے ستاون کاموں کے بوجھ کے علاوہ عملی سیاست کا پشتارہ بھی اپنی پیٹھ پر لادلیں۔ ہم نے مانا کہ آج سیاسی آزادی کی تحریک کو جانبازوں اور سرفروشوں کی شدید حاجت ہے مگر کم سے کم مسلمانوں کے اندر قومی تعلیم کو بٹہ مار کر کام کرنے والوں کی اس بھی بڑھ کر ضرورت ہے اس لئے ہم اپنے دوستوں کے اور خود اپنے دل کے شبہات اور اعتراضات کے جواب میں غالب کا ایک شعر پڑھ کر اس بحث کو ختم کرتے ہیں:۔

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے — رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کے لئے

# آپ کیا کر رہے ہیں

اگر اردو زبان کی ترقی سے آپ کو دلچسپی ہے تو ملاحظہ کیجئے کہ ہر طبقہ کے اہل الرائے خوشخط نستعلیق ٹائپ کے متعلق کیا مشورہ دیتے ہیں اور آپ بھی ہمارے ہمدست و ہم نوا ہو جیئے۔

۱ جناب نواب سالار جنگ بہادر، جاگیردار حیدر آباد دکن

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ کی جاں فشاں کوشش بار آور ہونے والی ہے

۲ جناب نواب سر اکبر حیدری معتمد خاص حضور نظام حیدر آباد دکن

مجھے خوشی ہوگی اگر مسٹر قریشی اور آپ کی کمپنی کی کوششوں کو مالی کامیابی حاصل ہو جائے گی

۳ جناب ڈاکٹر راس مسعود صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

میں اس کو باعث فخر خیال کرتا ہوں کہ آپکے کام میں ساتھ دوں۔

۴ جناب نواب سر مزمل اللہ خاں صاحب آف بھیکم پور

میں نہایت مسرت کے ساتھ سرپرستوں کے زمرہ میں شامل ہوتا ہوں۔

۵ جناب نواب محمد اسمعیل خاں صاحب خزانچی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

میں قریشی صاحب کے اس خیال سے کاملاً متفق ہوں کہ اس کام کے لئے ایک کمپنی بنائی جائے۔

۶ جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب ایم۔ ایل۔ اے

اردو زبان کی ترقی میں نستعلیق ٹائپ نہ ہونے کی وجہ سے بڑی سخت رکاوٹیں ہیں۔

۷ جناب سید سلیمان ندوی، صدر دار المصنفین اعظم گڈھ

میرے خیال میں آپ کی یہ ایجاد عالم اردو میں انقلاب پیدا کر دے گی۔

۸ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

اگر کوئی باہمت سوداگر اس کام میں روپیہ لگا دے تو یہ اردو زبان کی بڑی خدمت ہوگی۔

۹ آنریبل میاں سر فضل حسین صاحب
"میری خواہش ہے کہ آپ ہر طرح کامیاب ہوں۔"

۱۰۔ شوکت علی فہمی دہلی
"آپ کا ٹائپ اقتصادی حیثیت سے خوشنمائی کے اعتبار سے اور ہر لحاظ سے اردو پریس پر ایک بہت بڑا احسان ہے۔"

۱۱ جناب رشید احمد صدیقی صاحب ایم اے پروفیسر اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
"میں اپیل کرتا ہوں کہ اس مبارک تحریک میں جس کے ذریعہ اردو کی طباعت و اشاعت میں ایک انقلاب ہو جائے گا تمام متعلق اصحاب مسٹر قریشی کی فراخ دلی کے ساتھ امداد کریں۔"

۱۲ جناب ضیا احمد صاحب ایم اے پروفیسر فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
"مسٹر قریشی کی ایجاد بے حد مفید ہے اور اردو داں پبلک سے ہر قسم کی ہمت افزائی کی مستحق ہے۔"

۱۳۔ جناب ایم۔ ایم شریف صاحب مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
میں بڑے شوق کے ساتھ اس دن کا منتظر ہوں جب اردو کی اکثر مطبوعات ٹائپ میں چھپیں گی

۱۴ جناب پروفیسر فیروزالدین مراد بی اے، ایم ایس سی ایف آر ایس اے ایف پی ایس (لندن)
میں نے خوشخط نستعلیق ٹائپ فاونڈری لمیٹیڈ کا پروسپیکٹس بہت غور سے پڑھا ہے۔ اور بہت احتیاط کے ساتھ مسٹر قریشی کے ایجاد کیے ہوئے نستعلیق ٹائپ کے نمونوں کا امتحان کیا ہے اور مجھے پورا اطمینان ہو گیا ہے کہ یہ کمپنی بہت جلد نفع کمانے لگے گی۔ میں بڑی خوشی کے ساتھ اس دن کا منتظر ہوں جب میری مصنفہ کتابیں اس خوشخط نستعلیق ٹائپ میں چھپیں گی۔

۱۵ جناب پروفیسر عبدالستار صدیقی صاحب الہ آباد یونیورسٹی
"آپ کا تجویز کیا ہوا ٹائپ اُن سب نستعلیق ٹائپوں سے جو انیسویں صدی کے آغاز سے اب تک بنائے گئے ہیں۔ بہتر ہے"

۱۶ جناب خدا بخش صاحب ایرانی پروفیسر فارسی ایلفنسٹن کالج بمبئی۔
"اگر اس ٹائپ میں چھاپی جائیں تو ہماری زردشتی دینی کتابیں بہت وسیع اشاعت حاصل کرینگی
یہ ٹائپ یقیناً فارسی زبان کے ادب میں ایک نئی جان ڈال دے گا"

۱۷ جناب ٹی گنگ صاحب منیجر لینو ٹائپ کمپنی بمبئی
مسٹر قریشی! آپ کے ایجاد کئے ہوئے ٹائپ کو واقف کار اصحاب حیدر آباد دکن کے
سرکاری نستعلیق ٹائپ سے بہت زیادہ بہتر خیال کرتے ہیں۔

۱۸ جناب حاجی مقتدیٰ خاں صاحب شیروانی منیجر مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ
"سب سے زیادہ شہرت حیدرآباد (دکن) کے نمونہ نے حاصل کی مگر میں دیکھتا ہوں کہ جو کامیابی
مسٹر قریشی کے نمونوں سے نمایاں ہوتی ہے وہ دیکھنے میں نہیں آئی۔ گورنمنٹ اور ریاستوں
اور تمام علم دوست افراد اور جماعتوں کو اس کی ہر ممکن ہمت افزائی کرنی چاہیئے"

۱۹ خواجہ حسن نظامی صاحب
مسٹر قریشی کا ٹائپ ہر لحاظ سے کامیاب ہے۔

۲۰ جناب ڈاکٹر ہادی حسن صدر شعبہ فارسی مسلم یونیورسٹی علی گڑہ
مجھے اس میں شک نہیں ہے کہ آئندہ تمام فارسی اور اردو کتابیں اور رسالے اس خوشنما ٹائپ
سے چھپا کریں گے میری تمنا ہے کہ یہ کمپنی اتنا سرمایہ جمع کرلے کہ اپنی تجویز کے مطابق ٹائپ بناکر
بازار میں لاسکے"۔

۲۱ جناب محفوظ الحق صاحب علمی، مولوی فاضل، دہلی
حقیقت یہ ہے کہ آج تک ایسا خوب صورت ٹائپ ایجاد نہیں ہوا۔

خط و کتابت اور ترسیل منی آرڈر کا پتہ
**خوشخط نستعلیق ٹائپ فاونڈری لمیٹیڈ۔ قرول باغ دہلی**

رجسٹرڈ

نمبر ۱۰۵۹۲

# جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

جلد ۲۱

بابت ماہ اگست ۱۹۳۳ع

نمبر ۲

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

AH Faruqi

1927.

بسم اللہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۲۱ | بابتہ ماہ اگست ۱۹۳۳ عیسوی | نمبر ۲


## فہرست مضامین

# اخلاقی دیوالے کے آثار

(۱)

میرے کرم فرما مجھے برابر ہندوستانی اخباروں کے تراشے[۱] بھیجتے رہتے ہیں جن میں منع حمل[۲] کی تدبیروں سے انضباط ولادت[۳] کی حمایت کی جاتی ہے۔ میں نوجوانوں سے ان کے خانگی معاملات کے متعلق خط وکتابت کر رہا ہوں اور اس کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے۔ مجھے خط لکھنے والوں نے بے شمار مسئلے چھیڑ رکھے ہیں ان میں سے صرف چند ہی باتوں سے بحث کرنے کی ان صفحات میں گنجائش ہے۔ امریکی دوست مجھے اس موضوع کے متعلق کتابیں اور مضامین بھیج رہے ہیں اور ان میں سے بعض تو مجھ سے اس بات پر خفا بھی ہو گئے ہیں کہ میں نے منع حمل کی تدبیروں سے کام لینے کی مخالفت کی۔ وہ افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ بعض باتوں میں ترقی پسند ریفارمر ہونے کے باوجود میں انضباط ولادت کے معاملے میں دقیانوسی خیالات رکھتا ہوں۔

اس سے مجھے یہ خیال ہوا کہ ان تدبیروں کے حق میں ضرور کوئی قطعی اور حتمی دلیل ہو گی اور میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ میں نے اس موضوع کے متعلق اب تک جو کچھ کہا ہے اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت ہے۔ اس فکر میں تھا کہ جو کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں انھیں پڑھوں کہ کسی شخص نے مجھے ایک کتاب "اخلاقی دیوالے کے آثار" لا کر دی۔ اس کتاب میں اسی مضمون کی بحث ہے اور میرے خیال میں بالکل علمی طریقے سے اس پر نظر ڈالی گئی ہے۔ اصل میں یہ کتاب موسیو پال بورو نے فرانسیسی زبان میں لکھی ہے اور اس کا نام

---

[۱] Cuttings اخبار کے وہ حصے جن میں کوئی خاص دلچسپ مضامین یا خبریں ہوں اور وہ تراش کر الگ کر لیے جائیں۔

[۲] contraception حمل قرار پانے کو روکنا۔

[۳] birth control ضرورت سے زیادہ اولاد نہ ہونے دینا۔

D' Indiscipline des Moeurs ہے جس کے لفظی معنی ہیں "اخلاق کی بدنظمی"۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ کانسٹیبل کمپنی نے شائع کیا ہے اور ڈاکٹر میری شارلیب سی، بی، ای ایم، ڈی، ایم ایس (لندن) نے مقدمہ لکھا ہے۔ اس میں ۱۵ باب ہیں اور کل حجم ۵۱۸ صفحہ ہے۔

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد میں نے دل میں سوچا کہ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ مصنّف کے خیالات کا خلاصہ بیان کرنے سے پہلے مجھے چند مستند کتابیں منع حمل کے مجوزہ طریقوں کی حمایت میں بھی پڑھنی چاہئیں۔ اس لئے میں نے انجمن خدام ہند[۵۱] کے کتب خانے سے اس موضوع کی کُل کتابیں جو وہاں موجود تھیں لے کر پڑھیں۔ کاکا کلیلکر نے جو اس مضمون کا مطالعہ کر رہے ہیں مجھے ہیولاک ایلس کی کتابیں دیں جو خاص اسی مسئلے کے متعلق ہیں اور ایک دوست نے رسالہ "طبیب"[۵۲] کا ایک خاص نمبر بھیج دیا جس میں مشہور طبیبوں کی قیمتی رائیں جمع کی گئی ہیں۔

میرا مقصد اس مضمون کے متعلق کُل مطبوعات جمع کرنے سے یہ تھا کہ جہاں تک ایک ایسے شخص کے لئے جو خود طبیب نہیں ہے ممکن ہے موسیو بورو کے نتائج کی صحت کو جانچوں۔ اکثر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ہر مسئلے میں خواہ اس پر خود سائینس والوں نے بحث کی ہو تصویر کے دو رُخ ہوا کرتے ہیں اور دونوں کی حمایت میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے اس لئے مجھے یہ فکر تھی کہ موسیو بورو کی کتاب کا تعارف ناظرین سے کرانے سے پہلے منع حمل کے حامیوں کے خیالات سے واقفیت حاصل کروں۔ میں اچھی طرح سوچ سمجھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ کم سے کم ہندوستان میں منع حمل کے طریقے استعمال کرنے کے حق میں کوئی معقول دلیل پیش نہیں کی جا سکتی لیکن اگر یہ ثابت ہو جائے کہ خود مغرب کے لئے یہ طریقے مضر ہیں تو ہندوستان کے مخصوص حالات پر غور کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

---

[۵۱] Servants of India Society

[۵۲] The Practitioner

آیئے اب یہ دیکھیں کہ موسیو بورو کیا کہتے ہیں۔ ان کا مطالعہ فرانس تک محدود ہے لیکن فرانس کی اہمیت کچھ کم نہیں۔ اس کا شمار دنیا کے بڑے ترقی یافتہ ملکوں میں ہوتا ہے۔ اس لئے اگر یہ طریقے فرانس میں ناکام ہوئے تو کسی اور جگہ ان کا کامیاب ہونا قرین قیاس نہیں ہے۔

ممکن ہے اس بات میں اختلاف رائے ہو کہ ناکامی کسے کہتے ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ میں نے اسے جس معنی میں استعمال کیا ہے اسے وضاحت سے بیان کر دوں منع حمل کے طریقوں کی ناکامی اس وقت ثابت ہو گی جب یہ دکھایا جا سکے کہ ان کی بدولت اخلاقی رشتے کمزور ہو گئے ہیں، عیاشی بڑھ گئی ہے، مردوں اور عورتوں نے حمل کے روکنے میں صرف صحت کو اور اولاد کی تعداد محدود کرنے کی اقتصادی مصلحت کو مدنظر نہیں رکھا بلکہ زیادہ تر اس سے اپنی خواہشات نفسانی کو پورا کرنے کا کام لیا۔ یہ اعتدال پسندوں کا خیال ہے۔ انتہا پسند حامیان اخلاق کے نزدیک منع حمل کی تدابیر کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ مرد یا عورت کے لئے جنسی جبلت[۱] کو تسکین دینا صرف اسی وقت ضروری ہے جب اس کا مقصد اولاد پیدا کرنا ہو جس طرح کھانا کھانا صرف زندگی کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ ان دونوں کے علاوہ ایک تیسرا نقطہ نظر بھی ہے۔ ایک طبقہ یہ کہتا ہے کہ اخلاق کوئی چیز نہیں اور اگر ہے بھی تو اس کا مقتضا ضبط نفس نہیں بلکہ ہر نفسانی خواہش کو اس حد تک پورا کرنا ہے کہ جسم کو ایسا ضرر نہ پہنچ جائے کہ وہ حظ نفس کے قابل نہ رہے جو اصل مقصد ہے۔ اس خیال کے لوگوں کے لئے میرے نزدیک موسیو بورو نے اپنی کتاب نہیں لکھی ہے کیونکہ وہ اس کا خاتمہ ٹام مین[۲] کے اس قول پر کرتے ہیں "مستقبل ان قوموں کے ہاتھ ہے جو پاکدامن ہیں"۔

اس کتاب کے پہلے حصے میں موسیو بورو نے بہت سے واقعات جمع کر دیئے ہیں جنھیں

---

۱؎ جذبۂ شہوت sexual instinct

۲؎ Tom Mann

پڑھ کر سخت رنج ہوتا ہے۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ کس طرح فرانس میں بڑے زبردست کاروبار قائم ہوگئے ہیں جن کا کام محض یہ ہے کہ انسان کے ادنیٰ ترین جذبات کی تسکین میں مدد دیں۔ منع حمل کے حامیوں کا لے دے کے جو ایک دعویٰ ہے کہ ان طریقوں کے استعمال ہونے سے اسقاط کے واقعات کم ہو جائیںگے وہ بھی ثابت نہیں ہوتا۔ موسیو بورو کہتے ہیں "یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اس پچیس سال کے عرصے میں جبکہ فرانس میں منع حمل کے طریقوں کا خاص طور پر زور رہا ہے مجرمانہ اسقاط حمل کی وارداتیں کم نہیں ہوئی ہیں"۔ بلکہ ان کا تو یہ خیال ہے کہ یہ وارداتیں بڑھتی جاتی ہیں۔ ان کا اندازہ ہے کہ ان کی تعداد ہر سال ۲۷۵۰۰۰ اور ۳۲۵۰۰۰ کے درمیان ہوتی ہے۔ رائے عامہ اب ان کی طرف سے اس قدر کراہت کا اظہار نہیں کرتی جتنا کچھ سال پہلے کیا کرتی تھی۔

(۲)

موسیو بورو فرماتے ہیں "اسقاط کے بعد بچوں کے قتل، محرمات کے ساتھ بدکاری اور اسی قسم کے دوسرے جرائم تک نوبت پہنچتی ہے جو فطرت انسانی کے لئے باعث ننگ ہیں۔ بچوں کے قتل کے بارے میں صرف اتنا کہنا ہے کہ باوجود ان سہولتوں کے جو بن بیاہی زچاؤں کو دی جاتی ہیں اور باوجود منع حمل اور اسقاط کی کثرت کے یہ جُرم پہلے کے مقابلے میں بڑھ گیا ہے۔ جو لوگ "بھلے مانس" کہلاتے ہیں اِن کی طرف سے اب اس پر اس قدر لعنت ملامت نہیں ہوتی اور جیوری اس کے ملزموں کو عموماً بَری کر دیتی ہے۔

موسیو بورو نے کتاب کی ایک پوری فصل میں فحش نگاری سے بحث کی ہے۔ وہ اس کی تعریف یوں کرتے ہیں "ان وسائل سے جو ادب، ڈراما اور تصویر انسانوں کی تفریح طبع اور سکونِ قلب کے لئے فراہم کرتی ہے گندے اور شہوت پرستانہ مقاصد میں کام لینا"۔ آگے چل کر وہ کہتے ہیں "اس کاروبار کی ہر شاخ کو وہ گرم بازاری حاصل ہوئی ہے جس کا اندازہ ڈائرکٹروں کی قابلیت، تجارتی تنظیم کے کمال، سرمائے کی فراوانی اور طریق کار کی بےنظیر خوبی

کو دیکھ کر ہو سکتا ہے۔" "اس کے اثرات اس قدر قوی اور عجیب و غریب ہیں کہ انھوں نے انسان کی ساری نفسی زندگی کو متاثر کر دیا ہے۔" اور "اصلی زندگی کے ساتھ ایک اور شہوانی زندگی جس کا وجود صرف تخیل میں ہے پیدا ہو گئی ہے۔" اس کے بعد موسیو بورو نے موسیو روئیین سے یہ دردناک عبارت نقل کی ہے:۔

"وہ کتابیں جن میں شہوانی جذبات اور شہوانی مظالم کا ذکر ہوتا ہے نفسی قانون کے ذریعے سے بیشمار ناظرین پر نہایت قوی ترغیب کا اثر ڈالتی ہیں اور ان کی کثرت اشاعت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو لوگ اپنے تخیل میں ایک دوسری شہوانی زندگی بسر کرتے ہیں ان کی تعداد کا کچھ ٹھکانا نہیں (علاوہ ان بیچاروں کے جو پاگل خانوں میں بند ہیں)۔ خصوصاً اس زمانے میں جب اخباروں اور کتابوں کے غلط استعمال سے ہر شخص کے نفس کے گرد بہ قول و۔ جیمس کے "متعدد ضمنی کائناتیں" پیدا ہو جاتی ہیں جن میں ہر شخص اپنے آپ کو محو کر دیتا ہے اور اپنے ساتھ اپنے موجودہ فرائض کو بھی بھول جاتا ہے۔"

یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ سب مہلک نتائج براہ راست ایک بنیادی غلطی سے پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ شہوانی خواہش کا پورا کرنا بجائے خود انسانی ضروریات میں داخل ہے اور بغیر اس کے نہ مرد کی نشو و نما مکمّل ہوتی ہے نہ عورت کی۔ جہاں انسان کے دل میں یہ خیال بیٹھا اور وہ اس چیز کو جسے پہلے بدی سمجھتا تھا نیکی سمجھنے لگا پھر ان تدبیروں کی کوئی انتہا نہیں رہتی جن سے شہوانی جذبہ اُبھرتا ہے اور اسے تسکین دینے میں مدد ملتی ہے۔

اس کے بعد موسیو بورو حوالوں اور مثالوں کے ذریعے سے یہ دکھاتے ہیں کہ کس طرح روزانہ اخباروں، رسالوں، ناولوں، تصویروں اور تھیٹر کے ذریعے سے اس ناپاک مذاق کی تسکین کا روز افزوں سامان ہوتا ہے۔

اب تک غیر شادی شدہ لوگوں کے اخلاقی انحطاط کا ذکر تھا اس کے بعد موسیو بورو

ان اخلاقی بے عنوانیوں کا ذکر کرتے ہیں جو شادی کے بعد ہوتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں " امراء، متوسط طبقے اور کسانوں میں بہت سی شادیاں دولت کی حرص اور عزت کی ہوس پر مبنی ہوتی ہیں شادی اس غرض سے بھی کی جاتی ہے کہ کوئی عُہدہ مل جائے، جائدادیں خصوصاً دو زمیندار یاں اکٹھی ہو جائیں وہ تعلق جو پہلے سے ہے قانونی شکل اختیار کرلے۔ ناجائز اولاد جائز قرار پا جائے۔ گٹھیا کے مریض کو بڑھاپے میں دل و جان سے خدمت کرنے والی مل جائے، فوجی بھرتی کے وقت انسان اپنے تعین کا مقام منتخب کرسکے بلکہ کبھی اس لئے بھی کہ عیاشی کی زندگی جس سے انسان کا جی سیر ہوتا جاتا ہے ختم ہو جائے اور ایک دوسری قسم کی شہوانی زندگی اس کی جگہ اختیار کی جاسکے۔"

اس کے بعد موسیو بورو اعداد و شمار سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ ان شادیوں سے عیاشی کم ہونے کے بجائے بڑھ جاتی ہے۔ اس ذلت و خواری کو ان آلات سے بہت مدد ملی ہے جو سائنس یا مکانک کی ایجادات کہلاتے ہیں اس غرض سے بنائے گئے ہیں کہ جماع کے فعل کو بدلے بغیر اس کے اثرات کو محدود کردیں۔ میں ان افسوسناک عبارتوں کو چھوڑتا ہوں جن میں زنا کی زیادتی کا ذکر اور طلاق اور قانونی علیحدگی[ل] کے حیرت انگیز اعداد و شمار ہیں جن کی تعداد پچھلے بیس[۲۰] سال میں دُگنی سے زیادہ ہو گئی ہے۔ میں اس بے روک آزادی کی طرف بھی صرف سرسری اشارے پر اکتفا کرتا ہوں جو " دونوں جنسوں کے لئے یکساں معیار اخلاق " کے اصول پر عورتوں کو نفس پرستی کے لئے دیدی گئی ہے۔ منع حمل اور اسقاط کے طریقوں کے درجۂ کمال پر پہنچ جانے سے دونوں جنسیں اخلاقی قیود سے آزاد ہو گئی ہیں ایسی حالت میں لوگ خود شادی کا مضحکہ اڑاتے ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ مندرجہ ذیل عبارت موسیو بورو نے ایک مصنف سے نقل کی ہے جس کی کتابیں عوام میں مقبول ہیں " میری رائے میں شادی ہمیشہ ایک نہایت وحشیانہ رسم ہے۔ مجھے ذرا بھی شبہہ نہیں کہ اگر نسل انسانی عقل و انصاف میں کچھ

---

ل Judicial seperation عدالت کا فیصلہ جس کی رو سے میاں بیوی بغیر طلاق کے ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔

ترقی کرے گی تو یہ رسم موقوف کردی جائے گی......... لیکن مرد اتنے ناشائستہ ہیں اور عورتیں اتنی بزدل ہیں کہ جس قانون کی ان پر حکومت ہے اس سے برتر قانون کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔" موسیو بورو نے ان افعال پر جن کا ذکر آچکا ہے اور ان نظریوں پر جن کی رو سے یہ جائز ثابت کئے جاتے ہیں تفصیل سے نظر ڈالی ہے۔ وہ جوش میں آکر چلّا اٹھتے ہیں "غرض یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اخلاقی بےنظمی کی تحریک ہمیں نئی منزلوں کی طرف لے جا رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ آخر وہ منزلیں کون سی ہیں؟ آیا وہ مستقبل جو ہمارے سامنے ہے ترقی حسن، اور روز افزوں روحانیت سے مملو ہے یا تنزل اور ظلمت، بدصورتی اور بہیمیت سے جو روز بروز بڑھتی جائے گی؟ کیا یہ بےنظمی جس کا دور دورہ ہے، اس قسم کی مفید بغاوت ہے جو فرسودہ اخلاق کے خلاف ہوا کرتی ہے، اس قسم کا مبارک جہاد جسے آئندہ نسلیں شکر کے ساتھ یاد رکھتی ہیں کیونکہ یہ چیزیں خاص خاص زمانوں میں ان کی نہضت اور ترقی کے آغاز کے لئے لازمی ہیں، یا یہ ہماری قدیم جہالت اور وحشت ہے جو ان اخلاقی قوانین کے مقابلے میں اٹھ کھڑی ہوتی ہے جن کی سختی اسی لئے ناگزیر ہے کہ اس کے بغیر ہم ان بہیمی جذبات کو روک نہیں سکتے؟ ایسا تو نہیں کہ ہمارا سابقہ ایک نامبارک بغاوت سے ہے جو زندگی اور سلامتی کے خلاف ہو رہی ہے؟" اس کے بعد موسیو بورو اس بات کی نہایت زبردست شہادت پیش کرتے ہیں کہ اب تک اس کے نتائج ہر طرح بیحد مضر ثابت ہوئے ہیں یہاں تک کہ ان سے انسانی زندگی کی ہلاکت کا خطرہ ہے۔

(۴)

ان دونوں باتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے کہ میاں بیوی جہاں تک بشری قوت کام دے ضبط نفس کے ذریعے سے اپنی اولاد کی تعداد کو محدود رکھیں یا وہ اس مقصد کو اس طرح حاصل کریں کہ شہوانی فعل کا لطف تو اٹھاتے رہیں مگر بعض تدبیروں سے اس کے نتائج کو روک دیں۔ پہلی صورت میں ان کا ہر طرح فائدہ ہے۔ دوسری صورت میں سراسر نقصان ہے۔ ایم بورو نے اعداد و شمار اور نقشوں کے ذریعے سے یہ ثابت کیا ہے کہ منع حمل کے طریقوں

کاروزافزوں استعمال جس کا مقصد یہ ہے کہ شہوانی خواہش دل کھول کر پوری کی جائے مگر اس کے قدرتی نتائج روک دئے جائیں یہ رنگ لایا ہے کہ نہ صرف پیرس میں بلکہ سارے فرانس میں اموات کی شرح ولادت کی شرح سے بڑھ گئی ہے۔ جن ۸۷ علاقوں میں فرانس منقسم ہے ان میں سے ۶۸ میں شرح ولادت شرح اموات سے کم ہے۔ ایک جگہہ یعنی لوت کے علاقے میں اموات کی شرح ۱۶۲-اور ولادت کی ۱۰۰ ہے۔ اس کے بعد تارن وگارون کا نمبر ہے جہاں اموات ۱۵۶-اور ولادتیں ۱۰۰ ہیں۔ ان اُنیس علاقوں میں بھی جہاں ولادت کی شرح اموات سے زیادہ ہے کئی ایسے ہیں جہاں فرق محض برائے نام ہے۔ صرف دس علاقوں میں اتنا فرق ہے جو قابل ذکر ہے۔ سب سے کم شرح اموات یعنی ۱۰۰ ولادتوں کے مقابلے میں بہتر موت لی ہاں اور پادوکیلے میں ہے۔ موسیو بورو ثابت کرتے ہیں کہ یہ آبادی کے گھٹنے کا عمل جسے وہ "اختیاری موت" کہتے ہیں ابھی تک جاری ہے۔

اس کے بعد موسیو بورو فرانس کے صوبوں کی حالت پر تفصیل سے نظر ڈالتے ہیں اور ذیل کی عبارت موسیو گیدؔ سے نقل کرتے ہیں جو انھوں نے ۱۹۱۴ء میں نارمنڈی کے متعلق لکھی تھی "پچاس برس کے عرصے میں نارمنڈی میں تین لاکھ باشندے کم ہوگئے ہیں اور یہ تعداد ضلع اورن کی پوری آبادی کے برابر ہے۔ ہر ۲۰ سال میں اس صوبے میں ایک ضلعے کے برابر آبادی کم ہوتی جاتی ہے۔ اور چونکہ اس میں صرف سو ضلعے ہیں اس لئے ایک صدی کا عرصہ اس کے لئے کافی ہے کہ اس کے زرخیز مرغزار فرانسیسیوں سے خالی ہوجائیں۔ میں نے خاص کرکے فرانسیسیوں سے خالی ہوجانا کہا کیونکہ یقیناً دوسرے لوگ یہاں آکر آباد ہوجائیں گے اور اگر ایسا نہ ہو تو افسوس کی بات ہے۔ کے این کے آس پاس لوہے کی کانوں میں جرمن لوگ کام کررہے ہیں اور ابھی کل ہی کا ذکر ہے کہ اس مقام پر جہاں سے ولیم فاتح جہاز میں بیٹھ کر انگلستان روانہ ہوا تھا چینی مزدوروں کا ایک ہراول دستہ جہاز سے اُترا ہے۔ اس پر موسیو بورو یہ اضافہ کرتے ہیں" اور خدا جانے کتنے

اور صوبے ہیں جن کی حالت ایسی ہی ابتر ہے۔"

اس کے بعد وہ یہ دکھاتے ہیں کہ آبادی کے گھٹنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ قوم کی فوجی قوت کم ہوگئی ہے۔ ان کے نزدیک فرانس سے ہجرت کر کے مقبوضات میں آباد ہونے والوں کی تعداد کی کمی کا باعث بھی یہی ہے۔ پھر وہ فرانس کی نوآبادیوں کی توسیع کے رک جانے اور فرانسیسی تجارت، فرانسیسی زبان اور ادب کے تنزل کا باعث بھی اسی کو قرار دیتے ہیں۔

اس کے بعد موسیو بورو پوچھتے ہیں "کیا یہ فرانسیسی لوگ جنھوں نے جنسی ضبط و انضباط کو ترک کر دیا ہے راحت و مسرت، مادی بہبود، جسمانی صحت اور ذہنی تہذیب کے حاصل کرنے میں آگے بڑھ گئے ہیں" اور خود ہی جواب دیتے ہیں "جہاں تک صحت کے بہتر ہونے کا تعلق ہے چند لفظ کافی ہوں گے ہم بہت چاہتے ہیں کہ تمام اعتراضات کا جواب باقاعدہ طور پر دیں مگر اس دعوے پر تو سنجیدگی سے غور کرنا بہت ہی دشوار ہے کہ "جنسی آزادی" سے جسم کو قوت اور صحت کو فائدہ پہنچے گا۔ ہر طرف سے یہ سننے میں آتا ہے کہ نوعمروں اور بالغوں دونوں کی طاقت کم ہوگئی ہے۔ جنگ سے پہلے فوجی افسروں کو بار بار رنگروٹوں کا جسمانی معیار گھٹانا پڑا۔ اور ساری قوم کی مشقت کو برداشت کرنے کی قوت گھٹ گئی ہے۔ ظاہر ہے یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ اس تنزل کا سبب صرف اخلاقی ضبط کی کمی ہے۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ شراب خواری کی کثرت صحت کو خراب کرنے والے مکانوں وغیرہ کے ساتھ ساتھ اس چیز کو بھی اس تنزل میں بہت کچھ دخل ہے اور اگر ہم غور سے دیکھیں تو آسانی سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ بد اخلاقی اور وہ جذبات جن پر اس کی بنا ہے ان دوسری بلاؤں کے سب سے بڑے حامی اور مددگار ہیں۔

"امراض خبیثہ کی خوفناک کثرت نے صحت عامہ کو اس قدر نقصان پہنچایا ہے جس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔"

موسیو بورو نو مالتھوسیوں[۵۱] کے اس نظریے کو بھی تسلیم نہیں کرتے کہ جو معاشرہ انضباط

---

[۵۱] Neo Malthusians منع حمل کے حامیوں کا ایک گروہ

ولادت سے کام لیتا ہے اس کے افراد کی دولت اس انضباط کی نسبت سے بڑھ جاتی ہے۔
اور اپنے قول کی تائید میں وہ جرمنی کی ترقی پذیر شرح ولادت کا مقابلہ فرانس کی تنزل پذیر
شرح ولادت سے کرتے ہیں جس کے ساتھ ساتھ اس ملک کی دولت بھی کم ہو رہی ہے۔
اور وہ کہتے ہیں یہ بات بھی نہیں ہے کہ جرمنی میں تجارت کی حیرت انگیز توسیع کا سبب یہ ہو
کہ وہاں مزدوروں کی اجرت دوسرے ملکوں سے کم ہے۔ وہ موسیو روسینول سے یہ الفاظ
نقل کرتے ہیں "جن دنوں جرمنی کی آبادی ۔۔۔۔۔۔۴۱ تھی وہاں لوگ بھوکے مرتے تھے۔ مگر جب سے
آبادی ۔۔۔۔۔۔۶۸ ہو گئی ہے دولت برابر بڑھ رہی ہے" اس کے بعد وہ خود فرماتے ہیں" یہ
لوگ ہرگز راہبوں کی سی زندگی بسر نہیں کرتے۔ پھر بھی ان کے لئے یہ ممکن تھا کہ ہر سال سیونگ بنکوں
میں بڑی بڑی رقمیں جمع کریں جن کی تعداد ۱۹۱۱ء میں دو کھرب بیس ارب فرانک تھی حالانکہ
۱۸۹۵ء میں صرف ۸۰ ارب فرانک جمع تھے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر سال ۸ ارب پچاس کرور فرانک
کا اضافہ ہوتا رہا۔"

ذیل کی عبارت جو موسیو بورو جرمنی کی صنعتی ترقی کا ذکر کرنے کے بعد اس کے عام
تہذیب و تمدن کے متعلق لکھتے ہیں دلچسپی سے پڑھی جائے گی :۔
"بغیر عمرانیات کا ماہر ہونے کے انسان یقینی طور پر کہہ سکتا ہے کیونکہ یہ کھلی ہوئی بات
ہے کہ یہ صنعتی ترقی ناممکن تھی اگر زیادہ شائستہ مزدور، زیادہ تعلیم یافتہ مستری، مکمل تربیت
یافتہ انجینیر دستیاب نہ ہوتے ۔۔۔۔۔ صنعتی مدرسے تین طرح کے ہیں :۔ پیشہ آموز جن کی
تعداد پانسو ہے اور ان میں ۔۔۔۔۷ طالب علم تعلیم پاتے ہیں، صنعتی جو اس سے بھی زیادہ
تعداد میں ہے اور ان میں بعض میں ایک ہزار سے زیادہ طالب علم ہیں اور یہ یونیورسٹیوں
کی طرح ڈاکٹر کی گراں قدر سند دیتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ ۳۶۵ تجارتی مدرسے ہیں جن میں ۳۴۰۰
طالب علم ہیں اور بے شمار مدرسوں میں زراعت کی تعلیم ہوتی ہے جس سے ۔۔۔۔۹ طلبہ فائدہ
اٹھاتے ہیں۔ بھلا ان چار لاکھ طلبہ سے جو پیدائش دولت کے مختلف صیغوں میں تعلیم پاتے ہیں

ہمارے ملک کے پیشہ آموز مدرسوں کے پینتیس ہزار طلبہ کا کیا مقابلہ اور کیا وجہ ہے کہ جب ہمارے ....۱۷۷ ہموطن جن میں سے ۷۷۹۰۹۸ اٹھارہ برس سے کم عمر کے ہیں کاشتکاری پر بسر کرتے ہیں. ہمارے زراعتی مدرسوں میں صرف ۳۲۲۵ طلبہ ہیں؟" موسیو بورو نے کمال احتیاط سے یہ بات صاف کردی ہے کہ جرمنی کی اس حیرت انگیز ترقی کا سبب محض ولادتوں کا اموات سے زیادہ ہونا نہیں ہے مگر وہ بجا طور سے کہتے ہیں کہ اگر دوسرے حالات موافق ہوں تو غالب شرح ولادت قومی نشو و نما کی ناگزیر شرط ہے. انھیں جو دعوے ثابت کرنا ہے وہ یہ ہے کہ افزائش پذیر شرح ولادت ہرگز مادی بہبود اور اخلاقی ترقی کے منافی نہیں ہے شرح ولادت کے معاملے میں ہم ہندوستانیوں کی وہ حالت نہیں ہے جو فرانسیسیوں کی ہے. مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی غالب شرح ولادت بہ خلاف جرمنی کے قومی نشو و نما کے لئے مفید نہیں ہے. مگر مجھے پہلے سے اس باب کا مضمون بیان نہیں کرنا چاہیئے جو میں نے موسیو بورو کے اعداد و شمار اور نتائج کی روشنی میں ہندوستانی حالات سے بحث کرنے کے لئے مخصوص کردیا ہے۔

جرمنی کے حالات پر جہاں شرح ولادت شرح اموات سے بڑھی ہوئی ہے غور کرنے کے بعد موسیو بورو کہتے ہیں "کیا ہم یہ نہیں جانتے کہ فرانس مجموعی قومی دولت کے اعتبار سے چوتھے نمبر پر ہے اور وہ بھی اس طرح کہ تیسرے نمبر والے سے بہت پیچھے ہے؟ فرانس کی آمدنی اس روپے سے جو مختلف کاموں میں لگا ہوا ہے ۲ کھرب ۵۰ ارب فرانک سالانہ ہے اور جرمنی کے لوگوں کی تقریباً ۵ کھرب فرانک ہے ...... ہماری زمین کی آمدنی ۱۸۷۹ء اور ۱۹۱۴ء کے درمیان یعنی ۳۵ برس کے عرصے میں ۴ کھرب فرانک کم ہو گئی ہے یعنی بجائے ۹ کھرب ۲۰ ارب کے ۵ کھرب ۲۰ ارب رہ گئی ہے. ضلعے کے ضلعے ایسے ہیں جن میں کاشت کرنے کے لئے آدمی نہیں ہیں اور بعض تعلقوں میں سوائے بوڑھوں کے جوان نظر ہی نہیں آتے۔"
آگے چل کر وہ فرماتے ہیں۔" اخلاقی بےنظمی اور مستقل لاولدی کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم کی فطری صلاحیتیں

تنزل پذیر ہیں اور معاشرتی زندگی میں بیّن طور پر بوڑھوں کا غلبہ ہے...... فرانس میں ہزار آدمیوں میں صرف ۱۷۰ بچے ہیں حالانکہ جرمنی میں ۲۲۰ اور انگلستان میں ۲۱۰ ہیں........
........بوڑھوں کا تناسب ضرورت سے زیادہ ہے اور دوسرے لوگ جو اخلاقی بےنظمی اور اختیاری لاولدی کی وجہ سے قبل از وقت ضعیف ہو گئے ہیں ان پر بھی وہی بڑھاپے کی مایوسی اور ہراس طاری ہے جو از کار رفتہ نسلوں میں ہوا کرتا ہے۔"

اس کے بعد مصنف کہتا ہے "ہم جانتے ہیں کہ فرانسیسی قوم کے اکثر لوگ اپنے حکمرانوں کی اس خانگی حالت (اخلاقی بدعنوانیوں) کی طرف سے بے پروا ہیں کیونکہ ایک بڑا سہل نظریہ بنا لیا گیا ہے کہ "خانگی زندگی پر پردہ پڑا رہنے دو" اور وہ نہایت رنج کے ساتھ موسیو لیو پولڈ مونود کا یہ قول نقل کرتے ہیں:-

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ شرمناک مظالم کو دور کرنے کے لئے لڑائی لڑی جائے اور مظلوموں کی بیڑیاں کاٹ دی جائیں مگر ان لوگوں کو کیا کہئے گا جن کی بزدلی کا یہ حال ہے کہ اپنے ضمیر کو تحریصوں سے نہ بچا سکے جن کی شجاعت ایک بوسے سے یا ایک چین جبیں سے مغلوب ہو جاتی ہے........ جو بغیر شرم و حیا کے بلکہ بڑے فخر کے ساتھ اس عہد وفا کو توڑتے ہیں جو انھوں نے ایک مبارک اور مقدس ساعت میں اپنی بیوی سے کیا تھا، جو اپنے گھروں کو خود غرضی اور خود پرستی کے ظلم میں گرفتار رکھتے ہیں........ ایسے لوگ دوسروں کو کیونکر آزاد کرا سکتے ہیں۔"

آخر میں مصنف ساری بحث کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے "غرض جدھر دیکھئے یہی نظر آتا ہے کہ ہماری اخلاقی بدنظمی کی مختلف شکلوں نے فرد کو، خاندان کو اور مجموعی معاشرے کو نہایت شدید نقصان پہنچایا ہے اور ہمیں ایسی مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے جو سچ مچ بیان سے باہر ہے۔ ہمارے نوجوانوں کی عیاشی، عصمت فروشی کی گرم بازاری، فحش کتابوں کی کثرت، روپے یا عزت یا عیش و عشرت کی خاطر شادی کرنا، زناکاری، طلاق، اختیاری منع

حمل اور اسقاط نے قوم کو ناکارہ کر دیا ہے اور اس کی افزائش روک دی ہے۔ افراد اپنی قوتوں کی حفاظت میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں اور تعداد کی کمی کے ساتھ ساتھ نئی نسل اخلاقی صفات کے لحاظ سے بھی گر گئی ہے۔ "ولادت کم مگر آدمی بہتر" یہ اصول ان لوگوں کے لئے کچھ عجیب کشش رکھتا تھا جن کی نظر کو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مادی تصور نے محدود کر دیا تھا اور جو یہ سمجھتے تھے کہ انسانوں کی نسل کشی بھی بھیڑ بکری یا گھوڑے کی طرح ہو سکتی ہے۔

آگسٹ کونت نے بڑا اچھا ہوا فقرہ کہا ہے کہ یہ لوگ جو ہماری معاشرتی بیماریوں کے طبیب ہونے کے مدعی ہیں اگر بیکاری کا پیشہ اختیار کرتے تو اچھا تھا کیونکہ وہ فرد اور جماعت دونوں کی نامحدود نفسی پیچیدگیوں کے سمجھنے کی قابلیت نہیں رکھتے۔

"اصل بات یہ ہے کہ انسان جتنے خیالات رکھتا ہے، جتنے فیصلے کرتا ہے، جتنی عادتیں ڈالتا ہے ان میں سے کسی کا اثر اس کی انفرادی اور معاشرتی زندگی پر اس قدر گہرا نہیں ہوتا جتنا ان خیالات، فیصلوں اور عادتوں کا جو شہوانی خواہش کے تقاضے سے متعلق ہیں خواہ وہ اس کا مقابلہ کرے اور اس پر غالب آئے خواہ اس سے دب کر مغلوب ہو جائے دونوں صورتوں میں اس کے عمل کی لہر معاشرتی زندگی میں بہت دور دور تک پہنچتی ہے کیونکہ فطرت کا حکم یہی ہے کہ جو فعل سب سے زیادہ پردہ خلوت میں پوشیدہ ہے وہ عالم جلوت میں بے شمار اثرات پیدا کرے۔

"اس خلوت کی آڑ میں ہم اپنے دل کو ضابطۂ اخلاق کی خلاف ورزی کرتے وقت یوں سمجھا لیتے ہیں کہ ہمارے بُرے فعل سے کوئی اہم نتائج پیدا نہیں ہوں گے۔ جہاں تک ہماری ذات کا تعلق ہے ہمیں اطمینان ہو جاتا ہے کہ ہمارے فعل کا مقصد ہی اپنی ذاتی غرض یا لذّت ہوتی ہے۔ اب رہا مجموعی معاشرہ تو ہم یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ ہماری ناچیز ذات سے اس قدر بلند تر ہے کہ ہمارے کرتوت کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم دل ہی دل میں امید رکھتے ہیں کہ دوسرے لوگ پاکباز اور پارسا رہیں گے۔ ستم

یہ ہے کہ ہمارا یہ بزدلانہ اندازہ اس وقت تک قریب قریب ٹھیک نکلتا ہے جب تک ہم بدفعلی کا ارتکاب عادتاً نہیں بلکہ گاہے ماہے کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے ہم اپنی اس کامیابی پر پھول جاتے ہیں اور اپنے رویئے پہ قائم رہتے ہیں یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ہم اسے جائز سمجھنے لگتے ہیں اور یہی ہماری سب سے بڑی سزا ہے۔

"لیکن ایک دن آتا ہے جب اس مثال کے اثر سے دوسرے بھی اس فعل کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ہماری ہر بدفعلی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ "دوسرے لوگوں" کا نیکی کا دامن تھامے رہنا جس پر ہم اس قدر بھروسا کرتے ہیں مشکل ہو جاتا ہے اور اس کے لئے بڑی ہمت کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہمارا ہمسایہ یہ سمجھ کر کہ میں کب تک بیوقوف بنتا رہوں ہماری تقلید پر کمر باندھ لیتا ہے۔ اسی دن سے تباہی کا آغاز ہو جاتا ہے اور ہر شخص آسانی سے اندازہ کر سکتا ہے کہ اس کی بدکرداری کے نتائج کیا ہیں اور اس کی ذمہ داری کی حد کہاں تک ہے ......

"وہ برا فعل جو ہمارے نزدیک پردے میں نہاں تھا ظاہر ہو جاتا ہے اس کے اندر ایک خاص غیر مادی شعاع افگنی کی قوت[۵۱] ہوتی ہے اور اس کا اثر ہر جماعت میں ہر طبقے میں پہنچ جاتا ہے۔ ہر ایک شخص کے جرم کی سزا سب کو بھگتنا پڑتی ہے کیونکہ ہمارے افعال کی تاثیر اس حلقے کی طرح جو موجوں کی حرکت سے پیدا ہوتا ہے پھیلتے پھیلتے معاشرتی زندگی کے سمندر میں بڑی دور دور تک پہنچتی ہے ......

"اخلاقی بےنظمی سے بقائے نسل کا چشمہ فوراً خشک ہو جاتا ہے۔ بالغ مرد اور عورت اخلاقی اور جسمانی کمزوری میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان کی زندگی کو گھن لگ کر رہ جاتا ہے۔"

(۴)

اخلاقی بےنظمی، منع حمل کے طریقوں سے اس کی مزید شدت اور اس کے خوفناک نتائج کا ذکر کرنے کے بعد مصنف اس کے علاج کی تدبیروں پر غور کرتا ہے۔ میں ان حصوں کو چھوڑتا ہوں

---

۵۱ radio - activity

جن میں وضع قوانین کا ذکر ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ ان کا ہونا ضروری ہے گو بذات خود یہ بالکل بیکار ہیں۔ آگے چل کر اس نے یہ بتایا ہے کہ نہایت احتیاط کے ساتھ رائے عامہ کی تربیت سے ان فرائض کا احساس پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ بن بیاہے پاکدامن رہیں وہ بیشمار انسان جو اپنی شہوانی خواہشات کو ہمیشہ کے لئے روک نہیں سکتے شادی کر لیں اور شادی کے بعد عہد وفا کو نباہیں اور زن وشو کے تعلقات میں بھی اعتدال برتیں۔ پھر اس نے اس دلیل پر نظر ڈالی ہے جو پاکدامنی کے خلاف پیش کی جاتی ہے کہ "اس کا حکم مرد اور عورت کی طبیعی فطرت کے خلاف اور ان کی صحت کے توازن کے لئے مُضر ہے" اور "یہ ناقابل برداشت" مداخلت ہے فرد کی آزادی اور خود مختاری میں اور اس کے اس حق میں کہ راحت حاصل کرے اور اپنی زندگی جس طرح چاہے گذارے۔"

مصنف اس نظریئے کا مخالف ہے کہ عضو تناسل اور اعضا کی طرح "تسکین کا طالب رہتا ہے۔" اس کا کہنا یہ ہے کہ "اگر یہ بھی دوسرے اعضا کی طرح ہوتا تو اس کامل قوت ضبط کی کیا توجیہہ کی جاتی جو ہمارے ارادے کو اس پر حاصل ہے اور اس کا کیا جواب دیا جاتا کہ جذبہ شہوت کا پیدا ہونا جسے ریا کار "شہوانی حاجت" کہتے ہیں ان بیشمار محرکات کا نتیجہ ہے جو ہمارا تمدن لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے سن بلوغ سے برسوں پہلے پیدا کر دیتا ہے؟"

میرا بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اس قابل قدر طبی شہادت کو نقل کر دوں جو اس کتاب میں اس بات کے ثبوت میں جمع کی گئی ہے کہ ضبط نفس نہ صرف بے ضرر ہے بلکہ صحت کے لئے ضروری ہے اور اس کا حاصل کرنا یقیناً ممکن ہے:۔

ٹیوبنگن یونیورسٹی کے پروفیسر اوئیسٹرلن کہتے ہیں "شہوانی جبلت نہ اتنی اندھی ہے اور نہ اس قدر قوی کہ اسے اخلاقی قوت اور عقل کے ذریعے سے قابو میں رکھنا بلکہ بالکل مغلوب کر لینا ناممکن ہو۔ نوجوان مرد کو بھی نوجوان عورت کی طرح مناسب وقت تک ضبط نفس سے کام لینا لازم ہے۔ اسے جان لینا چاہیئے کہ اس قربانی کا نتیجہ مضبوط صحت اور سدا بہار قوت ہے۔

"یہ بات جتنی بار کہی جائے کم ہے کہ عفت اور پاکدامنی عضویات اور اخلاق دونوں کے قوانین کے سراسر مطابق ہیں اور شہوت پرستی مذہب اور اخلاق کی طرح عضویات اور نفسیات کی رُو سے بھی جائز ثابت نہیں کی جا سکتی۔"

لندن کے رائل کالج کے پروفیسر سر لائنل بیل کا قول "سب سے بہتر اور برتر اشخاص کی مثال سے ہمیشہ یہ ثابت ہوتا رہا ہے کہ سب سے قوی جبلت بھی مضبوط اور سنجیدہ ارادے اور کردار معاشرت میں کافی احتیاط کے ذریعے سے پوری طرح رد کی جا سکتی ہے۔ شہوانی خواہش کا ترک اگر محض خارجی موانع کی وجہ سے نہیں بلکہ ایک اختیاری اصول عمل کے طور پر برتا گیا ہے تو اس سے آج تک کسی شخص کو نقصان نہیں پہنچا۔ غرض ضبط نفس کا قائم رکھنا اتنا زیادہ مشکل نہیں بہ شرطیکہ یہ ایک نفسی کیفیت کا جسمانی مظہر ہو...... ضبط نفس محض افعال تک محدود نہیں بلکہ اس میں جذبات کی پاکیزگی اور وہ قوت شامل ہے جو گہرے عقیدوں سے پیدا ہوتی ہے۔"

سوئیستانی ماہر نفسیات فوریل کی رائے ہے "ہر قسم کے اعصابی افعال مشق سے بڑھتے اور قوت پاتے ہیں۔ بہ خلاف اس کے کسی خاص حصّے کے معطل رہنے سے اس میں تحریک پیدا کرنے والے اسباب کا اثر کم ہو جاتا ہے۔

"وہ سب اسباب جن سے شہوانی بے چینی پیدا ہوتی ہے خواہش نفس کی شدت میں اضافہ کرتے ہیں ان اکسانے والی چیزوں سے پرہیز کیا جائے تو احساس کم ہو جاتا ہے اور خواہش رفتہ رفتہ گھٹتی جاتی ہے۔ نوجوانوں میں یہ خیال رائج ہو گیا ہے کہ ضبط نفس کوئی غیر طبعی اور ناممکن چیز ہے حالانکہ بہت سے لوگ اپنے عمل کے ذریعے سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ شہوانی خواہش کے ترک سے صحت کو نقصان نہیں پہنچتا۔"

ربنگ لکھتا ہے "میں بعض نوجوانوں کو جانتا ہوں جن کی عمر ۲۵، ۳۰ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے اور وہ کامل ضبط نفس سے کام لیتے ہیں یا جس وقت ان کی شادی ہوئی اس

وقت تک اس پر عامل تھے۔ ایسی مثالیں شاذ نہیں ہیں۔ البتہ یہ لوگ اپنا اشتہار نہیں دیتے۔
"مجھ سے بہت سے طالب علموں نے اپنے پوشیدہ حالات بیان کئے ہیں اور یہ شکایت کی کہ میں نے اس بات پر کافی زور نہیں دیا کہ شہوانی خواہش آسانی سے قابو میں لائی جاسکتی ہے۔"
ڈاکٹر ایکٹن کے نزدیک "شادی سے پہلے نوجوان کامل ضبط نفس سے کام لے سکتے ہیں اور انھیں یہی کرنا چاہیئے۔"

سر جیمس پیجٹ دربار انگلستان کے طبیب خاص کا قول ہے "جس طرح پاکبازی سے روح کو نقصان نہیں پہنچتا اسی طرح جسم کو بھی ضرر نہیں ہوتا اور ضبط خواہش بہترین طرز عمل ہے۔"
ڈاکٹر ای پیریر رقمطراز ہیں "یہ عجیب خبط ہے جس کا دور کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ اس میں نہ صرف بچے بلکہ ان کے باپ بھی مبتلا ہیں کہ کامل ضبط نفس میں بہت سے خطرے فرض کرلئے گئے ہیں۔ اصل میں پاکدامنی نوجوانوں کے لئے جسمانی، اخلاقی اور ذہنی تحفظ کا ذریعہ ہے۔"

سر اینڈریو کلارک کہتے ہیں "ضبط خواہش سے نقصان نہیں پہنچتا، نشو ونما نہیں رکتی۔ اس سے آدمی کی قوت اور سکت بڑھ جاتی ہے اور ادراک تیز ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے خواہش نفس کی پیروی سے انسان کو اپنے اوپر قابو نہیں رہتا، سستی اور ڈھیل کی عادتیں پڑ جاتی ہیں، سارے نظام جسمانی پر بے حسی اور پستی چھا جاتی ہے اور وہ ان بیماریوں کی زد میں آجاتا ہے جو کئی پشتوں تک منتقل ہوا کرتی ہیں۔ خواہش نفس کی پیروی کو نوجوانوں کے لئے ضروری قرار دینا صرف خطا ہی نہیں بلکہ ظلم ہے۔ یہ بات غلط بھی ہے اور مضر بھی۔"
ڈاکٹر سر بلیڈ لکھتے ہیں "خواہش نفس کی پیروی میں جو مضرتیں ہیں انھیں ہر شخص جانتا ہے ان میں اختلاف کی گنجائش نہیں۔ ضبط خواہش کے نقصانات محض خیالی ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مقدم الذکر کی توجیہہ میں بہت سی ضخیم عالمانہ کتابیں لکھی گئی ہیں اور موخر الذکر کی تاریخ لکھنے والا آج تک کوئی پیدا نہیں ہوا۔ ان نقصانات کی طرف لوگ محض چھپے اشارے کرتے رہتے ہیں جو شرم کی وجہ سے گفتگو تک محدود رہتے ہیں اور منظر عام پر آنے کی تاب

نہیں لا سکتے۔"

ڈاکٹر مانٹی گازا "عضویات عشق"[ل] میں تحریر کرتے ہیں" میں نے آج تک نہیں دیکھا کہ پاکبازی سے کوئی بیماری پیدا ہوئی ہو ........ سب لوگ خصوصاً نوجوان اس کے فوری فوائد کا تجربہ کر سکتے ہیں۔"

برن یونیورسٹی کے مرضیات اعصاب کے مشہور پروفیسر ڈاکٹر دوبوائے کا بیان ہے۔

"ضعف اعصاب کے مریض ان لوگوں میں زیادہ ہوتے ہیں جو شہوت پرستی کی باگ ڈھیلی چھوڑ دیتے ہیں بہ نسبت ان اشخاص کے جو حیوانیت کے بندے نہیں ہوتے۔" اور ان کی شہادت کی کامل تصدیق ڈاکٹر فیرے بیسیتر ہسپتال کے طبیب نے کی ہے کہ جو لوگ نفسی پاکبازی برت سکتے ہیں وہ ضبط خواہش کریں تو ان کی صحت کے لئے مطلق خطرہ نہیں۔ صحت کا انحصار جنسی جبلت کی تسکین پر نہیں ہے۔"

پروفیسر الفریڈ فورنیئے رقمطراز ہیں" اس مسئلے میں کہ ضبط خواہش میں نوجوانوں کے لئے خطرے ہیں بہت کچھ بیہودہ اور غیر ذمہ دارانہ گفتگو کی گئی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر یہ خطرے موجود ہیں تو میں ان سے بے خبر ہوں اور مجھے بہ حیثیت طبیب کے آج تک ان کے وجود کا کوئی ثبوت نہیں ملا باوجودیکہ مجھے طبی معائنوں میں ہر طرح کے مریضوں کے دیکھنے کا موقع حاصل ہوا ہے۔"

"اس کے علاوہ میں ماہر عضویات کی حیثیت سے اتنا اور کہوں گا کہ حقیقی قوت مردمی کم و بیش اکیس سال کی عمر میں حاصل ہوتی ہے اور اس سے پہلے جنسی حاجت محسوس نہیں ہوتی خصوصاً اس صورت میں کہ وہ غیر طبعی تحریکوں کے ذریعے سے قبل از وقت ابھاری نہ گئی ہو مقررہ عمر سے پہلے شہوت جنسی کا پیدا ہونا محض مصنوعی چیز ہے اور اکثر بے راہ تربیت کا نتیجہ ہوتا ہے۔"

---

ل‍ La physiologie de l'amour

"بہر حال آپ یقین کیجئے کہ فطری رجحان کو روکنے میں اس قسم کے خطرے کم ہیں بہ نسبت اس کے کہ وہ قبل از وقت پورا کیا جائے۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میرا کیا مطلب ہے۔"
ان مستند شہادتوں کو نقل کرنے کے بعد جن میں اور بہت سی آسانی سے اضافہ کی جا سکتی ہیں، موسیو بورو نے اس تحریک کو نقل کیا ہے جو ۱۹۰۲ء میں بروسلز میں مجلس سدِّ امراض جسمانی و اخلاقی نے بہ اتفاق رائے پاس کی تھی۔ اس مجلس میں تمام دنیا کے ماہرین فن جمع ہوئے تھے۔ تحریک کے الفاظ یہ ہیں "نوجوانوں کو سب سے بڑھکر اس بات کی تلقین کرنا چاہیئے کہ پاکبازی اور ضبط خواہش نہ صرف بے ضرر ہیں بلکہ ان صفات میں سے ہیں جن پر محض طب اور حفظان صحت کے نقطۂ نظر سے بجد زور دینے کی ضرورت ہے۔"
اس کے بعد موسیو بورو کہتے ہیں "چند سال ہوئے کرسچیانا یونیورسٹی کے طبّی شعبے کے پروفیسروں نے بھی بالاتفاق ایک بیان شائع کیا تھا۔ ہم سب لوگوں کے تجربے کے مطابق یہ قول کہ پاکبازی کی زندگی صحّت کے لئے مضر ہے محض بے بنیاد ہے۔ ہمارے نزدیک تجرد میں عمر بسر کرنے سے کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچتا۔"
"غرض مخالفوں کے دلائل پر غور ہو چکا۔ اب ہم عمرانیات اور اخلاقیات کے ماہر موسیو روئین کے ہمزبان ہو کر کہہ سکتے ہیں کہ "شہوانی خواہش غذا اور ورزش کی ضروریات کی طرح نہیں جسے تھوڑی حد تک بھی پورا کرنا لازمی ہو۔ یہ واقعہ ہے کہ مرد اور عورت پاکبازی کی زندگی بسر کر سکتے ہیں اور بجز چند غیر طبعی اشخاص کے کسی کو کوئی خاص خرابی بلکہ تکلیف تک محسوس نہیں ہو گی۔ یہ کہا جا چکا ہے (اور اس کی جس قدر تکرار کی جائے کم ہے کیونکہ اس بنیادی حقیقت سے بھی اس کثرت سے لوگ ناواقف ہیں) کہ طبعی افراد کو جن کی بہت بڑی اکثریت ہے، ضبط خواہش سے مطلق کسی طرح کی بیماری نہیں ہوتی۔ البتہ خواہش نفس کی پیروی سے بہت سے شدید امراض جن سے ہر شخص واقف ہے پیدا ہوتے ہیں۔ قدرت نے فاضل غذا کے لئے ایک نہایت سہل اور حکمی تدبیر کر دی ہے یعنی

احتلام اور ماہواری ایام "۔

"اس لئے ڈاکٹر ویری کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ یہاں سچی جبلت یا حقیقی حاجت کا سوال نہیں ہے ۔ ہر شخص جانتا ہے کہ اگر وہ غذا کی حاجت پوری نہ کرے یا سانس کی آمد ورفت کو روک دے تو کیا انجام ہوگا لیکن کسی نے کوئی ایسی مثال نہیں بتائی ہے کہ عارضی یا مستقل ضبط خواہش سے کسی طرح کی بیماری شدید یا مزمن پیدا ہوئی ہو......... طبعی زندگی میں ہمیں بہت سے پاکدامن لوگوں کی مثالیں نظر آتی ہیں جو دوسرے لوگوں سے نہ تو سیرت کی پختگی میں کم ہیں نہ ارادے کی قوت میں نہ صحت اور طاقت میں اور اگر وہ شادی کریں تو اولاد پیدا کرنے میں بھی ہیٹے نہ رہیں گے .......... وہ حاجت جس کے مدارج اس قدر مختلف ہوں وہ جبلت جو اس قدر آسانی سے ٹل جائے ۔ اصل میں نہ کوئی حاجت ہے اور نہ کوئی جبلت "۔

محبا معت اس لڑکے کی جو نشو ونما کی حالت میں ہو کسی عضویاتی ضرورت کو پورا نہیں کرتی بلکہ اس کے برعکس اس کی طبعی ارتقا کا تقاضا کامل پاکدامنی سے پورا ہوتا ہے اور وہ لوگ جو اس سے انحراف کرتے ہیں اپنی صحت کو نا قابل تلافی نقصان پہنچاتے ہیں ۔ بلوغ کے ساتھ بڑی بڑی تبدیلیاں ہوتی ہیں ، جسم کے مختلف وظائف میں ہلچل سی مچ جاتی ہے اور ایک عام نشو ونما کا آغاز ہوتا ہے ۔ عنفوان شباب کی منزل میں قدم رکھنے والے لڑکے کو اپنی ساری قوت حیات کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ اکثر اس عمر میں بیماری کی مدافعت کرنے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے اور بیماری اور اموات کی شرح اس سے پہلے کے دور کے مقابلے میں بڑھ جاتی ہے .......... عام نشو ونما اور عضوی ارتقا کا طولانی عمل ، جسمانی اور نفسی تغیرات کا وہ پورا سلسلہ جس کے بعد بچہ مرد بنتا ہے فطرت سے شدید محنت اور سعی کا طالب ہے ۔ ایسے وقت میں ہر طرح کی بے اعتدالی خطرناک ہے خصوصاً شہوانی قوت کا قبل از وقت استعمال "۔

(۵)

پاکدامنی کے عضویاتی فوائد کا ذکر کرنے کے بعد موسیو بورد اس کے اخلاقی اور ذہنی برکات کے

متعلق پروفیسر مانٹی گازا سے ذیل کی عبارت نقل کرتے ہیں :۔

"سب لوگ خصوصاً نوجوان پاکبازی کے فوری فوائد کا تجربہ کر سکتے ہیں۔ اس کی بدولت حافظہ پُرسکون اور قوی ہو جاتا ہے، دماغ میں تیزی اور رسائی، ارادے میں مضبوطی اور مجموعی سیرت میں وہ استحکام پیدا ہو جاتا ہے جو عیاشوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا۔ پاکدامنی کے آئینے میں ہمیں اپنے گرد و پیش کی چیزیں طرح طرح کے خوشنما رنگوں میں نظر آتی ہیں جو کسی بلّور کے ذریعے سے ممکن نہیں۔ اس کی شعاعوں سے کائنات کا ذرّہ ذرّہ منور ہو جاتا ہے اور اس کی بدولت ہم سعادت سرمدی کے ماہ کامل سے نور اور سرور حاصل کرتے ہیں جو گہن سے پاک اور زوال سے بری ہے۔" اور اس پر وہ خود یہ اضافہ کرتے ہیں :۔ "جو طاقتور نوجوان پاکدامن رہتے ہیں ان کی خوشدلی، خوش مزاجی اور اعتماد نفس کے مقابلے میں ان کے ان ساتھیوں کا خواہش کا جنون اور اضطراب قلب باعث عبرت ہے، جو ہوائے نفس کے بندے ہیں۔"

اس کے بعد وہ پاکدامنی کی برکتوں کا مقابلہ "عیاشی کے افسوسناک نتائج سے کرتے ہیں۔ ان کا دعوٰے ہے" ترک خواہش سے کسی قسم کی بیماری پیدا ہونے کی ایک مثال بھی پیش نہیں کی جا سکتی" اخلاقی بے ضبطی سے جو مہلک امراض پیدا ہوتے ہیں ان سے ہر شخص واقف ہے .........

انسان کا جسم ......... اس طرح سے سڑ کر رہ جاتا ہے کہ ناقابل اظہار ہے ......... پھر اس گندگی کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے جو دل و دماغ اور تخیل کو آلودہ کر دیتی ہے۔ جدھر دیکھیئے سیرت و اخلاق کی پستی، شباب کی بے قید ہوس رانی، اور خود غرضی کی شدت کا رونا رویا جاتا ہے۔"

یہ ہے حقیقت شہوانی ضرورت کی جس کے نام سے نوجوان شادی سے پہلے کھل کھیلتے ہیں جو لوگ اس ہوس رانی کے اصول کے حامی ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ خواہش نفس پر قیود عائد کرنے کے معنی ہیں" انسان کی اس آزادی میں مداخلت کہ وہ اپنے جسم سے جس طرح چاہے کام لے۔" مصنّف دلائل کے طومار سے یہ ثابت کرتا ہے کہ شہوانی خواہش کے پورا کرنے کی آزادی پر قیود عائد کرنا عمرانی اور نفسی نقطۂ نظر سے ضروری ہے۔

مصنّف کہتا ہے "عمرانیوں کے نزدیک اجتماعی زندگی محض ایک طلسم ہے گوناگوں تعلقات کا ایک جال ہے عمل اور ردعمل کا جس کے اندر کسی ایسے مشغلے کا تصور بھی ممکن نہیں جو دوسرے مشاغل سے علیحدہ اور دراصل بے ربط ہو۔ خواہ ہم کوئی ارادہ کریں، کسی بات کی کوشش کریں عصبیت ہمارے کاموں کا رشتہ ہمارے ابنائے جنس کے افعال سے جوڑ دیتی ہے اور ہمارا ہر خیال خواہ وہ کتنے ہی گہرے پردوں میں چھپا ہو، ہر خواہش خواہ وہ کتنی ہی بے ثبات ہو اپنا اثر اس قدر دور تک پہنچاتی ہے کہ ہمارا ذہن اس کی وسعت کے اندازے سے معذور ہے۔ انسان کا خاصّہ معاشرت کوئی عارضی یا فروعی خاصیت نہیں۔ یہ اس کی فطرت میں داخل ہے۔ اس کی انسانیت کا جزو ہے۔ اس کا انسان ہونا ہی معاشرت پسند ہونے کا باعث ہے۔ کوئی اور میدان عمل انسانی فطرت سے اس حد تک خصوصیت نہیں رکھتا۔ عضویات اور اخلاقیات، معاشیات اور سیاسیات، علم اور جمالیات، مذہب اور معاشرت غرض سب چیزیں پراسرار روابط، غیر معین تعلقات کے ایک عالمگیر نظام کی پابند ہیں۔ یہ رشتہ اس قدر استوار ہے یہ جال اس قدر مضبوط ہے کہ بعض اوقات عمرانیات کا ماہر انسانی تعلقات کے لامتناہی سلسلے کو جو اس کی آنکھوں کے سامنے زمان و مکان کی وسعت میں پھیلتا چلا جاتا ہے دیکھ کر واقعی بڑی مشکل میں پڑ جاتا ہے۔ وہ ایک ہی نظر میں اس کا اندازہ کر لیتا ہے کہ بعض اوقات انسان کی ذمہ داری کس قدر عظیم الشان ہوتی ہے اور وہ آزادی جو بعض معاشرتی حلقے اسے دینا چاہتے ہیں اس کے مقابلے میں کتنی بے حقیقت ہے۔"

مصنّف آگے چل کر کہتا ہے "اگر ہم یہ مانتے ہیں کہ بعض صورتوں میں انسان کو سڑک پر تھوکنے کی اجازت نہیں ہے ........ تو وہ اتنے بڑے حق کا مطالبہ کیسے کر سکتا ہے کہ اپنی جنسی قوت کو جس طرح چاہے صرف کرے؟ کیا اس قوت کو کوئی دنیا سے نرالی مراعات حاصل ہے کہ وہ عصبیت کے عالمگیر قانون کے اثر سے بچ جاتی ہے؟ آخر وہ کون شخص ہے جو اتنا نہیں سمجھتا کہ اس فعل کی انتہائی اہمیت سے تو فرد کے عمل کا

ردعمل اور بھی شدید ہو جاتا ہے؟ فرض کیجئے کسی نوجوان لڑکے اور لڑکی میں وہ جھوٹی دوستی ہو گئی ہے جس کی حقیقت سے ناظرین واقف ہیں۔ یہ دونوں خیال خام میں رہتے ہیں کہ ان کے پیمان محبت سے کسی اور کو واسطہ نہیں۔ وہ آزادی کے قلعے میں محصور ہو کر اپنے دل کو سمجھا لیتے ہیں کہ ان کے اس فعل سے جو پردہ خلوت میں پوشیدہ ہے معاشرے کو کوئی دلچسپی نہیں اور وہ سراسر اس کی مداخلت سے باہر ہے۔ کیسا طفلانہ دھوکا ہے! اجتماعی عصبیت جو ایک قوم کے کل افراد کو بلکہ قوموں کے دائرے سے آگے بڑھ کر تمام نوع انسانی کو متحد کرتی ہے سب دیواروں سے یہاں تک کہ خلوت خانے کی چار دیواری سے بھی گذر جاتی ہے اور باہمی تعلقات کا زبردست سلسلہ اس مفروضہ ذاتی فعل کو معاشرتی زندگی میں بہت دور کے افعال سے جوڑ دیتا ہے اور اس ربط میں انتشار پیدا کر دیتا ہے۔ ہر فرد جو اپنے اس حق پر اصرار کرتا ہے کہ عارضی یا بے ثمر جنسی تعلقات پیدا کرے، جو اس آزادی کا مطالبہ کرتا ہے کہ اپنی قوت تناسل کو محض اپنی لذت کے لئے استعمال کرے معاشرے میں تفریق اور ابتری کی بنا ڈالتا ہے خواہ اس کا یہ مقصد ہو یا نہ ہو۔ ہمارے معاشرتی ادارے گو وہ ہماری خود غرضیوں اور بے وفائیوں سے بگڑ چکے ہیں، ابھی تک ہم سے اس کے طالب ہیں کہ ہم خوشی سے ان ذمہ داریوں کو قبول کریں جو خواہش تناسل کے ساتھ لازمی طور پر وابستہ ہیں اسی قبولیت کے بھروسے پر معاشرے نے اپنے بے شمار کاروبار پھیلا رکھے ہیں۔ مثلاً ملکیت، اجرت، وراثت تشخیص محصول، فوجی خدمت، حق انتخابات، مدنی حقوق وغیرہ۔ اگر فرد اپنے حصے کی ذمہ داری سے انکار کر دے تو وہ ایک آن واحد میں سارے کارخانے کو ابتر کر دیتا ہے اور معاہدہ اجتماعی کے سب سے اہم اصول کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کے بوجھ کو بڑھاتا ہے اور خود اچھا خاصا مفت خورا، طفیلی، چور، دغا باز ہے۔ ہم معاشرے کے سامنے جس طرح اپنی سب قوتوں کے معاملے میں جواب دہ ہیں اسی طرح جسمانی قوت کے معاملے میں بھی ہیں۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ہم پر اور بھی زیادہ ذمہ داری ہے۔

کیونکہ ایسا معاشرہ جو غیر مسلح ہے اور بیرونی حملوں سے تقریباً آزاد ہے اس چیز کو ہماری مرضی پر چھوڑنے پر مجبور ہے کہ ہم اپنی جسمانی قوت کو مناسب طریقے سے معاشرتی مفاد کے مطابق صرف کریں۔"

اس معاملے کے نفسی پہلو کے متعلق بھی مصنف اسی قدر سخت خیالات رکھتا ہے۔

"مدتوں پہلے کسی نے یہ بات کہی تھی کہ آزادی دیکھنے میں رحمت سہی مگر اصل میں زحمت ہے" یہی تو اس کی عظمت اور شان ہے۔ آزادی قیود عائد کرتی ہے، جبر سے کام لیتی ہے۔ وہ ہر شخص کی سعی کے مجموعے کو بڑھا دیتی ہے۔ ہر فرد آزاد ہونا چاہتا ہے۔ اسے یہ لو لگی ہوتی ہے کہ اپنی خود مختاری کا دائرہ وسیع کرکے اپنے نفس کی تکمیل کرے۔ بات تو سیدھی سی معلوم ہوتی ہے مگر پہلے پہل جو تجربے ہوتے ہیں انھیں سے اس کا پیچیدہ اور تکلیف دہ ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ وحدت ہماری فطرت۔ اور ہماری اخلاقی زندگی کا خاصّہ ہے تو ہوا کرے ہمیں اپنے دل میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ بہت سی لہریں ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد اٹھا کرتی ہیں ان سب میں ہمیں اپنے نفس کا شعور ہوتا ہے مگر تمام باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمیں ان میں انتخاب سے کام لینا چاہیئے۔ ہم بھی جیّد ماہر تعلیمات فارسٹر کے ہم زبان ہو کر پوچھتے ہیں، اے نوجوان تو کہتا ہے کہ تو اپنی مرضی کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ اپنی خودی کو حقیقت کا جامہ پہنانا چاہتا ہے مگر یہ تو بتا کہ تو اپنی خودی کے کس حصّے کو حقیقت کا جامہ پہنائے گا؟ اس کا کون سا حصّہ بہتر اور برتر ہے۔ وہ جس کا مرکز تیری عقلی قوت ہے یا وہ جو تیری فطرت کے پست ترین طبقے یعنی حسیات سے وابستہ ہے؟ اگر یہ سچ ہے کہ جماعت اور فرد کی ترقی اس کا نام ہے کہ روحانیت کو روز بروز فروغ ہو اور روح کو مادّے پر کامل غلبہ حاصل ہو جائے تو ظاہر ہے کہ ہمیں انتخاب میں شبہہ یا تامل نہیں ہوگا البتہ عمل کرنے کی قوت چاہیئے اور کام بھی سہل نہیں ہے۔ شاید آپ یہ جواب دیں" مگر میں تو انتخاب کی ضرورت نہیں سمجھتا میں تو اپنے

نفس کو بہ حیثیت ایک ہم آہنگ اور منظم کل کے حقیقت کا جامہ پہنانا چاہتا ہوں۔ اچھا یوں ہی سہی۔ مگر یہ یاد رکھنا کہ خود یہ ارادہ ایک انتخاب ہے کیونکہ ہم آہنگی قائم کرنے کے لئے نزاع اور انتشار کو دور کرنا پڑتا ہے۔ گوئٹے کا قول ہے "مر کر نئی زندگی حاصل کر" اور یہ محض صدائے بازگشت ہے ان الفاظ کی جو انیس سو سال پہلے مسیحؑ نے کہے تھے" بہ تحقیق میں تم سے کہتا ہوں جب تک گیہوں کا دانہ زمین پر گر کر فنا نہ ہو جائے وہ اکیلا رہتا ہے مگر فنا ہونے کے بعد وہ خوب پھلتا ہے۔"

موسیو گابریل سیائے لکھتے ہیں" ہم آدمی بننا چاہتے ہیں۔ یہ بات کہنے میں تو سہل ہے مگر حق ہمیشہ فرض کی صورت اختیار کر لیتا ہے ایسے سخت فرض کی جس میں ہر شخص کم و بیش قاصر رہتا ہے۔ ہم بہت اکڑ کر کہتے ہیں کہ ہم آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ اگر آزادی سے مراد ہے جو جی چاہے وہ کرنا یعنی جبلی خواہشات کی غلامی تو ہمیں اس پر اس قدر فخر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر سچی آزادی مراد ہے تو ہمیں کمر باندھ کر اس لڑائی کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے جو کبھی ختم نہیں ہوگی۔ ہم اپنی وحدت کا اپنی شخصیت کا اپنی آزادی کا ذکر کرتے ہیں اور بڑے فخر سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم خدا کے لافانی بیٹے ہیں۔ مگر افسوس! جب ہم اس نفس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں تو وہ ہاتھ نہیں آتا بلکہ بہت سے بے ربط اجزا میں تحلیل ہو جاتا ہے جو ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں۔ متضاد خواہشات اس کے اندر انتشار پیدا کرتی ہیں اور انھیں خواہشات سے وہ مرکب ہے۔ اس کے مخصوص جوہر کے علاوہ اس کی حقیقت سوائے ان تعصبات کے جو اس پر غالب ہیں اور ان تحریصات کے جو اسے لبھاتی ہیں اور کچھ نہیں۔ اس کی مفروضہ آزادی اصل میں غلامی ہے جو اسے محسوس نہیں ہوتی اور اسی لئے وہ اس کا مقابلہ نہیں کرتا۔"

روئیین کہتا ہے" ضبط نفس وہ نیکی ہے جو سکون و اطمینان سے معمور ہے مگر نفس پرستی ایک اجنبی مہمان کو بلا لاتی ہے جس سے ہلاکت کا خطرہ ہے۔ خواہش نفس کا ظہور یوں تو ہر عمر میں تکلیف دہ ہوتا ہے مگر جوانی میں تو یہ خطرہ ہے کہ وہ انسان کو وضع فطرت سے

بالکل منحرف نہ کردے یعنی قوت ارادی اور حسیات کے توازن کو ناقابل تلافی طور پر بگاڑ نہ دے۔
ایک لڑکا جو پہلی بار کسی عورت سے خواہ وہ کوئی بھی ہو وقتی دلچسپی کے طور پر صحبت کرتا ہے وہ اصل میں اپنی جسمانی، ذہنی اور اخلاقی زندگی کو جوکھم میں ڈال رہا ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ کل اس کا اثر اسے اپنے گھر میں اپنے کام میں اپنی معاشرتی زندگی میں نظر آئے گا وہ نہیں جانتا، کہ حسی لذت کا انکشاف کیونکر بھوت بن کر اس کے پیچھے پڑ جائے گا، اسے حقیقی معنی میں اپنا بندہ بنائے گا اور یہ بندگی ایسی ہوگی جس سے نجات کی آس نہیں۔ ہم نے بہت سی زندگیاں دیکھی ہیں جن سے ابتدا میں بڑی بڑی امیدیں تھیں مگر آگے چل کر برباد گئیں اور ان کی پہلی ناکامی کی گھڑی وہی تھی جو ان کی پہلی اخلاقی لغزش کی تھی۔"

"شاعر کے مشہور اشعار میں فلسفی کے ان الفاظ کا مضمون یوں ادا کیا گیا ہے:۔

انسان کی اچھوتی روح ایک گہرے برتن کی طرح ہے
اگر وہ پہلے قطرے جو اس میں ڈالے جائیں ناپاک ہوں
تو پھر چاہے اسے سات سمندر کے پانی سے دھوئیں
اس کی اتھاہ گہرائی کسی طرح پاک نہیں ہو سکتی۔"

"گلاسگو یونیورسٹی کے عضویات کے پروفیسر جان جی۔ ایم کینڈرک کی نصیحت بھی اس سے کم اہم نہیں۔" جذبہ شہوانی کو جو نیا نیا پیدا ہوتا ہے ناجائز طور پر تسکین دینا نہ صرف اخلاقی جرم ہے بلکہ جسم کے لئے بھی نہایت مضر ہے۔ یہ نئی ضرورت اگر پوری کردی جائے تو ظالم حاکم کی طرح سر پر سوار ہو جاتی ہے۔ مجرمانہ مروّت سے کام لے کر انسان اس کی اطاعت کرتا ہے اور اسے اور بھی تحکم پسند بنا دیتا ہے۔ ہر نئے فعل سے عادت کی زنجیر میں ایک اور کڑی بڑھ جاتی ہے۔

"بہتوں میں اُسے توڑنے کی طاقت نہیں رہتی اور بے بسی کی حالت میں ان کا خاتمہ جسمانی اور ذہنی تباہی پر ہوتا ہے۔ وہ اس عادت کے غلام بن کر رہ جاتے ہیں جو اکثر

بدی کی وجہ سے نہیں بلکہ جہالت کی وجہ سے پڑ جاتی ہے۔ اس سے محفوظ رہنے کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ انسان اپنے خیالات کو پاک رکھے اور اپنی ساری زندگی کا انضباط کرے۔"

اس کے بعد موسیو بورو ڈاکٹر دیس کاند کا یہ قول نقل کرتے ہیں "رہی جنسی خواہش سو ہمارا دعوٰے ہے کہ عقل اور ارادے کو اس پر پورا پورا قابو حاصل ہے۔ یہ ضروری ہے کہ جنسی حاجت کا نہیں بلکہ جنسی خواہش کا لفظ استعمال کیا جائے کیونکہ یہ کوئی عضوی وظیفہ نہیں ہے جس کے پورے ہونے پر انسان کی زندگی موقوف ہو۔ حقیقت میں یہ کوئی حاجت نہیں ہے مگر بہت سے لوگوں نے اسے حاجت سمجھ رکھا ہے۔ وہ اس خواہش کو جس نظر سے دیکھتے ہیں اس کی وجہ سے ان کے نزدیک جماع اشد ضروری چیز ہے ہم تو ہرگز اس فعل کو فطری قوانین کی اضطراری اور انفعالی اطاعت کا نتیجہ نہیں سمجھتے۔ بلکہ ہمارے خیال میں وہ ایک فعل اختیاری ہے جو اپنے قصد یا اپنی مرضی سے کیا جاتا ہے اور اکثر اس کی تجویز اور تیاری پہلے سے ہوتی ہے۔" (باقی آئندہ)

# قربانی

ہر ملک اور ہر قوم کی ابتدائی تہذیب میں جبکہ انسان کے دماغ میں خدائے واحد کا تخیل اور اس کی صفات کا تصور ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ انسان اپنے ذہنی دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے انسان اور جانور کی قربانی کو سب سے زیادہ افضل سمجھتا تھا کیونکہ وہ اپنے دیوتاؤں کو اپنا ہی جیسا کھانے پینے کا پابند اپنی ہی شکل کے مشابہ اور اپنے ہی جیسے جذبات رکھنے والا خیال کرتا تھا جیسا کہ پرانے دیوتاؤں کے مجسموں کے مشاہدے سے ثابت ہوتا ہے جو انسانی شکل کے مشابہ ہیں۔ رفتہ رفتہ جب انسان کی دماغی حالت میں کچھ ترقی ہوئی تو اس نے دیوتاؤں پر انسان کا خون چڑھانا ترک کر دیا لیکن جانوروں کی قربانی بعض قوموں میں اب تک جاری ہے، جیسے ہندوستان میں کالی کلکتہ والی پر آج بھی ہزارہا جانور قربان کئے جاتے ہیں ہر نوع قربانی کی ابتدا ہر ملک اور ہر قوم کی ابتدائی تہذیب میں اسی باطل اعتقاد کے ماتحت ہوئی کہ خدا اپنی شکل، ضروریات عادات و جذبات میں انسان کے مشابہ ہے اور جو جانور شراب پھل پھول اور زیورات وغیرہ اس پر چڑھائے جاتے ہیں وہ ان کا جوہر استعمال کرتا ہے اور چونکہ یہ قربانی کی رسم انسان کے دماغ میں خدا کا تصور پیدا کرنے کے لئے ہزارہا سال سے امداد کرتی چلی آرہی تھی اور اُس زمانہ کے نیم وحشی انسان کی فطرت کا ایک جزو ہو گئی تھی اور ان کی ضروریات زندگی اور تمدن کے لحاظ سے ان کے لئے بہت مفید تھی اس لئے فطرت انسانی کے پیدا کرنے والے خدا نے جب عرب کی نیم وحشی قوم میں آج سے چودہ سو برس پہلے نبی آخر الزماں کے ذریعہ سے اپنی ذات و صفات کا صحیح تصور قائم کرنا چاہا تو اس مروجہ رسم کو شراب یا "ربا" (یعنی مستحقین خیرات وزکوٰۃ و قرض حسنہ کو دو گنے اور چوگنے سود پر روپیہ قرض دینا) کی طرح سے حرام یا ناجائز نہیں کیا کیونکہ وہ شراب یا ربا کی طرح سے مخرب اخلاق یا مضر نہیں تھی بلکہ وقتی اور مقامی تمدنی ضروریات کے لحاظ سے ایک

مفید اور کارآمد رسم تھی مگر چونکہ وہ ایک باطل اعتقاد کے ماتحت دیوتاؤں کو خوش کرنے کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی اس لئے جب خدا نے اس کے وقتی اور مقامی فوائد کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کو مثل شراب و ربا کے حرام یا ناجائز نہیں کیا تو یہ لازمی بات تھی کہ جس باطل عقیدے کے ساتھ یہ وابستہ تھی اس عقیدے کی تردید و تکذیب کر کے خدائے واحد کے عقیدے کے ساتھ اس کو وابستہ کیا جائے چنانچہ اس کے متعلق جو آیت کلام مجید میں نازل ہوئی ہے وہ یہ ہے۔" ۲۲ : ۳۷۔ لن ینال اللہ لحومھا و لا دماؤھا و لکن ینالہ التقویٰ منکم۔ یعنی نہ تو ان کا گوشت اور نہ خون خدا قبول کرتا ہے بلکہ وہ تمہارا تقویٰ (یعنی برائیوں سے بچنا) قبول کرتا ہے۔" اور پھر دوسری جگہ ارشاد فرمایا "۴۹ : ۱۵۔ او جاھد و اباموالھم و انفسھم فی سبیل اللہ اولئک ھم الصدقون (یعنی اور جو خدا کی راہ میں اپنی دولت اور اپنے نفس کے ساتھ کوشش کرتے ہیں وہی سچے مومن ہیں") ان دونوں آیتوں کا جن میں پہلی خاص قربانی کے متعلق ہے اور دوسری بطور عام حکم کے ہے یہی مطلب ہے کہ جانوروں کی خونریزی خدا کی نظروں میں کوئی فعل احسن نہیں ہے کیونکہ وہ گوشت اور خون کو قبول نہیں کرتا ہے جیسا کہ اسلام سے پہلے لوگوں کا اعتقاد تھا بلکہ اس کے نزدیک سچا مومن وہ ہے جو برائیوں سے بچتا ہے اور خدا کی راہ میں اپنے جان و مال سے کوشش کرتا ہے یعنی بنی نوع انسان کی خدمت کرتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب جانوروں کی قربانی خدا قبول نہیں کرتا ہے تو پھر ان کا ذکر کلام مجید میں کیوں آیا اور ان کی قربانی کے متعلق ہدایتیں کس لئے نازل ہوئیں۔ غلامی کی رسم کے متعلق کلام مجید کے احکام پر غور کرنے سے یہ سوالات خود بخود حل ہو جائیں گے۔ اس رسم کے متعلق کلام مجید نے کہیں صاف الفاظ میں ممانعت نہیں کی بلکہ اس کو جائز رکھتے ہوئے غلاموں کے ساتھ نیک سلوک کرنے اور ان کو آزاد کرنے کی جابجا ترغیب دی ہے اور اس کو ایک کار ثواب بتلایا ہے اور بعض مقامات پر کسی فرض کی عدم ادائگی کے کفارے یا کسی قصور کی تلافی میں غلاموں کو آزاد کرنے کا حکم دیا ہے تو کیا کلام مجید میں اس رسم کے بند کرنے کا صاف حکم نہ ہونے اور گناہوں کے

کفارے میں غلاموں کو آزاد کرنے کی ہدایتیں موجود ہونے سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ غلامی کی رسم کو قائم رکھنا خدا کی منشا کے مطابق ہے اور اگر اس کو قائم نہ رکھا گیا تو بعض گناہوں کے کفارے میں جو غلاموں کو آزاد کرنے کا حکم ہے اس کی حکم عدملی ہو جانے سے مسلمان گناہ کے مرتکب ہو جائیں گے۔ اکثر مسلمانوں کا ایسا عقیدہ ہے تو اسلام پر غیر مسلم کا یہ اعتراض بالکل صحیح ہوگا کہ اسلام نے اس وحشیانہ رسم کو جائز قرار دے دیا لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مسلمان کبھی اسلام پر اس اعتراض کا عائد کیا جانا پسند نہیں کرتے بلکہ اس کے خلاف یہ ثابت کرتے ہیں کہ اسلام ہی نے سب سے پہلے اس رسم کے بند کرنے کی کوشش کی۔ اگر رسم غلامی کے متعلق کلام مجید میں صاف الفاظ میں ممانعت نہ ہوتے ہوئے بلکہ برعکس اس کے غلاموں کے ساتھ سلوک کرنے اور گناہوں کے کفارے میں آزاد کرنے کی ہدایتیں موجود ہوتے ہوئے مسلمان اس رسم کو بند کرنے سے کسی گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ جانوروں کی قربانی کے متعلق محض کلام مجید میں بعض ہدایتیں موجود ہونے سے اس رسم کو بند کرکے دوسرے مفید ذرائع سے اس کی روح کو قائم رکھنے سے مسلمان کیونکر کسی گناہ کے مرتکب ہو سکتے ہیں۔ خاصکر ایسی حالت میں جبکہ کلام مجید نے صاف بتلا دیا کہ خدا جانوروں کا گوشت یا خون قبول نہیں کرتا بلکہ وہ تمہارا تقوےٰ پسند کرتا ہے۔ جس طرح سے بعض مخصوص وقتی اور مقامی وجوہات کی بنا پر کلام مجید نے رسم غلامی کو قائم رکھا اور فوراً بند کرنے کا صاف الفاظ میں حکم نہیں دیا اسی طرح سے بعض دیگر وقتی اور مقامی وجوہات کی بنا پر جن کی تفصیل اوپر بیان کی گئی ہے رسم قربانی کو بھی قائم رکھا اور فوراً بند کرنے کا حکم نہیں دیا اور جس طرح رسم غلامی کی موجودگی میں بہترین انسانی خدمت غلاموں کو آزاد کرنے کے ذریعہ سے کی جا سکتی تھی وہ رسم غلامی کے بند ہو جانے کی صورت میں ان جدید ذرائع سے کی جا سکتی ہے جو موجودہ کشمکش حیات کے باعث غلاموں کو آزاد کرنے کے مقابلے میں زیادہ اہم اور مفید ہیں۔ اسی طرح سے آج سے چودہ سو برس پہلے کے مقامی طرز معاشرت کی موجودگی میں جو بہترین انسانی خدمت جانوروں کو قربان کرکے ان کا گوشت

تقسیم کر کے کی جا سکتی ہیں۔ وہ آج اس ترقی تہذیب کے زمانے میں جبکہ مسلمانوں کی تعداد کروڑوں سے تجاوز کر گئی اور ان کی ضروریات تبدیل ہو گئیں اور کثیر التعداد ہو گئیں اور ان کا طرق زندگی بدل گیا ان جدید ذرائع سے کی جا سکتی ہے جو تقسیم گوشت کے مقابلہ میں زیادہ ضروری اور منفعت بخش ہیں مثلاً درسگاہیں، یتیم خانے، خیراتی شفاخانے، تجارتی کمپنیاں اور کارخانے وغیرہ قائم کرنا۔

اب ہم قربانی کی اس آیت پر غور کریں گے جو کلام مجید میں خاص قربانی کی ہدایت کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ "۲۲: ۲۷ و ۲۸ - وَاَذِّن فی الناس بالحج یاتوک رجالاً وّعلیٰ کلِّ ضامرٍ یاتین من کلّ فجٍ عمیق ؕ لیشھدوا منافع لھم ویذکروا اسم اللّٰہ فی ایّامٍ معلومات علیٰ ما رزقھم من بھیمۃ الانعام ج فکلوا منھا واطعموا البائس الفقیر۔ ترجمہ۔ اور انسان کے درمیان حج کا اعلان کر دے وہ تیری طرف پیدل اور ہر جھکے ہوئے اونٹ پر آئیں گے ہر ایک دور کے راستے سے آتے ہوئے تاکہ وہ اپنے واسطے فائدے دیکھیں اور مقررہ اوقات میں خدا کا نام لیں ان پر جو کہ اس نے ان کو چوپایوں سے دیا ہے، تب اس میں سے خود کھاؤ اور مصیبت زدہ اور محتاجوں کو کھلاؤ۔" ان آیات میں قربانی کے متعلق صرف دو ہدایتیں ہیں ایک یہ کہ جو کچھ چوپایوں کی قسم سے خدا نے ان کو دیا ہے اس پر مقررہ وقت میں خدا کا نام لیں اور دوسرے یہ کہ اس میں سے خود کھائیں اور مصیبت زدہ اور محتاجوں کو کھلائیں۔ غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرنے کا اصول "اوجاھِم واباموا لھم" عملی طور پر سمجھانے کے لئے اور خدائے واحد کا تصوّر ذہن میں پیدا کرنے کے لئے ابتدائی طریقہ قدرتی طور پر یہی ہو سکتا تھا کہ جو رسم قربانی ان میں قدیم الایام سے جاری تھی اور ان کی وقتی اور مقامی ضروریات کے اعتبار سے ان کے لئے مفید تھی اسی کے ذریعے سے ان کو یہ دونوں باتیں سمجھائی جائیں لہٰذا خدائے واحد کے تصوّر کی طرف رہنمائی کرنے کے لئے مقررہ اوقات میں اس پر خدا کا نام لینے کی ہدایت کی گئی اور غریبوں اور محتاجوں کی امداد کا سبق سکھانے کے لئے اس میں سے مصیبت زدہ اور محتاجوں کو کھلانے کا حکم نازل ہوا۔ باقی جانوروں کی قربانی کا جہاں تک تعلق ہے وہ صرف ان دونوں اصولوں کو عملی طور پر

سمجھانے کا ایک مقامی اور ابتدائی ذریعہ ہے نہ کہ ایک دائمی حکم ہے۔ اگر خدا جانوروں کی قربانی کا اپنی طرف سے حکم دیتا تو وہ اپنے ہی حکم کے متعلق یہ کبھی نہیں فرماتا کہ "میں ان کا گوشت اور خون قبول نہیں کرتا ہوں" اس کی مثال ایسی ہے جیسی والدین اور بچوں کی جب بچے بالکل چھوٹے ہوتے ہیں اور ان کی ذہنیت محدود ہوتی ہے تو والدین ان کی بہت سی باتوں کو برداشت کرکے ان کی صرف اس قدر تصحیح کر دیتے ہیں جتنی کہ ان کے لئے مفید ہوتی ہے اور جتنی کہ وہ اس عمر میں سمجھ سکتے ہیں اور برداشت کر سکتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ بچوں کی صحت کے لئے کھیل کود بہت مفید ہے لیکن وہ کھیلتے میں اپنے جسم کو غلاظت بھی لگا لیتے ہیں مگر سمجھدار والدین ان کو محض غلیظ ہو جانے کی وجہ سے کھیل کود سے قطعی منع نہیں کرتے ہیں بلکہ ان کو صاف رہنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ خود اپنے ہاتھ سے ان کو نہلاتے دُھلاتے اور صاف کپڑے پہناتے ہیں لیکن جب وہ بڑے ہو کر سمجھدار ہو جاتے ہیں اس وقت والدین ان کے کھیل کود میں مصروف رہنے کو پسند نہیں کرتے کیونکہ اب کھیل کود ان کے لئے مضر ہے۔ کھیل کود کی بجائے اب ان کے لئے مشکلات زندگی کا مقابلہ کرنا زیادہ مفید ہے۔ اس حقیقت سے کوئی تاریخ داں انکار نہیں کر سکتا کہ نزول قران کے وقت عرب ایک متمدن قوم ہونے کے اعتبار سے ایک بچہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی اور خدا کا انسان کے ساتھ تعلق بالکل والدین کی طرح سے مانا جاتا ہے لہٰذا جب تمدن کے بچے کو تمدن کی ابتدائی باتیں سکھائی گئیں تو بالکل بچوں کے کھیل کود کی طرح سے ان کی قربانی کی رسم کو ان کے وقتی اور مقامی مفاد کی غرض سے برداشت کیا لیکن اس کی غلاظت سے روکنے کے لئے ان کے اس باطل اعتقاد کی تغلیط کر دی گئی کہ خدا جانوروں کی قربانی سے خوش ہوتا ہے مگر چونکہ اب تمدن کا بچہ اپنی بچپن کی منزلیں طے کر چکا تو اس کے لئے جانوروں کی قربانی کا کھیل کود مفید نہیں رہا اب اس کے لئے اپنی جان و مال سے بنی نوع انسان کی خدمت کرنے کے وہی آج سے چودہ سو برس پہلے کے عرب کے وقتی اور مقامی ذرائع بیکار ہیں چونکہ زندگی بالکل بدل گئی لہٰذا زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے ذرائع بھی بدل گئے لہٰذا اب اس کو

بنی نوع انسان کی خدمات کے وہی ذرائع استعمال کرنے چاہئیں جو اس کی موجودہ ضروریات کے لحاظ سے مفید ہوں تاکہ وہ خدا کی خوشنودی کا باعث ہوں اور یہ مسئلہ اس قدر صاف ہے کہ اس میں اور مزید بحث کی ضرورت نہیں تاہم اتمام حجت کے واسطے ہم ایک اور پہلو سے بھی اس پر غور کریں گے حج کے متعلق جو آیت اوپر نقل کی گئی اس میں خدا نے یہ پیشینگوئی کی ہے کہ اسلام تمام دنیا میں پھیل جائے گا اور لوگ دور دراز ممالک سے پیدل اور اونٹوں پر حج کے لئے آیا کریں گے۔ اگرچہ اس عالم الغیب خدا کو یہ علم تھا کہ لوگ ریلوں، موٹروں اور طیاروں میں بھی حج کے لئے آیا کریں گے لیکن اس پیشینگوئی میں اس نے ان سواریوں کا ذکر اس لئے نہیں کیا کہ اس زمانے کے لوگ ان چیزوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے بلکہ سواری کے لئے صرف اونٹ کا لفظ استعمال کیا کیونکہ عرب میں دور دراز سفر کے لئے اس زمانہ میں صرف اونٹ ہی استعمال ہوتا تھا، لہٰذا دور دراز سفر کی سواری کے لئے صرف اونٹ کا لفظ استعمال کیا گیا اور چونکہ خدا نے اس پیشینگوئی میں سواری کے لئے صرف اونٹ کا لفظ استعمال کیا ہے اس لئے اگر اونٹ کے لغوی معنی ہی لئے جاویں تو خدا کی پیشینگوئی غلط ہوئی جاتی ہے مگر چونکہ خدا کی پیشینگوئی غلط نہیں ہو سکتی لہٰذا اونٹ کے معنی لازمی طور پر سواری کے لینے پڑیں گے یعنی لوگ مختلف قسم کی سواریوں میں جو جس زمانہ میں رائج ہوں گی حج کے لئے دور دراز راستہ سے آیا کریں گے۔ لہٰذا جب اُسی آیت میں ایک مخصوص چوپایہ یعنی اونٹ کا لفظ مختلف سواریوں کا مفہوم اپنے اندر شامل رکھ سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ انہیں وجوہات کی بنا پر چوپایوں کا لفظ جو اس زمانہ میں معیار دولت سمجھے جاتے تھے دولت کا مفہوم اپنے اندر شامل نہ رکھتا ہو اور جب اونٹ کی سواری کے بجائے جس کا نام کلام مجید میں مخصوص طور پر بیان کیا گیا ہے ریل، موٹر اور طیارے جو اس زمانہ میں بہترین اور مفید ترین سواری کے ذرائع ہیں حج کے لئے استعمال ہو سکتے ہیں تو چوپایوں کی بجائے جو اب معیار دولت نہیں رہے اور جن کو خدا تو پہلے ہی سے قبول نہیں کرتا تھا روپیہ پیسہ جو اس زمانہ میں بہترین اور مفید ترین معیار دولت ہے کس وجہ سے استعمال نہیں ہو سکتا۔

عید الضحیٰ اور حج کے موقع پر اب جانوروں کی قربانی کی قطعی ضرورت نہیں کیونکہ اس زمانہ میں نہ تو اس سے قوم کو وہ فائدہ پہنچتا ہے جو اس زمانہ میں پہنچ سکتا تھا جبکہ مسلمان، صرف عرب کے اندر ہی محدود تھے اور انکی سیدھی سادی ضروریات میں صرف پیٹ بھرنے ہی کی ضرورت سب سے زیادہ اہم ضرورت تھی بلکہ جانوروں کی قربانی کی بجائے روپیہ اور پیسہ کی قربانی کی ضرورت ہے کیونکہ اول تو ان کی تعداد اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اگر تمام دنیا کے مسلمان جن پر حج فرض ہو سکتا ہے حج کے واسطے مکہ معظمہ جائیں اور وہاں کروروں کی تعداد میں چوپائے قربان کریں تو ان کا محض گوشت ہی ضائع نہ جائے بلکہ وہ جگہ اتنی غلیظ ہو جائے کہ رہنے کے قابل بھی نہ رہے اور دوسرے مسلمانوں کی ضروریات اب محض پیٹ بھرنے ہی تک محدود نہیں رہی ہیں بلکہ اس سے اور زیادہ اہم ضروریات ہیں جن کے پورا کرنے سے مسلمانوں میں محتاجوں کی تعداد خود بخود کم ہو سکتی ہے اور جن پر ان کی قومی بقا و استحکام کا دارومدار ہے اور جو مسلمانوں کی خاص توجہ کی محتاج ہیں۔ کس قدر افسوس اور عبرت کا مقام ہے کہ مسلمان ہر سال عید الضحیٰ اور حج کے موقع پر اپنا کرورہا روپیہ چوپایوں کی بیکار خونریزی پر صرف کریں اور جس کے باعث ہندوستان میں انسانی خونریزی مزید برآں ہو اور یہ تصور کریں کہ اس بیکار حیوانی اور انسانی خونریزی سے خدا خوش ہوتا ہے جبکہ اس نے صاف صاف الفاظ میں یہ فرما دیا کہ میں ان کا گوشت یا خون قبول نہیں کرتا اور جبکہ ان کے کرورہا مفلس بیمار اور کمزور بھائی جو واقعی امداد کے مستحق ہیں بھوکے اور پیاسے گرمی سردی اور بیماری کی تکلیفیں برداشت کرتے ہوئے ٹھوکریں کھاتے پھریں اور جبکہ ان کے ہزاروں قومی بہبودی اور ملکی ترقی کے کام روپیہ کی کمی کی وجہ سے نامکمل پڑے رہیں یا برباد ہو جائیں۔ کیا وہ مذہب جس نے یگانگی اور انسانی برادری کا سبق اول اور آخر مرتبہ دنیا میں انسان کو سکھایا۔ قوم کے محتاج اور اپاہج لوگوں کی پرورش نگرانی اور تعلیم اور قومی اور ملکی ترقی کے واسطے زکوٰۃ کو فرض کیا اور خیرات کرنے اور اپنی جان و مال سے بنی نوع انسان کی خدمت کرنے کو سچے مومن کا شعار بتلایا اس ظلم و ستم کو روا رکھ سکتا ہے۔

بہرحال رسم قربانی کے متعلق جو آیات کلام مجید میں نازل ہوئی ہیں ان پر جس پہلو سے بھی غور کیا جائے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ جانوروں کی قربانی بذات خود کوئی خدا کا استمراری حکم یا نیکی یا اس کے خوش کرنے کا ذریعہ نہیں ہے خدا تو برائیوں سے بچنے اور اپنی جان و مال سے بنی نوع انسان کی خدمت کرنے سے خوش ہوتا ہے اور اس خدمت کا جو بہترین اور مفید ترین ذریعہ جس ملک اور جس زمانے میں ہو اسی ذریعے کے استعمال کرنے میں خدا کی منشاء کے مطابق خدا کی فرمانبرداری ہوتی ہے لہٰذا اگر اس زمانہ میں ہندوستان کے مسلمان خدا کی منشائے کے مطابق قربانی کی رسم جاری رکھنا چاہتے ہیں جیسا کہ ہر سچے مومن کا فرض ہے تو ان کو عید الضحیٰ اور حج کے موقعوں پر ان موجودہ اسلامی انجمنوں کو روپیہ بھیجنا چاہیئے جو ان کے نزدیک انسانی خدمات کر رہی ہیں اور ان تمام انجمنوں کو ایک مرکزی تنظیم کے ماتحت قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے جیسی جماعت احمدیہ کی مرکزی تنظیم قایم ہے۔

(مضمون نگار صاحب نے "ضروریات حیات" اور "اسلامی انجمنوں" کے بقا کی فکر میں یہ نہیں خیال رکھا کہ افراد کی مصلحت اندیشی سے اصول دین میں ترمیم نہیں ہوا کرتی۔

حقیقت یہ ہے کہ حج اسلام کا نہایت اہم رکن ہے جس کے اوپر امت اسلامیہ کی اجتماعی فلاح و بہبود کا انحصار ہے دنیا کی کسی قوم اور کسی ملت کے پاس حج جیسی مقدس انجمن نہیں ہے حج کے ذریعہ سے ساری امت اسلامیہ ایک ہو سکتی ہے اور میدان عرفات میں ہر سال کے خاتمہ پر نئے سال کے لئے اجتماعی لائحہ عمل امت کے واسطے مرتب کرکے پیش کیا جا سکتا ہے اس اجتماع ملت کی حیثیت جس میں اطراف عالم سے مسلمان آکر شریک ہوتے ہیں ضیوف الٰہی کی حیثیت ہے۔ اس لئے اللہ نے ان لوگوں جن کو اس نے دولت دے رکھی ہے فرض کر دیا ہے کہ اس موقع پر قربانیاں کرکے خود بھی کھائیں اور غرباء اور مساکین کو بھی کھلائیں۔ قرآن میں ہے "فکلوا منھا و اطعموا القانع والمعتر"

اس حقیقت کو پیش نظر رکھنے کے بعد کون ہے جو دنیاوی لحاظ سے بھی حج یا قربانی کی مخالفت کر سکتا ہے یا اس کے اوپر کسی وقتی یا ہنگامی ضرورت کو ترجیح دے سکتا ہے۔

رہیں مقامی قربانیاں سو وہ فریضہ نہیں ہیں بلکہ سنت ہیں۔ مگر سال بھر میں ایک دن قربانی کرکے کھانے اور کھلانے سے جس کا مقصد اجتماعیات میں شرکت ہے کونسا نقصان ہے کہ اس میں تبدیلی کی جائے اور پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ قربانی کو بند کرنے کے بعد وہ رقم لازمی طور پر اسلامی انجمنوں کو مل جایا کرے گی؟ (م۔ ج))

# اسلام اور حالات حاضرہ

(یہ جناب محمد ابراہیم صاحب میر سیالکوٹی کا ایک لیکچر ہے جو انہوں نے جامعہ ملیہ کے سامنے ۷ار نومبر ۱۹۳۲ء کو دیا تھا)

اہل مشرق، عام اس سے کہ ہندو ہوں یا مسلمان، اس پر متفق ہیں کہ بعض ہستیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو دوسروں کے لئے موجب خیر و برکت اور باعث فیض و رحمت ہوتی ہیں ان کی برکات اخلاقی و روحانی بھی ہوتی ہیں اور مادّی بھی یعنی تمدنی و سیاسی،

اہل یورپ کی ظاہر پرست مادّی آنکھ نور روحانیت و اخلاقی شرافت سے بے بہرہ ہے اس لئے وہ اس حقیقت کے ادراک سے قاصر ہیں۔ ان کی تمام سعی مادّی ترقی میں خرچ ہوتی ہے اور ان کے ظاہری و باطنی قویٰ تمام تر اسی میں مصروف عمل ہیں۔ اس لئے ان کو اس کی تحصیل میں ننگ انسانیت پیشوں کے اختیار کرنے سے بھی عار نہیں۔

یورپ کی اس مادّی ترقی نے اہل مشرق کے دل و دماغ کو بھی حیران و پریشان کر دیا ہے اور ہم اس کریہہ و ناگوار طبع منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے سادہ لوح بھائی اپنے آبائی مفاخر کو فراموش کر کے اور اپنی مایۂ ناز اخلاقی شرافت کو بالائے طاق رکھ کر یورپ کی اندھا دھند تقلید کر رہے ہیں، کچھ تو ان کی مادّی ترقی دیکھ کر اور کچھ ان کے زیر اثر نشوونما پا کر وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ یورپ کے عروج و ترقی کا اصلی سبب یہی بے دینی و بداخلاقی ہے اور بس۔ اس طرح سے آہستہ آہستہ روحانی کیف اور اخلاقی اثر ان کے دل و دماغ سے بلکہ فطرت سے مٹ رہا ہے۔ فانا للہ

ایسی ترقی انسانیت کے لئے ہلاکت کا گڑھا ہے۔ کیونکہ انسان روح اور جسم ہر دونوں سے مرکب ہے جس طرح اسے جسم کی پرورش کے لئے مادی چیزوں کی ضرورت ہے اسی طرح اسے

روح کی تربیت وہدایت کے لئے روحانی امور کی بھی حاجت ہے۔

یہ امرِ مسلّم کل ہے کہ روح جوہر شریف ہے اور مادہ ایک خسیس چیز ہے پس خسیس جزو کی پرورش میں لگ کر شریف جوہر سے غافل و بے پروا ہو جانا شانِ عقلمندی کے خلاف ہے۔

ایسے ہی لوگوں کے مناسب حال قرآن مجید میں ارشاد ہے:۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِيْنَ أَعْمَالًا ۝ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝

(کہف پ۱۶)

یعنی (اے پیغمبرؐ!) اُن سے کہو کہ کیا ہم تم کو ایسے لوگوں کی خبر بتائیں جو اپنی عملی زندگی میں نہایت ہی خسارے میں ہیں یہ وہ ہیں جن کی ساری سعی دنیوی زندگی (کے اسباب کی تحصیل میں) برباد ہو گئی۔ اس پر بھی وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم جو کچھ بھی کر رہے ہیں اچھا کر رہے ہیں۔"

چونکہ یورپ کے اس جن کا تسلط ہم ہندوستانیوں (ہندو ہوں یا مسلمان) سب کے دماغوں پر تقریباً پورا پورا ہو چکا ہے۔ اور بدقسمتی سے ہمارے مذاق اخلاقی و روحانی حلاوت سے بے ذوق ہو گئے ہیں اس لئے بقولے "اگر زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" میں اس کے متعلق اس تھوڑے سے وقت میں صرف یہ بیان کر سکوں گا کہ "دین و دنیا میں کیا جوڑ ہے" اور ایک انسان ایک ہاتھ میں دین اور دوسرے میں دنیا لے کر کس طرح زندگی بسر کر سکتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر یہ کہ دیندار و پرہیز گار رہتے ہوئے بھی ہم کس طرح دنیا میں ایک مقتدر و مختار قوم بن سکتے ہیں۔ خدا کے فضل سے اسی میں آپ کا موجودہ عقدہ اسلام اور حالات حاضرہ بھی حل ہو جائے گا۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْ إِلَّا بِاللّٰهِ

اسلام سے بیشتر عرب کے لوگ تین طرح پر تھے۔

ایک دنیا کی عیش و عشرت میں منہمک اور جسمانی لذتوں سے سرشار، توہم پرستی میں مبتلا اور رواج و رسمیات کے پھندوں میں گرفتار، وقت کے فیشن کے شیدائی اور مقتضائے حال کے فدائی، خدا سے غافل، عقل و انجام بینی کے دشمن، جذبات نفس کے مقہور، اعمال

کی باز پُرس سے بے پروا ، ان کا خیال تھا کہ جو کچھ ہے بس یہی مادی دنیا ہے اس کے بعد عالم عاقبت محض ایک ذہنی و خیالی چیز ہے جس کی حقیقت واقعی کچھ بھی نہیں پس جو امور عاقبت میں بکار آمد ہیں، یعنی عبادت الٰہی، نیک کرداری، پرہیزگاری، وغیرہا، ان کے اذہان ان کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتے تھے چنانچہ ان کی بابت فرمایا :-

| | |
|---|---|
| یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ هُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ٥ (روم پ ۲۱) | "یہ لوگ دنیا کی ظاہری زندگی تو خوب جانتے بھالتے ہیں لیکن عاقبت کی طرف سے بالکل غافل ہیں" |

نیز فرمایا :-

| | |
|---|---|
| وَ قَالُوْٓا اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا وَ مَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ ٥ (انعام پ ۷) | "یہ لوگ کہتے ہیں کہ بس ہماری تو یہی دنیا کی زندگی ہے اور ہم (حساب اعمال کے لئے) اٹھائے نہیں جائیں گے" |

ان عیش پرستوں کے مقابلے میں ایک دوسرا گروہ بھی تھا، گو تعداد میں بہت تھوڑا تھا وہ ان دنیا داروں کی ایسی بری زندگی سے سخت بیزار اور جسمانی لذتوں اور فانی عیشوں سے سخت متنفر تھا۔ ان کا خیال تھا کہ کسب معاش زن و فرزند کے تعلقات، خدا کی یاد میں حارج ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے بہت سے گناہ سرزد ہوتے رہتے ہیں، جن سے انسانی اخلاق تباہ و برباد ہو جاتے ہیں اور نور روحانیت بجھ جاتا ہے۔

ظلم و ستمگاری، سرقہ و ڈکیتی، زنا و بدکاری، حسد و بغض، خیانت و مکاری، غرض سب برائیوں کا سرچشمہ یہی دنیا داری ہے۔ اس لئے وہ لوگ شہری رہائش اور دنیا داروں کی صحبت سے کنارہ کش ہو کر جنگلوں اور صحراؤں میں تجرد کی زندگی بسر کرتے تھے، جہاں یہ سخت سخت ریاضتیں ان کا محبوب طبع، مرغوب دل اور فرحت بخش شغل تھیں ان کو رُھبانُ کہتے تھے چنانچہ اسی رہبانیت کی نسبت فرمایا :-

| | |
|---|---|
| وَ رَهْبَانِیَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَیْهِمْ (حدید پ ۲۷) | یعنی "ترک دنیا کی رسم انھوں نے از خود ایجاد کر لی تھی ہم نے ان پر مقرر نہیں کی تھی" |

غرض یہ دنیاداری ہر دو گروہ کے نزدیک خدا سے غافل کر دینے والی چیز تھی، ایک نے تو اس میں پڑ کر خدا کو چھوڑ دیا اور جنھوں نے خدا سے لَو لگائی وہ اس دنیا کو سنبھال نہ سکے،

ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک تیسرا گروہ بھی تھا، بظاہر درویش، لیکن در باطن "گرگ در پوست میش" بھیڑ کی پوستین میں بھیڑیے۔ تلقین دین۔ تعلیم شرائع۔ اصلاح قوم کے دم بھر کر دنیا حاصل کرنے والے، بلکہ دنیا داروں کی آنکھوں میں خاک ڈال کر ان کی بھی جیبیں کترنے والے، بڑے مکار، پورے دنیادار، چنانچہ ان کی بابت فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ (توبہ پ ۱۰) | "اے مسلمانو! بہت سے علماء (شریعت) اور مشائخ (طریقت) لوگوں کے مال باطل (طریق) سے کھاتے ہیں، اور خدا کی راہ سے روکتے ہیں"! |

عرب سے باہر دوسری دنیا کی حالت بھی قریباً یہی تھی، ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (روم۔ پ ۲۱) (خشکی وتری میں بگاڑ کا غلبہ ہو گیا) مصر و یونان، روم و ایران، تاتار و ہندوستان سب جگہ یہی حال تھا،

الغرض تین طرح کے لوگ تھے۔ عیش پرست[۱] جو خدا سے غافل تھے اور خدا پرست[۲] جو دنیوی تعلقات سے متنفر تھے اور مکار[۳] دیندار دنیا دار، ایک[۱] تو اس تاریکی میں تھے کہ اس دنیا کے سوا کچھ ہے ہی نہیں، اور دوسرے[۲] اس غلطی میں تھے کہ دنیا بالکل بیکار و بے سود، بلکہ موجب خسران ونقصان ہے۔ دنیا میں لگیں، تو خدا سے غفلت اور خدا سے تعلق پیدا کریں، تو دنیوی تعلقات سے بے تعلق ہونا لازم اور تیسرے[۳] ان ہر دونوں کو کھا جانے والے ہر ایک ان میں سے افراط و تفریط میں پڑ کر جادۂ اعتدال اور صراطِ مستقیم سے منحرف ہو چکا تھا۔ کیونکہ انسان محض مضغۂ گوشت ہی نہیں کہ اس کی کوشش صرف لحمی پرورش ہی پر ختم ہو جائے اور بس۔ پھر اس میں اور دیگر لایعقل حیوانات میں کیا امتیاز رہے گا؟ اور اسے اشرف المخلوقات کہلانے کا کیا حق ہو گا؟

قرآن مجید میں اسی معنی میں فرمایا :-

| | |
|---|---|
| وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ ۝ (محمدؐ پ ۲۶) | "جو لوگ احسان فروش ہیں (یعنی پیغمبر برحق کی دعوت کا انکار کر کے خدا کے احسانوں پر پردہ ڈالتے ہیں) وہ (دنیوی فوائد سے) متمتع ہوتے رہتے ہیں، اور کھاتے پیتے ہیں جس طرح بہائم ولایعقل حیوانات کھا پی کر زندگی گزارتے ہیں سو ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔" |

پھر یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ خدا نے انسان کی لحمی صورت میں ایک نورانی جوہر بھی رکھا ہے جس کی وجہ سے اسے دیگر اکثر مخلوقات پر خصوصی شرف وفضیلت ہے۔ اسی معنی کو سمجھانے کے لئے قرآن مجید میں ارشاد ہے :-

| | |
|---|---|
| وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل پ ۱۵) | "ہم نے بنی آدم کو بہت عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں سوار کیا اور ان کی روزی ستھری چیزوں کی بنائی، اور ان کو اپنی مخلوقات میں سے (بہت سی اجناس) پر بزرگی وبرتری بخشی۔" |

نیز یہ کہ انسان فرشتوں کی طرح محض روحانی نہیں ہے کہ محض ذکر خدا اس کی غذا ومایۂ حیات ہو، بلکہ اسے ایک نہایت شاندار اور خوبصورت ہیکل اور متناسب الاعضا سربلند قامت بھی بخشی گئی ہے، یہ ہیکل قدرت کی گرانمایہ امانت وودیعت ہے، پس اس کا قائم رکھنا بھی انسان کا ایک بھاری فرض ہے۔ چنانچہ فرمایا :-

| | |
|---|---|
| لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (التین پ ۳۰) | "ہم نے انسان کو بہتر سے بہتر ساخت میں پیدا کیا ہے۔" |

تیسرے گروہ کی غلطی یہ تھی کہ دینداری کی آڑ میں دنیا کمانا مکاری وعیاری ہے جو خلوص قلب اور انابت ورجوع الی اللہ کے خلاف ہے، یہ گروہ پہلے دونوں سے بدتر اور

نہایت خطرناک تھا، پہلے گروہ نے غلطی کی لیکن دنیا میں مشغول ہو کر خود فریب کھایا، کسی دوسرے کو نہیں دیا اور دوسرے گروہ نے غلطی کی، لیکن نیک نیتی سے اور نقصان کیا لیکن صرف دنیوی، باقی رہے یہ تیسرے مکّار، سو انھوں نے جان بوجھ کر اپنی عاقبت برباد کر لی اور دیگر لوگوں کو فریب دے کر دنیا کمائی۔ اسی لئے قرآن شریف میں ان کی مذمت بیشتر ہے۔

پس آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہر فریق کو اس کی غلطی سے آگاہ کیا، اور دنیاوی تعلقات کو قائم رکھتے ہوئے پرہیزگار رہنے کی ہدایت کی، نہ صرف زبانی ارشاد و ہدایت بلکہ اپنے نمونۂ عمل سے بتلا دیا کہ دین و دنیا ہر دوں کی گٹھری کو سنبھالتے ہوئے دنیا کے خطرناک دریا سے اس طرح صحیح سلامت پار اتر سکتے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی مُحَمَّدٍ نَبِیِّ الرَّحْمَۃِ۔ اس میں شک نہیں کہ صدیوں کی بگڑی ہوئی طبیعتوں میں یہ ذوق پیدا کرنا اور نسلوں کی اُلٹی ہوئی ذہنیتوں میں یہ خیال ڈالنا بہت مشکل تھا کہ اسی زندگی میں اور انہی چوبیس ۲۴ گھنٹے کے شب و روز میں اپنی جسمانی پرورش اور زن و فرزند کے تعلقات اور کسب معاش اور ملک گیری و جہانبانی کی مصروفیتوں میں رہتے ہوئے اور نیند اور بیداری سفر و حضر، صحت و بیماری، دوستوں اور برادروں کے روابط، مخالفین کی مخالفت، حاسدوں کی مزاحمت ایسے امور کی کشمکشوں میں زندگی گزارتے ہوئے، قلبی انابت اور رجوع اپنے خالق و مالک کی طرف بھی رکھ سکتے ہیں۔

اور پھر یہ کہ ان سب تعلقات کو پرہیزگاری کے سایہ میں نبھا سکتے ہیں اور یہ مشاغل یادِ خدا میں حارج نہیں ہوتے۔ چنانچہ فرمایا:-

یُسَبِّحُ لَہٗ فِیْھَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝ رِجَالٌ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَآءِ الزَّکٰوۃِ ۝

"ان (عبادت گاہوں) میں صبح و شام ایسے لوگ خدا کی تسبیح و تقدیس کرتے رہتے ہیں جن کو سوداگری اور خرید و فروخت خدا کے ذکر اور نماز کے قائم کرنے اور زکوٰۃ کے

يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۝
(نور پ۱۸)

اوا کرنے سے غافل نہیں کرنے پاتی۔ وہ لوگ اس دن سے ڈرتے ہیں جب مارے خوف کے دل الٹ جائیں گے اور آنکھیں پھری کی پھری رہ جائیں گی۔"

پھر یہ کہ یہ سب باتیں ذہنی طور پر سمجھا لینی اتنی دشوار نہیں جس قدر یہ کہ ایسی پست خیال، افتادہ اور صحرائی قوم کے عملی قویٰ میں حرکت پیدا کر کے ان کو مصروف عمل کرنا اور پھر کامیابی کے بام پر پہنچانا مشکل ہے۔

لیکن قربان اس رحمۃ للعلمین کے جس نے روحانیت وجسمانیت کا نہایت ہی نازک تعلق اور مشکل جوڑ فریقین کو ذہن نشین کرا کر ان کی غلط فہمی دور کر دی۔

بدتمیز عیش پرستوں میں تو حلال حرام کی تمیز پیدا کر دی اور اس طرح ان کی افراط کو حد اعتدال پر لے آئے اور اس میں شک نہیں کہ تمتعات دنیوی سے حد اعتدال تک متمتع ہونے سے یاد خدا سے غفلت نہیں ہوتی، چنانچہ فرمایا:۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَا اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝
(پ۲۸ منافقون)

"مسلمانو! تم کو تمہارے مال اور تمہاری اولاد خدا کے ذکر سے غافل نہ کر دیں اور جو ایسا کرے گا یعنی ان میں مشغول ہو کر یاد خدا سے غفلت کرے گا تو وہ لوگ خسارے میں رہیں گے۔"

نیز فرمایا:۔

يَا بَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۚ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ ۚ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝
(اعراف پ۸)

"اے بنی آدم! ہم نے تم پر ایک لباس انعام کیا جو تمہاری شرمگاہ کو ڈھانکتا ہے اور تمہارے لئے موجب زینت بھی ہے اور (اس کے علاوہ) لباس تقویٰ (بھی ہے) جو (اس ظاہری لباس سے) بہت بہتر ہے وہ خدا کے نشانات میں سے ہے تاکہ لوگ تذکر اختیار کریں۔"

اس وقت تک میں جو کچھ بیان کر سکا وہ سب قرآن مجید کی تعلیم کی خوبی کے متعلق تھا اس وقت تک مجھے موقع نہیں ملا کہ آپ کو قرآن حکیم کے "بیان" کی خوبی بھی بتاؤں یعنی یہ کہ قرآن مجید کسی امر کو کس طرح سمجھاتا ہے اور ذہن انسانی کو کس طرح ظاہر سے باطن یا محسوسات سے معقولات کی طرف انتقال کراتا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ ان امور میں پڑ جانے سے میں اپنے موضوع سے کسی قدر دور جا پڑونگا لیکن آپ سے معافی کا خواستگار رہتا ہوا اتنا عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس آیت کے حُسنِ بیان اور طرزِ ادا نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ جب تک اس کی بابت کچھ مزید شرح نہ کر لوں آگے نہ بڑھوں۔

صاحبان! اس آیت کے آخر میں لفظ یَذَّکَّرُوْنَ ہے جس کے ترجمے کے لئے مجھے اپنے قصورِ علم یا نقصان زبان کی وجہ سے کوئی ایک لفظ اس کے مساوی نہ ملا تو میں اس کا ترجمہ نہیں کر سکا لہذا اب مرکب الفاظ میں تشریح کرنے کی ضرورت پڑی۔

تَذَکَّرُ کہتے ہیں ایک بات کو سمجھ کر دوسری بات کے یاد آجانے کو جیسے کہ ایک بات کے سمجھانے سے دوسری بات یاد کرا دینے کو تذکیر کہتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے:۔

| | |
|---|---|
| وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَکَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ وَذَکِّرْهُمْ بِاَیّٰمِ اللّٰهِ (ابراہیم پ۱۳) | "ہم نے موسٰے کو اپنے نشان دے کر بھیجا کہ اپنی قوم (بنی اسرائیل) کو اندھیروں سے اُجالے کی طرف نکال لاؤ اور ان کو (ان کی موجودہ پست حالی میں) خدا کے ایام (انقلاب روزگار) یاد کرا کر نصیحت کرو۔" |

اسی طرح یتیموں کے مال کی حفاظت اور پورے ماپ تول اور عدل و انصاف کی بات کہنے اور عہد کے پورا کرنے کے احکام ذکر کرنے کے بعد فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| ذٰلِکُمْ وَصّٰکُمْ بِهٖ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ ۝ (انعام پ۸) | "یعنی تم کو ان (مذکورہ بالا باتوں) کا (تاکیدی) حکم اس لئے کیا کہ تم تذکر کرو۔" |

یعنی ان امور پر شدت سے کاربند ہو جاؤ یہ سمجھ کر کہ اگر میرے بال بچے یتیم رہ جائیں اور

کوئی ظالم و غاصب ان کا مال ظلم سے کھا جائے اور اگر کوئی شخص کم تول کر یا کم ناپ کر دے اور اگر کوئی شخص میرے متعلق عدل و انصاف کی بات کو پس پشت ڈال دے اور اگر کوئی شخص مجھ سے عہد کرکے پھر جائے اور اسے پورا نہ کرے تو یہ سب باتیں مجھے کیسی بُری لگیں گی۔ پس اسی سے سمجھ لو کہ جس طرح یہ افعال تمہارے حق میں کسی اور سے سرزد ہوں تو تم کو بُرے لگیں گے اسی طرح جب تم کسی دوسرے کے حق میں یہی کام کروگے تو اس کو بھی نقصان وہ ہونے کی وجہ سے ویسے ہی بُرے لگیں گے پس تم ان بدخصائل سے مجتنب رہو۔

اسی طرح اس آیتِ لباس میں لفظ تَذَکَّرُ ذکر کرکے سمجھایا کہ جس طرح تمہارا ظاہری لباس تمہاری ظاہری پردہ پوشی اور زینت کا موجب ہے اسی طرح تقوے اور پرہیزگاری بھی ایک لباس ہے جو تمہارے باطنی عیوب چھپاتا اور تمہیں باطنی حسن سے زینت دیتا ہے اور عقل کی رو سے یہ بالکل ظاہر ہے کہ یہ باطنی پردہ پوشی اور زینت اس ظاہری پردہ پوشی اور زینت سے بدرجہا بہتر ہے پس اس کے حاصل کرنے میں سعی و کوشش کرنی لازم ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوگا کہ لباس ظاہری میں پردہ پوشی اور زینت تو ظاہر ہے لیکن تقویٰ میں یہ دونوں باتیں کہاں ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ تقویٰ میں دو امر ہیں۔ خدا کے حکموں کو بجالانا اور اس کے منہیات سے باز رہنا، چنانچہ فرمایا:۔

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ (انعام پ)

"یہی (مذکورہ بالا تعلیم) میرا سیدھا راستہ ہے پس تم اسی کی پیروی کرنا اور (اس کے سوا دوسرے متفرق) رستوں کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تم کو خدا کی راہ سے جدا کردیں گے۔ خدا نے تم کو ان باتوں کی وصیت (تاکید) اس لئے کی ہے کہ تم پرہیزگار بن سکو۔"

میرے معزز بھائیو! اور دوستو! ابھی ایک اور بات باقی ہے کہ لباس ظاہری میں پردہ پوشی اور زینت تو ظاہر ہے لیکن تقویٰ میں یہ دونوں باتیں کہاں ہیں؟

دیکھئے ! اس آیت میں فَاتَّبِعُوْهُ کا امر بھی ہے اور لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ کی نہی بھی ہے اور اسی امر و نہی پر کاربند ہونے کو تقویٰ کہا ہے۔ هٰذا وَ لِلّٰهِ الْحَمْدُ ۔

پس لباس باطنی یعنی تقویٰ میں منہیات سے بچنے کی شق تو پردہ ہے اور دوسری شق یعنی خدا کے امروں کو بجا لانا وہ زینت ہے۔ اَللّٰهُمَّ جَمِّلْنَا بِالتَّقْوٰی

جو لوگ ظاہری لباس سے تو خوب مزیّن ہیں لیکن تقویٰ سے خالی ہیں، خواہ منہیات و معاصی کے ارتکاب کی وجہ سے خواہ فرائض و احکام کے ترک کی وجہ سے ان کی نسبت آنحضرتؐ نے فرمایا :۔

رُبَّ کَاسِیَةٍ فِی الدُّنْیَا عَارِیَةٌ فِی الْاٰخِرَةِ { ایسی بہت سی عورتیں ہیں کہ وہ دنیا میں تو لباس پہنے ہوئے ہیں لیکن آخرت میں وہ ننگی ہوں گی۔ (صحیح بخاری) (اعاذنا اللّٰہ منہا)

ہر چند کہ اس حدیث میں مونث کے صیغے ہیں لیکن مفہوم سے مستنبط ہو سکتا ہے کہ ایسے مردوں کا بھی حکم ایسا ہی ہوگا اور اب آج کل تو بہت سے نوجوان مرد بھی عورتوں کی طرح صورت شکل اور لباس میں محض ظاہری زیب و زینت کے دلدادہ و شائق ہو رہے ہیں اور سادگی اور محنت و جفاکشی ان میں نام کو نہیں رہی کیونکہ زینت اور یہ باتیں جمع ہونی مشکل ہیں۔

اس آیت لباس میں ابھی بہت سی باتیں نکلتی کی ہیں۔ لیکن اب میں اپنے اصل مضمون کے قریب آنے کے لئے اسی پر اکتفا کرتا ہوا آپ سے معافی چاہتا ہوں ؎

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم ٭ چناں کہ حرف عصا گفت موسیٰ اندر طور

ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم جس طریق سے ان ہر سہ گروہوں کو راہ راست پر لائے اس کا اجمالی نقشہ یوں ہے کہ ایک طرف تو آپ دنیا داروں کو تقویٰ اور پرہیزگاری کے ذریعے درجہ اعتدال پر لائے اور دوسری طرف صحرا نشین درویشوں کو وہاں سے اٹھا کر شہروں میں لائے کہ شہر اب تمہاری رہائش کے قابل ہو گئے ہیں اور تقویٰ و پرہیزگاری (جو تمہارا اصل مقصود ہے) اس پر عمل پیرا ہوتے ہوئے تمتعات دنیوی سے متمتع ہونا گناہ نہیں ہے۔ شہروں میں

رہو۔ بیوی بال بچے کے تعلقات قائم کرو۔ حلال وحرام میں تمیز کرتے ہوئے کسبِ معاش کرو اور خدا کی دی ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ۔ تقسیم کار کے اصول سے اوقات نماز میں خدا کو یاد کرو۔ کسب کے اوقات میں روزی کماؤ۔ سونے کے اوقات میں آرام کرو۔ گویا معمورہ عالم کو دنیا داروں اور درویشوں دونوں کے رہنے کے لائق بنا دیا۔

چنانچہ فرمایا :۔

| | |
|---|---|
| قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۝ (اعراف پ) | "(اے پیغمبر! ان خشک زاہدوں سے) کہدو کہ خدا کی زینت جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کی اور روزی کی ستھری چیزیں کس نے حرام کہیں؟ یعنی حرام نہیں ہیں۔" |

باقی رہے تیسری صنف کے لوگ۔ سو ان کے لئے تھوڑی سی فہمائش کافی تھی مثلاً یہ کہ دنیا دار تو تم ہو ہی اور دینداری کا دم بھی بھرتے ہی ہو ہم تم کو دنیا داری سے تو منع کرتے نہیں، ہاں یہ ضرور کہتے ہیں کہ تم اپنے عمل میں اخلاص پیدا کرو اور دینی فرائض محض خدا کی رضا کے لئے ادا کرو۔ دیندارانہ وضع کو ذریعہ معاش نہ بناؤ بلکہ ٹھیک اسی طرح دنیا دار بن کر حلال وجوہ سے روزی کماؤ جس طرح وہ دنیا دار کماتے ہیں جن کو تم ٹھگتے ہو ایسے لوگ زیادہ تر اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) ہی تھے کیونکہ ایسے کام عموماً لکھے پڑھے اور خضر صورت صوفی صافی ہی کرتے ہیں اور نوشت خواند زیادہ تر اہل کتاب ہی میں تھی۔ اسمٰعیلی لوگ لکھنے پڑھنے سے عموماً عاری تھے وہ ایسی مکاری و عیاری نہیں جانتے تھے، اچھا برا جو کچھ کرتے تھے کھلم کھلا کرتے تھے۔ چنانچہ ان ظاہر پرستوں کی نسبت فرمایا :۔

| | |
|---|---|
| وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۝ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ | "ان کو صرف یہی حکم دیا گیا تھا کہ وہ خدا کی عبادت یک رُخ ہو کر صرف اسی سے جوا لینے کے لئے کیا کریں اور نماز بھی پڑھا کریں اور زکوٰۃ (بھی) دیا |

| | |
|---|---|
| وَ ذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ (بینہ پ ۳۰) | کریں اور پختہ کار لوگوں کا یہی دستور و آئین ہے۔" |

ہر فریق کی اصلاح کے لئے قرآن شریف میں کثرت سے آیات ہیں لیکن میں وقت کی قلت کا لحاظ رکھتے ہوئے انہی آیات مذکورۂ بالا پر اکتفا کرتا ہوں اور آپ کو حرف مطلب کے نزدیک ترلاتا ہوں۔

آنحضرت صلعم کی اس حکیمانہ تعلیم سے چند سالوں میں سب کے دماغ روشن ہو گئے اور اس آئینۂ حق نما میں سب کو اپنی کمی بیشی کی صورت اصلی رنگ میں نظر آنے لگی۔ حتےٰ کہ اب خدا تعالیٰ نے ان سے یوں خطاب کیا :۔

| | |
|---|---|
| وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَ زَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَ كَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَ الْفُسُوْقَ وَ الْعِصْيَانَ ط (الحجرات پ ۲۶) | "(مسلمانو!) خدا نے ایمان تمہارے نزدیک نہایت ہی محبوب کر دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں میں زینت دے دی ہے اور کفر و بدکاری اور نافرمانی تمہارے نزدیک مکروہ و ناپسند کر دی ہے۔" |

ملک کی سابقہ حالت کا اس موجودہ حالت سے مقابلہ کرتے ہوئے آپ کو نمایاں طور پر ایک عظیم انقلاب نظر آئے گا۔ زمین و آسمان تو وہی ہوں گے۔ اس زمین پر اس آسمان کے سایہ تلے اب وہ برے اقوال اور گندے افعال نہ پائے جائیں گے جن سے آسمان پھٹنے کے قریب ہوتا تھا اور زمین لرزتی تھی۔ ان آدمیوں کی صورتیں تو وہی نظر آئیں گی لیکن سیرتوں میں دن رات کا فرق معلوم ہو گا۔ یہ کوئی نئی نسل پیدا نہیں ہوئی تھی کہ نسلاً بعد نسلٍ ایسا بڑا انقلاب واقع ہو گیا ہو بلکہ اسی موجودہ نسل کے بڈھے اور جوان مرد اور عورتیں غلام اور ان کے بڑے بڑے گردنکش آقا، خدائے ذوالجلال کے آستانہ پر جبینِ نیاز مل رہے ہیں اور گڑگڑا کر گذشتہ قصوروں کی معافی چاہ رہے ہیں۔

مدتوں کے بھاگے ہوئے غلام بغیر وارنٹ گرفتاری کے خود بخود کمال انابت و رجوع قلبی سے درگاہِ ربّ العزت میں حاضر ہو کر عفو جرائم کی درخواستیں گزار رہے ہیں اور لطف یہ کہ

اس میں روحانی حظ اور قلبی مسرت پا رہے ہیں۔

اینٹ پتھر کو سجدہ کرنے والے اب صرف اپنے مالک کے سامنے پیشانی زمین پر رکھ کر اس کی تسبیحیں پڑھ رہے ہیں اور قیصر و کسریٰ تک کے سامنے بھی نہیں جھکتے۔

شراب کے نشے سے سرشار ہو کر بدکاریوں میں راتیں گزارنے والے اور نیند کی بیہوشی سے صبح تک بستروں سے نہ ہلنے والے۔ عفیف و پرہیزگار ہو کر عیالدار ہوتے ہوئے شب بیدار تہجد گزار ہو رہے ہیں۔ جن کی شان میں یوں وارد ہے :-

تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا (الم سجدہ پ ۲۱)

"ان کے پہلو بستروں سے ہٹ ہٹ جاتے ہیں۔ (اور وہ) اپنے پروردگار سے (اس کے عذاب کے) خوف سے اور اسکی رحمت کی امید پر دعائیں مانگتے ہیں۔"

نیز انہی کی صفت میں فرمایا :-

وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّھِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا (فرقان پ ۱۹)

نیز (رحمٰن کے بندے) وہ لوگ (ہیں) جو اپنے رب کے سامنے سجدے اور قیام میں یعنی تہجد کی نماز میں رات گذار دیتے ہیں۔"

بیوگان اور یتامیٰ کے مال ظلم و استبداد سے کھا جانے والے۔ جن کے پتھر جیسے دلوں پر اس کی کچھ بھی ٹھیس نہیں لگتی تھی اب وہ بیوگان کی عزت و حرمت کے محافظ اور یتیموں کے کفیل و مربی ہو رہے ہیں اور ان کے مالوں کی نگہبانی کے علاوہ ان کی تعلیم و تربیت میں اپنے عزیز مال و اوقات خرچ کر رہے ہیں کہ وہ کس مپرسی کی حالت سے ترقی کر کے اور قوم کے ہم سنگ ہو کر مفید ارکان ہو سکیں۔

جس قوم میں قانون وراثت میں اس قدر سخت قیدیں تھیں کہ عورت تو عورت ان نرینہ فرزندوں کو بھی محروم رکھا جاتا تھا جو گھوڑے کی پشت پر سوار ہو کر میدان کارزار میں لڑنے کے قابل نہ ہوں۔ اب وہ آنحضرت ؐ کی اصلاح کی برکت سے مرد کے ترکے سے عورت کو

والدین کے ترکے سے بیٹی کو اور خردسال بلکہ شیر خوار بچے کو بھی حصّہ دے رہے ہیں۔

جو قوم ولادت کے وقت ہی لڑکیوں کا گلا گھونٹ دیتی تھی یا اگر زندہ رکھا تو چند سال بُری بھلی طرح پالتے رہے پھر صغر سنی ہی میں زندہ در گور کر دیا اب وہ اس رحمۃ للعلمین کی ہدایات پر عمل پیرا ہو کر اور آپ کے طریق عمل کی پیروی کر کے لڑکیوں کو نہایت شفقت و پیار سے پال رہے ہیں ان کو دین و اخلاق کی تعلیم دے رہے ہیں۔ ہنر اور سلیقہ سکھا رہے ہیں اور عورت کو مرد کے لئے امور خانہ داری میں ایک بہتر معاون و مشیر بنا رہے ہیں۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ قدرت نے آنحضرت صلعم کو نمونہ عمل بنانے کے لئے ایک نہیں، دو نہیں، تین نہیں پوری چار بیٹیاں عطا کیں اور تین بیٹے بھی بخشے۔ لیکن خدائے حکیم کی حکمت دیکھئے کہ آپ کے سب بیٹے صغر سنی ہی میں فوت ہو گئے اور سب لڑکیاں زندہ رہیں جن کو آپ نے نہایت شفقت و پیار سے پالا وہ بلوغت کی عمر کو پہنچیں، آپ نے ان کی شادیاں کیں اور ان کے سب امور باحسن صورت انجام دیئے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی مُحَمَّدٍ نَبِیِّ الرَّحْمَۃِ ؏

مسلمانو! میرے عزیز بھائیو! کیا آپ نہیں چاہتے کہ دلی عقیدت سے نوع انسانی خصوصاً صنف نازک کے ایسے شفیق محسن پر درود شریف بھیجیں، کیوں نہیں، ہاں تو پڑھئے

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی مُحَمَّدٍ نَبِیِّ الرَّحْمَۃِ

ظالم ڈاکو اور رہزن، کسی پر ترس نہ کھانے والے۔ اب قافلوں کے محافظ اور مظلوموں کے حامی اور مسلمانوں کے قائد و رہنما ہو رہے ہیں۔

زمانہ جاہلیت کے عربوں کی ضد اور تعصّب، کبر و نخوت، فخر و مباہات، رعونت و غرور آپس میں جنگ و جدال، فتنہ و فساد، مردم آزاری و خونریزی کس کو یاد نہیں ہے۔ ہے۔ وہی لوگ، ہاں وہی لوگ (نہ کہ آئندہ نسل) آنحضرت صلعم کی برکت سے آپس میں ایک دوسرے کے ہمدرد و غمخوار بلکہ بھائی بھائی ہو رہے ہیں انہی سے خطاب کر کے فرمایا:-

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا (آل عمران پ۴)

"(مسلمانو!) تم خدا کی وہ نعمت بھی یاد کرو جب تم آپس میں دشمن تھے تو (خدا نے) تمہارے دلوں کو جوڑ دیا، پس تم اس کی نعمت (پیغمبر اسلام و کلام الٰہی سے آپس میں) بھائی بھائی ہوگئے۔"

اس کے بعد قدرت کا تماشا دیکھئے۔ کہ یہی بھیڑ بکری چرانے والے لوگ دنیا کے فاتح ہوکر اخلاق و تدین، تہذیب و تمدن اور سیاست و جہانبانی میں استاد روزگار ثابت ہوئے۔

یہ کوئی معمولی انقلاب نہیں تھا میں اپنے ناقص مطالعہ کا اعتراف کرتے ہوئے نہایت وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ زمانہ کی آنکھ نے اپنی پیدائش سے اس وقت تک صفحۂ ہستی پر یہ نظارہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لیل و نہار کے دور میں اسے یہ سماں کبھی نظر نہیں آیا تھا وہ اپنی قسمت پر جس قدر بھی ناز کرے بجا ہے اور اپنے نصیبے پر جس قدر بھی فخر کرے اسے زیبا ہے کہ جس مبارک ہستی کے شوق میں اس نے لکھو کھا لیل و نہار کے سیاہ و سفید رنگ بدلے اور جس صاحب شوکت کے دیدار کی آرزو میں وہ ہزارہا سال سے آفتاب و ماہتاب کی نورانی آنکھوں سے منتظر تھا اسے (صلعم) اس نے اپنی پیرانہ سالی کے آخری دور میں دیکھ لیا۔ اور دیکھا بھی تو ساری تمنائیں اور آرزوئیں اور جملہ مرادیں اور خواہشیں پوری کرتے ہوئے اور دامن کو گوہر مقصود سے بھرتے ہوئے دیکھا۔

زہے نصیب زمانے کے کہ اس نے اس دن کے بعد کہ عبداللہ بن عبدالمطلب کا یتیم ظالموں کے ظلم سے بچنے کے لئے اپنے وطن مالوف مکہ معظمہ سے رات کے وقت چھپکر ایک یار غار کے ساتھ ہجرت کر جاتا ہے۔ وہ دن بھی دیکھ لیا کہ وہ خدا کا سچا رسول (فداہ روحی) وعدۂ الٰہی اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ (قصص پ۲۰) کی صدا کانوں میں رکھتے ہوئے اس شب ہجرت سے برابر آٹھویں سال دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ نہایت شان و شوکت سے فاتحانہ حالت میں پھر مکہ معظمہ میں داخل ہوتا ہے اور

فتح کا جھنڈا گاڑ کر اور خدائے واحد کے نام کا جلال پکار کر اپنی قوم کے تمام لوگوں کو خدا کا یہ پیغام سُناتا ہے :۔ یا معشر قریش ان اللہ قد اذھب عنکم نخوۃ الجاھلیۃ وتعظمھا بالاٰباء الناس من اٰدم واٰدم خلق من تراب ثم تلا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یاایھا الناس انا خلقناکم الخ یا معشر قریش ویا اھل مکۃ ما ترون انی فاعل بکم قالوا خیرا اخ کریم وابن اخ کریم ثم قال اذھبوا فانتم الطلقاء (طبری جلد ۳ صفحہ ۱۲۰) یعنی اے گروہِ قریش! بیشک خدا نے (آج) تم سے جاہلیت کی نخوت اور آبا و اجداد کی وجہ سے فخر کرنا دور کر دیا ہے۔ تمام لوگ آدم سے ہیں۔ اور آدم مٹی سے پیدا کیا گیا تھا پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔ اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد (آدم) اور ایک عورت (حوا) سے پیدا کیا اور تمہاری ذاتیں اور برادریاں صرف تمہاری پہچان کے لئے بنائیں تم میں سے خدا کے ہاں بڑی عزت والا وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے۔ اے گروہِ قریش! اور اے اہل مکہ تمہارے خیال میں میں تم سے کیسا سلوک کروں گا۔ انھوں نے کہا نیک (سلوک)، آپ (ہمارے) صاحب کرم بھائی ہیں اور صاحب کرم بھائی (عبداللہ بن عبدالمطلب) کے بیٹے ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا جاؤ تم سب آزاد ہو"۔

میرے معزز و عزیز بھائیو! یہ وہ کامیابی ہے جو سوائے آپ کے کسی سیاسی لیڈر کسی فاتح اور کسی مصلح کو کبھی حاصل نہیں ہوئی اور نہ کوئی دوسرا اس عظمت و شان کا گزرا ہے کہ بانیِ مذہب بھی ہو، بانی قوم بھی ہو اور بانی سیاست و سلطنت بھی ہو۔ یہ ہر سہ امور آپ سوائے آنحضرت صلعم کی ذات بابرکات کے کسی ایک میں یکجا جمع نہیں پائیں گے۔

طول بہت ہو گیا ہے اور مضمون ابھی بہت سا باقی ہے لہذا میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوتا ہوا یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگرچہ میں نے بخیال خود وہ سب باتیں جن کی

آپ کو ضرورت ہے نہایت احتیاط سے واقعات تاریخیہ کے رنگ میں سمجھادی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ منزل مقصود ابھی بہت دور ہے اس لئے میں گذشتہ تفصیل کو یکجا جمع کرنے اور بعض اشارات کو واضح کرنے کے لئے آپ سے صرف تین باتیں کہنے کی اجازت چاہتا ہوں، واللہ الموفق،

اول یہ کہ آپ نے کبھی سوچا اور خیال کیا کہ اس کارخانہ علت و معلول میں خداوند عالم نے اپنے حبیب رحمۃ للعالمین صلعم کے لئے کیا سامان مہیا کئے تھے اور زمانہ میں کس صورت میں اس کا ساز گار بنایا تھا کہ آپ کو ایسی بڑی کامیابی حاصل ہوئی جو سابقاً کسی کو بھی نہ ہوئی تھی اور اس کے ضمن میں یہ خیال بھی کبھی گزرا کہ خداوند تعالیٰ نے آپ کو ایک سنسان بیابان میں کیوں پیدا کیا؟ جس کے باشندے عام طور پر وحشیوں اور درندوں سے بھی بڑھے ہوئے تھے اور ان میں اور اُن میں سوائے صورت ظاہری کے کوئی نمایاں فرق نہیں تھا۔ کیا خدائے ذوالجلال کو آپ کے لئے کسی متمدن اور علوم و فنون میں ترقی یافتہ اور آئین سلطانی کے خوگر ملک میں جگہ تنگ ہوگئی تھی۔ مثلاً ہندوستان کہ اس کی قدیم روایات اس کی شان کی شہادت دیتی ہیں، اور ایران کہ اس کی سلطنت بھی بہت پرانی تھی۔ اور روم کہ رومن ایمپائر کے قانون کی ہمہ گیری کا سکہ ایک عالم پر چھایا ہوا تھا اور یونان کہ علوم و فنون میں دنیا جہان کا استاد تھا اور مصر کہ اس کے بادشاہوں کا جبروت و سطوت مشہور عالم تھا۔

خداوند عالم نے اپنے حبیب فاتح دنیا، استاد جہاں، مصلح عالم کو ایک سنسان ویرانے میں پیدا کیا اور اس میں بھی اس حصے میں جس کی شان میں خود اس کے اپنے کلام میں وارد ہے۔ بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ (ابراہیم پ۱۳) یعنی ایسی وادی میں جہاں زراعت نام کو نہیں، یعنی مکہ میں یا یوں کہئے کہ ایک ناقابل زراعت وادی میں پیدا کیا۔

ظاہر ہے کہ ایسے علاقے کے لوگوں کے اخلاق نرم تو ہوں گے نہیں، سخت ہی ہوں گے ریگستان و سنگستان کے رہنے والے نہ نازک بدن ہو سکتے ہیں نہ نازک مزاج۔ پتھروں میں بسنے

والے موم نہیں ہو سکتے۔ اچھا تو پھر خدا تعالیٰ نے ایسا کیوں کیا؟

قدرت کی اس گہری حکمت کو سمجھنے کے لئے میں ایک سوال کرنے کی جرأت کرتا ہوں اس کے جواب سے خدا کے فضل سے اس حکمت کا راز کھل جائے گا۔ وہ یہ کہ آپ بتائیں کہ بجھے ہوئے یا کچھ دہکتے ہوئے کوئلے میں پھونکیں مار مار کر اسے مفید مطلب بنانا موزوں و آسان ہوگا یا تیز شعلے دار آگ کی تیزی کو اعتدال کے درجے پر لانا؟

(حاضرین نے جواب دیا کہ تیز شعلے دار آگ کی تیزی کو درجۂ اعتدال پر لانا موزوں ومناسب ہوگا) شکر ہے کہ آپ نے وہی جواب دیا جو میرے نزدیک درست تھا کہ شعلے دار آگ کی تیزی کو معتدل کر کے اسے مفید مطلب بنانا موزوں و آسان ہے۔

بس اسی سے سمجھ لیجئے کہ ہندوستان و ایران اور روم و مصر و یونان سب ممالک ترقی پا چکنے کے بعد تنزل کے عمیق گڑھے میں گرے ہوئے تھے۔ شامتِ اعمال جو عیاشی و بدکرداری اور ظلم و بیداد کا لازمی نتیجہ ہے زوال کی صورت میں ان پر وارد ہو چکی تھی ان کے فطری قُویٰ زائل ہو چکے تھے اور ان کے جذبات کی تیزی بُجھ چکی تھی۔ یا یوں سمجھئے کہ ان کے سب جذبات درجہ تفریط میں تھے لیکن ان سب کے برخلاف عرب کی ساری فطری قوتیں موجود تھیں اگر وہ کسی غیر پر حاکم نہ تھے تو کسی غیر کے محکوم وغلام بھی نہ تھے۔ ؎

نہ بر اشتر برسوارم نہ چوں اشتر زیر بارم      نہ خداوند رعیّت نہ غلامِ شہریارم

ان کی برائیاں جس قدر اوپر مذکور ہوئیں سب ایسی تھیں جو ان جذبات کے ماتحت ہوا کرتی ہیں۔ جن کا ٹمپریچر درجۂ اعتدال سے گزر کر درجہ افراط پر پہنچا ہوتا ہے۔ ڈکیتی اور رہزنی، قتل و قتال، جنگجوئی اور خونریزی۔ مفاخرت و مبارزت، عصبیت و حمیت، دفاع وانتقام جیسے کام بُزدلوں سے نہیں ہو سکتے اور شراب نوشی و عیاشی۔ اسراف و مباہات نام و نمود کے لئے پر تکلف عام ضیافتیں کنجوس مکھی چوس نہیں کر سکتے۔

پس خدائے حکیم نے یہ چاہا کہ فاتح اعظم اور مصلح عالم کو ایک ایسے ملک میں پیدا کرے جو غیروں کے قہر و تغلب سے آزاد ہو۔ ان کی سیاسی روح زندہ ہو وہ قوم خودداری و عصبیت کی مالک ہو اپنی قوم کے سوا کسی غیر کے سائے کو بھی برداشت نہ کر سکتی ہو کسی کی احسانمند ہونے کی بجائے احسان کرنا ان کا فخر ہو۔ بس ان کی اصلاح کے لئے کسی بڑی تکلیف و محنت کی ضرورت نہیں تھی ان کو غلطی کا احساس کرایا اور بٹن دباکر درجۂ افراط سے درجۂ اعتدال پر لا کھڑا کیا۔ کیونکہ تیز جذبات والا انسان سمجھ آ جانے پر اپنی غلطی کو فوراً تسلیم کر لیتا ہے اور پھر دوسروں کی اصلاح میں اسی طرح جدوجہد کرتا ہے جس طرح مخالفت میں سعی و کوشش کرتا تھا اور حقیقت امر کو سمجھ لینے کے بعد اسے عمل میں لانے کے لئے اس کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ نہ کسی کا دباؤ نہ کسی کا لالچ۔

پس آنحضرت صلعم نے قوم عرب کے تیز جذبات کو درجہ اعتدال پر لا کر ان کو اس قابل بنا دیا کہ وہ ایک قلیل مدت میں فاتح عالم ہو گئے اور ایک صدی کے اندر حکومت اسلام کی حدود اس قدر وسیع ہو گئیں کہ اگر ایک طرف مشرق میں ہندوستان کے سربفلک پہاڑوں سے ٹکراتی تھیں تو دوسری طرف مغرب اقصٰے میں کوہ پیرنیز کے پار تک پہنچ گئی تھیں۔

دوسری بات جس کی اجازت میں نے آپ سے لی یہ ہے کہ یہ تو قدرت کا کام تھا کہ آنحضرت صلعم کو ایک ایسے آزاد ملک میں پیدا کیا جس پر کسی غیر کا کبھی سایہ بھی نہ پڑا تھا، اس کے علاوہ خود آنحضرت صلعم نے اس قوم کی نبض شناسی کس طرح کی؟ اور ان کی بے قاعدگی کو منظم کس طرح کیا؟ اس میں آپ لوگوں کا اصل "مقصود اسلام اور حالات حاضرہ" پوری طرح واضح ہو جائے گا۔ سو معلوم ہو کہ قومیت کا مدار دو چیزیں ہیں۔ عصبیت اور اجتماعی قوت۔

حضرات یہ تو آپ صاحبان کو معلوم ہی ہے کہ عربوں میں عصبیت غالب درجے کی تھی اگر کسر تھی تو بس اجتماعی نظام کی تھی۔ کہ ان کی ساری قوت ذاتی جھگڑوں آپس

کی جنگوں اور انتقاموں میں صرف ہوتی تھی اور مجتمع ہونے نہیں پاتی تھی۔ پس آنحضرت صلعم نے ان کو ایک اسٹیج پر مجتمع کر کے آپس میں ایک دوسرے کا ہمدرد و غمخوار بلکہ برادر و غمگسار بنا دیا حقیقت میں یہ بھی الٰہی کرشمہ تھا کیونکہ نبی اللہ کے سب کام خدائی توفیق کی طرف منسوب ہوتے ہیں چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:- وَ اِنْ یُّرِیْدُوْٓا اَنْ یَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ وَ اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ (انفال پ۱۰)

یعنی (اے پیغمبر!) اگر یہ (کفار صلح کے رنگ میں) تم کو دھوکا دینا چاہیں تو تم کو تو بس (ایک) اللہ ہی کافی ہے۔ وہ وہی تو ہے جس نے اپنی امداد اور (جماعت) مومنین سے تمہاری تائید کی اور ان (مومنوں) کے دلوں میں الفت ڈال دی اگر تم دنیا کا سارا مال خرچ کر دیتے تو پھر بھی ان کے دلوں میں اُلفت پیدا نہ کر سکتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے (بغیر روپے کے لالچ کے محض اپنے فضل سے) ان میں (ایک دوسرے کی) الفت ڈال دی۔ بیشک وہ بڑا زبردست (اور) بڑا باحکمت ہے۔

پس اے میرے مُعزز سامعین! اگر آپ بھی حالات حاضرہ پر غالب آنا چاہتے ہیں اور ان کے نتائج کو اپنی مراد کے موافق دیکھنا چاہتے ہیں تو اوّل تو اپنے آپ میں عصبیت قومی اور غیرت و حمیّت دینی و ملّی پیدا کریں اور پھر اپنی قوت کو کسی محکم نظام کے ماتحت مجتمع کریں اور آپ کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ نظام سے بہتر نظام کہاں ملے گا؟ جو منبر پر چڑھ کر سب کے سامنے بآواز بلند پکار کر فرماتے ہیں خَیْرُ الْهُدٰی هُدَی مُحَمَّدٍ (صلی اللہ علیہ وسلم) یعنی بہترین سیرت سیرت محمدی ہے۔

آنحضرت صلعم کی اس آواز کو ساڑھے تیرہ سو سال گذر چکے ہیں اور یہ آج تک اسی طرح گونج رہی ہے۔ اس عرصے میں بڑے بڑے مصلح اور ریفارمر گزرے مگر ان میں

کوئی اس مصلح اعظم کے پاسنگ بھی نہیں تھا۔ مثلاً زمانہ حال کے سب سے بڑے آدمی گاندھی جی سمجھے جاتے ہیں جنھوں نے اپنی قوم اور اپنے ملک کی آزادی کے لئے ایک عالم کو تہ وبالا کر رکھا ہے میں ان کے ارادے اور ہمت کی قدر کرتا ہوں گو ایک رسول برحق کے ساتھ ایک ملکی لیڈر اور غیر رسول شخص کا مقابلہ مناسب نہ ہو لیکن چونکہ ان کی اکثر قوم ان کو مہاتما اور بعض خدا کا اوتار بھی سمجھنے لگے ہیں اور ان کی نظر میں گاندھی جی کی عزت وعظمت خدا کے بعد کسی دوسرے سے کم نہیں وہ ان کے نام کی جے پکارتے ہیں ان کے فرمان پر مال و جان، عزت و آبرو، زن و فرزند سب کچھ قربان کر رہے ہیں اس لئے حالات حاضرہ کو مدنظر رکھتے ہوئے میں ان کی سعی اور طریق عمل کی نسبت بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں، جس کا مختصر بیان یوں ہے کہ "گاندھی جی بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اصول پر اپنی قوم میں عصبیت وحمیت پیدا کر رہے ہیں اور ان کی قوت کو محکم نظام کے ماتحت جمع کر رہے ہیں" اور وہ اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہو رہے ہیں لیکن یہ نتیجہ کہ منزل مقصود پر پہنچ جائیں بلکہ یہ بھی کہ اسے دور سے بھی دیکھ لیں دہلی میں کھڑا ہو کر کہتا ہوں کہ "ہنوز دلی دور است" کی مثل ہے۔ اسے نہ تو گاندھی جی دیکھیں گے اور نہ وہ نسل جس میں وہ اپنی سعی و عمل خرچ کر رہے ہیں!

باقی رہیں آئندہ نسلیں سو ان کا حال خدا کو معلوم کہ وہ کس کینڈے کی ہوں گی کیونکہ ابھی تک قوم میں ایکسٹریمسٹ یعنی انتہا پسند بھی ہیں، ماڈریٹ اعتدال پسند بھی ہیں اور ٹوڈی اور خوشامدی اور وفادار نمکخوار بھی ہیں جو نادیدہ خدا پر بتان نظر فریب کو ترجیح دیتے ہیں اور معلوم ہے کہ اجزائے مرکبہ میں کبھی کوئی جزو غالب آجاتا ہے اور کبھی کوئی۔ اس لئے آئندہ کی بابت کوئی صحیح رائے قائم نہیں ہو سکتی۔

گاندھی جی کی یہ ترقی انتہائی سمجھی جائے تو اس کے بعد تنزل و انحطاط لازم، اور اگر اس کے بعد ترقی کا کوئی اور درجہ باقی ہے تو خدا جانے اونٹ کس کروٹ بیٹھے، اور

قوم اس درجہ پر پہنچے یا نہ پہنچے اور گاندھی جی اس دنیا سے کوچ کر جائیں، پس بہر حال گاندھی جی کی زندگی میں موعودہ یا مزعومہ کامیابی موہوم ہے۔

اخلاقی اصلاح میں جتنی کامیابی ہوئی وہ بھی ظاہر ہے۔ شراب خانے برابر کھلے ہیں۔ بمبئی سے کلکتہ و رنگون تک اور کشمیر و پنجاب سے دکن تک تمام ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی لچھمی دیوی کی پجاری روزمرہ ہزاروں لاکھوں روپے خرچ کر کرکے یورپ سے دھڑا دھڑ شراب منگوا رہے ہیں کچھ پی رہے ہیں کچھ پلا رہے ہیں اور ہندوستان کے مال اور ہندوستانیوں کے اخلاق و صحت کو اپنی زر پرستی کے لالچ پر برباد کر رہے ہیں قحبہ خانے کھلے ہوئے ہیں۔ مہاجن پیٹ بھر کر سود کھاتے ہیں۔ سرکاری ملازم دل کھول کر رشوت لیتے ہیں۔

آنحضرت صلعم اپنی زندگی ہی میں خدا کی توحید، اسی کی خالص عبادت اور تزکیہ نفس کی بنیاد پر تہذیب و اخلاق فاضلہ کے سائے میں سیاسی انقلابات اور تمدنی ترقیات کراتے ہیں اور اس باغ کی بہار اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اس دنیائے فانی سے انتقال فرماتے ہیں۔ جس قوم کو تیار کرتے ہیں وہی دنیا کی فاتح ہوتی ہے (ابو بکر صدیقؓ و عمر فاروقؓ پیچھے پیدا نہیں ہوئے۔ عثمان ذی النورین اور امیر معاویہ آئندہ نسل میں سے نہیں تھے) اُمّی (ان پڑھ) قوم صاحبانِ علم کے تختوں کی وارث ہوتی ہے۔ اور ان کے خزانوں اور راندہ وختوں کو خدا کے نام کی بلندی، تہذیب و علم کی اشاعت اور عدل و انصاف و مساوات کی ترویج میں خرچ کرتی ہے، انھی کی شان میں کہا گیا ہے ع "کیا اُمّیوں نے جہاں میں اُجالا"

شراب خوری و حرام کاری ملک عرب سے یکدم دور ہو گئی، بھیڑ بکری چرانے والے امیر کبیر اور سلاطینِ عالم ہو گئے لیکن خدا سے غافل نہیں ہوئے۔ پہلو میں سیاسی جوش رکھتے ہوئے ماں باپ اور دیگر بزرگوں سے شوخ و گستاخ نہیں ہوئے۔ تمدنی و

اقتصادی ترقی میں حلال و حرام میں تمیز کرتے ہیں۔ سود حرام جانتے ہیں۔ کم تولنا رشوت لینا، غصب اور دھوکے سے مال حاصل کرنا خنزیر کے برابر گنتے ہیں حالانکہ آپ سے پہلے ایام جاہلیت میں وہ یہ سب کام کرتے تھے اور یہاں تو بڑے بڑے سیاسی لیڈر، بڑے بڑے تعلیم یافتہ اور اچھے بھلے کسب حلال کرتے کرتے قومی تحریکوں میں شامل ہو کر وجہ حلال سے کنارہ کش ہو کر ظاہرا یا پوشیدہ قومی چندوں کو ذریعہ معاش بنا رہے ہیں ع "بہ بیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا"

آنحضرت صلعم مال حرام سے صدقہ اور قومی چندہ قبول نہیں فرماتے۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

لا یقبل اللہ صلوٰۃ بغیر طہور و لا صدقۃ من غلول (ترمذی) "یعنی خدا تعالےٰ طہارت (غسل و وضو) کے بغیر نماز قبول نہیں کرتا اور حرام و خیانت کے مال سے صدقہ خیرات قبول نہیں کرتا۔"

جس طرح حلال کھانے کی نسبت فرمایا:۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ (بقرہ پ۲) "یعنی اے مسلمانو! کھاؤ تم پاک چیزوں سے جو ہم نے تم کو عطا کیں۔"

اسی طرح خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے کی نسبت بھی فرمایا:۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا انفقوا من طیّبات ما کسبتم (بقرہ پ۳) "یعنی اے مسلمانو! اپنی پاک کمائی میں سے (راہ خدا میں) خرچ کیا کرو۔"

اور عام اخلاقی و سیاسی و روحانی برائیوں کی ممانعت میں فرمایا:۔

قل انما حرم ربی الفواحش ما ظہر منہا و ما بطن و الاثم و البغی بغیر الحق و ان تشرکوا باللہ ما لم ینزل بہ سلطانا و ان تقولوا علی اللہ ما لا تعلمون ہ (اعراف پ۸) یعنی (اے پیغمبر! ان سے) کہہ دو کہ میرے رب نے تو

(ہر قسم کی) بے حیائی ظاہری و باطنی (قولی و فعلی) حرام کر دی ہے اور (ہر قسم کا) گناہ اور ناحق کی بغاوت (و شورش) اور خدا کے ساتھ شریک گرداننا جس کے بارے میں خدا نے (کسی دین میں بھی) کوئی دلیل بھی نازل نہیں کی۔ اور یہ بھی (حرام کر دیا ہے) کہ تم خدا کے ذمے وہ باتیں لگاؤ جن کا تم کو علم نہیں"۔

غرض آنحضرت صلعم نے انسانی ہستی کے سب امور جسمانی و روحانی۔ اخلاقی و تمدنی معاشرتی و سیاسی کی اصلاح کی اور آپ خدا کے فضل سے اپنی کوشش کو اپنی آنکھ سے بار آور دیکھ کر نہایت ٹھنڈے دل سے دنیا سے رخصت ہوئے۔ لیکن گاندھی جی جو آج دنیا بھر میں یا کم از کم ہندوستان میں یا اپنی اکثر قوم میں سب سے بڑے آدمی یا خدا کا اوتار مانے جاتے ہیں۔ نوع انسانی کی نہیں بلکہ صرف ہندوستان کی آزادی دیکھنا چاہتے ہیں پھر بھی باوجود ہر طرح کی ممکن کوشش کرنے کے (خواہ وہ کوشش تدبیر کے متعلق ہو خواہ صرف اموال کے متعلق خواہ تحمل شدائد و مکروہات کے متعلق) ابھی مقصود کے نزدیک تک بھی نہیں پھٹکے۔

پھر یہ کہ آنحضرت صلعم کو جو قوم ملی وہ ان پڑھ ہے مال و دولت میں کمزور ہے۔ تمدن میں بالکل پیچھے ہے۔ تعداد اور دنیوی حیثیت میں اپنے حریفوں اور مخالفوں سے کمتر ہے، لیکن گاندھی جی کی قوم ماشاءاللہ دولت کی دھنی، علوم مروجہ میں دیگر ہمسایہ قوموں سے فائق، شاہی رسوخ میں ان سب سے آگے۔ تدبیر و مطلب براری میں اُستاد تعداد میں شاہی قوم سے صدہا گنا زیادہ، ممتاز عُہدوں پر فائز، دفاتر پر کلیتہً قابض اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گورنمنٹ کی پالیسی کو خوب سمجھنے والی بلکہ ان کے نقش قدم پر چلنے والی لیکن من کی مُراد ابھی تک معرض التوا میں ہے۔ گاندھی جی بھی اعلان کرتے ہیں کہ اگر چھ مہینے تک سوراج نہ ملا تو میں آبادی چھوڑ دوں گا۔ ہمالیہ کی چوٹیوں پر چلا جاؤں گا۔ دس سال کا عرصہ گزر گیا۔ لیکن نہ تو سوراج ملا اور نہ گاندھی جی کوہ ہمالیہ پر گئے۔

دوسری طرف دیکھئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :۔

| | |
|---|---|
| ایھا الناس قولوا لا الٰہ الا اللہ تملکوا لعرب وتدین لکم العجم۔ | یعنی "اے لوگو! تم لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کرلو۔ تم عرب کے بادشاہ ہوجاؤگے اور عجمی تمہاری رعیت ہوجائیں گے۔" |

آپ کی یہ آواز اس وقت کی ہے جب مکہ میں آپ کے ساتھ کوئی قومی جماعت نہیں تھی۔ چند ایک غربا و ضعفا، آپ کے ساتھی تھے جن کو نہ گھروں میں امن تھا نہ شہر میں امان آخر چند سال میں عرب آپ کی حیات طیبہ ہی میں زیرنگیں ہوجاتا ہے اور آپ اپنی رحلت کے آخری دن دوسرے ممالک کی فتوحات کے لئے اپنے دست مبارک سے جھنڈا قوم کے ہاتھ میں دیتے ہیں اور تاکیدی حکم فرماتے ہیں کہ "اس لشکر کو ضرور بھیج کر رہنا" (صحیح بخاری) گویا عرب کے بعد آئندہ فتوحات کا بھی دروازہ کھول کر قوم کو اس میں داخل ہونے کا حکم دیتے ہیں اور دنیا سے نہایت اطمینان کے ساتھ رخصت ہوتے ہیں، یہ ہے وہ کامیابی جس کی نظیر دنیا جہان میں کسی قوم کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

آخر اس کا کیا سبب ہے؟ کہ ایسے بڑے بڑے مدبر۔ نبض شناسان زمانہ۔ مالکانِ دولت و ثروت۔ صاحبانِ علم و ہنر۔ جن کے ساتھ ہزاروں نہیں، لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں فدائی لڑنے مرنے، مال و جان قربان کرنے کے لئے موجود ہوں وہ تو ناکام رہیں اور ایک اُمّی سب رکاوٹوں پر غالب آتا ہوا ایک مُٹھی بھر بے سامان غریب جماعت سے پوری طرح کامیاب ہوکر دنیا سے رخصت ہو۔

صاحبان! میں اپنی رائے سے اس کا کوئی سبب مقرر نہیں کرتا بلکہ میں اس کارساز و بادشاہ حقیقی، مالک زمین و آسمان کے قول سے استناد کرتا ہوں جس نے آنحضرتؐ سے اور آپ کی مخلص جماعت سے وعدہ کیا تھا کہ میں تم کو دنیا میں ضرور ضرور حاکم بناؤں گا۔ چنانچہ ارشاد ہے :۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا ط یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا ط وَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ٥

یعنی خدا تعالیٰ تم (بہر دو جماعت مخلصین و مہاجرین) میں سے ان لوگوں سے جو (خالصاً) ایماندار ہیں اور نیکو کردار بھی ہیں، وعدہ کرتا ہے کہ وہ ان کو زمین میں ٹھیک اسی طرح اختیار و اقتدار بخشے گا جس طرح اس نے ان سے پہلے لوگوں کو بخشا تھا اور ان کے لئے ان کے اس دین کو جسے اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے (یعنی اسلام کو) صاحب مقدور بنا دیگا یعنی وہ اسے اسٹیٹ ریلیجن (سلطنت کا مذہب) بنا دے گا اور ان کے (موجودالوقت) خوف کو امن سے بدل دے گا وہ (اس امن و اقتدار کی حالت میں) میری ہی عبادت کریں گے میرے ساتھ کسی چیز کو بھی شریک نہیں گردانیں گے۔ اور جو لوگ اس (نشان کے پورا ہونے) کے بعد بھی کافر (ومنکر) رہیں گے تو وہ (نہایت ہی) حکم عدول (ثابت) ہوں گے۔"

یہ آواز آنحضرت صلعم کے اپنے خیال کی نہ تھی بلکہ یہ خدائی نقارہ تھا۔ مولینا روم صاحب ایسی آوازوں کی نسبت فرماتے ہیں ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود  گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

بس صرف یہی اور یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلعم قوم سے جو وعدہ کر رہے ہیں وہ خدا کے حکم سے کر رہے ہیں جس کا پورا ہونا لازم ہے اور گاندھی جی اپنے خیالی اور خواہش سے ایسا کہتے ہیں اور اپنی آواز کو موثر بنانے کے لئے پرزور الفاظ اور امید افزا عبارتوں سے قوم کو دلاسا دیتے ہیں وَشَتَّانَ بَیْنَھُمَا۔ یعنی ان دونوں میں بہت فرق ہے۔

صاحبان! میں نے آپ کا بہت سا وقت لیا اب میں معافی کا خواستگار ہو آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔ وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ٭

# عربی اور فارسی شاعری کے امتیازات

## عشقیہ رنگ

### بسلسلۂ ماسبق

عشق و محبّت کا مادّہ چونکہ فطرتِ انسانی میں داخل ہے اس لئے قاعدے اور اصول کے موافق خطہ ارضی کے ہر متنفس پر اس کے اثرات یکساں ہونا چاہئیں۔ امیر و غریب و قنیع و شریف جاہل و عالم اور خورد و کلاں کے امتیاز پر اس کے اثرات مرتب ہونا اصول کے خلاف معلوم ہوتا ہے اور نہ کسی جگہ کی آب و ہوا کی اثر انگیزی کو اس میں دخل ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔

معنوی اعتبار سے تو ہر انسان کے اندر عشق و الفت کی سوزش و چاشنی کا مساویانہ ثبوت دیا جا سکتا ہے لیکن حقیقت میں اس کے اثرات آب و ہوا کی لطافت، فرحت انگیزی، اور تمدن و معاشرت کے ارتقا کے منت کش ہیں۔ گاؤں کے ایک جاہل اور غیر متمدن انسان کے عشقیہ جذبات اور اس کی کیفیات پر ہر نہج سے غور کیجئے صرف اشتراک جذبات تو ضرور ان کے اندر موجود ہوگا لیکن کیفیت جذبات اور پاکیزگی و لطافت کے اعتبار سے وہ کبھی بھی ایک تمدن آشنا کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسی صورت سے ایک غیر متمدن سوسائٹی اور ملک کا تقابل بھی تہذیب آشنا اور تمدن پذیر ملک و قوم کے جذبات عشقیہ سے کیا جا سکتا ہے۔ اوّل الذکر کے جذبات میں جس قدر رکاکت و رزالت کی آلودگیاں نظر آئیں گی اسی قدر ثانی الذکر کے جذبات تنوع و ترفع اور لطافت و نفاست کے سرمایہ دار ہوں گے۔

عشق و الفت اور اس کے مقتضیات چونکہ سرشتِ انسانی کا لازمہ ہیں اس لئے اس اصول کی بنا پر عربی خمیر بھی عشق و محبت کی چاشنی سے خالی نہیں ہو سکتا لیکن جو تمکینت و

چاشنی ایرانی خمیر میں دست فطرت میں ودیعت کی تھی اس کا عشر عشیر بھی عرب کو حاصل نہیں تھا اور اس کا سبب بھی تمدن و معاشرت کی ترقی اور عدم ترقی کا فرق تھا۔

ایران کا صرف تمدن ارتقا کے آخری زینہ پر نہ تھا بلکہ ملک کا گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ زندگی کے پُرلطف اور گوناگوں مناظر کو اپنے آغوش میں چھپائے ہوئے تھا۔ آب و ہوا کی لطافت و رنگینی عشق و الفت کی خوابیدہ قوتوں کو ذرا سی دیر میں بیدار کر کے دل و دماغ دونوں کو سرخوش و مدہوش بنا دیتی تھی۔ لیکن عرب کی وادیٔ غیر ذی زرع کو ان محاسن میں سے ایک خوبی بھی حاصل نہ تھی۔

عراق کا حصہ اگرچہ ایرانی حدود سے بالکل متصل تھا اور تخت ایران کے اثرات خصوصی کی وجہ سے یہاں کے عربی باشندے مذہب زردشت قبول کر چکے تھے لیکن وہ سرسبزی و شادابی اس جگہ مفقود تھی جو ملک عرب کے علاقہ شام میں پائی جاتی تھی۔ یہ تمام علاقہ تخت روم کے اثر میں تھا اور اس وجہ سے مذہب عیسوی یہاں فروغ پائے ہوئے تھا۔ تمدن و معاشرت کے اعتبار سے اس علاقہ کا مرتبہ عراق عرب سے بہت پست تھا۔ عراق کا تمدن ایرانی اثر کی وجہ سے تمام عرب سے ممتاز سمجھا جاتا تھا۔ لیکن جو چیزیں اس وقت کی شاعری کے لئے ممد و معاون ہو سکتی تھیں فطرت نے وہ ایک ایک کر کے حجاز کے سب سے پست اور غیر ذی زرع خطہ میں ودیعت کی تھیں۔

عرب میں شعریت کی ابتدا اور اس کا عنفوان آزاد مشربی کا منت کش ہے۔ شام و عراق ایرانی اور رومی سیادت قبول کر چکے تھے اس لئے وہ آزاد مشربی جس پر کہ عرب کے بچہ بچہ کو ناز تھا ان کی طبائع سے ایک حد تک دور ہو چکی تھی۔ دونوں جگہ کی شاعری پر درباری اثر آہستہ آہستہ اپنا کام کر رہا تھا اس کے برعکس حجاز اور اس کا ملحقہ علاقہ آزادی کی پُربہار فضا میں زندگی بسر کرنا اپنے لئے طغرائے امتیاز سمجھتا تھا چونکہ شاعری کا آغاز حریت کی فضا میں ہوا تھا اس لئے اس خطہ میں بہ نسبت اور عربی علاقوں کے اس فن کو

بہت ترقی ہوئی۔ مگر چونکہ حجاز کا علاقہ زیادہ تر ریگستانی حصہ پر مشتمل تھا۔ آب ہوا انتہا سے زائد گرم واقع ہوئی تھی۔ سرسبزی اور شادابی کا کوسوں پتہ نہ تھا۔ تمدن و معاشرت کی پستی کے اعتبار سے بھی پورا علاقہ تمام دنیا میں اپنی نظیر آپ تھا ملک کے چپہ چپہ پر بجائے مدنیت کے بدویت کے آثار چھائے ہوئے تھے۔ تقریباً ہر شخص خانہ بدوشی کی سی زندگی بسر کرتا تھا، عشقیہ شاعری اور تغزّل کے رنگ کو نکھارنے والی جو چیز ہو سکتی ہے وہ ملک کی شادابی و خوش حالی اور تمدن و معاشرت کی ترقی ہے۔ حجاز کا خطہ ان محاسن سے عاری تھا اس لئے یہاں کی عشقیہ شاعری میں وہ جاذبیت و کشش اور کہربائی نہیں پائی جاتی ہے جو ایران کے عشقیہ رنگ میں ہے۔

ہر چیز ملکی خصوصیات کا اثر ضرور قبول کرتی ہے حجازی عرب چونکہ تمدن کی روشنی سے متمتع پذیر نہیں ہوئے تھے اس لئے ان کی شاعری صرف ایک خاص صنف میں محدود ہو کر رہ گئی۔ عشقیہ رنگ میں بھی انھوں نے اپنے دماغی قوے کو صرف کیا ہے لیکن اس کے بیان میں ایرانی شگفتگی، رنگینی اور جاذبیت کا کوسوں پتہ نہیں بلکہ بدویانہ سادگی کا عنصر غالب ہے۔

عشقیہ رنگ میں اس وقت تک کہربائی پیدا نہیں ہو سکتی جبتک کہ اس کے اندر معاملات محبت اور واردات عشق کو لطافت رنگینی کے سامعہ نواز انداز میں بیان نہ کیا جائے۔ بیشک، سادگی خود ایک قسم کی پاکیزگی اپنے اندر پنہاں رکھتی ہے لیکن اگر سادگی کے پردے میں شوخی اور رنگینی کی جھلک بھی نمایاں کردی جائے تو وہی سادگی تیر و نشتر بن جاتی ہے۔ ایران کا عشقیہ رنگ اسی قسم کا سامان قتل اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے۔ یہ سادگی کے پردے کو اپنی رنگ آمیزیوں اور گلکاریوں سے ایسا نظر فریب اور جاذب توجہ بنا دیتا ہے کہ پھر دوسری طرف نظر نہیں جمتی جن چیزوں سے عشقیہ جذبات میں تحریک اور اُبھار پیدا ہوتا ہے قدرت نے وہ ایک ایک کرکے ایران کی جنت مثال سرزمین کے لئے مخصوص کردی تھیں۔ جہاں موسم گل آیا اور ان پاکیزہ جذبات میں تحریک پیدا ہوئی۔ شعرائے عرب ان جذبات کی اثر انگیزی سے واقف تو تھے لیکن وہ رنگینیاں اور سرمستیاں میسّر نہ تھیں جن کے اثر سے انسانی دماغ میں نشۂ الفت

کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ایرانی شاعر اس صہبا کے نہ اُترنے والے نشہ سے مدہوش ہو کر اس راستے کے احساسات و کیفیات کو اس انداز سے بیان کرجاتا ہے کہ بحر طبع میں ایک قسم کا شورانگیز تلاطم پیدا ہو جاتا ہے۔ ایرانی شاعر کا ایک ایک لفظ جو اس نشہ کے عالَم میں اس کی زبان سے نکلتا ہے وہ اپنے اندر کیف و انبساط کا ایک ایسا سمندر رکھتا ہے جس کے ساحل کا کوسوں پتہ نہیں ہوتا۔ ایران کا مست و سرخوش شاعر خود ہی اس ہوش رُبا کیفیت سے مُست نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے نشہ کی کیفیت سے دوسروں کو بھی بیگانۂ ہوش بنا دیتا ہے۔ وہ خود بھی عالم رنگ و بو کے تفکرات سے تھوڑی دیر کے لئے آزاد ہو جاتا ہے اور دنیا کو بھی اس سے کیف آگین اور لطف اندوز ہونے کی نہایت مستی کے عالَم میں دعوت دیتا ہے۔ عرب کا شاعر معاملات عشق کو بیان تو کرتا ہے مگر ان کے اندر رنگ آمیزی اور کیف و انبساط پیدا کرنا اس کی سادگی پسند طبیعت سے بعید معلوم ہوتا ہے۔ عشق کے اندر جو معاملات اور واردات پیش آتے ہیں ان کی ترجمانی بھی کرتا ہے لیکن ان معاملات کے بیان میں جن کیفیتوں اور رنگینیوں کا ہونا ضروری ہے ان کا منزلوں پتہ نہیں۔ اس کے علاوہ اس میدان میں جو مشکلات و حوادث پیش آتے ہیں ان کو تو نہایت شرح و بسط کے ساتھ پیش کرتا ہے لیکن اس کی دلفریبیوں، ہنگامہ آرائیوں اور مستیوں کی کیفیات کو ہاتھ نہیں لگاتا گویا اس کے نزدیک دردِ عشق میں سوائے آزار کے کوئی لذّت نہیں۔ ایرانی شاعر اس راستے کی پاشکافی اور آبلہ پائی کو فیضانِ عشق تصوّر کرتا ہے۔ ہر قسم کی تکلیف اس کے سامنے عین راحت بن کر آتی ہے بلکہ اس کے نزدیک اس راستے کی تکلیف کو تکلیف سمجھنا مرتبۂ عشق کی توہین ہے ؏

عشق می گویم و جان می دہم از لذّت وے

ہر چند ظلم ہست و ستم ہست و داد نیست　　جائے ہنوز نیست بہ ذوق دیار عشق

یعنی عشق و محبّت کی تکالیف میں وہ کیفِ سرمدی پنہاں ہے کہ اس سے دل نہیں بھرتا اور

تیرِ پر تیر کھانے کو جی چاہتا ہے۔

دل جُز رہِ عشق تو نپوید ہرگز　　جُز محنت و دردِ تو نجوید ہرگز

یعنی دل سوائے تیری راہِ عشق کے اور کچھ نہیں تلاش کرتا اور بجز تیرے غمِ عشق اور دردِ محبت کے کچھ نہیں چاہتا۔

رہروان راخستگیٔ راہ نیست　　عشق ہم راہ است وہم خود منزل است

بلکہ وہ اس وقت کی حالت پر جب کہ وہ کسی کے دامِ الفت میں گرفتار نہ تھا افسوس کرتا ہے۔

نالہ از بہرِ رہائی نہ کند مُرغِ اسیر　　خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود (عرفیؔ)

یعنی مُرغِ اسیر اس لئے آہ و فریاد نہیں کرتا کہ صیّادِ ستم پیشہ اس کو کسی طریقہ سے رہا کر دے بلکہ یہ تمام نالہ و شیون صرف اس زمانے کی بربادی کے لئے ہو رہا ہے جبکہ وہ صیاد کے دام کا شکار نہ ہوا تھا۔ زندگی کا حقیقی لُطف تو گرفتاری کے بعد ہی حاصل ہوا ہے۔ کاش کہ گرفتاری سے پہلے کا زمانہ بھی صیّاد کی مہمانی میں گزرتا۔

مرزا غالبؔ نے اسی مفہوم کو طنزیہ اُصول کے ماتحت ایک عجیب دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔

زخم سِلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذّت زخمِ سوزن میں نہیں

ایران کا رنگین مزاج اور بہار پرور وہ شاعر عشق و اُلفت کی پُر بہار وادی کی سیر کرتا ہے اور اس میں سے ایسے ایسے خوش نما پھول توڑ کر لاتا ہے جن کی بھینی بھینی اور مست کُن خوشبو سے ہر شخص تھوڑی دیر کے لئے مست و سرخوش ہو جاتا ہے۔ وہ اس کی ہر پیش آنے والی کیفیت کو سینکڑوں انداز سے پیش کر کے مخاطب سامع کو دنیا و مافیہا سے بیگانہ بنا دیتا ہے۔ وہ عشق و محبّت کی لذات و کیفیات کو ابتدا سے انتہا تک ایک خاص قسم کی وجدانیت تصور کرتا ہے۔

عشق در اوّل و آخر ہمہ ذوق است و سماع　　ایں شرابے است کہ ہم پختہ وہم خام خوش است (طالب آملی)

یعنی کیفیت عشق اور لذت محبت اوّل سے آخر تک ذوق و سماع میں ڈوبا ہوا ایک نغمہ ہے اور یہ ایک ایسی شراب ہے جو پختہ اور خام دونوں حالتوں میں نہایت پُرکیف اور روح افزا ہے۔ وہ حقیقت کے چہرے کی نقاب کشائی کے لئے اس سے بہتر کوئی اور چیز نہیں سمجھتا۔

متاب از عشق رو گرچہ مجازی است
کہ آں بہرِ حقیقت کارسازی است (مولینا جامی)

اس کے نزدیک تاثیر محبّت اور کیفیت عشق سے بڑھ کر کوئی اور اکسیر ہی نہیں، وہ صرف اسی کو ایک ایسی اکسیر سمجھتا ہے جس سے دل کی تمام خباثتیں اور کدورتیں ذرا سی دیر میں دور ہو جایا کرتی ہیں۔ وہ صرف اسی کو ایک ایسی معجون تصوّر کرتا ہے جس سے طبیعت کا انقباض دور ہو کر سوز و گداز اور لطف و نرمی کا مادّہ پیدا ہو جاتا ہے۔

ہیچ اکسیر بہ تاثیر محبّت نرسد کفر آوردم و در عشق تو ایماں کردم (نظیری)

یعنی "دنیا کی کوئی اکسیر تاثیر محبّت کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتی۔ اس کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ میں دنیا میں کفر کی کثافتوں سے آلودہ اور ملوّث آیا تھا لیکن تیرے عشق نے انھی کثافتوں اور آلودگیوں کو عین ایمان بنا دیا۔"

چونکہ اس کے ملک کا گوشہ گوشہ اور چپّہ چپّہ یوسفستان بنا ہوا تھا اس لئے وہ چمنِ عشق کی ہر رنگینی اور دلفریبی کو بصد انداز اور بہزار اسلوب بیان کرتا ہے اور اس چمن کے ہر غنچہ کو مختلف طریقوں سے شگفتہ کر کے دلوں میں آگ سی لگا دیتا ہے۔ وہ داستانِ عشق اور افسانۂ محبّت کو اس پُرکیف، شور انگیز اور رنگین انداز سے بیان کرتا ہے کہ مخاطب کا دل و دماغ ذوقِ عشق کی کیفیات سے معمور ہو جاتا ہے۔

ہر کس کہ بشنود، شورشِ ذوقِ عاشقی۔ از بس کہ حرفِ عشق بہ لذت ادا کنم

یعنی "دردِ عشق ایسے پُرکیف اور لذّت بخش انداز سے بیان کرتا ہوں کہ جو کوئی بھی اس کو سُنتا ہے وہ ذوقِ عشق میں مست ہو جاتا ہے۔"

لفظ عشق کی تفسیر وہ اس اسلوب سے کرتا ہے جس سے یہ حقیقت ہویدا ہوتی ہے کہ دُنیا میں صرف یہی ایک ایسی چیز ہے جو کل ذوی العقول کے اندر اپنے پُر کیف انداز سے طاری اور ساری ہے۔

ہر آنچہ اندر زمانہ درد و دل بود　　　یکے کردند و عشقش نام کردند
بہ گیتی ہر کجا درد و دلے بود　　　ہم کردند و عشقش نام کردند

یعنی "دنیا میں جس جگہ بھی درد اور دل پایا جاتا تھا ان کو باہم آمیختہ کر کے عشق نام رکھ دیا" چونکہ سوزِ درد اور دل ہر جاندار میں پایا جاتا ہے لہٰذا کوئی جاندار عشق و محبت سے خالی نہیں۔

وہ جانداروں ہی میں عشق و محبّت کی کیفیات و اثرات کا مشاہدہ نہیں کرتا، بلکہ نباتات و جمادات سے لے کر دریا کی روانی، لہروں کا اضطراب، ہوا کی سنناہٹ اور ذروں کا اتصال اسی چیز کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ ؎

جہاں پر فتنہ از غوغائے عشق است

اس کی نظریں چمن عشق کی دلفریبیوں اور نیرنگیوں میں اس قدر محو ہو جاتی ہیں کہ اس کو ہر چیز مئے عشق کے نشہ سے سرشار معلوم ہوتی ہے اور ہر جگہ حُسن محبوب کی سحر طرازیاں اور جلوہ پاشیاں نظر آتی ہیں۔

ہمہ کس طالب یار اند چہ ہشیار و چہ مست
ہمہ جا خانۂ عشق است چہ مسجد چہ کنشت
در عشق، خانقاہ و خرابات شرط نیست
ہر جا کہ ہست پرتوِ روئے حبیب ہست

**ازالۂ شبہہ** چونکہ عربی شاعری میں بھی اس قسم کی لطافتیں اکثر مواقع پر پائی جاتی ہیں اس لئے اس کو فارسی رنگ لطافت سے خالی کہنا ضرور ایک قسم کا شبہہ پیدا کر دیتا ہے۔ میں مانتا ہوں کہ عربی شاعری بھی اس میدان میں فارسی شاعری کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جس عربی شاعری میں اس قسم کی لطافتیں پائی جاتی ہیں حقیقت میں وہ عربی شاعری ہے بھی یا نہیں۔ زبان کے اعتبار سے تو اس کو ہر شخص عربی شاعری کہنے کے لئے مجبور ہے۔ لیکن جب اس کے طرز ادا، اسلوب بیان اور جذبات کی گہرائیوں پر نظر ڈالی جاتی ہے تو بیک جنبش نظر یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ بجز زبان کے اور کوئی خصوصیت اس کے اندر عربی شاعری کی نہیں جیسا کہ میں پہلے کسی جگہ پر اس بات کو صاف کر چکا ہوں، کہ عربی شاعری میرے نزدیک عبارت ہے صرف اس ارض مقدس کی شاعری سے جس کو حجاز کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

بنو اُمیہ کے ہاتھ میں جب تک زمام خلافت رہی اس وقت تک ایک گونہ عربی اثرات کا پرتو ان کی شاعری پر قائم رہا۔ چونکہ خلفائے اُمیہ کا پایہ تخت علاقہ شام میں تھا اور یہیں سے سلطنت کے تمام امور متعلقہ سرانجام پاتے تھے اس وجہ سے ان اثرات کا پرتو باقی رہا لیکن جب بنو اُمیہ کے ہاتھ سے عباسیوں کے ہاتھوں میں زمام حکومت پہنچی تو انھوں نے بغداد کی سدا بہار زمین کو اپنے لئے منتخب کیا۔ چونکہ بغداد ایرانی حدود سے قریب تر واقع ہوا تھا اس لئے اس جگہ کے منتخب ہوتے ہی ایرانیت تمام دربار پر چھاگئی۔ سلطنت کے تمام شعبوں پر ایرانی اثرات نے قبضہ کر لیا۔ حتیٰ کہ مامون رشید کے عہد میں سرکاری زبان بھی فارسی ہوگئی ایرانیوں کو اپنے نزاکت آفریں تمدن کے سامنے کسی کی تہذیب ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ دربار پر ایرانی ابر کی طرح چھائے ہوئے تھے۔ اس لئے مجبوراً عربوں کو ایرانی رنگ میں اپنے آپ کو رنگنا پڑتا تھا۔ علاوہ ازیں ملک اور اس کی تہذیب کا اثر بھی اپنا کام کرتا رہا۔ مغلیہ عہد میں جتنے فارسی گو شعراء ہندوستان آئے ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں نکل سکا جو ہندوستان کی تہذیب اور آب و ہوا کے اثر سے متاثر نہ ہوا ہو۔ جذبات و خیالات کے علاوہ زبان تک یہاں کے اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ بچی۔ سینکڑوں محاورات و مصطلحات یہاں ایسے پیدا ہوگئے جن کا سمجھنے والا ایران میں نہیں تھا

اسی اختلاف و بیگانگت کی وجہ سے ایرانیوں نے بجز خسرو "علیہ الرحمۃ" کے سب کو پوچ گویان ہند میں شمار کیا ہے۔ ایران میں سرسبزی و شادابی اور ہوا کی فرحت انگیزی کے باعث تیز ہوائیں یعنی لوئیں نہیں چلتیں لیکن ایرانی شعرا جب ہندوستان آئے تو ان کو مجبوراً اس لفظ کا اضافہ بطریق تفریس کرنا پڑا۔ چنانچہ عرفی کہتا ہے۔

آں بادکہ ہند گر آید جگر آید　　　　درچاشت گہ از شبنم گل گرد فشانست

مرزا کلیم خاص ایرانی نژاد ہے لیکن یہاں کے اثر کی وجہ سے کس قدر ہندیت کا پرتو چمک رہا ہے۔

منہ بر وعدۂ تنبولیان دل
کہ جز خون خوردن از وے نیست حاصل
زحسن شستۂ دھوبی چہ گویم،
از اں بے پردہ محبوبی چہ گویم
گل گڑھل نہ فہمیدست موسم
شگفتہ چوں رُخ یار است دایم

جس ایرانی شاعر نے جنت نشان ہند کی طرف کبھی رُخ نہیں کیا ہے وہ شکیب رہائی کا ذمہ دار کسی سرو قامت، شوخ دیدہ ترک بچے کو قرار دیتا ہے۔

درچشم من آمد آں سہی سرو بلند
برہود دلم زدست و درپائے فگند

لیکن جو ہندوستان کی آب و ہوا سے لطف اندوز ہو چکا ہے وہ اس کا ذمہ دار راجپوت اور شیخ زادے کو بھی قرار دیتا ہے۔

بتانِ راجپوت و شیخ زادہ　　　　شکیب عاشقاں برباد دادہ

ایران میں ہوا کی فرحت و لطافت اس کے نزدیک نتیجہ ہے صرف گل سوسن ریحان و نسترن، نرگس و نسرین اور سرو چنار کی بہتات کا۔ لیکن ہندوستان پہنچکر یہ

چیزیں اس کے دماغ سے نکل جاتی ہیں. ہندیت کے آثار رنگ لانے لگتے ہیں۔

نہالِ نیمش از بس خوش نسیم است

دلِ طوبےٰ زرشک آں دو نیم است

اسی طریقے سے جب عربی شعرا اپنی حدود چھوڑ کر عباسیہ دربار میں پہنچے تو ان کے عاشقانہ جذبات بھی کچھ ایرانیوں کے اختلاط اور کچھ آب ہوا کی اثرانگیزی کی وجہ سے رنگین و پُر کیف ہوگئے وہ سادگی جو اس سے پہلے ان کی شاعری کی اصلی روح تھی جاتی رہی اور اس کے بجائے لطافت و رنگینی اور نزاکت و شوخی پیدا ہو گئی۔

وَ العشق کا المعشوق یعذب قربہ للمبتلیٰ وَ ینال من حوبائہ

یعنی عاشق کو قربِ عشق ایسا ہی عزیز ہے جیسا قرب محبوب، باوجودیکہ عشق دشمن جانِ عاشق ہے مگر بایں ہمہ مرغوب ہے۔ یہ رنگ قدیم شاعری میں بھی نظر آتا ہے لیکن زور و شور، سوز و گداز، جوش و سرمستی اور تغزل کی یہ انتہا نظر آئی جو دور ما بعد کی شاعری میں پائی جاتی ہے۔ فارسی شاعر بھی اسی مضمون کو اسی رنگ میں پیش کرتا ہے۔

جائے ہنوز نیست بہ ذوق دیار عشق ہرچند ظلم ہست و ستم ہست و داد نیست

قدیم عربی شاعر اظہارِ عشق کو اپنی محبت کی توہین تصور کرتا ہے لیکن وہی خون جب ایرانی اثرات قبول کرلیتا ہے تو اس کا اخفا اس کے اختیار میں نہیں رہتا۔

کتمت حبک حتّٰی منک تکرمۃ

ثم استوی فیک اسراری وَ اعلانی

یعنی میں نے تیری محبّت کو سب سے چھپایا حتّٰی کہ خود تجھ سے بھی پوشیدہ رکھا لیکن جب عشق غالب آگیا تو میرا اخفا و اظہار برابر ہوگیا۔ فارسی شاعر اسی مفہوم کو اس انداز سے لکھتا ہے۔

میتواں داشت نہاں عشق زہردم لیکن زردیٔ رنگ رخ و خشکی لب راچہ علاج

یعنی لوگوں سے جذبۂ عشق کا چھپانا کوئی مشکل بات نہیں لیکن خشک لبی اور زرد روئی کا کیا علاج۔

اسفی علی اسفی الذی دلہتنی　　　عن علمہ فیہ علی خفاء

یعنی مجھ کو غم اس ادراک کے جاتے رہنے کا ہے جس کی لذت سے تو نے مجھ کو سرخوش و مدہوش بنا دیا اور اس کی وجہ فارسی شاعر کی زبانی سنئے۔ ع

عشق در اوّل و آخر ہمہ ذوق است و سماع

ان المعین علی الصبابۃ بالاسیٰ　　　اولیٰ برحمۃ ربّہا و اخائہ

یعنی "جو شخص باوجود اس حالتِ عشق کے جو مجھ پر طاری ہے ملامت کرتا ہے گویا وہ میرے غم کی ترقی میں مدد کرتا ہے اس کو یہ سزاوار و مناسب ہے کہ وہ مجھ پر رحم کرے اور میری غمخواری کرے نہ کہ نصیحت و ملامت کرکے میرے رنج و غم کو بڑھائے۔"

حقیقت میں اس شعر کے کل تاثرات عکس ہیں ایرانی آب و ہوا کی رنگینی و لطافت کا۔ یا یوں سمجھئے کہ اس رنگ کی ساری آب و تاب ایرانیت کی منت کش ہے۔

مرزا غالب نے اس مفہوم کو نہایت پاکیزہ انداز میں پیش کیا ہے:۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

عربی شعرا کے تمام ملکی اوصاف یہاں کی آب و ہوا اور تمدن کے نذر ہو چکے تھے یہاں کی بہار آفریں اور نزہت خیز آب و ہوا نے ایسا اثر پیدا کر دیا تھا کہ اپنی سادگی خود ان کو بری معلوم ہونے لگی تھی بلکہ طبائع کو متوجہ کرکے کلام میں ایرانیت پیدا کی جاتی تھی۔ ایرانی تمدن کا اثر صرف شاعری تک محدود نہ رہا تھا بلکہ عربی تمدن و معاشرت بھی اسی کے زیر اثر ہو گئے تھے عرب کی اصلی شاعری پر جو بنی امیہ کے ابتدائی عہد میں ختم ہو چکی تھی جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو ان کی شاعری میں پہاڑوں کی بلندی گھوڑوں اور اونٹوں کی رفتار، گرمی کی شدت، سفر کی مصیبت، مکانوں کی ویرانی اور بادِ سموم

کے جھونکوں وغیرہ کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔

عَلَی الذّبل جیّاش کانَّ اھتزامہٗ    اذا جاش فیہ حمیہ غلی مرجل

یعنی اس گھوڑے کو جب ایڑ کا اشارا کیا جاتا ہے تو وہ بہت گرم ہو جاتا ہے اور اس کے خراٹوں کی آواز ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ہنڈیا کا جوش۔

کانَّ ثبیرًا فی عرانین وبلہ    کبیرُ اُناسٍ فی بجادٍ مُزمّلِ

یعنیؔ کوہ ثبیر پر جبکہ بڑے بڑے بوندوں کا پانی برسنا شروع ہوا تو اس کی مختلف نالیوں سے جھاگ دار پانی بہنے لگا۔ یہ منظر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا کوئی بڑا سردار دھاریوں دار کملی اوڑھے بیٹھا ہے۔"

وَاَتلعُ نُہّاضٌ اذا صَعّدت    کسکانِ بوصیّ بدجلۃ مصعد ؟

یعنیؔ اس ناقہ کی کشیدہ گردن بہت بلند ہونے والی ہے جب وہ اس کو اٹھاتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دریائے دجلہ میں کشتی رواں کا دنبالہ ہے۔"

عربوں کا دستور تھا کہ خانہ بدوشی کی حالت میں جس جگہ ان کو پانی اور چراگاہیں مل جاتی تھیں اس جگہ وہ اپنے خیمے لگا دیتے تھے چونکہ مختلف قبیلوں کے لوگ خیمہ لگائے ہوئے تھے اس لئے ایک دوسرے سے ربط وضبط پیدا ہو جاتا تھا اور بسا اوقات یہ ربط عشق ومحبّت کے درجہ تک ترقی کر جاتا تھا جب پانی وغیرہ ختم ہو جاتا تھا تو سب لوگ ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے تھے پھر جب کہیں اتفاق سے وہاں کبھی گذر ہوتا تھا تو وہ منہدم مقامات اور کھنڈروں کو دیکھ کر اپنے محبوب کی یاد میں مضطرب ہو جاتے تھے خود روتے تھے اور دوسروں کو بھی رُلاتے تھے اور درد انگیز انداز سے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہتے تھے۔

قفا نبک من ذکری حبیب ومنزل
بسقط اللوی بین الدخول فحومل

یعنی "اے میرے دوستو! ذرا ٹھیرو کہ ہم اپنی محبوبہ کی فرودگاہ کی یاد میں (جو موضع دخول وحمول کے ریت کے ٹیلے پر واقع ہے) اچھی طرح رولیں۔"

عفت الدیار محلها فمقامها　　　بمنیٰ تابّد غولها فرجامها

"وہ منیٰ کے گھر جن میں چند روز تک قیام رہا تھا سب مٹ گئے اور اس کے مواضع غول اور فرجام برباد ہو گئے۔"

فارسی شعرا نے بھی اس رنگ میں اپنی جدت طبع کے چند نمونے پیش کئے گو رنگ عربی ہے لیکن اس کی آب وتاب ایرانی ہے جو بیک نظر معلوم ہو جاتی ہے۔

ہست این دیار یار اگر شاید فرود آرم جمل
پرسم رباب و دعد را حال از رسوم و از طلل

ویرانی اور انقلاب حالت کے بیان میں تو بالکل ایرانیت چھائی ہوئی ہے۔

جائیکہ بود آں دلستاں با دوستاں در بوستاں
شد زاغ و کرگس را مکان شد سور و ماہی را وطن

جب عربی شعرا کے دماغوں میں ایرانی رنگ کے اثرات پیدا ہو گئے تو کوہ و بیابان کے مضامین مرغزار و گلزار بن گئے وہاں کی شاعری آبشاروں اور باد نسیم کے ذکر سے خالی رہی لیکن اس خطۂ بہار انگیز میں قدم رکھنے کے بعد یہ سب چیزیں داخل ہو گئیں۔

اس تفصیلی بحث سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ حقیقت میں عرب کی اس دور کی شاعری باختلاف زبان فارسی شاعری ہے یعنی باعتبار زبان اس کو عربی شاعری کہا جاسکتا ہے لیکن بلحاظ تخیلات وجذبات کسی صورت سے بھی اس کو عربی شاعری نہیں کہا جاسکتا، صاف طریقہ سے فارسی رنگ عربی پردے میں سے نظر آرہا ہے۔ عربی شاعری مع اپنی تمام خصوصیات کے صرف وہی شاعری ہے جو ابتدائے اسلام تک باقی رہی تھی اور اس موازنہ کے اندر میری مراد بھی اسی عہد تک کی شاعری سے ہے

اسی وجہ سے میں نے اپنے اس مضمون میں بنو امیہ اور عباسیہ کی دور کی شاعری کو ہاتھ نہیں لگایا۔

عربی شعرا کے حقیقی اوصاف مساوات، بلند حوصلگی، فیاضی، جنگ آزمائی، بہادری اور تواضع تھے اس لئے ان کی شاعری میں یہ اوصاف جن خوبیوں اور جوش کے ساتھ پائے جاتے ہیں وہ جوش و خروش بہاریہ اور عشقیہ رنگ میں نہیں، بہاریہ رنگ تو قدرتاً بہت ہی پھیکا ہے ہاں عشقیہ رنگ میں کچھ سامان لطفِ ذوق ہے لیکن وہ تیزی اور روانی نہیں جو ایرانی رنگ میں مخصوص ہے۔

**عشقیہ رنگ کے تیز ہونے کا سبب** ایران میں عشقیہ رنگ کے تیز و شوخ ہونے کے اسباب میں سے ایک سبب حسن بے پردہ کی قیامت خیزیاں اور محشر آرائیاں بھی تھیں یہاں کی سرزمین ہی حسن خیز نہ تھی بلکہ اس کی فضا بھی حسن کی تجلیوں اور ضیا پاشیوں سے معمور تھی۔ سارا ملک یوسفستان بنا ہوا تھا۔ ذرہ ذرہ آفتاب حسن کی تنویر سے مستنیر تھا ہر نوخیز کے چہرے سے حسن کی معصومیت برستی تھی۔ شراب حسن اس جگہ پہنچکر دو آتشہ سے سہ آتشہ بن چکی تھی، حسن کی عریانی نے ملک کے گوشہ گوشہ اور چپہ چپہ میں عشق و محبت کی آگ سی سلگا دی تھی، نوخیز ترکوں کے حسن معصوم کی شورشیں اس آگ پر تیل کا کام کر رہی تھیں، ساقی گری اور مجلس آرائی کی خدمات انھی شباب پروردوں کی سپرد تھیں۔ جلوت و خلوت کے شریک اور سفر و حضر کے ہمدم بھی تھے۔ ان کا تقویٰ شکن غمزہ ہر وقت دل افگاری اور نمک پاشی میں مصروف رہتا تھا ان کے سرخ و سفید اور حسین چہرے پرستاران محبت اور بندگان عشق کے لئے ہر وقت قیامت برپا کرتے رہتے تھے۔ بڑے بڑے امرا و سلاطین ان کے جگر پاش غمزوں سے مجروح ہو کر ان کی غلامی میں زندگی بسر کر رہے تھے حتیٰ کہ زاہدان وقت کا دین و ایمان بھی ان کی زہد شکن اداؤں سے محفوظ نہ رہا تھا۔

محتسب در قفائے رنداں است     غافل از صوفیان شاہد باز (سعدی)

سلطنت عباسیہ کے آخری بدنصیب تاجدار نے جب فوج کو غیر ملکی بنانے کے ذوق میں عربوں کو فوجی صیغہ سے علیحدہ کر کے نوخیز ترکوں کو بھرتی کیا تو گلی کوچوں میں انکی آزادانہ آمدورفت شروع ہو گئی اور یہی وہ زمانہ تھا جب ان کے جمال جہاں آرا کی شوخیاں اور حسن نظرفروز کی رعنائیاں عنفوان شباب پر آگئی تھیں، کسی شخص کا دامن صبر و قرار ان کے حسن و غمزہ کی گرفت سے آزاد نہ تھا ان کے شور انگیز جلووں نے تمام ملک کو نمونۂ رستخیز بنا دیا تھا جس کی طرف ان کی مدبھری نظریں اُٹھ جاتی تھیں اس کو بیگانۂ عقل و ہوش ہونا پڑتا تھا ان کی مستانہ چال ایک قیامت تھی۔ ہر قدم پر خوابیدہ فتنے بیدار ہوتے تھے۔ ع

باصد کرشمہ آں بت بدمست می رود،
خود می کند خرام و خود از دست می رود

سبزہ زاروں میں ان کی گلگشتیں ایک عجیب ہوش رُبا کیفیت اپنے اندر پنہاں رکھتی تھیں ان کے نزہت بخش اور فرحت آثار چہرے دیدۂ مردم نظارہ کے لئے سامان بہار مہیا کرتے تھے۔

یارب ایں بچۂ ترکاں چہ بتاں اند کہ ہست　　　دیدۂ مردم نظارہ از ایشاں چہ بہار

یعنی "اے خدا! یہ ترک بچّے کیسے معشوق ہیں کہ ان کے دیکھنے سے آنکھ میں بہار پیدا ہوتی ہے"۔

لیکن عرب میں یہ باتیں کہاں میسّر تھیں ان کا حسن سادگی کا سرمایہ دار تھا۔ شوخی و شرارت ناز و غمزہ جو قصرِ حسن کے نقش و نگار ہیں ان سے یہاں کا حسن معرا تھا۔ یہاں ان کے صہبائے حسن میں مستی و چاشنی کا پتہ نہ تھا اور نہ ناز و غمزے میں وہ جگر افگاریاں تھیں جو ایران کے شوخ و شنگ ترکوں کے انداز میں پائی جاتی تھیں چونکہ عرب میں مرد سے عشق و محبت کا اظہار نہیں کیا جاتا تھا، ان کے عشق کا مرکز اصول فطرت کے موافق عورت کی ذات تھی عورت کو کتنی ہی آزادی کیوں نہ ہو لیکن وہ مردوں کی آزادی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ایران

کے گلی کوچوں میں ترک بچے اپنی بل کھائی زلفوں کو سنوارے عشقیہ جذبات میں ایک بے پناہ تلاطم پیدا کرتے رہتے تھے۔ یہ اسی کا اثر تھا کہ مدرسوں میں استادوں کی نظریں بھی پری جمال شاگردوں کے چہروں سے ایک منٹ کے لئے جدا نہیں ہوتی تھیں ع

من بتو مشغول و تو با عمرو زید

عربوں کو اصول فطرت کے موافق پردہ نشینوں سے عشق و محبت کے معاملات پیش آتے تھے اس لئے مدتوں تک یہ معاملات صیغۂ راز میں پوشیدہ رہا کرتے تھے چونکہ یہ راز کسی کے چھپائے سے چھپتا نہیں اس لئے جب یہ بات راز کی سرحد سے باہر ہو جاتی تو خاندان کی جانب سے اس عورت کی آزادی اور آمدورفت پر پابندیاں عائد کردی جاتیں، لیکن جب یہ حفاظت ان کی طاقت سے باہر ہو جاتی تو اکثر صورتوں میں اس کا نکاح اس کے عاشق کے ساتھ کر دیا جاتا تھا اس سے دو فائدے نکلتے تھے ایک تو ازدواجی زمانہ نہایت عیش و عشرت اور صلح و امن سے بسر ہوتا تھا دوسرے ذلت و رسوائی سے بھی نجات مل جاتی تھی۔ عربی حسن چونکہ کوچہ بکوچہ تشہیر سے بہت دور رہا اس وجہ سے عرب میں عشقیہ شاعری کو وہ ترقی نصیب نہیں جو ایران کی بہار آفریں زمین کو حاصل ہوئی۔

فارسی شاعری نے وصل و فراق، گلہ و شکر، صبر و قرار اور رقابت کی داستانوں میں جو جو خیال بندیاں اور مضمون آفرینیاں پیدا کی ہیں عرب کی عشقیہ شاعری میں ان پُرکیف داستانوں کا دسواں حصہ بھی نہیں پایا جاتا، عہد تمدن کی عربی شاعری میں گو اس قسم کے جستہ جستہ خیالات ایرانی رنگ میں پائے جاتے ہیں لیکن اس دور کی عربی شاعری حقیقت میں باختلاف الفاظ ایرانی شاعری ہے اس لئے اسکی تمثیلات سے یہاں کچھ بحث نہیں۔

اگرچہ فارسی کی عشقیہ شاعری میں عشق و محبت اور وصل و فراق کی مسلسل

داستانوں کے بجائے مفرد خیالات کا حصہ زیادہ پایا جاتا ہے اور محبوب کی جدائی اور وداع وسفر کے حالات تفصیلی اور مسلسل رنگ میں نہیں ملتے لیکن ان مفرد خیالات میں لذّت و کیف اور ندرت وجدّت کے رنگین جذبات کا جتنا حصّہ موجود ہے وہ عربی کے مسلسل اور مفصّل انداز میں نہیں۔ عشق ومحبت کی منزل سے جتنے راستے نکل سکتے تھے فارسی شعراء نے ان میں سے ہر ایک پر اپنے مضمون آفریں قلم سے جیسی کچھ نکتہ آفرینیاں اور جدت طرازیاں کی ہیں عربی شعراء کے دماغ اس طرف رسائی بھی نہیں کر سکتے۔ محبوب کی بے مہریوں اور فلک نیلگوں کی ظلم فرسائیوں کو کتاب عشق میں سبق اوّل کا درجہ حاصل ہے۔ فارسی شاعری نے اس سبق کے متن پر جتنی حاشیہ آرائی کی ہے عربی شاعری اس سے یکسر خالی پائی جاتی ہے۔

**وداع اور سفر محبوب** محبوب کا سفر اور اس کے جزئیات کی تشریح عشقیہ شاعری کا خاص موضوع رہا ہے۔ مختلف انداز سے شعرائے عرب نے اس موضوع پر قلم فرسائیاں کی ہیں اور عجیب عجیب نکتہ آفرینیوں سے کام لیا ہے اگرچہ فارسی کی عشقیہ شاعری کا یہ خاص موضوع نہیں اور نہ اس موضوع پر قلم فرسائی کا اس کو دعویٰ ہے لیکن اس کے باوجود جو رقت اور درد و کرب اس کے انداز میں ہے عربی رنگ اس اظہار اضطراب سے خالی ہے۔

خذول تراعی ربربا بخمیلة　　　　تناول اطراف البریر وترتدی

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ میری معشوقہ (خولہ) مجھ سے جدا ہو کر جا رہی ہے اور براہ تعلق یا بسبب میری کشش محبت کے میری طرف دیکھتی جاتی ہے جیسے کہ ہرنی اپنے ساتھیوں سے جدا ہو کر دوسرے گلے کے ساتھ چرنے لگتی ہے تو وہ کبھی کبھی اپنے سابق ساتھیوں کو بھی دیکھ لیا کرتی ہے کہ وہ کہاں چر رہے ہیں۔

- اس شعر کے ہر لفظ پر ایک گہری نظر ڈال جایئے کسی لفظ سے آپ کو اس حسرت و اضطراب کا پتہ نہیں چل سکتا جو محبوب کی جدائی کے وقت عاشق کے غمزدہ دل میں قدرتاً

پیدا ہوا کرتا ہے. بلکہ اس شعر کا طرز بیان واقعہ نگاری کے عام انداز سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے
وداع وسفر کے بیان میں ایسے الفاظ اور ایسے اسالیب کا انتخاب جس سے حسرت و اضطراب
کا عالم نہایت شدت کے ساتھ ظاہر ہو بہت ضروری ہے۔

وَالی لامضی الہمّ عند احتضارہ　　　بعوجاء مرقال تروح وَتغتدی

خلاصہ معانی یہ ہے کہ "میری محبوبہ گو مجھ سے دور چلی گئی ہے مگر مجھ کو اس تک پہنچنے میں
کوئی دشواری نہیں۔"

اس شعر سے اطمینان اور جرأت کا انداز ثابت ہوتا ہے جو سراسر خلاف ہے وداع
وسفر کے مواقع کے۔ ان مواقع پر جرأت و اطمینان کے بجائے خاکساری، گریہ وزاری اور اضطراب
و بے چینی کے مضامین کا ہونا لابدی ہے۔

بل مَاتذکر من نوار وقد نأت　　　وَتقطعت اسبابھا وَرمامھا

اپنے آپ کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ اب تو نوار (نام محبوبہ) کو کیا یاد کرکے
روتا ہے اس کے خیال کو چھوڑ دے۔ کیونکہ وہ بہت دور چلی گئی اور اس کے وصال کے
سب راستے بند ہو گئے۔

مریۃ حلت بفید وجاورت　　　اھل الحجاز فاین منك مرامُھا

نوار بنی مرہ کی نسل سے ہے اور وہ مقام فید میں جا اتری ہے اور اہل حجاز کی ہمسائی
ہو گئی پس جب یہ حال ہے تو تیرے لئے کون سی صورت کامیابی کی ہے۔

بمشارق الجبلین او بمحجّر　　　فتضمّنتھا فردۃ فرجامُھا

اس شعر کے تفصیلی معنی کا خلاصہ یہ ہے کہ محبوبہ (نوار) پہاڑوں سے گھرے
ہوئے میدان میں جا اتری ہے یعنی اب وہ ہم سے بہت دور ہو گئی اور وصل کا کوئی موقع نہیں رہا۔
ان تینوں اشعار سے کسی طرح بھی عاشق کی اضطرابی کیفیت کا پتہ نہیں چلتا۔ بلکہ
عاشق اپنے دل کو تسلّی دیتا ہے کہ جو ہونا تھا سو ہو گیا اب گریہ وزاری سے کوئی فائدہ

نہیں بہتر یہی ہے کہ اس کے خیال وصل کو بھی دور کر دیا جائے ہاں بعض مضامین بصد جستجو ایسے مل جاتے ہیں جن میں وداع وسفر کے وقت کی خصوصیات کا پرتو جھلکتا ہوتا ہے۔

قفی قبل التفرق یا ظعینا تخبرك الیقین وتخبرینا

یعنی اے ہودج نشین محبوبہ جدائی سے پہلے اپنی سواری ٹھیرا تاکہ ہم تجھ کو اپنی تکلیف مفارقت سے خبر کر دیں اور تو ہم کو اپنے حال سے مطلع کر دے۔

تبصر خلیلی ھل تریٰ من ظعائن تحملن بالعلیاء من فوق جرثم

اے میرے دوست! ذرا غور سے دیکھ کیا تجھ کو ایسی زنان ہودج نشین نظر آ رہی ہیں جو اپنا اسباب کجاوے پر باندھ رہی ہیں یا صرف مجھ کو جوش محبت کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے جلد بتا کہ کیا میرا خیال صحیح ہے تاکہ میں ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر ان کے پاس پہنچوں اور ایک آخری نظر ان پر ڈال لوں۔

یہ خیالات اگرچہ کچھ وداعی حالات کی مصوری کرتے ہیں لیکن وہ بات نہیں پیدا ہوتی جو ایرانی رنگ میں ہے۔

فارسی شاعر صرف حالات سفر اور مقتضیات کے ذکر پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اصولی طور پر ابتدا سے چلتا ہے جب کسی شخص کو کسی سے قلبی تعلق ہو جاتا ہے تو اس کی جدائی اور دوری ایک منٹ کے لئے نہیں بھاتی اس کی مرضی اور خواہش یہی ہوتی ہے کہ اس کا محبوب اس کی نظر کے سامنے رہے، اتفاق سے جب کہیں محبوب جانے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اس کو اس انداز سے روکتا ہے جس سے اس کے باطنی احساس اور اندرونی اضطراب کا نقشہ سامنے آ جاتا ہے اور سامع بیک ساعت اس کی محبت کی گہرائیوں کا صحیح جائزہ لے سکتا ہے اس موقع پر صرف یہی ایک چیز لحاظ کے قابل ہوتی ہے یعنی سفر سے باز رکھنے کے انداز سے اگر اس کے اندرونی احساسات کا پتہ نہ چل سکے تو یقیناً اس کے جذبات میں اثر انگیزی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس انداز کو ملاحظہ کیجئے۔ الفاظ میں تو عمومیت کا رنگ پایا جاتا ہے لیکن

اسلوب بیان اور طرز نگارش سے اس احساس کا پتہ چل جاتا ہے جو کسی کے دل میں ایک عام بے چینی کی لہر پیدا کئے ہوئے ہے۔

از تو نماندہ تاب جدائی دگر مرا      بہر خدا مرو بہ سفر یا ببر مرا

اس تقسیم میں جدت آمیز تخصیص کا ایک اور رنگ پیدا کیا ہے جس سے معشوق کی عام سرد مہری اور بے التفاتی کی شان بھی ہویدا ہو جاتی ہے۔

نادیدہ کرد، تا نکنم عزم ہمرہی      آں مہ چو دید وقت سفر در گذر مرا

عام قاعدہ ہے کہ جب کوئی کسی عزیز کے سفر کے متعلق یکا یک خبر سنتا ہے تو مضطرب سا ہو جاتا ہے۔ عاشق کے نزدیک محبوب کی ہستی سے بڑھ کر اور کون عزیز ہو سکتا ہے۔ جب اس کو اپنے معشوق کے سفر کے بارے میں اچانک خبر ملتی ہے تو اس خبر کو سنکر اسکے مجروح دل پر جیسی کچھ گزرتی ہے اس کو اس انداز سے ظاہر کرتا ہے کہ سامع کے دل پر بھی ایک قسم کی چوٹ سی محسوس ہوتی ہے۔

گر قصد آں نہ داشت کہ گردم ز غم ہلاک
بہر چہ کرد؟ از سفر خود خبر مرا

عربی شاعر کا یہ مخصوص رنگ ہے کہ وہ راستے کی سختیوں، مصیبتوں اور دشوار گزاریوں کو اس انداز سے بیان کرتا ہے جس کو سن کر معشوق ارادۂ سفر سے باز آجائے فارسی شاعر نے بھی اس موقع پر یہی اسلوب اختیار کیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ایرانی رنگ تغزل اس بیان میں وہ کیف و سوز پیدا کرتا ہے جس سے عربی رنگ خالی ہے۔

یاران خدائے را بسوئے او گذر کنید      باشد کش ایں خیال زخاطر بدر کنید
از حال ما چناں کہ درو کار گر شود      آں بے محل سفر کن ما را خبر کنید
منعش کنید از سفر و در میان منع      اغراق در صعوبت رنج سفر کنید
گر خود شنید جان من و مژدہ از شما      او نشنود مباد کہ ایں جا گذر کنید

یعنی اے دوستو! خدا کے لئے اس بے مہر کے پاس ذرا جاؤ ممکن ہے کہ یہ خیال اس کے دل سے نکالنے میں تم کامیاب ہو جاؤ اس بے موقع سفر کرنے والے سے ہمارا حال اس انداز سے بیان کرو، کہ اس کے دل پہ خاص اثر مترتب ہو۔ سفر کے ارادے سے اس کو روکو، بسلسلۂ گفتگو میں راستہ کی سختیوں کو بھی خوب بیان کرو اگر وہ مان لے تو میرے پاس خوش خبری لانا میں اس کے عوض اپنی جان نذر کردوں گا اور اگر بدقسمتی سے نہ سُنے تو پھر میرے پاس آنے کا خیال نہ کرنا"۔

عربی کی تمام شاعری کا مطالعہ کر جائیے لیکن یہ انداز بیان اور یہ سوز و گداز آپ کو کسی جگہ بھی نہیں ملے گا باوجودیکہ عربی شاعری کا یہ خاص موضوع ہے مگر کشش و کہربائی فارسی کے ساتھ ہے۔

**بدگمانیاں** بدگمانی اور عشق دونوں لازم و ملزوم چیزیں ہیں جہاں عشق پایا جائے گا وہاں بدگمانی کا وجود ضرور ضرور ہوگا یا یوں سمجھئے کہ عشق و محبت کا تقاضا ہی بدگمانی کی تخلیق ہے۔ دنیا کے کسی خطّہ کی شاعری بدگمانی کے بیانات سے خالی نہیں، عربی شاعری نے بھی اس رنگ کو مختلف انداز سے پیش کیا ہے لیکن فارسی شاعری نے "بہ تقاضائے فطرت خویش" اس مضمون میں جو گوناگوں رنگ آمیزیاں کی ہیں عربی شاعری ان رنگ آرائیوں سے معرا ہے۔

بدگمانی کے سبق کا یہ اہم ٹکڑا ہے کہ محبوب عاشق کی مزاج پُرسی کے لئے آتا ہے۔ لیکن عاشق کے لئے یہ خیال سوہان روح بن جاتا ہے کہ اس کو میرے گھر کا پتہ کیسے معلوم ہوا اور نہ معلوم کہ کہاں کہاں اور کس کس سے میرے گھر کا پتہ اس نے دریافت کیا ہوگا اس ٹکڑے کو ایران کا رند اور مست شاعر گوناگوں انداز اور مختلف قسم کی طلسم کاریوں سے بیان کرتا ہے اور ایک عجیب حسرت و یاس کا عالم پیدا کر دیتا ہے۔ عربی رنگ اس قسم کی رنگینیوں سے خالی نہیں لیکن حسرت و یاس کی تخلیق سے ضرور عاری ہے۔

با آں کہ بہ پرسیدن ما آمدہ مُردم
کایا کہ ز پرسید رہ خانۂ ما را

اُردو میں مرزا غالبؔ نے اس مضمون کو ایک دوسرے رنگ میں پیش کیا ہے جو یقیناً انھی کا حصہ ہے۔

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں ،
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

عاشق کا کوئی دوست اگر اتفاق سے معشوق کے متعلق کچھ دریافت کر لیتا ہے (خواہ وہ رسمی طور پر خیریت مزاج ہی کیوں نہ ہو) لیکن عاشق کے دل میں پے بہ پے یہ خیالات پیدا ہوتے ہیں کہ "اس نے کیوں اور کس غرض سے یہ دریافت کیا" اس کا اور محبوب کا کیا تعلق ہے۔

کاش اے محرم! نمی پرسیدمت کان مہ کجا است ،
یک سخن گفتی و باز از صد گمانم سوختی ،

جب محبوب کی آنکھوں میں خواب کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو عاشق کے دل میں ایک بد گمانی پیدا کرنے والا اضطراب سا پیدا ہو جاتا ہے وہ سوچنے لگتا ہے کہ کہیں ضرور اس نے رات عیش و طرب میں بسر کی ہے جس کی وجہ سے اس وقت اس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی ہے۔ زلفوں کی آراستگی پر جب نظر پڑتی ہے تو وہ بھی اس کے بدگمان دل کے لئے وجہ بدگمانی بن جاتی ہے۔

خواب آں نرگس فتان تو بے چیزے نیست
تاب آں زلف پریشان تو بے چیزے نیست

حتےٰ کہ بدگمانی کی دنیا میں ایک موقع یہ بھی آتا ہے کہ عاشق خود اپنی ہستی کے متعلق بدگمانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ خود اپنی نظر بھی معشوق کی جانب اٹھانے کو شک بدگمانی کی نظر سے دیکھتا ہے اور شوق آرزو کے مطابق نظر اندازی کو بے ادبی پر محمول کرتا ہے۔ ع بحکم شوق تماشا مکن کہ بے ادبی است (عرفی)

مرزا غالب نے اس مفہوم کی حقیقی مصوری کی ہے۔ ملاحظہ ہو۔ ۵

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

**ستم انگیزیاں** ظلم و ستم یہ وہ الفاظ ہیں جو عشقیہ شاعری کی دنیا میں معشوق کی ذات کے ساتھ بطور صفات استعمال کئے جاتے ہیں دنیا کے کسی خطہ کا محبوب ان صفات سے عاری نہیں۔ عربی شاعری کا محبوب بھی ان صفات سے متصف ہے۔ لیکن ایرانی محبوب میں جس شدت کے ساتھ یہ صفات موجود ہیں اتنی شدت عربی محبوب میں نہیں ایران کا فتنہ گر معشوق عاشق کی کمزوریوں اور حوصلہ مندیوں سے اچھی طرح واقف ہے اس لئے وہ ظلم و ستم اور فتنہ گری کے چہرے کی سو سو طرح سے نقاب کشائی کرتا ہے اور چونکہ وہ اس رمز سے بھی واقف ہے کہ عاشق کو میرے ظلم و ستم سے کوئی تکلیف نہیں پہونچتی بلکہ اس کے لئے عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا۔ اس لئے وہ نہایت بیباکی سے عاشق کو چھیڑنے کے لئے نت نئے ظلم ایجاد کرتا ہے۔

ہر گاہ کہ از لطف بہ کیں میل تو بیش است
اول نمک سینۂ ما پاش کہ ریش است (عرفی)

خود تو رقیب کے ساتھ چہل قدمی میں مصروف ہے راستہ میں کہیں قسمت کا مارا بیچارہ عاشق بھی مل جاتا ہے۔ چھیڑنے کی غرض سے اس سے بھی ساتھ چلنے کو کہتا ہے حالانکہ وہ اس بھید سے خوب واقف ہے کہ اس حالت میں عاشق کی غیرت ساتھ چلنے کو کبھی بھی گوارا نہیں کر سکتی لیکن اس کا مقصود تو بجز شوخی و ناز اور کچھ نہیں۔

سیر دی با غیر دمی گوئی بیا عرفی تو ہم
لطف فرمودی برو کیں پائے رفتار نیست

ایرانی محبوب کی نوخیزی اور ناز و غمزہ کا مقابلہ دوسری جگہ کا محبوب نہیں کر سکتا یہ صرف ایرانی محبوب کی جمال آرائیوں کا اثر ہے کہ فارسی شاعری نے عشقیہ میدان میں وہ

گوہر آبدار پیش کئے ہیں کہ دنیا کی عشقیہ شاعری اس کے تنوع اور فروغ کے سامنے ماند پڑ گئی۔
ایرانی محبوب ناز و انداز کا ایک پیکر اور حسن و غمزہ کا ایک حسین مجسمہ ہے اور اسی کے ساتھ
عشق و محبت کا ادا شناس اور معاملات الفت کا نکتہ داں اس کے مقابل عرب کے محبوب میں
بجائے حُسن و غمزے کی کشش کے بدوبیت اور الّڑھ پن کے آثار زیادہ پائے جاتے ہیں۔
واردات عشق کی ادا شناسی سے اس کو کوئی واسطہ نہیں ایران کا بلند و بالا محبوب اپنے
حسن دلکش کی پر نوا فگنی سے عاشقانہ جذبات کو اس قدر برانگیختہ کر دیتا ہے کہ ہر شخص کا
دل عشق و محبت کی فسوں کاریوں سے مسحور سا ہونے لگتا ہے اور ایک عام کیفیت سی طاری
ہو جاتی ہے اور یہ بیخودی اتنی ترقی کر جاتی ہے کہ خود محبوب عاشق کی جانب متوجہ ہے
لیکن عاشق کو محویت کی وجہ سے کچھ خبر نہیں۔

ربودہ آں چناں از خود خیال آں پری رویم
کہ خود حرفے اگر پرسد جواب او نمی گویم
ز حال او اگرچہ آگہم بیش از ہمہ، لیکن
ز بیتابیٔ شوق احوال او از این و آں پرسم

ایرانی محبوب کا ہر انداز ظلم اپنے اندر ایک ایسا نشتر پنہاں رکھتا ہے جس کے لگنے کے
بعد زخم کا اندمال ممکن نہیں اس شوخی کی انتہا کو ملاحظہ کیجئے۔

گفتم چہ گونہ می کشی و زندہ می کنی — از یک نگاہ کشت و نگاہ دگر نہ کرد

گاہے گاہے عاشق کو اپنے پہلو میں جگہ دے دی جاتی ہے بظاہر تو یہ لطف و کرم
معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں کرم و عنایت مقصود نہیں بلکہ اس میں یہ رمز پنہاں ہوتا ہے
کہ وہ اچھی طرح سے چمن حسن کی خوشہ چینی بھی نہ کر سکے۔

در بزم از اں بہ پہلوئے خود جا دہد مرا
تا راست سوئے او نتوانم نگاہ کرد

رقیب کی مکر آمیز اور بوالہوسانہ انداز گفتگو میں محبوب کو لطف آرہا ہے. لیکن عاشق کو فریب میں مبتلا کرنے کی غرض سے وہ رقیب کی جانب سے بطرز حیلہ اپنا منھ پھیر لیتا ہے تاکہ عاشق یہ سمجھ لے کہ رقیب کی جانب اس کو التفات نہیں بلکہ خود رقیب ہی اس کی بزم میں بے شرمانہ آتا ہے. حالانکہ محبوب کی ساری توجہ در پردہ رقیب ہی کی جانب ہے. عاشق کو تو صرف مبتلائے فریب رکھنا چاہتا ہے.

چوں کند غیر سخن بہر فریب دل من　　　رو بگردانی و خود را بشنیدن داری

نواب کلب علی خاں مرحوم والی ریاست رام پور نے اسی مفہوم کو ایک عجیب دلکش انداز سے پیش کیا ہے.

سخن با غیر و روئے سوئے من داری سرت گردم
زچشم حسرتم فہمیدہ باشی بدگمانی را

"سرت گردم" کے اضافی ٹکڑے نے اس مفہوم میں شعریت کا اصلی رنگ پیدا کر دیا. معشوق کی بزم ناز میں عاشق اور رقیب دونوں موجود ہیں. عاشق بیچارہ رقیب کی موجودگی کے باعث ایک راز کی بات آہستہ سے معشوق سے پوچھتا ہے لیکن وہ اپنی شوخی، ستم ظریفی اور کج ادائی سے نہیں چوکتا اس کا جواب وہ اس انداز سے دیتا ہے کہ رقیب کے کان بھی اس سے آشنا ہو جاتے ہیں چونکہ وہ بات رقیب کے خلاف واقع ہوتی ہے اس لئے عاشق کو اس کی ستم ظریفی کی وجہ سے مفت میں ندامت و شرمندگی حاصل ہوتی ہے.

چناں گوید جواب من کزاں گردد رقیب آگہ
بہ مجلس گر من بیدل از و حرفے نہاں پرسم

اس کو ظلم آرائی کا صرف ایک انداز ہی یاد نہیں بلکہ سینکڑوں طریقے اس کی قوت اختراع ایجاد کرتی رہتی ہے اس کا ہر انداز ایک نیا ظلم اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ عاشق بہ مصلحت چند روز کے لئے آمد و رفت بند کر دیتا ہے. ستم

شعار محبوب کو اس چند روزہ غیر حاضری سے ایک نیا انداز ظلم ہاتھ آجاتا ہے اور وہ اس غیر حاضری کی تعزیر میں پھر اس کو حاضری کی اجازت بھی نہیں دیتا۔

رفتم دو روزے از در او بہر مصلحت
دیگر مرا نخواند دہاں را بہانہ ساخت

چونکہ ظلم وستم اور ناانصافی محبوب کے خمیر میں داخل ہے اس اعتبار سے عربی محبوب بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہیں لیکن اسی کے ساتھ عاشق کی خبر گیری اور وفاشعاری کے اوصاف بھی اس کی ذات میں پائے جاتے ہیں اگر وہ ایک طرف ظلم دوست ہے تو دوسری جانب رحم وکرم کی نشانیاں بھی اس کے اندر موجود ہیں۔

خذ دل تراعی ربربا بخمیلة تناول اطراف البریر وترتدی

"یعنی میری معشوقہ مجھ سے جدا ہو کر جا رہی ہے اور براہ تعلق میری طرف دیکھتی جاتی ہے جیسے کہ ہرنی اپنے ساتھیوں سے جدا ہو کر دوسرے گلہ کے ساتھ چرنے لگتی ہے تو وہ کبھی کبھی اپنے ساتھیوں کو بھی دیکھ لیا کرتی ہے کہ وہ کہاں چر رہے ہیں۔" وقت روانگی عاشق کی طرف دیکھنا اس کے رحم وکرم کی دلیل ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ عرب کا عاشق اپنے آپ کو لئے ہوئے رہتا ہے وہ معشوق کی بے اعتنائیوں اور بے التفاتیوں پر فخر نہیں کرتا بلکہ وہ اس حالت کو زیادہ عرصے تک اپنے لئے ناقابل برداشت تصور کرتا ہے اور نہایت شرافت کے ساتھ اس سے علیحدگی اختیار کرلیتا ہے۔

بِطَلِیحِ اَسْفَارٍ تَرَکْنَ بَقِیَّةً ، مِنْهَا فَاَحْنَقَ صُلْبُهَا وَ سَنَامُهَا

خلاصہ مفہوم یہ ہے کہ محبوب کے برتاؤ میں اگر کچھ فرق آجائے تو تیرے لئے ضروری ہے کہ تو اپنی تیز رو ناقہ کے ذریعہ اس کے پاس سے علیحدہ ہو جا لیکن ایرانی محبوب کے پاس رحم وکرم کا گذر نہیں وہ ظلم وستم کا ایک مجسمہ ہوتا ہے۔ عاشق کا استفسار حال اس کی ظلم پیشہ سرشت کے سراسر خلاف ہے بلکہ وہ اس طرف توجہ بھی نہیں کرتا اور اگر کبھی اس

کا خیال آ بھی گیا تو اس کا منشا استفسار حال نہیں ہوتا بلکہ اس پردے میں نمک پاشی مدنظر ہوتی ہے عاشق کو سنانے کے لئے رقیبوں سے اس کی حالت دریافت کرتا ہے۔ جس سے بیچارے عاشق کا دلِ غمزدہ اور مجروح ہو جاتا ہے۔

پس از عمرے اگر حال من بیمار می پرسد
نمی پرسد زمن آں نیز ہم ز اغیار می پرسد

اس کی ستم ظریفی اور ظلم دوستی کا ایک انداز یہ ہے کہ عاشق حرماں نصیب کے جو راز اس کو معلوم ہوتے ہیں ان کو تو رقیبوں سے کہہ دیتا ہے لیکن رقیبوں کے حالات اپنے رازوں کی طرح عاشق سے پوشیدہ رکھتا ہے۔

سخن مدعیان را کند از من پنہاں ؟ وآنچہ از من شنود بر ہمہ اظہار کند

عشق و محبت اور شوق و آرزو کی زیادتی کی وجہ سے عاشق کی یہ عین تمنا ہوتی ہے کہ معشوق اس کی طرف خاص التفات رکھے اور اس کے کہنے پر عمل کرے لیکن محبوب کو عاشق کُشی میں جو لطف آتا ہے وہ عاشق پرستی اور وفا شعاری میں کہاں۔ عاشق کی ذلت و رسوائی میں جو لذت پنہاں ہے وہ تکریم عاشق میں نہیں۔ عاشق کی آرزوؤں کا وہ صرف اس وجہ سے خون کرتا ہے کہ اس سے اس کو لطف آتا ہے وہ عاشق کی رائے کی صرف اس وجہ سے مخالفت کرتا ہے تاکہ رقیبوں کی نظروں میں عاشق کی رسوائی اور سبکی ہو سکے۔

تا مرا در نظر مدعیاں خوار کند ہر چہ گویم بخلاف سخنم کار کند

عاشق کی خوش قسمتی سے کبھی کوئی ایسا کلمہ اس کے منہ سے نکل بھی گیا جس سے محبت کا مفہوم متعین کیا جا سکے یا عاشق کی دلجوئی کا انداز پایا جا سکے تو فوراً پے بہ پے ایسی باتیں کہہ جاتا ہے جس سے کلمات سابقہ کا مفہوم محبت کے دائرے میں محدود کرنا مشکل ہو جاتا ہے

یکبار نہ گفتی سخن مہر کہ در پے صد گونہ حدیث غلط انداز نہ گفتی

ایرانی محبوب کے ظلم و ستم کا سب سے نیا انداز یہ ہے کہ عاشق کسی تدبیر سے اگر بزم محبوب میں

پہنچ بھی گیا تو اس بیچارے سے آنے کی غرض دریافت کی جاتی ہے اور مقصود اس سے یہ ہوتا ہے کہ اس طنزی رنگ سے پریشان ہو کر بزم کو خالی کر دے چنانچہ نتیجہ اس کا یہی نکلتا ہے کہ عاشق بیچارہ شرمندہ ہو کر بزم محبوب سے اُٹھ جاتا ہے۔

پس از عمرے کہ در بزمش بہ صد تقریب بنشینم      سخن از مدعائے من کند تا زود برخیزم

عاشق بیچارہ گڑگڑاتا ہے آہ و زاری کرتا ہے لیکن اس کے بے وفا دل میں رحم و کرم کے آثار بھی نہیں پیدا ہوتے وہ اس کی بے چینی اور اضطراب کی جانب التفات بھی نہیں کرتا بلکہ اس کے اظہار اضطراب پر مُسکرا کر منہ پھیر لیتا ہے۔

می نشینم می شکیبم می گدازم میر دم      اضطرابے می کنم اما کہ پروا می کند

معشوق بزم ناز میں سرگرم تماشا ہے اتنے میں اس کو عاشق کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کا خیال پیدا ہوا۔ عاشق کو بلانے کے لئے قصداً ایسے شخص کو بھیجتا ہے جس کو عاشق کے گھر کا پتہ بھی نہیں معلوم اور مقصود اس کج ادائی سے عدم طلبی کے الزام سے برأت ہے۔

با غیر نشینی و فرستی ز پے ما      آں را کہ نداند رہ کاشانۂ ما ہم

عاشق کی گردن زدنی کا وقت ہے حسرت بھری نگاہوں سے وہ چاروں طرف دیکھ رہا ہے کہ شاید دم قتل ہی وہ فتنہ گر سامنے آجائے لیکن اس فتنہ جو اور بے وفا دشمن کی قوت اختراع اس وقت بھی ظلم و ستم کے اختراع سے باز نہیں آتی بلکہ ایسے نازک اور کس مپرسی کے عالم میں اس کا ظلم کچھ اور ترقی کر جاتا ہے۔ وہ اٹھتا ہے اور اٹھ کر آنکھوں پر پٹی باندھ دیتا ہے تاکہ وہ حسرت دیدار اپنے ساتھ لے جائے۔

قاتل من چشم بند و چوں کند بسمل مرا      تا بماند حسرت دیدار ہم در دل مرا

انجمن نشاط میں محبوب تشریف فرما ہے ہر شخص سے ناز و انداز کے ساتھ باتیں ہو رہی ہیں۔ لیکن بیچارے عاشق کی طرف کوئی توجہ نہیں۔ ہر بوالہوس کو نقاب برافگندہ کر کے محروم صبر و ہوش بنایا جاتا ہے حسن کی تجلیوں سے معمور ہو کر اگر محبوب کی جانب اس کی نظر اُٹھ بھی جاتی ہے تو

اس کو بے ادب کہہ کر ڈانٹ دیا جاتا ہے، بوالہوس اس کی اس تحقیر پہ خوش ہوتے ہیں لیکن وہ منزل عشق کا سرگرم جنیدہ اس انداز معصومانہ کی لذت سے مست و بیخود ہو جاتا ہے۔

رخ جملہ را نمود و مرا گفت تو مبیں      زیں ذوق مست و بیخبرم کان سخن چہ بود

حقیقت تو یہ ہے کہ کاسۂ گدائی کی شکست سے مجنوں کو جو لطف حاصل ہوا تھا اس سے بوالہوس واقف نہیں۔ نظیری نے اسی مفہوم کو دوسرے انداز سے لکھا ہے۔

قسمت چنیں فتاد کہ تر کان مست بیں      دردو دوا بطاق نہادند جام را

مرزا غالب نے اس مفہوم میں بدگمانی کا رنگ پیدا کر کے اس کو بہت ہی بلند کر دیا۔

مجھ تک کب اس کی بزم میں آیا تھا دورِ جام<br>
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اگر اس کے دل میں کبھی خیالات نوازش پیدا بھی ہوتے ہیں تو وہ محبت کے جذبے کے ماتحت نہیں بلکہ انسانیت اور عمومیت کے لحاظ سے۔ ع

نوازشے ز کرم می کند محبت نیست      (نظیری)

اگر انسانیت یا عمومیت کا لحاظ مد نظر نہیں ہوتا تو خود غرضی کے آثار پوشیدہ ہوتے ہیں۔

آفریں بر دل نرم تو کہ از بہر ثواب<br>
کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدۂ      (حافظ)

(باقی آئندہ)

# تنقید و تبصرہ

**حقیقت علمی شاعری** | از مولوی نصیر الدین حسین صاحب نصیر بیرسٹر ایٹ لا عظیم آبادی
تقطیع $\frac{20\times30}{16}$ حجم ۱۱۶ صفحے۔ لکھائی، چھپائی کاغذ نہایت نفیس۔ قیمت اور ملنے کا پتہ درج نہیں۔ غالباً مصنف سے اور معارف پریس اعظم گڈھ سے مل سکتی ہے۔

حضرت نصیر کو قارئین جامعہ شاعر نغز گو کی حیثیت سے جانتے ہیں مگر آپ کی نقادی کے کمال سے ابھی تک واقف نہیں تھے۔ "حقیقت علمی شاعری" میں آپ نقاد شاعر یا شاعر نقاد کی شان سے نظر آتے ہیں۔ یہ ایک مثنوی ہے جس میں شاعری کی تعریف اس کی مختلف اصناف کا بیان حقیقی اور مجازی شاعری کا فرق عبرانی، یونانی، سنسکرت، لاطینی عربی شاعری کی خصوصیات، اردو شاعری کی مختصر تاریخ، جس میں قدیم اور جدید شعرا کے کلام پر دو دو چار چار شعر میں تبصرہ کیا گیا ہے، مشرقی اور مغربی شاعری کا مقابلہ یہ سب چیزیں نہایت صاف اور سلیس اردو نظم میں ادا کی گئی ہیں۔ جو حضرات کتاب کا نام دیکھ کر ڈر گئے ہوں ان کے اطمینان کے لئے یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ علمی شاعری سے مراد عام اعلےٰ شاعری ہے اور یہی مصنف کی تنقید کا موضوع ہے نہ کہ کوئی خاص صنف شعر جس میں خشک علمی مباحث نظم کئے گئے ہوں۔ وجہ تسمیہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ "حقیقت علمی شاعری" سے ۱۳۴۹ھ نکلتا ہے جو کتاب کا سال تصنیف ہے۔

ہمارے خیال میں یہ نام خود مصنف نے جو بڑے خوش مذاق شاعر اور ادیب ہیں تجویز نہیں کیا ہوگا بلکہ کسی خوش عقیدہ بزرگ نے ثواب کی غرض سے رکھا ہوگا۔ کتاب سے پہلے مولٰنا سید سلیمان ندوی کا مقدمہ ہے جس میں مصنف کے فضل و کمال اور مکارم و اخلاق کی مختصر مگر نہایت دلکش تصویر ہے۔ پھر سید محمد اسمٰعیل صاحب رسا ہمدانی ایڈوکیٹ نے

(جن کے نام نامی کے ساتھ نہ معلوم کس مصلحت سے ہر جگہ ٹرپل ایم. اے گولڈ میڈلسٹ لکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے) مصنّف کے حالات لکھے ہیں، ان کے فارسی اور اُردو کلام پر تبصرہ فرمایا ہے۔ آخر میں موقع سے مناسبت پیدا کرنے کے لئے اس مثنوی پر بھی مختصر سا ریویو کر دیا ہے۔

مثنوی اہل ذوق کے پڑھنے کی چیز ہے۔ تنقیدی مسائل کو نظم کرنا اور وہ بھی اس طرح کہ خشکی یا پیچیدگی نہ پیدا ہونے پائے اور کہیں کہیں شاعری کا مزا بھی آجائے۔ کوئی سہل کام نہیں۔ اس کے لئے حضرت نصیر ہی جیسے کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر کی ضرورت تھی۔

---

آزاد روزانہ | اڈیٹر عبدالباقی صاحب بی. اے جامعہ۔ صدیق طبیب صاحب۔ اسمٰعیل چشتی صاحب۔ سید محفوظ جامعی صاحب تقطیع معمولی ضخامت ۱۲ صفحات کاغذ اور کتابت وطباعت اعلےٰ قیمت سالانہ عـــ ٨ روپیہ فی پرچہ ایک آنہ۔ مقام اشاعت لاہور۔

جناب عبدالباقی صاحب بی اے جامعہ اور ان کے رفقائے کار نے روزنامہ زمیندار سے علیحدگی کے بعد آزاد کے نام سے ایک روزانہ اخبار جاری کیا ہے۔ اس وقت اس کا پہلا نمبر پیش نظر ہے جو بہترین کتابت وطباعت کے ساتھ بارہ ۱۲ صفحات پر شائع ہوا ہے۔ سرورق پر دو ۲ علمی و مذہبی مضمون ہیں۔ دوسرے صفحے پر ڈاکٹر ٹیگور۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال اور دوسرے عمائدین قوم کے پیغامات ہیں۔ تیسرے صفحے پر یورپ پر ہندوستان کا ذہنی وروحانی تفوق اور یورپ پر امریکہ کا قرضہ دو اعلےٰ درجے کے علمی مضمون ہیں۔ چوتھے صفحے پر قادیانی تحریک اور اس کے مقتدا پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ ملّا رموزی کا ایک چھوٹا سا مضمون ہے اور سوروپے کا انعامی معمّا ہے پانچویں صفحے پر مقالہ افتتاحیہ اور نوٹ ہیں۔ علاوہ اس کے ہندوستان کی ممتاز قومی و وطنی مجالس پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ پھر اسلامیان ہند کے دس مقتدر زعماء پر ایک عجیب مضمون ہے پھر خبریں ہیں۔ پھر سول نافرمانی کے داخلی اور خارجی نتائج پر مشہور فاضل

بابو بھگوان داس کا ایک اہم مضمون اور اس کے بعد ایک مسلسل افسانہ ہے۔ مضامین اور خبروں کی ترتیب میں ایک خاص سلیقہ اور صفائی نظر آتی ہے۔ پالسی قریب قریب وہی ہے جو زمیندار کی ہماری دلی دعا ہے کہ خدا اس نونہال کو پروان چڑھائے۔

---

ایلکٹریکل انجینیرنگ حصہ اول | مصنفہ محمد شجیع اللہ صاحب تقطیع ۲۰×۲۶/۸ ضخامت ۱۶۸ صفحات کتابت و طباعت بہترین۔ کاغذ متوسط۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ احسن بک ایجنسی بازار سریاں والا لاہور۔

محمد شجیع اللہ صاحب الیکٹرک انجینیرنگ پر کتابوں کا ایک سلسلہ تیار کر رہے ہیں زیر نظر کتاب، اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ اس میں انھوں نے مکانات، مل اور فیکٹری کے وائرنگ پر تمام معلومات نہایت ترتیب اور سلیقہ سے یک جا کر دی ہیں۔ جگہ جگہ نقشے اور تصویریں بھی دی گئی ہیں جس سے کتاب اور بھی مفید ہو گئی ہے۔ ہمارے خیال میں اب تک اس فن پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں یہ ان سب سے بہتر ہے۔

---

بوہرہ قوم اور وقف ایکٹ | مرتبہ ایک مصنف مسلمان تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ۹۸ صفحات۔ کاغذ اور کتابت و طباعت متوسط قیمت تین آنہ ملنے کا پتہ مطبع نادری جبل پور۔

بوہروں کے مذہبی پیشوا حضرت ملا طاہر سیف الدین مدظلہ کے پاس لاکھوں کروڑوں روپے کے اوقاف ہیں۔ بعض مسلمان چاہتے ہیں کہ اس کے حساب کتاب کی باقاعدہ نگرانی کی جائے ادھر بمبئی کی حکومت نے وقف ایکٹ کے نام سے ایک قانون بھی جاری کیا ہے۔ حضرت ملا صاحب اور ان کی قوم اس ایکٹ کے خلاف ہے اور اسے ایمان دھرم کے خلاف اور مداخلت فی الدین سمجھتی ہے اور ان کا مطالبہ ہے کہ یہ اوقاف وقف ایکٹ سے مستثنیٰ کر دیے جائیں۔ یہ رسالہ اسی موضوع پر ہے اور ایک مصنف مسلمان صاحب نے بڑے زور شور سے حضرت ملا صاحب کی حمایت کی ہے۔

# خواجہ میر درد کے مدفن پر

نہ چین دے سکی جب شورشِ نہاں مجھ کو
ترے حضور میں لائی کشاں کشاں مجھ کو

میں تیری عظمتِ خاکِ مزار کے صدقے
زمیں بھی آج نظر آئی آسماں مجھ کو

نگاہِ شوق میں مدفن کی ہے یہ تابانی
کہ ذرّے ذرّے پہ ہے طور کا گماں مجھ کو

سُنائی دیتا ہے ہر نغمۂ لطیفِ حیات
دکھائی دیتا ہے ہر جلوۂ نہاں مجھ کو

نظر کو جس کی تمنا تھی ایک مُدت سے
دکھا دیا مری قسمت نے وہ سماں مجھ کو

مجھے وہ نورِ حقیقت عطا کیا تو نے
کہ اپنے دل پہ ہے اب طور کا گماں مجھ کو

نہیں ہوا کہیں ایسا کہ دادِ غم ملتی
یہاں پہنچ کے ملی لذّتِ فغاں مجھ کو

حدودِ دہر، قیودِ جہاں سے ہوں آزاد
زمیں پہ رہ کے ہوئی سیرِ لامکاں مجھ کو

ریاضِ حُسنِ معانی کی نوبہار ہے تو
قرار بخش تمنائے بے قرار ہے تو

(۳)

ترے نفس میں تھی نکہت ریاضِ جنت کی
تری نظر میں تھی تفسیر رازِ فطرت کی

کلیم طورِ معانی خطاب تھا تیرا
ترا وجود ہی گویا جواب تھا تیرا

ترا کلام ہے رنگین پیامِ فطرت کا
ترا بیان ہے جھونکا نسیمِ جنت کا

تجھی سے کھل گئے سربستہ رازِ ہستی کے
بتائے ہوش کو تو نے رموز مستی کے

جہانِ روح میں اِک قاصدِ سکوں تو تھا
فرازِ عشق کا اِک خضرِ رہنموں تو تھا

ترے کلام کی اب تک بہار باقی ہے
تری عروس کا اک اک نکھار باقی ہے

ترا جمالِ سخن لازوال ہے اب تک
سپہرِ شعر پہ نجم کمال ہے اب تک

شراب خانۂ اُردو کا تو وہ ساقی ہے
کہ جس کا آج بھی لبریز جام باقی ہے

# شذرات

جامعہ ملیہ کے ابتدائی مدرسے میں اس سال کنڈر گارٹن کلاس کا افتتاح ہوا ہے جس کی تعلیم اور نگرانی مس فلپسبورن کے سپرد ہے۔ یہ وہ جرمن خاتون ہیں جن کا تعارف ہم قارئین جامعہ سے کرا چکے ہیں۔ کنڈر گارٹن کا طریقہ آزمائش کے طور پر جاری کیا جا رہا ہے۔ سال بھر کے تجربے کے بعد جو نتائج نکلیں گے وہ ہمدردان جامعہ کی خدمت میں پیش کر دئے جائیں گے۔ اس مرتبہ مدرسے کو بڑی مشکل کا سامنا ہے مگر الحمد للہ وہ مشکل اس قسم کی ہے جو کامیابی اور ترقی کی وجہ سے واقع ہوتی ہے۔ مدرسے میں داخلے بہت کثرت سے ہو رہے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے بچوں کی تعداد پچھلے سال کے مقابلے میں دگنی ہو جائے گی۔ موجودہ اقامت خانے سب بھر گئے ہیں اور نئی عمارتیں جس وسعت اور مکانیت کی درکار ہیں اب قرول باغ میں نہیں ملتیں۔ اپنی عمارت جلد بنوانے کی ضرورت اب اور بھی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ اگر اکتوبر تک ہمدردان جامعہ کی تحریک میں خاطر خواہ کامیابی ہو گئی تو غالباً اسی سال عمارت کا سنگ بنیاد رکھ دیا جائے اور اسکی تکمیل کے لئے پوری پوری کوشش شروع کر دی جائے۔

---

شاید ہم پہلے بھی ان صفحات میں یہ کہہ چکے ہیں کہ جامعہ ملیہ کے تعلیمی نصب العین کو حاصل کرنے میں تدریجی طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے یعنی اگرچہ تعلیم مکتب سے لے کر بی۔اے تک کی ہوتی ہے اور تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری ہے لیکن تجویز یہ ہے کہ پوری توجہ اور سعی پہلے ابتدائی تعلیم پر صرف کی جائے پھر ثانوی تعلیم اور اوسط درجے کی صنعتی تعلیم پر، اس کے بعد اعلےٰ تعلیم اور علمی پیشوں کی تعلیم پر اور آخر میں علمی تحقیقات اور اشاعت علوم پر۔ خدا کا شکر ہے کہ ان مدارج میں سے پہلا درجہ یعنی ابتدائی تعلیم کا کام ایک حد تک حسب دلخواہ

ہونے لگا ہے اور امید ہوتی ہے کہ وہ ایک سال میں کارکنان جامعہ کو اس کی طرف سے مطمئن ہو کر آگے قدم بڑھانے کا موقع ملے گا۔ جو مشکلات موجودہ بے حسی کے دور میں قومی کاموں کو پیش آ رہی ہیں ان کا لحاظ کرتے ہوئے اگر جامعہ والے انتہائی سرگرمی اور استقلال سے کام کرتے رہے تب بھی اپنے کام کے کل مدارج پندرہ سولہ برس سے کم میں طے نہیں کر سکتے۔ ہاں اگر یک بیک کچھ ایسے اسباب پیدا ہو جائیں جو قوموں کے دور تعمیر میں اکثر پیدا ہو جایا کرتے ہیں اور جنہیں معمولی نظر کے لوگ پہلے سے نہیں دیکھ سکتے تو کیا عجب ہے کہ ملت اسلامی کے اس عارضی جمود کی جگہ وہ ہیجانی حرکت پیدا ہو جائے جسے جذبات پرست کوتاہ اندیش لوگ وقتی شور و غل میں ضائع کر دیتے ہیں لیکن ضبط پسند عاقبت بیں اس سے فائدہ اٹھا کر تھوڑے وقت میں بہت کام کر ڈالتے ہیں۔ اگر ایسی کوئی لہر اٹھی تو ممکن ہے کہ وہ جامعہ ملیہ کی کشتی کو بھی برسوں کی جگہ مہینوں میں پار لگا دے۔ بہر حال جامعہ کے خادم اس کے لئے تیار ہیں کہ اگر کوئی قریب کی راہ نہ بھی ملے تو دور کے دشوار گذار راستے سے ساری کڑیاں جھیلتے ہوئے آج کی جگہ کل منزل مقصود پر پہنچیں۔

---

یہ پرچہ جولائی کے پرچے کے تھوڑے ہی دن بعد شائع ہو رہا ہے۔ اس لئے "دنیا کی رفتار" کا مضمون اس میں نہیں دیا گیا بلکہ ستمبر کے جامعہ میں دیا جائے گا۔ ستمبر کا رسالہ قریب قریب تیار ہے اور اگر طباعت میں دشواریاں نہ پیش آئیں تو ستمبر کے شروع میں شائع ہو جائے گا۔ ہم کئی بار رسالے کو پوری پابندی سے نکالنے کا اعلان کر چکے ہیں اور ہر بار اپنی انتہائی کوشش کے باوجود کامیاب نہیں ہوئے اس لئے اب ہم اس قسم کا کوئی اعلان نہیں کرتے لیکن کوشش جاری ہے اور اس کا نتیجہ بھی ظاہر ہو جائے گا۔

---

بقائے صحت کے لئے ایک اچھی دوا

OKASA.

# OKASA اوکاسا

## دماغی کام کرنے والوں کیلئے ایک بہترین چیز ہے

OKASA.

اوکاسا کے استعمال سے چہرہ کا رنگ نکھر جاتا ہے چستی و توانائی بڑھ جاتی ہے۔

OKASA.

اوکاسا کے استعمال سے جھریاں اور سفید بال نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔

اوکاسا کے استعمال سے اعضائے رئیسہ نئی قوت محسوس کرنے لگتے ہیں۔

OKASA

اوکاسا کے استعمال سے اضمحلال، چڑچڑاپن، نیز دوسری اعصابی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں اور آدمی کی تمام زائل شدہ قوتیں عود کر آتی ہیں۔

## اس سے پہلے کہ

## بحالی قوت کا وقت گذر جائے، اوکاسا کا استعمال شروع کر دیجئے

سو ٹکیوں کا بکس دس روپے (عـہ) .......... آزمائش کے لئے تیس ٹکیاں چار روپے (عـہ)

---

اوکاسا کے اثرات سے مکمل فائدہ حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ نیا اور تازہ اوکاسا کی گولیاں استعمال کیجائیں، اسکی شناخت یہی ہے کہ تازہ اوکاسا کے ڈبہ پر ایک سرخ فلیتہ ہوتا ہے۔

---

اوکاسا ہر دوا فروش سے مل سکتی ہے، یا ذیل کے پتہ سے بھی منگا سکتے ہیں۔

**اوکاسا کمپنی برلن (انڈیا) لمیٹڈ، نمبر ۱۲ ریمپرٹ اسٹریٹ فورٹ، پوسٹ بکس نمبر ۳۹۶ بمبئی**

نئی ایڈیشن　　　نئے رنگ　　　نئی طرز

رجسٹرڈ نمبر ۱۸۹۲

# جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

جلد ۲۱ | بابت ماہ ستمبر ۱۹۳۳ء | نمبر ۳

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

1927.

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری — ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۲۲ | فہرست مضامین رسالہ جامعہ بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۴۳ء | نمبر ۳

# اخلاقی دیوالے کے آثار

(گذشتہ سے پیوستہ)

(۶)

شادی سے پہلے اور ازدواجی زندگی میں پاکدامنی پر زور دینے اور زبردست دلائل سے یہ ثابت کرنے کے بعد کہ ضبط نفس بجائے ناممکن یا مضر ہونے کے سراسر ممکن اور جسم اور نفس کے لئے مفید ہے موسیو بورو ایک پورے باب میں دائمی ترک خواہش کے امکان اور قدر و قیمت سے بحث کرتے ہیں۔ اس کا پہلا پیراگراف اس قابل ہے کہ یہاں نقل کیا جائے:۔

"ان بجات دہندوں، ان سچی جنسی آزادی کے ہراولوں کی صف اول میں جگہ پانے کے مستحق وہ نوجوان مرد اور عورتیں ہیں جنھوں نے زیادہ یکسوئی کے ساتھ کسی بڑے مقصد کی خدمت کرنے کی غرض سے یہ پسند کیا ہے کہ عمر بھر پاکدامن رہیں اور شادی کی مسرتوں سے ہاتھ دھولیں۔ ان کے اس ارادے کے اسباب حالات کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔ کسی نے اپنا فرض سمجھا ہے کہ بیمار ماں یا باپ کی تیمارداری کرے، کوئی یتیم بھائیوں اور بہنوں کے لئے والدین کی جگہ پر ہے، کوئی اپنی زندگی سائنس یا آرٹ یا غریبوں کی خدمت، یا اخلاقی تعلیم یا عبادت کے لئے وقف کرنا چاہتا ہے یا چاہتی ہے۔ اسی طرح اس اختیاری ایثار کے مدارج ہوتے ہیں...... کچھ لوگ معقول تعلیم کی برکت سے جو انھیں برے خیالات سے بچاتی ہے اور عمدہ اخلاقی حفظان صحت کے اصول پر عمل کرنے کی بدولت جنسی تحریصات سے قریب قریب آزاد ہوتے ہیں۔ بعض جو نیکی کی راہ میں آگے بڑھے ہوئے ہیں بعض صورتوں میں سخت کشمکش کے بعد حس کی شدت کو دبی خوب جانتے ہیں اپنی بہیمیت کو مغلوب کرنے اور اپنے جسم پر فتح پانے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ بہرحال ان سب مردوں اور عورتوں نے ایک ہی بات دل میں ٹھان رکھی ہے۔ انھوں نے یہ سمجھ لیا ہے ان کے لئے خدمت خلق کی بہترین صورت یہ ہے کہ شادی نہ کریں اور اپنے آپ سے یا اپنے خدا سے عہد کرلیا ہے کہ ساری

عمر پاکدامنی سے بسر کردیں گے۔ مانا کہ شادی کا فرض بالکل صاف ہے جس میں شبہ کی گنجائش نہیں۔ پھر بھی بعض صورتوں میں جیسا ہم آگے چل کر دیکھیں گے تجرد کا عزم یقیناً جائز ہے کیونکہ اس کا محرک ایک پاک اور برتر مقصد ہے۔ جب لوگوں نے میکائیل انجیلو کو شادی کرنے کی رائے دی تو اس نے کہا "مصوری بڑی رشک پسند محبوبہ ہے وہ سوکن کی روادار نہیں!"

میں اس شہادت کی تصدیق میں بہت سے یورپی حضرات کے تجربات پیش کرسکتا ہوں جو ہمیشہ ترک خواہش پر عامل رہے اور جن کا ذکر بوسیو بوروں نے کیا ہے۔ یہ تو بس ہندوستان ہی میں ہوتا ہے کہ بچپن سے شادی کا چرچا ہونے لگے۔ ماں باپ کے دل میں سوائے اس کے کوئی خیال کوئی حوصلہ نہیں ہوتا کہ ایک تو اپنے بچوں کا سہرا دیکھ لیں دوسرے ان کے کھانے پینے کا کچھ بند و بست کر جائیں۔ ان میں سے پہلی چیز کا تو یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ان کے جسم اور نفس میں قبل از وقت گھن لگ جاتا ہے اور دوسری کی بدولت وہ کاہلی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اکثر طفیلی بن کر رہ جاتے ہیں۔ ہم لوگ پاکدامنی اور اختیاری افلاس کی مشکلات میں بہت مبالغہ کرتے ہیں، ان باتوں کو بڑا کمال سمجھتے ہیں، انہیں مہاتماؤں اور جوگیوں کے لئے مخصوص قرار دیتے ہیں اور ان لوگوں کو معمولی زندگی کے دائرے سے باہر جانتے ہیں۔ ہمیں یہ بات یاد نہیں رہتی کہ جس زندگی کی معمولی سطح اس قدر پست ہو اس میں سچے مہاتماؤں اور جوگیوں کا ہونا قیاس میں بھی نہیں آسکتا۔ قاعدہ ہے کہ بدی خرگوش کی طرح تیزی سے دوڑتی ہے اور نیکی کچھوے کی طرح بہت استقلال سے مگر آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہے۔ چنانچہ مغرب کی عیش پرستی ہمارے یہاں بجلی کی رفتار سے پہنچ گئی ہے، اس نے اپنی گوناگوں دلفریبیوں سے ہماری آنکھوں کو خیرہ کر دیا ہے اور زندگی کی حقیقتوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ مغرب کی جو برکتیں ہر لحظہ تاربرقی کے ذریعے ہم پر نازل ہوتی رہتی ہیں اور جو نعمتیں ہر روز دخانی جہازوں کے مال کی صورت میں ہمارے ساحلوں پر اترا کرتی ہیں ان کے سامنے ہمیں پاکدامنی کے نام سے شرم سی آتی ہے اور اختیاری افلاس جرم سا معلوم ہوتا ہے۔ مغرب میں بھی عفت کا خزانہ موجود ہے جو چھوٹا سہی مگر کبھی ختم ہونے والا نہیں اور جن لوگوں کو خدا نے چشم بصیرت دی ہے وہ اس کی پرفریب سطح کے نیچے تک دیکھ سکتے ہیں۔ یورپ کے صحراؤں میں جا بجا نخلستان موجود ہیں جن سے پینے والے خالص آب حیات پی سکتے ہیں۔ وہاں سیکڑوں مرد

اور عورتیں بے شیخی گھارتے بے باتیں بنائے پاکدامنی اور اختیاری افلاس برتتے ہیں اور اکثر محض اس سبب سے جو اپنی جگہ بہت کافی ہے کہ کسی اپنے پیارے کی یا ملک کی خدمت میں زندگی بسر کریں۔ ہم اکثر روحانیت کے لمبے چوڑے دعوے کرتے ہیں گویا اسے زندگی کے معمولی کاروبار سے کوئی تعلق نہیں اور یہ محض ان زاہدوں کے لئے مخصوص ہے جو ہمالیہ پہاڑ کے جنگلوں میں روپوش ہیں یا غاروں میں چھپے بیٹھے ہیں۔ وہ روحانیت جو روزمرہ زندگی سے بے تعلق ہے اور اس پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتی محض ایک پیکر خالی ہے۔ جن نوجوان مردوں اور عورتوں کے لئے "ینگ انڈیا" ہر ہفتے چھپا کرتا ہے انہیں یہ جان لینا چاہئے کہ اگر وہ اپنے آس پاس کی فضا کو پاک کرنا اور اپنی کمزوری کو دور کرنا چاہتے ہیں تو وہ ہمیشہ پاکدامن رہیں اور یہ بات اتنی مشکل نہیں ہے جتنی وہ سمجھتے آئے ہیں۔

سنئے موسیو بورو اور کیا فرماتے ہیں: "جوں جوں وہ (یعنی جدید عمرانیات) ہمارے آداب معاشرت کی ارتقا پر نظر ڈالتی ہے اور علمی مطالعہ اجتماعی حقیقتوں کا کھوج لگاتا ہے، یہ بات ثابت ہوتی جاتی ہے کہ دائمی پاکدامنی برتنے سے حیات کے انضباط میں جو بہت بڑا کام ہے کس قدر مدد ملتی ہے۔ ماناکہ شادی انسانوں کی بہت بڑی اکثریت کے لئے زندگی کی طبعی حالت ہے مگر سب لوگ تو شادی کر نہیں سکتے اور نہ انھیں کرنا چاہئے۔ اگر ہم ان خاص ہستیوں سے جن کا ذکر ہو چکا ہے قطع نظر بھی کرلیں تو کنواروں کی تین قسمیں ایسی ہیں جو شادی نہ کرنے کی وجہ سے مورد الزام نہیں قرار پا سکتیں، ایک تو وہ نوجوان مرد اور عورتیں جو معاشی یا کاروباری اسباب کی بنا پر شادی کو ملتوی کرنا فرض سمجھیں دوسرے وہ لوگ جنھیں مناسب شریک زندگی نہ ملنے کی وجہ سے مجبوراً کنوارا رہنا پڑتا ہے۔ تیسرے وہ جنھیں بعض عضویاتی نقائص کی وجہ سے جو وراثت سے منتقل ہو سکتے ہیں، شادی سے پرہیز کرنا چاہئے بلکہ بعض اوقات تو اس کا خیال تک دل سے نکال دینا چاہئے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ترک نکاح میں جو خود ان کی راحت اور معاشرت کے مقاصد دونوں کے لحاظ سے ضروری ہے ان لوگوں کا رنج اور بھی گھٹ جائے گا اور خوشی اور بھی بڑھ جائے گی جب وہ دیکھیں گے کہ ہمارے علاوہ دوسرے بھی ہیں جنھوں نے باوجود کامل جسمانی اور ذہنی قوت کے اور بعض صورتوں میں باوجود مقدرت کے یہ عزم کرلیا ہے کہ ساری عمر شادی نہ کریں گے۔ ان

اختیاری کنواروں اور کنواریوں کا جنھوں نے اپنی زندگی کو پوری طرح خدا کی نذر یعنی عبادت اور تہذیب نفس کے لئے وقف کر دیا ہے، یہ دعوے ہے کہ ان کی آنکھوں میں ترک نکاح زندگی کی پست حالت کا نہیں بلکہ بلند حالت کا نام ہے جس میں انسان بخوبی ثابت کر دیتا ہے کہ ارادہ جبلت پر غالب آسکتا ہے۔

مصنف کہتا ہے " دائمی تجرد لڑکوں اور لڑکیوں پر جن کی ابھی شادی کی عمر نہیں ہے یہ ثابت کر دیتا ہے کہ جوانی کا زمانہ پاک دامنی کے ساتھ بسر کرنا ممکن ہے، ان لوگوں کو جن کی شادی ہو چکی ہے یہ فرض یاد دلاتا ہے کہ ازدواجی تعلقات میں پورا پورا ضبط قائم رکھیں اور اپنی ذاتی غرض کو، خواہ وہ بجائے خود جائز ہی کیوں نہ ہو، ہرگز ہرگز اخلاقی عالی ظرفی اور وفاداری کے بلند تر مطالبات پر غالب نہ آنے دیں "

فارسٹر کہتا ہے " تجرد کے عہد سے شادی کی تحقیر مطلق نہیں ہوتی بلکہ یہ تو نکاح کے عہد کا سب سے بڑا پشت پناہ ہے اس لئے کہ اس کی بدولت انسان کا اپنی فطرت کے دباؤ سے آزاد ہونا محسوس شکل میں نظر آجاتا ہے۔ یہ من کی موجوں اور خواہش نفس کے حملوں کے مقابلے میں ضمیر کا کام دیتا ہے۔ تجرد بھی شادی کے لئے ایک زرہ ہے اس معنی میں کہ اس کی وجہ سے بیاہے لوگ اپنے آپ کو ازدواجی تعلقات میں محض پوشیدہ فطری قوتوں کا غلام سمجھنے سے محفوظ رہتے ہیں اور فطرت کے مقابلے میں کھلم کھلا فاعل مختار بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں جن میں اس پر غلبہ پانے کی قوت ہے۔ جو لوگ دائمی تجرد کو غیر فطری سمجھ کر اس کا مضحکہ اڑاتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں۔ ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ جس طرز خیال کی رو سے وہ اس طرح کی باتیں کہتے ہیں اس کا لازمی نتیجہ عیاشی اور تعدد ازدواج ہے۔ اگر فطرت کا تقاضا اٹل ہے تو پھر بیاہے لوگوں سے ضبط نفس کی توقع کیوں کر کی جاسکتی ہے؟ پھر وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ بہت سی شادیوں میں میاں بیوی میں سے ایک کو دوسرے کی علالت یا کسی اور معذوری کی وجہ سے مہینوں، برسوں بلکہ کبھی کبھی ساری عمر حقیقی تجرد کی زندگی بسر کرنا پڑتی ہے یہی ایک ثبوت کافی ہے کہ سچی وحدت ازدواج کا دارومدار اس پر ہے کہ تجرد کی قدر و قیمت کیا سمجھی جاتی ہے۔

( ۷ )

دائمی ضبط نفس کے متعلق جو باب ہے اس کے بعد کے ابواب میں نکاح کے فرض اور اس کے

ناقابل انفساخ ہونے کی بحث ہے مصنف کہتا ہے کہ سب سے بہتر حالت تو دائمی ضبط نفس ہے مگر یہ عام لوگوں کے بس کی بات نہیں۔ ان کے لئے تو نکاح کو فرض سمجھنا چاہئے۔ اس لئے یہ دکھایا ہے کہ اگر نکاح کا اصل مقصد اور اس کی قیود صحیح طور پر سمجھ لی جائیں تو کوئی شخص مانع حمل تدابیر کی حمایت کا نام بھی نہ لے۔ موجودہ اخلاقی بے ضبطی کا سبب غلط اخلاقی تربیت ہے۔ ان اہل قلم کے خیالات کی تردید کرنے کے بعد جنھوں نے نکاح کا مضحکہ اڑایا ہے مصنف لکھتا ہے :۔

"آئندہ نسلوں کی خوش قسمتی سمجھئے کہ یہ خیال محض چھوٹے معلمین اخلاق کا اور ان لوگوں کا ہے جو اخلاقی حس سے بلکہ اکثر حقیقی ادبی ذوق سے بھی کورے ہوتے ہیں۔ ہمارے زمانے کے سچے ماہرین نفسیات اور ماہرین عمرانیات کی ہرگز یہ رائے نہیں۔ اخباروں اور ناولوں اور تھیٹروں کی پرشور دنیا اور اس دوسری دنیا میں جہاں فکر کی تربیت ہوتی ہے اور ہماری نفسیاتی اور عمرانی زندگی کی پراسرار جزویات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ جتنا اختلاف اس بارے میں ہے کسی اور چیز میں نہیں۔"

اس کے بعد سوسیو بورو ان دلیلوں کی تردید کرتے ہیں جو بے قید محبت کے حق میں پیش کی جاتی ہیں۔ انھیں ہولسٹن کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ "شادی نام ہے مرد اور عورت کے اتحاد کا، عمر بھر کی رفاقت کا، قانون الٰہی اور انسانی قانون کے حقوق کے یک جا ہوجانے کا۔" "شادی محض" دیوانی کا معاہدہ "نہیں ہے بلکہ" ایک مقدس رسم، ایک اخلاقی ذمہ داری ہے۔" اس نے یہ کام کر دکھایا کہ بندر کو دو پیروں پر کھڑا کر دیا (یعنی انسان بنا دیا)۔" یہ سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے کہ جن لوگوں کی باضابطہ شادی ہوجائے ان کے لئے سب کچھ جائز ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ اگر میاں بیوی عام طور پر توالد و تناسل کے بارے میں اخلاقی قانون کی پابندی کرسکتے ہیں تو ان کے لئے جائز ہے کہ اس کے علاوہ صحبت کے اور طریقے جو ان کا جی چاہے اختیار کریں۔ اس تدغن سے خود ان کا بھی فائدہ ہے اور معاشرے کا بھی جس کے قیام اور نشوونما کا دارو مدار شادی پر ہے۔" مصنف کی رائے میں "شادی نے جنسی جبلت کو جن ضابطوں میں جکڑ رکھا ہے ان سے انحراف کے نت نئے موقعے جو نکلتے آتے ہیں سچی محبت کے لئے دائمی خطرے کا باعث ہیں۔ اس خطرے کو دور کرنے کے لئے نگرانی کی ضرورت ہے کہ جنسی خواہش کا پورا ہونا ان حدود کے اندر رہے جو خود شادی کے مقصد

نے مقرر کردی ہیں۔ سینٹ فرانسس آف سیلس کہتے ہیں "قوی اثر دواؤں کا استعمال بہت خطرناک چیز ہے کیونکہ اگر ان کی مقدار زیادہ ہو جائے یا ان کی ترکیب ٹھیک نہ ہو تو بہت نقصان ہوتا ہے۔ شادی کو مذہبی اور متبرک رسم بنانے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ زناکاری کی دوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بڑی اچھی دوا ہے مگر اسی کے ساتھ بے حد قوی اثر ہے اس لئے اگر احتیاط سے استعمال نہ کی جائے تو بہت خطرناک ہے۔"

اس کے بعد مصنف اس نظریئے کی مخالفت کرتا ہے کہ فرد کو اپنی مرضی سے نکاح کرنے اور توڑنے کی یا حفظ نفس کی زندگی بغیر اس کی ذمہ داریوں کے بسر کرنے کی آزادی حاصل ہے۔ وہ وحدت ازدواج پر زور دیتے ہوئے کہتا ہے :-

"یہ کتنا غلط ہے کہ فرد آزاد ہے چاہے شادی کرے چاہے خود غرضانہ تجرد کی زندگی بسر کرے۔ اب یہ وہ لوگ جن کی شادی ہوگئی ہے وہ اور بھی کم اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ آپس کی رضامندی سے اپنا نکاح فسخ کریں۔ ان کی آزادی اس وقت ظاہر ہوئی تھی جب انھوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا تھا۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ پوری پوری واقفیت کے بعد اچھی طرح غور کرکے اپنے رفیق حیات کا انتخاب کرے جس کے ساتھ مل کر وہ اپنی نئی زندگی کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھا سکتا ہے لیکن جب ایک بار نکاح ہو گیا اور اس کی تکمیل بھی ہوگئی تو اب اس کے فعل کے ساتھ بے اندازہ نتائج وابستہ ہو جاتے ہیں جو ہر طرف بڑی دور تک پہنچتے ہیں۔ ان کا دائرہ ان دو شخصوں کی ذات سے کہیں آگے بڑھ جاتا ہے جن سے یہ عمل میں آیا تھا۔ ممکن ہے یہ نتائج بے اصول انفرادیت کے زمانے میں جیسا کہ آج کل ہے خود میاں بیوی کو نظر نہ آئیں مگر ان کی اہمیت کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ جیسے ہی گھریلو زندگی کا توازن بگڑا، جیسے ہی ایک نبی[۱] کے مفید ضابطے کی جگہ خواہش نفس کا قدم آیا، ساری ہیئت اجتماعی کو شدید ضرر پہنچ جاتا ہے۔ جو شخص ان غیر محدود اثرات سے، ان نازک رابطوں سے واقف ہے وہ اس بات کو سن کر نہیں ڈرتا کہ جہاں اور تمام انسانی ادارے عالمگیر قانون ارتقا کے ماتحت ہیں وہاں شادی میں بھی ضروری تغیرات لازم ہیں کیونکہ

---

[۱] ایک مرد کا صرف ایک عورت سے شادی کرنا اور اس کے سوا کسی سے جنسی تعلقات نہ رکھنا۔

اسے یقین ہے کہ اس معاملے میں جو کچھ ترقی ہوگی وہ ہر پھیر کر نکاح کے رشتے کو اور مضبوط کر دے گی۔ آج کل جبکہ باہمی رضامندی سے طلاق کا مطالبہ ہو رہا ہے نکاح کے ناقابل انفساخ ہونے کی ضمنی مخالفت کی جائے گی رفتہ رفتہ اتنی ہی اس قاعدے کی معاشرتی قدر و قیمت روشن ہوتی جائے گی اور یہ دستور جو صدیوں تک محض ایک مذہبی ضابطہ سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس کی معاشرتی اہمیت ابھی تک سمجھ میں نہیں آئی تھی، ایک ایسا اصول معلوم ہونے لگے جو فرد کے لئے بھی سودمند ہے اور عام معاشرے کے لئے بھی مفید ہے۔

"نکاح کے ناقابل انفساخ ہونے کا قاعدہ کوئی من مانی چیز نہیں جو زیبائش کا کام دیتی ہو بلکہ یہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تار و پود میں شامل ہے۔ لوگ ارتقا کا ذکر بہت کیا کرتے ہیں۔ انھیں یہ بھی تو سوچنا چاہئے کہ نوع انسانی کی یہ غیر معین ترقی جس کی خواہش سبھی کو ہے کیونکر ممکن ہے۔ فارسٹر لکھتا ہے "ذمہ داری کے احساس کا گہرا ہونا، فرد کا یہ تربیت حاصل کرنا کہ خود ساختہ ضابطوں کی پابندی اپنی خوشی سے کرے، صبر اور کرم میں اضافہ، خود غرضی کی روک تھام، جذباتی زندگی کو خواہش نفس کی عارضی لہروں اور انتشار کی قوتوں سے محفوظ رکھنا یہ سب انسان کی داخلی زندگی کے وہ عناصر ہیں جن کے متعلق ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ اعلیٰ اجتماعی تہذیب کے لوازم ہیں اور اس وجہ سے ان پر اس ابتری کا کوئی اثر نہیں پڑتا جو معاشی حالات میں کوئی غیر معمولی تغیر واقع ہونے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ بلکہ سچ پوچھیے تو معاشی ترقی خود عام معاشرتی ترقی سے وابستہ ہے اس لئے کہ معاشی امن اور کامیابی کا دار و مدار اصل میں ہمارے معاشرتی اتحاد عمل کی سچائی اور خلوص پر ہے۔ ہر معاشی تغیر جو ان بنیادی اصولوں کو نظر انداز کرتا ہے خود ہی اپنی تردید کر دیتا ہے۔ اس لئے اگر ہم اخلاقی اور عمرانی پہلو سے جنسی تعلقات کے مختلف طریقوں کی حقیقی قدر و قیمت پر غور کرنا چاہتے ہیں تو سارا فیصلہ اس سوال کے جواب پر منحصر ہے ہماری پوری معاشرتی زندگی کی توسیع اور تقویت کے لئے کون سا طریقہ سب سے مناسب ہے؟ کس میں سب سے زیادہ اس کا امکان ہے کہ عمر کے مختلف مدارج میں ذمہ داری بے نفسی اور ایثار کا زیادہ سے زیادہ احساس پیدا کرے، بے ضبط خود غرضی اور لاابالی پن کو سب سے مؤثر طریقے سے روکے؟ جب معاملے پر اس نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو اس میں ذرا سا بھی شبہ نہیں رہتا کہ یک زنی اپنی معاشرتی اور تعلیمی قدر کی بنا پر لازمی طور سے ہر اعلیٰ تہذیب کا دائمی اصول بن کر رہے گی یہی

ترقی سے نکاح کا رشتہ ڈھیلا نہیں ہوگا بلکہ اور کس جائے گا........ خاندان ہی وہ مرکز ہے جہاں انسان معاشرتی زندگی کے لئے ہر قسم کی طیاری کرتا ہے یعنی ذمہ داری، ہمدردی، ضبط نفس، باہمی رواداری اور باہمی تربیت سیکھتا ہے اور خاندان کو مرکزی حیثیت اسی وجہ سے حاصل ہے کہ اس کے تعلقات عمر بھر قائم رہتے ہیں اور ناقابل انفساخ ہوتے ہیں اور اس استقلال کی بدولت مشترک خاندانی زندگی اس قدر گہری، مستحکم، اور انسانوں کے باہمی روابط کے لئے موزوں ہو جاتی ہے کہ کوئی اور زندگی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی ہم کہہ سکتے ہیں کہ یک زنی کا اصول انسان کی معاشرتی زندگی کا اخلاقی معیار ہے۔"

اس کے بعد وہ آگست کونت کا قول نقل کرتے ہیں " ہماری طبیعتوں میں اس قدر تلون ہے کہ ان من کی موجوں کو قابو میں رکھنے کے لئے معاشرے کی مداخلت ضروری ہے ورنہ یہ انسانی زندگی کو اس قدر پست کردیں گی کہ وہ ادنے اور بے معنی تجربات کا ایک سلسلہ بن کر رہ جائے گی۔"

ڈاکٹر ٹولوز لکھتے ہیں " ایک بے سروپا خیال جو اکثر شادی شدہ لوگوں کی مسرت میں خلل ڈالتا ہے یہ ہے کہ عشق کی جبلت ایک ظالم بادشاہ کی طرح ہے جس کی خوشی پوری کرنا ہی پڑتی ہے چاہے جو کچھ بھی انجام ہو...... حالانکہ انسان کی خصوصیت اور اس کی ارتقا کا صریحی مقصد ہی یہ ہے کہ وہ اپنی خواہشات کی غلامی سے روز بروز آزاد ہوتا جائے۔ بچے رفتہ رفتہ اپنی روزمرہ کی حاجتوں اور اپنے جذبات کو قابو میں لانا سیکھتے ہیں۔ یہ اصول جو اچھی تربیت میں ہمیشہ مدنظر رہتا ہے کوئی من گھڑت چیز نہیں جو عملی زندگی سے بے تعلق ہو۔ کیونکہ ہماری فطرت کی ارتقا کا عین مقصد یہی ہے کہ وہ ہمارے ان شخصی رجحانات کے تابع ہو جائے جنھیں ارادہ کہتے ہیں۔ جن باتوں کا نام ہم نے "طبیعت" یا "مزاج" رکھ چھوڑا ہے وہ اصل میں بجز ارادے کی کمزوری کے اور کچھ نہیں۔ جو شخص واقعی مضبوط ارادہ رکھتا ہے وہ اپنی قوتوں سے صحیح وقت پر کام لینا جانتا ہے۔"

( ۸ )

اب ہمیں اس سلسلے کو ختم کرنا ہے۔ کوئی ضرورت نہیں کہ ہم موسیو بورو کی اس تنقید کا بھی ذکر کریں جو انھوں نے مالتھس کے نظریئے پر کی تھی، جس نے اپنے ہم عصروں میں افزائش آبادی کے مسئلے اور اس اصول کی حمایت

سے ہلچل ڈال دی تھی کہ اگر نوع انسانی کو ہلاکت سے بچانا ہے تو انضباط ولادت پر عمل کرنا چاہئے۔ خود مالتھس نے تو اس کا علاج ضبط خواہش تجویز کیا تھا مگر نو مالتھوسی[1] ضبط خواہش کے قائل نہیں بلکہ یہ کہتے ہیں کہ بیمی کثرت جماع کے نتائج سے بچنے کے لئے آلات سے اور کیمیاوی ذرائع سے کام لیا جائے۔ موسیو بورو اس کی دل سے تائید کرتے ہیں کہ انضباط ولادت اخلاقی ذرائع سے یعنی ضبط نفس سے کیا جائے اور آلات اور کیمیاوی ذرائع کے استعمال کی نہایت سختی سے مخالفت کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ مزدوروں کی حالت ان کی شرح ولادت پر نظر ڈالتے ہیں اور خاتمہ کتاب میں یہ دکھاتے ہیں کہ انفرادی آزادی اور انسانی ہمدردی کے نام سے کیسی کیسی اخلاق سوز حرکتیں کی جاتی ہیں۔ وہ رائے عامہ کی رہنمائی اور نگرانی کے لئے منظم کوشش کی رائے دیتے ہیں، ریاست کی مداخلت کی حمایت کرتے ہیں مگر آخر میں سب سے قابل وثوق تدبیر اسے سمجھتے ہیں کہ مذہبی احساس کو زندہ کیا جائے۔ اخلاقی دوالے کو دور کرنے یا روکنے کے لئے معمولی طریقے کافی نہیں ہیں خصوصاً اس صورت میں جب بدکاری نیکی سمجھی جاتی ہو اور پاکدامنی کمزوری، ضعیف الاعتقادی بلکہ بداخلاقی کہلاتی ہو۔ اس لئے کہ مانع حمل تدابیر کے بہت سے حامی واقعی ضبط خواہش کو غیر ضروری بلکہ مضر قرار دیتے ہیں۔ اس صورت میں مذہب کی مدد کے سوا باضابطہ بدکاری کے روکنے کی کوئی موثر تدبیر نہیں ہے۔ یہاں مذہب کا لفظ تنگ اور محدود معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ سچا مذہب زندگی میں خواہ وہ انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی سب سے زیادہ موثر چیز ہے۔ مذہب کا جذبہ دل میں پیدا ہونا ایک انقلاب ہے، ایک کایا پلٹ ہے، ایک نئی زندگی ہے۔ ایسی موثر قوت محرکہ کے سوا موسیو بورو کے خیال میں کوئی چیز بھی فرانس کو اس اخلاقی ہلاکت سے نہیں بچا سکتی جس کی طرف وہ قدم بڑھا رہا ہے۔

* * *

اب ہمیں مصنف سے اور ان کی کتاب سے رخصت ہو جانا چاہئے۔ ہندوستان کی وہ حالت نہیں ہے جو فرانس کی ہے۔ ہمارا مسئلہ کسی قدر مختلف ہے۔ مانع حمل تدابیر کا رواج ہندوستان میں عام نہیں ہے۔

---

[1] وہ لوگ جنھوں نے مالتھس کے نظریے میں ترمیم کر کے اسے از سر نو ترتیب دیا ہے۔

تعلیم یافتہ طبقوں میں ان کا استعمال خال خال ہونے لگا ہے۔ میرے خیال میں تو جو وجوہ ان تدابیر کے استعمال کی بتائی جا سکتی ہیں ان میں سے ایک بھی ہمارے ملک میں موجود نہیں ہے۔ کیا متوسط طبقے کے لوگوں کو اولاد کی کثرت کی شکایت ہے؟ انفرادی مثالیں یہ ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں کہ متوسط طبقوں میں شرح ولادت بہت زیادہ ہے۔ میں نے ہندوستان میں لوگوں کو ان طریقوں کی حمایت صرف بیوہ عورتوں اور کم سن بیویوں کے معاملے میں کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پہلی صورت میں مقصود ناجائز اولاد سے پیچھا چھڑانا ہے، ناجائز تعلقات سے بچنے کی فکر نہیں۔ اور دوسری صورت میں خوف صرف حمل کا ہے کم سن لڑکی سے جبراً صحبت کرنے میں کوئی ڈر نہیں۔ یا پھر ایک طبقہ مریض، کمزور، زنانے نوجوانوں کا ہے جو چاہتے ہیں کہ اپنی بیویوں سے یا دوسروں کی بیویوں سے صحبت کریں اور جس فعل کو وہ خود گناہ سمجھتے ہیں اس کے نتائج سے محفوظ رہیں۔ ایسے لوگ میرے نزدیک سارے ہندوستان میں، جو انسانوں کا سمندر ہے، بہت شاذ ہوں گے جو صحت اور قوت کی حالت میں صحبت تو کرتے ہیں مگر بچوں کا بوجھ اٹھانا نہیں چاہتے۔ ان لوگوں کو اپنی مثال پیش کر کے اس عمل کی حمایت کرنے کا کوئی حق نہیں، جو اگر ہندوستان میں عام ہو جائے تو یقیناً سارے ملک کے نوجوانوں کو تباہ کر کے رکھ دے گا۔ موجودہ تعلیم نے جس میں حد سے زیادہ تصنع ہے قوم کے نوجوانوں کی جسمانی اور ذہنی قوت کو سلب کر لیا ہے۔ ہم میں سے اکثر لوگ بچپن کی شادی کی اولاد ہیں صحت وصفائی کے اصولوں سے غفلت کرنے کی وجہ سے ہمارے جسموں میں گھن لگ گیا ہے۔ ہماری غلط اور ناقص غذاؤں نے جن میں نہایت گرم اور تیز مسالے پڑتے ہیں ہمارے ہاضمے کو بے کار کر دیا ہے۔ ہمیں منع حمل کی تدبیروں کی اور ان چیزوں کی جو ہماری بہیمی خواہش کو پورا کرنے میں مدد دیں کوئی ضرورت نہیں۔ ہمیں تو یہ سبق رٹانے کی ضرورت ہے کہ اپنی خواہش کو قابو میں رکھیں یہاں تک کہ بعض صورتوں میں اسے بالکل ترک کر دیں۔ ہمیں قول سے اور مثال کے ذریعے سے یہ سکھانے کی ضرورت ہے کہ اگر ہمیں ذہنی اور جسمانی کمزوری سے نجات پانا ہے تو ترک خواہش نہایت ضروری ہے اور یقیناً ممکن ہے ہم سے پکار پکار کر کہنے کی ضرورت ہے کہ اگر ہم بونوں کی قوم نہیں رہنا چاہتے ہیں تو یہ لازم ہے کہ ہم اس تھوڑی بہت قوت حیات کو جسے ہم روز ضائع کیا کرتے ہیں بچا کر رکھیں۔ ہماری نوجوان رانڈوں سے یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ چھپ کر گناہ کرنے کی بجائے کھلم کھلا شادی کا مطالبہ کرو۔

تمھیں اس کا اتنا ہی حق ہے جتنا نوجوان رنڈووں کو۔ ہمیں ایسی رائے عامہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ بچپن کی شادی کا سدباب ہو جائے۔ تلون کی کیفیت، سخت اور مسلسل کام سے بددلی، محنت اور جفاکشی سے جسمانی معذوری، من چلے پن کے کاموں کا زور شور سے شروع ہو کر بیٹھ جانا، جدت کی کمی غرض جو چیزیں ہم روز مرہ دیکھا کرتے ہیں ان کا سبب زیادہ تر جماع کی کثرت ہوتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ نوجوان اپنے دل کو اس خیال سے دھوکا نہیں دیتے ہوں گے کہ اگر اولاد نہ ہو تو صحبت میں کوئی حرج نہیں۔ اس سے کمزوری پیدا نہیں ہوتی۔ واقعہ یہ ہے کہ جماع کا فعل، اگر اس خلاف فطرت تحفظ کے ساتھ کیا جائے جو حمل سے بچنے کے لئے ہوتا ہے کہیں زیادہ ضعف پیدا کرتا ہے بہ نسبت اس کے کہ یہ پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ عمل میں آئے۔

"انسان کا ذہن بجائے خود ایک عالم ہے، اور آپ ہی آپ دوزخ کو جنت اور جنت کو دوزخ بنا دیتا ہے۔"

اگر ہم یہ سمجھنے لگیں کہ ہمارے لئے خواہش نفس کا بندہ بننا ضروری ہے اور اس میں کوئی ضرر یا گناہ نہیں ہے تو ہم اس کی باگ ڈھیلی چھوڑ دیں گے اور پھر واقعی یہ ہمارے روکے نہ رکے گی۔ لیکن اگر ہم تربیت کے ذریعے اپنے دل میں یہ خیال پیدا کر لیں کہ اس خواہش کی پابندی ہرگز ضروری نہیں بلکہ یہ باعث ضرر ہے، گناہ ہے اور ہم اسے قابو میں رکھ سکتے ہیں تو ہم پر یہ حقیقت کھل جائے گی کہ ضبط نفس بالکل ممکن ہے۔ ہمیں عیاشی کی اس تیز شراب سے جو مغرب سے نئی حقیقت اور نام نہاد انسانی آزادی کے بھیس میں آتی ہے خبردار رہنا چاہئے بلکہ اگر ہم اتنی ترقی کر گئے ہیں کہ اپنے بزرگوں کی قدیم حکمت سے بے نیاز ہیں تو ہمیں مغرب ہی کی اس ہوش افزا آواز پر کان دھرنا چاہئے جو اس کے دانشمندوں کے تجربات کے ذریعے سے کبھی ہم تک پہنچ جاتی ہے۔

چارلی اینڈریوز نے مجھے ایک پر از معلومات مضمون[1] "تولید اور تجدید" پر بھیجا ہے جو ولیم لافٹس ہیر کا لکھا ہوا ہے اور مارچ ۱۹۲۶ء کے رسالہ "اوپن کورٹ" میں شائع ہوا ہے۔ یہ ایک نہایت مدلل علمی مقالہ ہے۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ تمام اجسام دو وظائف کو ادا کرتے ہیں یعنی ایک تو اندرونی تولید جسم کی تعمیر

---

[1] یہ مضمون کتاب کے آخر میں ضمیمے کے طور پر درج کیا جائے گا۔

کے لئے دوسرے بیرونی تولید بقائے نسل کی غرض سے۔ ان عملوں کو وہ "تولید" اور "تجدید" کہتے ہیں۔ تجدید کا عمل یعنی اندرونی تولید فرد کے لئے بنیادی اہمیت رکھتا ہے اس لئے یہ ضروری اور اولیٰ ہے، بیرونی تولید یا تناسل خلیوں کی افزونی سے ہوتا ہے اس لئے یہ ثانوی چیز ہے........اس لئے اس درجے میں قانون حیات یہ ہے کہ بعضہ وان کے خلیوں کو پہلے تو تجدید کے لئے اور پھر تولید کے لئے غذا پہنچائی جائے۔ غذا کی کمی کی صورت میں تجدید کو مقدم سمجھنا چاہئے اور تولید کو روک دینا چاہئے۔ اس سے یہ پتہ چل سکتا ہے کہ تولید کو روکنے کی ابتدا کیوں کر ہوئی اور اس کے بعد اس نے نوع انسانی میں ترک خواہش اور عام رہبانیت کی شکل کس طرح اختیار کی۔ اندرونی تولید یعنی تجدید کا روکنا ناممکن ہے بجز اس کے کہ انسان مرنے پر کمر باندھ لے۔ اس طرح گویا یہ بھی معلوم ہو گیا کہ موت کی طبعی اصل کیا ہے۔ تجدید کے حیاتیاتی عمل کو بیان کرنے کے بعد مصنف کہتا ہے "مہذب انسانوں میں جماع اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے جتنا آیندہ نسل کے پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے اور وہ اندرونی تولید پر مقدم رکھا جاتا ہے جس کا انجام بیماری، موت بلکہ اس سے بھی بدتر ہے۔"

کسی شخص کو، جو ہند دفلسفے میں ذرا سا بھی دخل رکھتا ہے، مسٹر بیر کے مقالے کا یہ پیراگراف سمجھنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوگی:۔

"تولید کا عمل محض مکانیکی طریقے سے واقع نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے بلکہ خلیوں کی تقسیم و تقسیم کی طرح یہ ایک حیاتی عمل ہے یعنی اس میں ادراک اور ارادہ پایا جاتا ہے۔ یہ بات کہ ذی حیات چیزوں کی تفریق ان کا ایک دوسرے سے ممیز ہونا اور جداگانہ وجود اختیار کرنا محض مکانیکی[1] ہے کسی طرح عقل میں نہیں آتی۔ تاکہ اس طرح کے بنیادی عمل ہمارے موجودہ شعور سے اس قدر بُعد رکھتے ہیں کہ بہ ظاہر جانور یا انسان کے ارادے کا ان میں کوئی دخل نظر نہیں آتا لیکن ایک ذرا سے غور سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ جس طرح موجودہ ارتقا یافتہ انسانوں کا ارادہ ان خارجی حرکات اور

---

[1] Mechanical محض مادے اور حرکت کے قانون کے ماتحت۔

انفعال کو ادراک کی رہنمائی میں وقوع میں لاتا ہے اسی طرح جسم کی تدریجی ارتقا کی ابتدائی منزلوں میں، ماحول کی حدود کے اندر، اس کو حرکت میں لانے کے لئے ضرور ایک قسم کا ارادہ اور ادراک موجود ہوگا۔ اس چیز کو آج کل نفسیات کے ماہر "لاشعور"[۱] کہتے ہیں۔ یہ ہمارے نفس کا ایک حصہ ہے جو ہمارے روزمرہ خیالات سے بے تعلق ہے لیکن اپنے وظائف کے ادا کرنے میں بہت ہوشیار اور چوکس ہے یہاں تک کہ شعور کو تو نیند بھی آجاتی ہے مگر اسے کبھی نہیں آتی۔"

کون شخص اس کا اندازہ کر سکتا ہے کہ اگر جماع کا فعل بغیر کسی اور مقصد کے کیا جائے تو اس سے ہمارے نفس کے لاشعوری حصے کو جس کا عمل زیادہ مستقل ہے، کسی قدر ناقابل تلافی ضرر پہنچ جائے گا۔ تولید کی سزا موت ہے۔ جماع کا عمل نر کے لئے قطعاً تفرقی[۲] عمل ہے (یعنی اس سے موت کی تمہید شروع ہوجاتی ہے) اور وضع حمل کی شکل میں مادہ کے لئے بھی۔ اس سے مصنف یہ استدلال کرتا ہے:۔

"مردی، قوت حیات اور بیماریوں سے محفوظ رہنا، یہ ان لوگوں کا حصہ ہے جو خواہش نفس کو بالکل ترک یا قریب قریب ترک کر دیتے ہیں۔ تولید یا صرف لذت نفس کے لئے جنین کے خلیوں کو تجدید کے عمل سے ہٹانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے اعضا تازہ مایہ حیات کی رسد سے محروم ہوجاتے ہیں جس کا مضر اثر ان پر آہستہ آہستہ پڑتا رہتا ہے اور ایک روز ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ ان عضویاتی واقعات سے ایک شخصی اخلاق جنسی کی بنیاد پڑتی ہے جو کامل ضبط نہیں تو اعتدال کا ضرور تقاضا کرتا ہے اور بہر حال اس سے ضبط کی اصلیت سمجھ میں آجاتی ہے"[۳]

مصنف، جیسا کہ آسانی سے قیاس کیا جا سکتا ہے، کیمیاوی طریقوں اور آلات کی مدد سے انضباط ولادت کا مخالف ہے بہ قول اس کے:۔

---

[۱] The Unconcious

[۲] Katabolism اس عمل کی ایک شکل جس میں جسم حیوانی کے اندر مرکب مادہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔

اُس کی بدولت ضبطِ نفس کے محرکات جو دوراندیشی پر مبنی ہیں باقی نہیں رہتے اور اس کا موقع ملتا ہے کہ شادی کے بعد خواہش نفس کی پیروی کی کوئی حد نہ رہے سوائے اس کے کہ ضعیفی میں یہ خواہش خود بخود کم ہو جائے۔ اس کے علاوہ ظاہر ہے کہ غیر نکاحی تعلقات پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے۔ اس سے ناجائز، بے قید، بے ثمر صحبت کا دروازہ کھل جاتا ہے، جو جدید صنعت و حرفت، عمرانیات اور سیاسیات کے نقطۂ نظر سے نہایت خطرناک ہے۔ یہاں ان چیزوں کی تفصیل کرنے کا موقع نہیں ہے۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ منعِ حمل کے ذریعے نکاحی اور غیر نکاحی تعلقات میں جماع کی کثرت میں سہولت پیدا ہو جاتی اور اگر میرا مندرجہ بالا عضویاتی استدلال صحیح ہے تو یہ فرد اور جماعت دونوں کے لئے برا ہو گا۔"

ہندوستان کے نوجوانوں کو یہ مقولہ جس پر موسیو بورو نے اپنی کتاب ختم کی ہے دل پر نقش کر لینا چاہیے:-

"مستقبل ان قوموں کے ہاتھ ہے جو پاکدامن ہیں۔"

---

کہلاتا ہے۔ وہ علاقہ جو سائبیریا (Altai) اور وہ علاقہ جو منگولیا کی سرحد سے ملا ہوا ہے کوہ التائی (Altai Mountain) سے متصل ہے کوہ برکیل (Barkil) ۔ تھیان شان (Thien Shan) یعنی جبل السمار بالکل سن کیانگ کے درمیان واقع ہے جو اس صوبے کو شمالی اور جنوبی دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ جنوبی تھیان شان کا صحرا تکلہ مکان (Takla Makan) سن کیانگ کا ربع الخالی ہے جو ایک بالکل بنجر زمین ہے۔ زرخیز علاقہ جنوبی اور شمالی تھیان شان کے غرب میں ہے۔ جنوب میں دریائے ترم (Tarim) ہے جس کے کنارے آقرہ، کاشغر، یارقند، مارلباشی اور ختن واقع ہیں، شمال میں دریائے الیلش (Illinish R.) ہے، جو روسی ترکستان کے اندر چلا گیا ہے جس کے کنارے پر خولجہ، ایلی، جنہار، دوسو، سولٹ اور اروجی۔ کیٹائی شمالی سن کیانگ کے مشرق میں اور تاچین اس کے شمال مغرب میں ہیں۔

کل صوبے میں ۲۹ [۱] اضلاع ہیں جو تین قسموں میں منقسم ہیں۔ قسمت اول میں بارہ ضلعے ہیں جن میں سے چھ یعنی طرفان، آقسو، کیار، کاشغر، یارقند اور ختن جنوبی تھیان میں ہیں، اور پانچ یعنی کیٹائی، اروجی، خولجہ، ایلی اور تاچین شمالی تھیان شان میں اور حامی مشرق سن کیانگ میں۔ قسمت دوم میں چودہ ضلعے ہیں۔ باقی قسمت سوم میں ہیں۔ قسمت اول کا صدر مقام 'ٹو' (Tao) کہلاتا ہے اور وہاں کا حاکم 'ٹو این' (Tao yen) ۔ قسمت دوم کے صدر مقام کو 'ہین' (Hien) کہتے ہیں اور وہاں کے حاکم کو 'ہین چن' (Hien Chan) ۔ قسمت سوم کے صدر مقام کو 'زی چن' (Zi Chan) اور وہاں کے حاکم کو 'زی چن' (Zi Chan) ۔

سن کیانگ کا پایۂ تخت اس وقت اروچی ہے۔ وہاں ایک حاکم اعلیٰ رہتا ہے۔ منچو کے زمانے میں توچون (Tu Chun) یعنی گورنر جنرل کہلاتا تھا۔ جمہوریت چین نے اس خطاب کو بدل دیا ہے اب چوشی (Chu Shee) یعنی صدر صوبہ کہلاتا ہے۔ سن کیانگ کی موجودہ شورش اسی 'چوشی' جین شوزن (Chin Shoo Zin) نامی کے خلاف برپا کی گئی ہے کیونکہ اسی نے مسلمانوں کے

---

[۱] سالنامہ Shen Pao (Shanghai) صفحہ ب ۲۹۔

فساد کو پامال کرنے کی کوشش کی تھی جس وقت میں یہ مضمون تیار کر رہا ہوں سن کیانگ کی صورت حال یہ ہے کہ مسلمان[1] جنوبی تھیان شان پر قابض ہیں اور شمالی تھیان شان میں چینی حکام کا اقتدار ہے۔ اس شورش میں تھیان شان یا جبل السما جو ایک اونچی دیوار کی طرح صوبہ سن کیانگ کے درمیان واقع ہے خوب کام آیا۔ اس نے نہ صرف سن کیانگ کے جغرافی حیثیت سے جنوبی اور شمالی دو حصے کر دئے بلکہ سیاسی اقتدار بھی دو جماعتوں میں تقسیم کر دیا۔

**تاریخی تعلقات** | ہم کو معلوم ہو گیا کہ سن کیانگ ان تین ملکوں کے درمیان واقع ہے۔ وہاں سے ہر ملک میں جانے کے لئے صرف دو ہی راستے ہیں ورنہ ہر طرف قدرتی رکاوٹیں موجود ہیں۔ سن کیانگ کے ان تین ملکوں کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے ہر ایک ملک کے لئے اس کا امکان ہے کہ وہ اسے اپنے اندر شامل کرے لیکن یہ ضرور ہے کہ جب تک کوئی ملک ان قدرتی رکاوٹوں پر غالب نہ آجائے وہ اپنی حکومت کا اثر وہاں قائم نہیں کر سکتا یعنی جس ملک کے ساتھ سن کیانگ کی آمد و رفت زیادہ آسان ہوگی اس کا اثر وہاں زیادہ ہوگا۔

معاہدۂ ایلی (۱۸۸۱ء) سے قبل سن کیانگ کا دروازہ روسیوں کے لئے بالکل بند تھا۔ پامیر اور ہمالیہ کے سبب سے اہل سن کیانگ کے لئے ماوراء النہر کے اس طرف آمد و رفت رکھنا مشکل تھا لیکن شمالی تھیان شان کے راستے سے چین کے اندر آنے جانے میں کچھ ایسی دقت نہ تھی اور جنرل تسو چونگ تانگ (۱۸۸۰ء) نے اس راستے کو اور آسان بنا دیا۔ یہی وجہ تھی کہ انیسویں صدی کے وسط میں وہاں چینیوں کا زور ہو گیا اور اس وقت سے آج تک سن کیانگ میں ان کا سیاسی اقتدار رہا۔

چین کے تعلقات سن کیانگ کے ساتھ حضرت مسیح سے قبل شروع ہو چکے تھے۔ ترکوں کے قبائل جو اس زمانے میں 'ہون لو' (Hiong Noo) کہلاتے تھے، برابر چین کی سرحد پر یورش کرتے تھے۔ جب چین شی وانگ ٹی نے (۲۲۱ ق۔م۔ ۲۴۶ ق۔م) چین کی طوائف الملوکی اور جاگیرداری نظام

---

[1] دیکھو نقشہ

کا خاتمہ کر کے چین کو متحد کیا تو اس نے تتاری یورش کو روکنے کے لئے دیوار چین بنائی۔ پہلی صدی عیسوی میں تتاریوں نے چین پر دوبارہ حملہ کیا۔ چین کے مشہور جنرل "پان چاؤ" (Pan chao) (۹۴ مسیحی) نے ان کو دیوار چین کے ادھر چینی ترکستان میں پسپا کر دیا۔ پھر وہ ان کا پیچھا کرتا رہا یہاں تک کہ ان کا مضبوط قلعہ ختن فتح ہو گیا۔ ختن کا فتح ہونا تتاریوں کے لئے ایک ایسی ضرب کاری تھی کہ ان کو پھر چین پر یورش کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ پانچویں صدی میں تتاری قبیلے نے آٹیلا کے زیر قیادت یورپ پر یورش کی اور اسی یورش کے ساتھ قبیلہ غز ایشیائے کوچک میں پھیل گیا لیکن اس قبیلے کی ایک شاخ "کیٹائی" یا "کاتھی" (Kitai or Cathy) ترکستان میں رہ گئی۔ چھٹی صدی کے شروع میں اس خاندان نے چینی ترکستان میں اپنی ریاست قائم کر لی۔ کول ٹگن (Koltagan) اور بکیکا خاں (Bekiku Khan) ان کے مشہور حاکموں میں سے تھے۔ ان کا پایۂ تخت طرفان (Turfan) تھا۔ اس کے بعد یہ ملک کچھ دن تبت کے ماتحت رہا لیکن بارھویں صدی میں مغلوں نے آکر اس پر قبضہ کر لیا۔ اسلام کو اس زمانے میں یہاں خوب فروغ ہوا کیونکہ تخت چین مغلوں کے ہاتھ میں تھا (۱۲۷۷ء - ۱۳۶۰ء)۔ اور چینی ترکستان کے اکثر قبیلے مسلمانوں کے گروہ میں داخل ہو گئے۔ لیکن چودھویں صدی کے آخر میں مغلوں نے چین سے شکست کھائی۔ اس شکست کے ساتھ چینی ترکستان سلطنت چین میں شامل ہو گیا۔ اس وقت گو یہ علاقہ چین کے ماتحت تھا لیکن سوائے تھوڑا سا خراج ادا کرنے کے اسے چین سے کوئی سروکار نہیں تھا بلکہ بجائے چینی اثر کے ریاست خوارزم کا اثر اس پر زیادہ تھا۔ پایۂ تخت سے دور ہونے کی وجہ سے حکومت چین اپنے حکام چینی ترکستان نہیں بھیج سکتی تھی اور اور تمام انتظامات مسلمانوں کے ہاتھ میں چھوڑ دئے گئے تھے لیکن انیسویں صدی کے وسط میں یعقوب خاں جو روسی ترکستان کا رہنے والا تھا چپکے سے کاشغر میں جو اس وقت یہاں کا پایۂ تخت تھا داخل ہو گیا اور وہاں کے حاکم کا خاتمہ کر کے خود بادشاہ بن بیٹھا۔ وہاں کے مسلمانوں نے حکومت چین سے مدد مانگی۔ حکومت چین نے جنرل تسو چونگ ٹانگ (Tso Chung Tang) کو روانہ کیا۔ جنرل موصوف ابھی راستے میں تھا کہ خبر آئی نیاز حکیم جو یعقوب خاں کا دشمن تھا اس کا خاتمہ کر کے خود کاشغر پر قابض ہو گیا۔ لیکن تسو چونگ ٹانگ برابر آگے بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ وہ اورمچی میں پہنچ گیا۔ اس نے وہاں کے

مسلمانوں کو خوب بیوقوف بنایا۔ یہ لوگ جاہل اور ناسمجھ تھے اور ان میں مذہبی جنون بھی بہت تھا۔ ان کی جہالت اور مذہبی جنون سے فائدہ اٹھا کر جنرل لشو چونگ ٹانگ نے ان کے سیاسی اقتدار کا خاتمہ کر دیا، چینی ترکستان کو سلطنت چین کا ایک صوبہ بنا دیا (۱۸۷۸ء) اور ارومچی کو پایہ تخت قرار دیا۔ یعقوب خاں صرف ۱۳ سال تک بادشاہ رہا اور اس کی موت کے ساتھ سلطنت بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے چلی گئی۔ ۱۸۷۸ سے لے کر ۱۹۱۰ تک وہاں سکون رہا اور کسی قسم کی بدنظمی کی خبر نہیں آئی لیکن ۱۹۱۰ء میں مسلمانوں نے بغاوت ٹائی پنگ اور اصلاحی تحریک سے فائدہ اٹھا کر آزاد ہونا چاہا لیکن ناکام رہے۔ یہی زمانہ تھا جب چین میں انقلاب رونما ہوا۔

**انقلاب چین اور سن کیانگ** | ۱۹۱۱ء میں جبکہ چین میں سیاسی انقلاب رونما ہوا اور نانکنگ جمہوریت چین کا اعلان کیا گیا تو سن کیانگ بعینہٖ چین کا ایک صوبہ قرار دیا گیا۔ گورنر گو چینی ہوا کرتا تھا لیکن اس کی یہ مجال نہ تھی کہ مذہبی امور میں مداخلت کرے۔ اس کا تعلق صرف سیاست سے تھا۔ صوبے کے اندرونی انتظامات میں گورنر بالکل خودمختار تھا۔ امور خارجہ جو اس صوبے سے تعلق رکھتے تھے حکومت پیکن کے مشورے سے یا دفتر خارجہ کے ذریعے انجام پاتے تھے۔ گو یہاں کے لوگ یہ جانتے تھے کہ وہ چین کی رعایا ہیں لیکن ان کو اندرونی چین سے بہت کم واسطہ تھا۔ چین میں انقلاب کے بعد انقلاب ہوتا رہا لیکن اس کا اثر یہاں بہت کم نظر آتا تھا۔ سن کیانگ اور چین کی اس بے تعلقی کی کئی وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ دونوں ملکوں کے باشندوں میں خون اور رنگ کا فرق ہے۔ چینی ترکستان میں جو لوگ بستے ہیں وہ تتاری، منگولی، ترک، قرغز، قلموک اور دونغان (Dungan or Tungan) ہیں۔ خالص چینی یعنی خاص زرد نسل کے لوگ زیادہ سے زیادہ دس فی صدی ہوں گے۔ وہ بھی ان لشکریوں کی اولاد ہیں جو جنرل لشو چونگ ٹانگ کے ساتھ ارومچی میں جا کر بس گئے تھے۔ مذہب کے لحاظ سے چینی بدھ کے ماننے والے اور اسلاف پرست (Ancestor worshippers) ہیں اور تتاری و منگولی و دیگر قبیلے اسلام کے معتقد ہیں۔ ان کی تعداد دیگر قوموں کے مقابلے میں ۹۰ فی صدی ہے۔ سن کیانگ کا رقبہ ۵۳۰،۶۰۰،۰۰۰ مربع میل ہے اور کل باشندے ۲۵،۹۷،۶۴۰ ہیں۔ ۹۰ فی صدی کے حساب سے یہاں مسلمانوں کی تعداد کم و بیش

.... ۱۰، ۲۳ ، ۲۳ سمجھنا چاہئے۔ لیکن جس چیز نے اہل سن کیانگ اور باشندگان چین کے درمیان سب سے زیادہ بے ربطی پیدا کر رکھی ہے وہ اختلاف زبان ہے چین کے لوگ چینی بولتے ہیں اور سن کیانگ کے مسلمان ترکی ان کی ترکی زبان گو استنبولی ترکی سے مختلف ہے لیکن دونوں ایک ماں کی بیٹیاں ہیں۔ دونوں کے مصدر عربی ہیں اور دونوں عربی حروف میں لکھی جاتی ہیں۔ باشندگان سن کیانگ میں بہت کم ایسے ہیں جو چینی زبان سے واقف ہوں اور اہل چین میں بہت کم ایسے ہیں جو ترکی یا عربی جانتے ہوں حتیٰ کہ چینی مسلمان بھی عموماً ان زبانوں سے کورے ہیں۔ زبان کے اختلاف کی وجہ سے ان کی معاشرت بھی مختلف ہے قوموں کا عام قاعدہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی معاشرت کو برتر سمجھتے ہیں چینی لوگ سن کیانگ والوں کو اس لئے جنگلی کہتے ہیں کہ ان میں تعلیم سرے سے مفقود ہے۔ اور اہل سن کیانگ چینیوں کو اس وجہ سے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ وہ کافر ہیں۔ ایسی حالت میں سن کیانگ کے لوگوں کا اہل چین سے بے تعلق ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ان وجوہ کے علاوہ اور ایک وجہ بھی ہے وہ یہ کہ دونوں ملکوں میں آمد ورفت بہت دشوار ہے۔ قافلوں کو سوائے پیدل یا گدھے یا اونٹ پر سفر کرنے کے کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ لان چاؤ سے ارومچی تک کم سے کم تین مہینے کا وقت لگتا ہے۔

سن کیانگ گو اس وقت جمہوریت چین کے ماتحت ہے لیکن اس پر مرکزی حکومت کا اثر بہت کم ہے۔ یعقوب خاں کے استیصال کے بعد جو چینی وہاں رہ گئے گو ان کی تعداد کم ہے لیکن وہ چالاک اور حریص ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد چینیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ مسلمان جسمانی لحاظ سے قوی اور جنگ جو قوم ہیں لیکن منتظم نہیں ہیں وہ جان دے سکتے ہیں لیکن حکومت کو نہیں سنبھال سکتے۔ اگر ان میں انتظامی مادہ ہوتا تو یعقوب خاں اپنے ماتحت کے ہاتھ سے قتل نہ ہو جاتا۔

---

نوٹ صفحہ گذشتہ (1) Tyan: Two years of Nationalist China (Page 413).

(1) Douglas: China (Page 349).

اور اسلامی ریاست چین کے ہاتھ میں نہ چلی جاتی۔ اس وقت ترغند اور تتاری ترک جو اب تک اس ملک میں آباد ہیں بیرونی ممالک کے ساتھ کم تعلق رکھنے کی وجہ سے ذہن اور سیاست کے اعتبار سے پست چینیوں سے بھی بدرجہا پست ہیں چینیوں میں ضعف ضرور ہے لیکن حرکت کی کمی نہیں۔ ان لوگوں پر تو بالکل جمود طاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قانون اور دستور کی رو سے مساوی حقوق اور مواقع ملنے کے باوجود انھوں نے سیاست میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا اور نہ سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ملکی انتظامات بجز مذہبی امور کے سب چینیوں کے ہاتھ میں ہیں۔

**بعض چینی جنرل اور ان کا عیش پرستی کا فلسفہ**

سن کیانگ کے حاکم گو حکومت چین کی طرف سے مقرر ہوتے ہیں لیکن صوبجاتی امور میں ان کو پورا اختیار ہے۔ وہ اپنی رائے سے مقامی قانون کا نفاذ یا تنسیخ کر سکتے ہیں۔ چونکہ چینیوں کا کوئی خاص مذہب نہیں ہے اس لئے ان کا معیار زندگی دینی اخلاق پر مبنی نہیں۔ جب چین میں مغربی تعلیم کا اثر نہ تھا تو چینی حکام کی سیرت فلسفۂ کانفوشس (استاد کان[1]) اور عقیدۂ تاؤ سے متاثر ہوتی تھی مگر جب مغربی عیش پرستی کی ہوا چین کے طول و عرض میں پھیلی تو بعض چینی حکام نے اپنے پرانے معیار زندگی کو چھوڑ دیا اور لذتیت کے فلسفے نے اس کی جگہ لے لی۔ اس عیش پرستی کے تخیل نے چین کے موجودہ سیاسی نظام پر بہت کافی اثر ڈالا ہے۔ آج کل چین کے شمال سے لے کر جنوب تک اور شرق سے غرب تک جنرل ہی جنرل نظر آتے ہیں۔ خواہ فوجی عہدے ہوں خواہ ملکی سب کے سب ان جنرلوں کے ہاتھ میں ہیں یہاں تک کہ میونسپلٹی کے صدر اور عدالت کے مجسٹریٹ بھی وہی ہوتے ہیں۔ جنرل وہ کہلاتا ہے جس کے ماتحت کچھ فوج یا پولیس ہو۔ یہ تمام جنرل اکثر ایک دوسرے کے خلاف سازش کرتے ہیں۔ جن جنرلوں کے پاس فوجی قوت زیادہ ہے ان کو یورپ والوں کی طرف سے "وار لارڈ" (War Lord) کا خطاب دیا گیا ہے۔ یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ عوام کے خیر خواہ ہیں اور

---

[1] کان (Con) ایک خاندانی نام ہے اور 'فوش' یا 'فوتز' (Fuce or Fútze) کے معنی ہیں استاد۔

ان کی جان و مال کے محافظ بھی!

سن کیانگ بھی ان جنرلوں کے اثر سے محفوظ نہ رہا۔ جو کوئی جنرل وہاں مقرر ہوتا اس کا سب سے پہلا کام یہ تھا کہ اپنی قوت بڑھائے اور ذاتی جائداد جمع کرے۔ اس کے لئے وہ مختلف ذرائع اختیار کرتا کبھی افیون[1] کی کاشت کرانے اور اس کو فروخت کرنے کی صورت میں کبھی لگان اور ٹیکس کے اضافے یا محاصل کے پیشگی[2] وصول کرنے کی صورت میں۔ غرض ایمان داری یا بے ایمانی سے جس طرح بھی روپیہ مل سکے وہ اسے سمیٹنے کو طیار رہتا ہے۔ وہ خدا سے نہیں ڈرتا کیونکہ خدا کا قائل ہی نہیں۔ وہ اپنے افسر اعلیٰ کی پروا نہیں کرتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ افسر اعلیٰ کو اتنی قدرت نہیں کہ اس کو سزا دے سکے۔ گذشتہ سال مین جنگ منچوریا کے موقع پر صوبہ شانٹانگ ( Shangtung ) میں دو جنرلوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی، ایک صوبے کی حکومت کا صدر تھا اور دوسرا قسمت خاص، ٹسن ٹو ( Tsin - too ) کا میور (Mayor) تھا، اب یہ خبر ہے کہ صوبہ سی چوان ( Sze chuan ) میں دو جنرلوں میں لڑائی شروع ہو گئی۔ مرکزی حکومت جو ابھی غیر مستحکم ہے مگر اس میں کچھ قابل اور سمجھ دار لوگ ہیں، ان میں صلح کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ چنانچہ سن کیانگ کے معاملے میں بھی ان ذاتی مخالفتوں کا عنصر موجود ہے۔ The Chinese Journal of India Calcutta نے اپنے ۸ جولائی کے پرچے میں ایک یہ خبر شائع کی ہے کہ ارومچی میں ابتک سکون نہیں ہے۔ کئی سکریٹریوں نے جو چن شوزن کے ماتحت کام کرتے تھے، اس کے فرار ہونے کے بعد، حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی لیکن قبل اس کے کہ ان میں سے کوئی کامیاب ہو وانگ موسونگ ( wang mo sung ) نے جو شورش سن کیانگ کی تحقیقاتی کمیشن کا صدر حکومت نانکنگ کی طرف سے مقرر کیا گیا تھا، وہاں پہنچ کر ان کو دبا لیا اور وہ خود امن قائم کرنے میں

---

(1) New Asia. Nanking (Vol. 3 No 4. page 124).

(2) China submits herself to Chaos (Current History: New york, June 1933.)

مشغول ہوگیا۔ سن کیانگ کی موجودہ حالت کیا ہے یہ میں بعد میں بیان کروں گا۔

**عیسائی جنرل اور کانسو کے مسلمان**

یہاں پر ایک عیسائی جنرل کا ذکر کرنا غالباً خارج از موضوع نہ ہوگا کیونکہ اس شخص نے ۱۹۲۶ء میں ایک ایسی حرکت کی تھی جس سے مسلمانان کانسو کو بہت نقصان پہنچا۔ اس واقعے کے بیان کرنے سے میرا مقصد صرف بعض جنرلوں کی شخصی اور انفرادی سیرت کو دکھانا ہے جسے حکومت کے اصول اور دستور سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ عیسائی جنرل کون ہے؟ یہ وہ حضرت ہیں جن کا نام فانگ یو ہیانگ ( Fong yu Hsiang ) ہے اور جنہوں نے حال میں ایک زبردست اعلان شائع کیا ہے کہ وہ جاپانیوں کے ہاتھ سے منچوریا واپس لے لیں گے۔ یہ شخص 'اتحاد چین' (۱۹۲۷ء) کے بعد دفعۃً مرکزی حکومت سے بگڑ گیا اور شمالی چین میں اپنا قدم جمانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس موقع پر اس کو روپے کی سخت ضرورت تھی، صوبجاتی خزانہ خالی تھا، اور بینک والوں نے قرض دینے سے انکار کیا۔ جب اس نے دیکھا کہ روپیہ وصول کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے تو دفعۃً اس نے ایک فوجی فرمان جاری کردیا کہ تاجروں سے مزید محصول وصول ہو اور وہ بھی پیشگی لیا جائے یعنی آئندہ کئی سال کا محصول اس وقت وصول کرلیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جنرلوں کا یہ طرز عمل عوام کے لئے کس قدر تکلیف دہ ہوگا۔ شمالی چین میں زیادہ تر مسلمان آباد ہیں اور تاجروں کے طبقے میں بھی ان کی تعداد کافی ہے۔ انھوں نے اس فوجی فرمان کی سخت مخالفت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اور عیسائی جنرل کے درمیان زبردست جنگ چھڑ گئی۔ آخر کانسو مسلمانوں کا مرکز "ہاچاؤ" ( Ha-chaw ) فتح ہوگیا اور کئی ہزار مسلمان اس عیسائی جنرل کی تلوار سے شہید ہوگئے۔ موجودہ شورش سن کیانگ کے سلسلے میں ہم نے اس واقعے کا ذکر کرنا اس لئے مناسب سمجھا کہ اس شورش سے قبل کانسو میں بھی ایک اہم واقعہ مسلمانوں اور غیرمسلمانوں کے درمیان پیش آیا تھا جس میں ماچونگ این اور ان کے خاندان کے لوگ شریک تھے اور اسی ماچونگ این اور اس کے بھائی ماسی این نے موجودہ شورش میں بھی حصہ لیا۔ اس شورش کی خبر اور اس کا فوری سبب ہم نے جون کے 'جامعہ' میں بیان کیا تھا۔ اس مضمون میں ہم کو اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں، البتہ کانسو کی موجودہ سیاسی فضا کے متعلق کچھ لکھنا ضروری ہے، بغیر اس کے موجودہ مسئلہ سن کیانگ کے سمجھنے

سے ہم قاصر ہیں۔

واقعہ لین ٹان | اس میں شک نہیں کہ یعقوب خاں کا خاتمہ ہونے کے بعد سن کیانگ میں چینی مسلمانوں کا سیاسی اقتدار کم ہوگیا اور صوبجاتی انتظامات میں بجز مذہبی امور کے ان کا دخل بہت کم ہے لیکن کانسو کے مسلمانوں کی حالت ایسی نہیں ہے۔ کانسو کا خاندان 'ما' وہاں کے مسلمانوں کا سیاسی رہنما ہے۔ اس خاندان میں دیندار اور قابل آدمی ہر زمانے میں پیدا ہوتے رہے ہیں۔ انیسویں صدی سے شمالی مغربی چین میں مسلمانوں کی جو کچھ تحریک بھی اٹھی اس میں اس خاندان کے افراد ضرور شریک رہے۔ افسوس ہے کہ یہ لوگ جدید تعلیم سے بہت کم لگاؤ رکھتے ہیں ورنہ چینی مسلمانوں کے لئے اس زمانے میں بہت کچھ کر سکتے۔

کانسو اور سن کیانگ دونوں صوبے بالکل ملے ہوئے ہیں چینی ترکستان کے لوگ عموماً کانسو سے ہو کر شمالی چین میں داخل ہوتے ہیں اور کانسو کے مسلمان بھی اکثر سن کیانگ جایا کرتے ہیں گو راہ دشوار گذار اور موسم سرد ہے۔ "ٹائی پینگ" (Taiping) (سنہ ۱۹۱۰ء) کے زمانے میں یہاں کے لوگوں نے کوشش کی کہ شمالی چین میں ایک اسلامی ریاست قائم کردی جائے لیکن پکین پر ہشت دول یورپ کے متحدہ حملے نے مسلمانوں کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ 'ماشوشان' (Ma shu shan) کے آٹھ بھائی 'شورش ٹائی پینگ' میں شریک تھے مگر تقدیر نے ان کا ساتھ نہیں دیا اور وہ سب کے سب اس شورش میں تباہ ہوگئے۔ باوجود اس ناکامی کے خاندان 'ما' کا رسوخ کانسو میں کم نہیں ہوا۔

خاندان 'ما' میں اس وقت کئی مشہور جنرل ہیں اور وہ کئی مرتبہ کانسو، ننگ ہیا اور چین ہائی کے گورنر بھی رہ چکے ہیں۔ ان کے ماتحت کافی فوج ہے۔ یہ لوگ حکومت نانکینگ کے خیر خواہ ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ سنہ ۱۹۲۸ء میں جبکہ عیسائی جنرل فانگ یو ہیانگ نے حکومت نانکینگ سے بغاوت کردی اور فوجی فرمان سے مزید محصول شمالی چین کے مسلم تاجروں پر لگانا چاہا تو ان لوگوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ آخر نوبت جنگ تک پہنچی۔ اس وقت مسلمانوں کے قائد ماچونگ این اور ماپن ٹینگ تھے۔ جنگ میں ان لوگوں نے خوب داد شجاعت دی لیکن فوج ناتجربہ کار تھی اور ہتھیار کم تھے۔ آخر انھوں نے عیسائی جنرل سے شکست کھائی اور ہاچاؤ میں جو کانسو کے مسلمانوں کا مرکز ہے خون کی ندیاں بہ گئیں۔

شکست کے بعد ماچونگ این اور ماین ٹینگ ضلع لین ٹان ( Lin Tan ) کی طرف ہٹے۔ ان کی فوج بالکل منتشر ہو چکی تھی۔ ان کے ساتھ سوائے دس بیس نوکروں کے بہت کم محافظ تھے۔ یہ لوگ لین ٹان کے قریب پہنچنے کو تھے کہ سرحد پر ایک برطرف شدہ افسر یانگ چی ٹنگ ( Yang Chee Tsang ) نامی نے جو دو سال سے وہاں لوٹ مار کر رہا تھا اور جس کے ماتحت رہزنوں کی ایک اچھی خاصی جماعت تھی اس قافلے کو گھیر کر لوٹ لیا۔ اس کے بعد جنرل موصوف نے اپنی منتشر فوجوں کو جمع کر کے یانگ چی ٹنگ پر چڑھائی کی جو اس وقت شہر پر قابض تھا۔ بیس روز کی مسلسل جنگ کے بعد بھی شہر فتح نہیں ہو سکا۔ آخر جنرل ' ما ' کو شہر ہیا ہا ( Ma Hsia Ha ) کی طرف جانا پڑا۔ ان کے ہٹتے ہی یانگ چی ٹنگ شہر سے نکلا اور اس نے ارد گرد کے مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ کم سے کم پانچ ہزار[1] مسلمان اس کی تلوار کی نذر ہو گئے۔ کروڑوں کی جائداد لوٹ لی گئی۔ صرف مویشی کی تعداد سات ہزار تھی۔ لین ٹان کے قریب اگرچہ سرکاری فوج رہتی تھی لیکن اس نے ان رہزنوں کے استیصال کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا اور یہ عذر پیش کیا کہ اس کے پاس روپیہ نہیں ہے اور سامان بھی کم ہے! وہاں کے بڑے بڑے مسلم رؤسا مسلمانوں کی اس تباہ حالی کو دیکھ کر صبر نہ کر سکے۔ سب نے مل کر وہاں کے حاکم سے درخواست کی کہ امن و امان قائم کرنے کے لئے کوئی مناسب تدبیر اختیار کرے۔ مسلمان اس کا ساتھ دیں گے۔ آخر یہ طے ہوا کہ مسلمان مقامی حکام کی مدد کریں تاکہ وہ یانگ چی ٹنگ کو وہاں سے نکال دیں۔ اور مسلمانوں کی جان و مال کی حفاظت کریں۔ اکیلے ما من زن یا محمد کرامت علی نے جو مقامی مسلمانوں کے ایک رئیس تھے سو گھوڑے اور ستر ہزار ڈالر حکومت کو دئے اور اس طریقے سے وہاں تھوڑا بہت امن قائم ہوا لیکن یانگ چی ٹنگ جہاں کہیں پہنچتا بستیوں کو جلاتا اور مسلمانوں کو قتل کرتا تھا۔

یہ ۱۹۲۹ء کا ذکر ہے۔ اس فتنے کا انسداد اب تک نہیں ہوا۔ کیونکہ یانگ چی ٹنگ نے اب تک مسلمانوں کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ جب کبھی اس کو موقع ملتا تھا وہ اپنی رہزن جماعت کو لے کر شہر لین ٹان

---

[1] نضارۃ الہلال پیکن (جلد چہارم نمبر ۸ صفحہ ۱۲)

پر حملہ کرتا تھا مسلمانوں کی عورتیں، بچے، جان و مال کوئی چیز اس کے ہاتھ سے محفوظ نہ تھی مسلمانوں نے حکومت نانکینگ سے اس کی شکایت کی۔ حکومت نے ان کی درخواست منظور کرلی اور وعدہ کرلیا کہ جلد اس رہزن سردار کی خبر لی جائے گی۔ لیکن حکومت کو ان دنوں اتنی فرصت کہاں تھی! جاپان کے ساتھ شدید جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ حکومت نانکینگ اس موقع پر مسلمانوں کے لئے صرف اتنا کرسکی کہ اس نے کانسو کے موجودہ گورنر "چو لیز" ( Chu Shao Liang ) کو مناسب تدبیر اختیار کرنے کی ہدایت کردی لیکن یانگ چی ٹنگ گورنر کے قابو میں آنے والا نہ تھا اور وہ اب تک مسلمانوں کو تنگ کرتا رہتا ہے۔ دیکھئے آیندہ اس کا کیا تدارک ہوتا ہے۔

**چینی مسلمانوں کا احتجاج** لین ٹانگ کے مسلمانوں نے جب یہ دیکھا کہ ان کا معاملہ اب تک طے نہیں ہوسکا تو انھوں نے تمام چینی مسلم اخبارات میں ایک اپیل شائع کیا۔ چینی مسلمانوں نے اس پر لبیک کہا اور حکومت نانکینگ سے یانگ چی ٹنگ کے خلاف احتجاج کیا۔ ذیل میں اس احتجاج نامہ کا تھوڑا سا اقتباس ہے جو اسلامی اخبار "الصراط المستقیم" پیکن جلد ۲ نمبر ۲، ۳ و ۴ یعنی فروری، مارچ و اپریل نمبر میں شائع کیا گیا تھا۔

"مرکزی پارٹی، قومی حکومت، اس کے مختلف شعبوں اور ہر صوبے کے گورنر سے یہ عرض ہے کہ کانسو کے ضلع لین ٹانگ سے خبر آئی ہے کہ یانگ چی ٹنگ جو حکومت کا ایک افسر تھا اور ۱۹۲۸ء میں برطرف کردیا گیا تھا شہر لین ٹانگ کے مسلمانوں پر حملہ کررہا ہے۔ وہ ایک مرتبہ نہیں، دو مرتبہ نہیں بلکہ پانچ مرتبہ یورش کرچکا ہے۔ مرد قتل کردئے گئے ہیں، عورتیں عصمت ریزی کرکے شہر سے نکال دی گئی ہیں۔ اس نے اس پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ ایک بدھ مت کے پیشوا کو جو "نیو ہاشانگ" کے نام سے موسوم ہے آمادہ کیا ہے کہ وہاں کے غیر مسلموں سے مل کر مسلمانوں کو ستائے۔ چنانچہ ضلع صوان فان، میں، ایک "میتاکو" نامی کے چھوٹے بچے کو جس کی عمر ایک سال سے بھی کم ہے پکڑ کر لے گیا۔ گو وہاں کے مسلمانوں نے یانگ چی ٹنگ کے خلاف استغاثہ دائر کیا اور

صوبجاتی حکومت نے فیصلہ بھی کر دیا کہ ملزم کو سخت سزا دی جائے لیکن سیاسی وجوہ سے
وہ یانگ چی ٹسنگ کے خلاف کوئی باقاعدہ کارروائی نہیں کر سکی۔ یانگ جی ٹسنگ دیکھتا
ہے کہ مظلوم مسلمانوں کا کوئی سرپرست نہیں ہے اس لئے دل کھول کر وحشت اور درندگی
کے ہولناک منظر دکھاتا ہے۔ وہ مسلمانوں کی جائدادیں ضبط کر لیتا ہے اور ان کے کھیت
اجاڑ دیتا ہے۔ اب مسلمانوں کے بیس گاؤں اس کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ ان کو اپنی
ذاتی جائداد بنانا چاہتا ہے۔ وہ مسلمان کسانوں کے کاروبار میں مزاحم ہوتا ہے اور
ان کو اپنے گاؤوں کے اندر آنے نہیں دیتا۔ صوبہ کانسو کے دیگر حکام یانگ چی ٹسنگ
کی قوت سے ڈرتے ہیں اور اس کے خلاف کچھ نہیں کرتے ......"

"...... مانچو کے زمانے سے لے کر آج تک شمال مغربی چین میں مسلموں اور
غیر مسلموں کے درمیان بسا اوقات کشمکش رہتی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان میں کوئی
مذہبی اختلاف یا نسلی جذبہ ہے، بلکہ یہ ہے کہ بعض سرکش افراد کانسو میں اپنی قوت جمانا
چاہتے ہیں اور اس غرض کو حاصل کرنے کے لئے وہ برابر مسلمانوں کو تنگ کرتے ہیں۔
یہی وجہ ہے کہ اکثر خوں ریزی تک نوبت پہنچتی ہے۔ یہ بات جمہوریت چین سے مخفی نہیں
کہ اس وقت ملک کے چاروں طرف عجیب عجیب واقعات رونما ہوئے ہیں۔ منگولیا اور
تبت میں امن و امان نہیں ہے۔ مانچو نے منچوریا میں جاپان کے زیر سایہ اپنی حکومت
قائم کر لی ہے۔ اب صرف مسلمان حکومت چین کے وفادار اور خیر خواہ رہ گئے ہیں اور
حتی الامکان اس کی مدد کرتے ہیں۔ لیکن یہ سرکش یانگ چی ٹسنگ مسلمانوں سے ہم وطنوں
کا سا سلوک نہیں کرتا بلکہ ان کے مٹانے کی فکر میں ہے۔ مسلمانوں پر بار بار حملہ کرنا،
ان کی جائداد کو لوٹنا، انھیں خانماں برباد کر کے چھوڑ دینا اس کی وحشت اور درندگی
کے جذبے کو پورا نہ کر سکا۔ اب اس نے مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹانے کا تہیہ
کر لیا ہے چنانچہ "شین پاؤ" (Shen pao) میں اس نے ایک بڑا جلسہ کرایا،

جس میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ مسلمانوں کا خاتمہ کر دیا جائے! تین چار سال سے وہاں
کے مسلموں اور غیر مسلموں میں جو اختلافات چلے آرہے ہیں یہ اس سرکش کے پیدا کیے
ہوئے ہیں۔ اگر حکومت اس کے انسداد کے لئے کوئی عملی تدبیر اختیار نہیں کرتی تو
ہمیں اندیشہ ہے کہ یہ معاملہ اور تشویش ناک صورت اختیار کرے گا جس سے ایک ایسی
آگ بھڑک اٹھے گی جس کا بجھانا ناممکن ہو گا چینی مسلمان یانگ چی ٹنگ کے خلاف
پر زور احتجاج کرتے ہیں اور حکومت سے یہ جائز مطالبہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ
انصاف کیا جائے اور اس فتنہ و فساد کے بانی کی سرکوبی کی جائے ......"

مندرجہ بالا بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شمال مغرب میں کئی سال سے بے چینی ہے اور
مسلموں اور غیر مسلموں میں نزاع چلی آرہی ہے۔ یہ تو یقین ہے کہ ابھی تک یہ لڑائی کسی مذہبی جنون یا رنگ اور
نسل کے خیال پر مبنی نہیں ہے بلکہ صرف چند ہوس پرستوں اور عیش پرستوں کی ذات سے ہے لیکن اگر اس
واقعے نے طول کھینچا تو اس کا اندیشہ ضرور ہے کہ مسلمان اور غیر مسلمان ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آرا
ہوں گے۔ یہ ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ یہ سب واقعات حکومت چین سے بہت کم تعلق رکھتے ہیں۔ حکومت چین
اور مسلمانوں میں کوئی مخالفت نہیں ہے اور نہ عام چینیوں اور مسلمانوں میں کوئی جھگڑا ہے۔ یہ اختلاف بعض
مقامات اور بعض افراد تک محدود ہے۔ لین تان کے واقعے میں بعض غیر مسلمانوں نے بھی مسلمانوں کا ساتھ دیا
ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان حق بجانب ہیں۔ اس وقت سن کیانگ سے جس شورش کی خبر آئی ہے اس کی
نوعیت اسی قسم کی ہے۔ شورش کی خبر اور فوری سبب میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس
صوبے میں بیرونی اثرات کہاں تک ہیں۔

**روس اور سن کیانگ** | چین کو چھوڑ کر سن کیانگ میں اس وقت تین قوتوں کا اثر موجود ہے یعنی جاپان،
روس اور برطانیہ۔ دنیا یہ جانتی ہے کہ روس اور برطانیہ نے عرصے سے وہاں اپنا اپنا اثر قائم کر رکھا ہے
لیکن یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ حال ہی میں جاپان کی توجہ بھی سن کیانگ کی طرف ہو گئی ہے۔ تینوں کے
اثرات کی نوعیت مختلف ہے۔ روس کا اثر زیادہ تر معاشی ہے، جاپان کا تعلیمی اور برطانیہ کا سیاسی۔

سن کیانگ کا رقبہ بہت وسیع اور وہاں کی آبادی بہت کم ہے۔ سوائے کوہستانی اور ریگستانی علاقوں کے زمین ہر جگہ زرخیز اور قابل کاشت ہے اور معدنی دولت سے مالامال ہے۔ سونا، چاندی، تیل کے چشمے، کوئلے اور دوسری چیزوں کی کانیں بکثرت ہیں۔ پھر یہ کہ دیسی صنعت بالکل ابتدائی منزل میں ہے۔ بیرونی مصنوعات کے لئے اس سے بہتر منڈی اور بازار کہیں نہیں ملے گا۔ ان باتوں کی بنا پر ملک گیری کی ہوس رکھنے والوں اور سرمایہ داروں کی آنکھیں اس خطے پر لگی ہوئی ہیں اور مختلف قومیں مختلف تدبیریں کر رہی ہیں کہ اپنا اثر یہاں جمائیں۔ سن کیانگ اب صرف چین اور چینی ترکستان کے مسلمانوں کا مسئلہ نہیں رہا ہے بلکہ بین الاقوامی مسئلہ بن گیا ہے۔ کچھ سیاسی وجوہ سے اور کچھ معاشی وجوہ سے وسط ایشیا میں اگر کوئی جگہ سیاسی گھوڑوں کے دوڑانے کا میدان بن سکتی ہے تو یہی چینی ترکستان ہے۔

روس نے قریب ہونے کی وجہ سے پہلے تو بیرونی منگولیا پر اپنا اقتدار جما رکھا ہے اور اپنے زیر سایہ ایک خود مختار منگولی ریاست قائم کر لی ہے۔ اب اس کی توجہ سن کیانگ کی طرف ہے۔ سن کیانگ میں روسی مداخلت معاہدہ ایلی سے (۱۸۸۱ء) شروع ہوئی۔ معاشی میدان پورا اس کے قبضے میں ہے بلکہ اس کے تعلیمی اثرات بھی چین کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہیں۔ یانگ چین شین نے اپنے زمانے میں روسی اثر کو روکنے کی کوشش کی۔ اس نے تاجروں کو منع کر دیا تھا کہ سرکاری ایجنٹوں کے واسطے کے بغیر روس کے ساتھ کاروبار نہ کرنا چاہیئے۔ مال کی درآمد و برآمد صوبجاتی حکومت کی نگرانی میں تھی۔ مال کی قیمت اور مقدار کو حکومت نے کم و بیش محدود کر رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے زمانے میں روسی مصنوعات کے سیلاب کو ایک حد تک روکے رکھا۔ ۱۹۲۹ء کے بعد جن شوزن گورنر ہوا تو اس نے اس بندش کو اٹھا دیا۔ غالباً اس کا ارادہ تھا کہ بالشویکی اصول پر سن کیانگ کی معیشت کی تکمیل کرے اور ممکن ہے اسی غرض سے اس نے روسیوں کو اپنی فوج میں داخل کیا ہو جو بعد میں موجودہ شورش کا ایک سبب ثابت ہوا۔

سن کیانگ کی تجارت اور صنعت میں روس کا بڑا دخل ہے اور بازار زر قریب قریب پورا روس کے ہاتھ میں ہے۔ معاہدہ ایلی (۱۸۸۱ء) کی رو سے روسیوں کو سن کیانگ میں رہنے، کاروبار کرنے اور زمین جوتنے کے حقوق حاصل ہیں۔ ان دنوں سائبیریا۔ روسی ترکستان ریلوے کی تکمیل ہونے سے وہاں کی آمد و

رفت اور زیادہ ہوگئی ہے۔ روسیوں نے اپنی تجارت کو سن کیانگ میں فروغ دینے کے لیے شہر خولجہ اور ٹاچین کو مرکز بنایا ہے۔ جہاں سے مال کی درآمد و برآمد ہوتی ہے۔ سن کیانگ میں زرعی پیداوار بہت کافی ہے جن میں سے چاول، روئی، گیہوں، انگور اور دوسرے میوے قابل ذکر ہیں۔ ان کا تقریباً ایک ثلث روس جاتا ہے۔ باقی چیزیں جو روس کو جاتی ہیں وہ کاشغر کا ریشم اور قالین، ارومچی اور طرفان کے مویشی، ان کی پشم اور کھالیں ہیں۔ ان چیزوں کے عوض میں روس اپنے جوتے، پیتل کے برتن، لوہے کا سامان، سوتی کپڑا وغیرہ چینی ترکستان میں لاکر نہایت سستے داموں پر بیچتا ہے۔ انگریزی تجارت کو روسی مقابلے کی وجہ سے بہت نقصان ہو رہا ہے۔ مجموعی لحاظ سے روس کی تجارت سن کیانگ میں ۵/۸ ہے اور انگریزی ۲/۸، چینی و جاپانی ۱/۸۔ روس نے چینی ترکستان کو اپنی منڈی بنانے کے لیے مختلف تدبیریں اختیار کی ہیں۔ ان میں سے ایک تدبیر یہ ہے کہ انھوں نے گورنر چن شوزن کے ساتھ ایک خفیہ تجارتی معاہدہ[1] کیا جس کی بنا پر دریائے ایلیش کے کنارے چار شہروں کو روسی تجارتی بندرگاہ بنایا گیا، تجارت کی آمد و رفت میں روسیوں کو آزادی دی گئی، چنگی کے متعلق روسی مال کے لیے خاص رعایت کی گئی اور تمام بڑے بڑے شہروں میں روس کو اپنے ایجنٹ قائم کرنے کی اجازت دی گئی۔ روسی مصنوعات کے کثرت سے آنے کی وجہ سے تھوڑی بہت دیسی صنعت تھی وہ بالکل تباہ ہوگئی اور اس تجارتی تسلط کے ساتھ روس نے اپنے بنکوں سے نوٹ جاری کیے جو اس وقت سارے سن کیانگ میں چلتے ہیں۔

**انگریز اور سن کیانگ** ہم نے ذکر کیا تھا کہ سن کیانگ میں روسی اثر معاشی ہے۔ اب ہم انگریزوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ مغربی سن کیانگ میں انگریزوں کی تجارت بھی کافی ہے لیکن وہ روس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس وقت انگریزوں نے وہاں جو اثر قائم کیا ہے وہ سیاسی ہے موجودہ شورش میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انگریزوں کا ہاتھ ہے۔ خواہ واقعۃً انگریزوں کا ہاتھ نہ ہو مگر اس کی طرف شبہ کیا

---

(1) Current Events, Nanking Volume VIII, No. 6, page 246.

جاسکتا ہے چنانچہ "چائنا ویکلی ریویو" (شنگھائی) نے اپنی اشاعت مورخہ ۵ مئی میں ایک مضمون کے سلسلے میں یوں بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کے پاس جو آلات حرب ہیں وہ برطانوی کارخانوں کے ہیں اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ حکومت ہند کے حکام نے علمی تحقیقات کے بہانے سے ایک تحقیقاتی مہم روانہ کیا تھا جس کا مقصد مقامی لوگوں میں چین کے خلاف سازش پھیلانا تھا۔

الہلال پیکین اپنی اشاعت (جلد چہارم نمبر ۱۰ صفحہ ۱۵) ۱۵ اپریل ۱۹۳۳ء میں یوں لکھتا ہے:-

"سن کیانگ ایک بین الاقوامی تنازع کی جگہ ہے۔ اب زیادہ خطرہ ہے کہ یہ کسی نہ کسی وقت چین کے ہاتھ سے نکل جائے گا کیونکہ یہ روس اور برطانوی ہند دونوں کے سیاسی گھوڑے دوڑانے کی جگہ ہے۔ یہ ایک طرف روسی ترکستان کے ساتھ ملا ہوا ہے اور روس نے اب سائبیریا روس ترکستان ریلوے کو مکمل کر دیا ہے۔ دوسری طرف یہ افغانستان کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ افغانستان اور ہندوستان انگریزوں کے زیر اثر ہیں۔ چونکہ سن کیانگ کے مسلمانوں کا رسم و رواج، مذہب اور طرز معاشرت ان مسلمانوں سے ملتا جلتا ہے جو پامیر کے اس پار ہیں اور ان میں دینی اتحاد ہے۔ اس لئے انگریز ان مسلمانوں کی جہالت سے فائدہ اٹھا کر پان اسلامزم کا ڈنکا بجاتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ افغانستان اور ہندوستان کے ساتھ مل جاؤ۔"

شنگھائی کا ایک اور مشہور ماہوار رسالہ Shun Pao Monthly جلد دوم نمبر ۳ میں لکھتا ہے:-

"سن کیانگ کی شورش کے متعلق جنوری میں ایک خبر استنبول سے موصول ہوئی تھی کہ ملک گیری کی ہوس رکھنے والے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر یہ کوشش کر رہے ہیں کہ سن کیانگ میں ایک اسلامی ریاست قائم کی جائے جو روس اور برطانوی ہند کے درمیان ایک روک کا کام دے سکے۔ موجودہ شورش برطانوی ہند سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک مستعفی انگریزی افسر جو مصر، ہندوستان اور سنگاپور کے محکمہ نو آبادیات میں بھی رہ چکا ہے علمی تحقیق کے نام سے کئی مرتبہ سن کیانگ گیا ہے اور وہاں کی سیاسی حالات کا

مطالعہ کرتا رہا ہے......"

مندرجہ بالا بیانات خواہ افواہ ہوں خواہ حقیقت لیکن کوئی شخص اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ حکومت برطانیہ کی خواہش ہے کہ سن کیانگ میں ایک ایسی اسلامی ریاست قائم کی جائے جو مزدوری اور ملوکی حکومت کے درمیان ایک سد سکندری کا کام دے سکے۔ روس اور برطانیہ کے درمیان سن کیانگ میں علاوہ سیاسی کشمکش کے تجارتی کشمکش بھی ہے۔ یہ کشمکش زار کے زمانے سے شروع ہوئی تھی۔ کاشغر اور خولجہ میں روسی سفیر مقرر ہو جانا اس بات کا ثبوت تھا کہ روس دل ہی دل میں یہ تدبیر سوچ رہا ہے کہ سن کیانگ کو اپنی ہی منڈی بنائے چنانچہ جب برطانیہ نے اپنا سفیر وہاں بھیجا تو روسی سفیر نے قنصل برطانیہ کے خلاف سخت پروپگنڈا کیا لیکن چینی گورنر جنرل کی اجازت سے آخر برطانوی قنصل خانہ وہاں قائم ہو گیا اور وہاں کے لوگوں کے ساتھ تجارت کرنی شروع کی۔ اس پندرہ بیس سال کے اندر برطانیہ کا تجارتی اثر اس قدر بڑھ گیا کہ یہ ملک روس کا جانی دشمن ہو گیا۔ روس نے برطانوی تجارت کو شکست دینے کے لئے سائبیریا۔ روسی ترکستان ریلوے تعمیر کی جس کی وجہ سے روس اور چینی ترکستان کے درمیان آمد و رفت آسان ہو گئی اور نقل و حمل کی دشواری سے ایک دو سال سے برطانوی تجارت بہت کم ہو گئی چنانچہ برطانوی قنصل متعینہ کاشغر کی رپورٹ سے جو ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں اسٹیٹسمین دکلکتہ میں شائع کی گئی تھی۔ پتہ چلتا ہے کہ گذشتہ سال میں برطانوی تجارت میں چار لاکھ روپیہ کی کمی ہو گئی۔ رپورٹ تین وجوہ بتاتی ہے ایک تو ہندا اور کاشغر کے درمیان کے نقل و حمل کی دشواری، دوسرے روسی مال کا مقابلہ، تیسرے شرح مبادلہ کا گرنا لیکن جس چیز نے برطانوی تجارت کو زیادہ نقصان پہنچایا ہے وہ روسی مقابلہ ہے۔ چنانچہ رپورٹ ہذا میں آگے چل کر لکھا گیا ہے:

"روسی مقابلہ یورپی مصنوعات کے لئے بڑی مصیبت ہے کیونکہ روسی مال بہت ارزاں فروخت کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ روس کی روش کچھ عرصے تک جاری رہے گی۔ دواؤں، سوت، رنگ، مسالے، اونی اور سوتی مال اور سگریٹ میں روسی مقابلہ زیادہ اور سخت ہے......"

چین میں شرح مبادلہ کا گرنا برطانوی تجارت کے زوال کا سبب نہیں ہے۔ اصلی سبب یہ ہے کہ وہاں کا بازار زر روس کے ہاتھ میں ہے۔ ارومچی، طرفان، خولجہ اور کاشغر میں روسی بنک ہیں۔ زر کا

مبادلہ عموماً ان بنکوں کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ دوسرا اہم سبب آمد و رفت کی دشواری ہے۔ کاشغر اور ہند کے درمیان کوہستانی علاقہ ہے، ریلوے اور موٹر سروس قائم نہیں ہے، صرف گدھے اور خچر سے راستہ طے کیا جا سکتا ہے، آنے جانے میں مہینوں لگ جاتے ہیں۔ مزید برآں برطانوی مال کا سرمایہ زیادہ ہے اور باربرداری کے سارے اخراجات لگاکر برطانوی مال سن کیانگ پہنچ کر کہیں زیادہ گراں ہو جاتا ہے۔ برطانوی ہند عرصے سے اس دشواری کو محسوس کر رہا ہے کہ ریلوے بالفعل تعمیر نہیں ہو سکتی۔ موٹر سروس قائم کیا جانا بھی مشکل ہے۔ ہوا کے راستے سے کام لینا نسبتاً زیادہ آسان ہے۔ چنانچہ گزشتہ سال موسم گرما میں شملہ کے ایر کلب ([illegible]) کا ایک تفریحی مہم یہ تحقیق کرنے کے لئے گلگت گیا تھا کہ آیا ہندوستان اور کاشغر کے درمیان ہوائی راستے کا انتظام ہو سکتا ہے یا نہیں۔ ہم عنقریب سنیں گے کہ برطانوی ہند، کاشغر اور ہند کے درمیان ہوائی راستہ قائم کرکے روسی مفاد کو شکست دی گئی۔

برطانیہ نہ صرف یہ چاہتا ہے کہ چینی ترکستان میں اپنے سیاسی گھوڑے دوڑائے اور وہاں کی منڈی پر قابض ہو جائے بلکہ اس نے اندرونی انتظامات میں بھی ہاتھ ڈالنا شروع کیا ہے۔ برطانوی قنصل خانے کے قائم ہونے کے بعد سب سے پہلا کام انگریزوں نے یہ کیا کہ کاشغر میں اپنا ڈاک خانہ قائم کیا جس سے نہ صرف سرکاری ڈاک بھیجی جاتی ہے بلکہ عام لوگوں کی بھی۔ چنانچہ کاشغر سے جو خطوط ہندوستان کی طرف آتے ہیں ان پر گورنمنٹ آف انڈیا کے ٹکٹ لگے ہوتے ہیں حالانکہ کاشغر چین کے ماتحت ہے اور مراسلات پر حکومت چین کے ٹکٹ لگنے چاہئے تھے۔ بالفعل خط و کتابت کا سلسلہ بند ہے اور جو کچھ خبر ہندوستان کو آتی ہے وہ برطانوی قنصل کی لاسلکی سے شملہ آتی ہے اور بعض تاجر جو چینی ترکستان سے سرحد یا پشاور میں پہنچتے ہیں، اخبارات کو اپنے خیال کے مطابق بیان دیتے ہیں جس میں مبالغہ بہت زیادہ ہوتا ہے، صورت حال پر روشنی نہیں پڑتی۔ برطانوی ہند دوسرا کام یہ کرنا چاہتا ہے (اب زیر غور ہے) کہ کسی مسلمان کو برطانوی قنصل جنرل متعینہ کاشغر بنایا جائے جو حکومت برطانیہ کا خیرخواہ ہو تاکہ وہاں جاکر وہاں کے جاہل متعصب اور جامد مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملائے اور ان کو حکومت برطانیہ کے زیر اثر لانے کی کوشش کرے۔

**جاپان اور سن کیانگ** | روس اور برطانیہ کی دیکھا دیکھی جاپان کو بھی جوش آگیا۔ اس کی دلی تمنا ہے

مطالعہ کرتا رہا ہے ....... "

مندرجہ بالا بیانات خواہ افواہ ہوں خواہ حقیقت لیکن کوئی شخص اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ حکومت برطانیہ کی خواہش ہے کہ سن کیانگ میں ایک ایسی اسلامی ریاست قائم کی جائے جو روس اور ملو کی حکومت کے درمیان ایک سد سکندری کا کام دے سکے۔ روس اور برطانیہ کے درمیان سن کیانگ میں علاوہ سیاسی کشمکش کے تجارتی کشمکش بھی ہے۔ یہ کشمکش زار کے زمانے سے شروع ہوئی تھی۔ کاشغر اور خولجہ میں روسی سفیر مقرر ہو جانا اس بات کا ثبوت تھا کہ روس دل ہی دل میں یہ تدبیر سوچ رہا ہے کہ سن کیانگ کو اپنی ہی منڈی بنائے چنانچہ جب برطانیہ نے اپنا سفیر وہاں بھیجا تو روسی سفیر نے قنصل برطانیہ کے خلاف سخت پروپیگنڈا کیا لیکن چینی گورنر جنرل کی اجازت سے آخر برطانوی قنصل خانہ وہاں قائم ہو گیا اور وہاں کے لوگوں کے ساتھ تجارت کرنی شروع کی۔ اس پندرہ بیس سال کے اندر برطانیہ کا تجارتی اثر اس قدر بڑھ گیا کہ یہ ملک روس کا جانی دشمن ہو گیا۔ روس نے برطانوی تجارت کو شکست دینے کے لئے سائبیریا۔ روسی ترکستان ریلوے تعمیر کی جس کی وجہ سے روس اور چینی ترکستان کے درمیان آمد و رفت آسان ہو گئی نیز نقل و حمل کی دشواری سے ایک دو سال سے برطانوی تجارت بہت کم ہو گئی چنانچہ برطانوی قنصل متعینہ کاشغر کی رپورٹ سے جو ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں اسٹیٹسمین کلکتہ میں شائع کی گئی تھی۔ پتہ چلتا ہے کہ گذشتہ سال میں برطانوی تجارت میں چار لاکھ روپیہ کی کمی ہو گئی۔ رپورٹ تین وجوہ بتاتی ہے ایک تو ہندوستان اور کاشغر کے درمیان کے نقل و حمل کی دشواری، دوسرے روسی مال کا مقابلہ، تیسرے شرح مبادلہ کا گرنا لیکن جس چیز نے برطانوی تجارت کو زیادہ نقصان پہنچایا ہے وہ روسی مقابلہ ہے۔ چنانچہ رپورٹ ہذا میں آگے چل کر لکھا گیا ہے:

" روسی مقابلہ یورپی مصنوعات کے لئے بڑی مصیبت ہے کیونکہ روسی مال بہت ارزاں فروخت کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ روس کی روش کچھ عرصے تک جاری رہے گی۔ دواؤں، سوت، رنگ، مصالحے، اونی اور سوتی مال اور سگریٹ میں روسی مقابلہ زیادہ اور سخت ہے ...... "

چین میں شرح مبادلہ کا گرنا برطانوی تجارت کے زوال کا سبب نہیں ہے۔ اصلی سبب یہ ہے کہ وہاں کا بازار زر روس کے ہاتھ میں ہے۔ ارومچی، طرفان، خولجہ، اور کاشغر میں روسی بنک ہیں۔ زر کا

مبادلہ عموماً ان بنکوں کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ دوسرا اہم سبب آمد و رفت کی دشواری ہے۔ کاشغر اور ہند کے درمیان کوہستانی علاقہ ہے، ریلوے اور موٹر سروس قائم نہیں ہے، صرف گدھے اور خچر سے راستہ طے کیا جا سکتا ہے، آنے جانے میں مہینوں لگ جاتے ہیں۔ مزید برآں برطانوی مال کا سرمایہ زیادہ ہے اور باربرداری کے سارے اخراجات لگا کر برطانوی مال سن کیانگ پہنچ کر کہیں زیادہ گراں ہو جاتا ہے۔ برطانوی ہند عرصے سے اس دشواری کو محسوس کر رہا ہے کہ ریلوے بالفعل تعمیر نہیں ہو سکتی۔ موٹر سروس قائم کیا جانا بھی مشکل ہے۔ ہوا کے راستے سے کام لینا نسبتاً زیادہ آسان ہے۔ چنانچہ گزشتہ سال موسم گرما میں شملہ کے ایئر کلب (........) کا ایک تفریحی مہم یہ تحقیق کرنے کے لئے گلگت گیا تھا کہ آیا ہندوستان اور کاشغر کے درمیان ہوائی راستے کا انتظام ہو سکتا ہے یا نہیں۔ ہم عنقریب سنیں گے کہ برطانوی ہند، کاشغر اور ہند کے درمیان ہوائی راستہ قائم کر کے روسی مفاد کو شکست دی گئی۔

برطانیہ نہ صرف یہ چاہتا ہے کہ چینی ترکستان میں اپنے سیاسی گھوڑے دوڑائے اور وہاں کی منڈی پر قابض ہو جائے بلکہ اس نے اندرونی انتظامات میں بھی ہاتھ ڈالنا شروع کیا ہے۔ برطانوی قنصل خانے کے قائم ہونے کے بعد سب سے پہلا کام انگریزوں نے یہ کیا کہ کاشغر میں اپنا ڈاک خانہ قائم کیا جس سے نہ صرف سرکاری ڈاک بھیجی جاتی ہے بلکہ عام لوگوں کی بھی۔ چنانچہ کاشغر سے جو خطوط ہندوستان کی طرف آتے ہیں ان پر گورنمنٹ آف انڈیا کے ٹکٹ لگے ہوتے ہیں حالانکہ کاشغر چین کے ماتحت ہے اور مراسلات پر حکومت چین کے ٹکٹ لگنے چاہئے تھے۔ بالفعل خط و کتابت کا سلسلہ بند ہے اور جو کچھ خبر ہندوستان کو آتی ہے وہ برطانوی قنصل کی لاسلکی سے شملہ آتی ہے اور بعض تاجر جو چینی ترکستان سے سرحد یا پشاور میں پہنچتے ہیں، اخبارات کو اپنے خیال کے مطابق بیان دیتے ہیں جس میں مبالغہ بہت زیادہ ہوتا ہے، صورت حال پر روشنی نہیں پڑتی۔ برطانوی ہند دوسرا کام یہ کرنا چاہتا ہے (اب زیر غور ہے) کہ کسی مسلمان کو برطانوی قنصل جنرل متعینہ کاشغر بنایا جائے جو حکومت برطانیہ کا خیر خواہ ہو تاکہ وہاں جا کر وہاں کے جاہل متعصب اور جاہد مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملائے اور ان کو حکومت برطانیہ کے زیر اثر لانے کی کوشش کرے۔

**جاپان اور سن کیانگ** | روس اور برطانیہ کی دیکھا دیکھی جاپان کو بھی جوش آگیا۔ اس کی دلی تمنا ہے

کہ چونکہ سن کیانگ اقلیم ایشیا میں ہے، لہذا ایشیائیوں کے ہاتھ میں رہنا چاہئے۔ جاپان کی بڑھتی ہوئی آبادی
اور دست کاری کی ترقی اور مصنوعات کی زیادتی یہ سب باتیں جاپان کو مجبور کرتی ہیں کہ منچوریا کے علاوہ کوئی
اور ملک دریافت کرے اور نئی منڈیاں تلاش کرے۔ جاپان کی منچوریا و منگولیا کی پالیسی دنیا میں مشہور ہے۔
منچوریا تو اس کے قبضے میں چلا گیا اور اندرونی منگولیا اس کے زیر اثر ہے۔ اندرونی منگولیا اور سن کیانگ ساتھ
ساتھ ملا ہوا ہے۔ وہاں اپنا اثر جانے کے بعد اس کی توجہ لامحالہ سن کیانگ کی طرف ہوگی۔ اہل جاپان
آج کل بڑے سمجھ دار اور مدبر بن گئے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سن کیانگ میں بالفعل ان کا سیاسی اقتدار
نہیں جم سکتا اور معاشی میدان میں روس اور برطانیہ دونوں کا مقابلہ کرنا بھی اس کے لئے مشکل ہے۔
اس لئے جاپان نے اس وقت سن کیانگ کے متعلق سیاسی اور معاشی تدبیر سے بہتر ایک اور پالیسی
اختیار کی جو بعد میں مسلمانان سن کیانگ اور اہل جاپان کے لئے ضرور مفید ثابت ہوگی۔ تدبیر یہ ہے کہ
حکومت[1] جاپان نے اپنے سرمایہ سے سن کیانگ میں مختلف قسم کے اخبار جاری کئے ہیں جن سے صرف
پروپگنڈا مقصود ہے اور دوسری طرف حکومت جاپان یہ کوشش کر رہی ہے کہ سن کیانگ سے جتنے
زیادہ مسلم طلبہ کو جاپان میں بلا سکے بلائے۔ اس غرض سے ٹوکیو میں حکومت جاپان نے ایک جامع مسجد تعمیر
کی ہے۔ "الصراط المستقیم" پیکن لکھتا ہے کہ شاہ جاپان نے کچھ جاپانیوں کو اسلام کو قبول کرنے کی
اجازت دی ہے، تاکہ جاپانی نومسلموں کے ذریعے سے اسلامی دنیا کو اپنے ساتھ ملالیں۔ اسلامی رسم و رواج
اور اسلامی زبان یعنی عربی سے شغف پیدا کرنے کی کوشش بعض جاپانی نومسلموں نے بھی کی ہے۔ ایک
جاپانی[2] طالب علم جامعہ ازہر میں دو سال تک رہا، پھر ممالک اسلامیہ کے حالات کا مطالعہ کرنے کی
غرض سے شام سے ہوتا ہوا عراق آیا اور پھر ایران میں پہنچا لیکن اپنی آرزو پوری نہ کرسکا اور تپ میعادی
میں مبتلا ہو کر انتقال کر گیا۔ جاپان کے پایۂ تخت میں اس وقت اسلامی مدرسے کا انتظام ہے اور

---

[1] الصراط المستقیم پیکن، جلد سوم نمبر ۶، بابت ماہ جون ۱۹۳۳ء

[2] الفتح قاہرہ، جلد ہفتم عدد ۳۲۷ صفحہ ۱۳۔

حکومت جاپان نے سن کیانگ سے ۵۰ مسلم طلبہ اپنے ہاں بلائے ہیں اور ان کو جدید تعلیم دی جا رہی ہے۔[۵] جاپان کی یہ تعلیمی پالیسی اگر دس پانچ سال تک جاری رہی تو سن کیانگ کے مسلمان ضرور اس کی طرف مائل ہو جائیں گے بشرطیکہ جاپان کوئی ایسا قدم نہ اُٹھائے جو اسلامی اصول کے منافی ہو کیونکہ چینی ترکستان کے مسلمان ایک طرف تو روسی اشتراکیت سے تنگ آ گئے ہیں اور دوسری طرف موجودہ چینی گورنر سے خفا ہیں اور بہت ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں چینی ترکستان کے مسلمان اپنے اقتصادی اور معاشی حقوق جاپان کے سپرد کر دیں۔ یہ صورت اگر پیدا ہو جائے تو یہ مسلمانوں کے لئے مفید ہوگی یا مضر بالفعل ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ آئندہ کے واقعات ہمیں تبلا دیں گے۔

صورتِ حال | معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ شورش فروری کے آخر میں شروع ہوئی۔ چینی رسالے کا بیان ہے کہ ماچونگ این نے سب سے پہلے اس جہاد کا علم اٹھایا یعنی حامی کے مسلمانوں کی حمایت کے واسطے خروج کیا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ چن شوزن نے حامی کے مسلمانوں کی جاگیر کے ضبط کرنے کا حکم دیا تھا اور دوسرے اس وجہ سے کہ اس نے لین تان میں ۱۹۲۹ء یانگ چی ٹنگ سے شکست کھائی تھی۔ یانگ چی ٹنگ یقیناً یانگ چن شین سابق گورنر سن کیانگ کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ یانگ چن شین کے مقتول ہونے کے بعد چن شوزن گورنر ہوا۔ چن شوزن مانوشین کے قتل میں شریک تھا۔ مانوشین یانگ چن شین کا سکریٹری تھا اور یہ ماچونگ این کے خاندان سے تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ چن شوزن یعنی موجودہ گورنر جس کا ہاتھ مسلمانوں کے خون سے آلودہ ہو چکا تھا مسلمانوں پر ظلم کر رہا ہے تو اس نے حامی پر حملہ کر دیا۔

چینی مسلم اخبار اور غیر مسلم اخبارات نے اس خبر کی سخت تردید کی ہے کہ یہ مسلم و غیر مسلم سوال ہے اور اس بات سے انکار کیا ہے کہ موجودہ شورش حکومت کے خلاف برپا کی گئی ہے۔ یہ چن شوزن کی ذات کے خلاف برپا کی گئی ہے۔ حاجی محمد یوسف نے جو فرانسیسی بستی کی مسجد کے امام ہیں الصراط المستقیم

---

[۵] الصراط المستقیم پیکن، جلد سوم، نمبر ۶، بابتہ ماہ جون ۱۹۳۳ء۔

کی جون کی اشاعت میں ایک بیان دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:-

"بیرونی لوگوں میں یہ خبر مشہور ہے کہ سن کیانگ میں مسلموں و غیر مسلموں میں فساد ہوگیا۔ یہ غلط ہے کیونکہ کئی صدیوں سے مسلم و غیر مسلم بھائیوں کی طرح رہتے ہیں۔ مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں، خرید و فروخت کرتے ہیں، ان میں کامل اتحاد ہے، نفاق کا نام بھی نہیں۔ اس شورش کا سبب کچھ اور ہے یعنی ما نوشین[1] کا قتل"

غیر مسلم رسالوں میں بھی یہی خیال نظر آتا ہے۔ چنانچہ رسالہ 'واقعات رواں'[2] نانکنگ اپنی حال کی اشاعت میں لکھتا ہے۔

"سن کیانگ کی شورش کے متعلق باہر کے اخبارات میں یہ شور مچ رہا ہے کہ یہ مسلم و غیر مسلم کی لڑائی ہے۔ یہ سفید جھوٹ ہے۔ سن کیانگ میں اگرچہ مسلمان بستے ہیں اور ان کے ساتھ غیر مسلم چینی بھی رہتے ہیں لیکن اب ایک دوسرے سے گھل مل گئے ہیں۔ موجودہ شورش چن شوزن کی ذات کے خلاف برپا کی گئی ہے کیونکہ اس نے مسلمانوں پر سخت ظلم کئے اور ما نوشین کا خون بھی اس کی گردن پر تھا۔ ما نوشین مسلمانوں میں بہت ہر دلعزیز تھا۔ اسے یاد کرکے سن کیانگ کے مسلمان روتے تھے...."

جب ہم حکومت نانکنگ کا اعلان پڑھتے ہیں تو یہی خیال اس میں پاتے ہیں۔ چنانچہ اس اعلان میں حکومت کہتی ہے

"قومی مساوات اور مذہبی آزادی ہماری جماعت[3] کا سیاسی عقیدہ ہے اور

---

[1] الصراط المستقیم پیکن جون ۱۹۳۳ء

[2] Current Events, Nanking Volume VIII, No. 6, Page 245.

[3] Kero mintang (قومی جماعت)

دستورِ حکومت نے اس عقیدے کو اپنے بنیادی اصول میں داخل کیا ہے۔ باشندگانِ سرحد کے
معاملے میں حکومت برابر عدل اور انصاف سے کام لیتی ہے۔ صوبہ سن کیانگ مغربی انتہا
پر واقع ہے۔ آمد و رفت کی دشواری اور دوری کی وجہ سے مرکزی حکومت کا اثر وہاں
مشکل سے پہنچ سکتا ہے اور وہاں کے امور بالکل گورنر کے ہاتھ میں چھوڑ دیے گئے ہیں۔"

معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ گورنر چین شوزن نے اپنے عہدے پر مامور ہونے کے بعد عوام کی رائے
کا احترام نہیں کیا، اور نہ اس نے ان کے مفاد کے لئے کچھ کیا بلکہ اس نے صرف ذاتی قوت اور دولت حاصل
کرنے کی کوشش کی۔ یہ حرکت یقیناً مرکزی حکومت کی حکمتِ عملی کے منافی اور دستورِ جمہوریتِ چین کے مخالف
ہے۔ اس نے اپنی فوج میں سفید روسیوں کو داخل کرنے سے مسلمانوں کو بہت تکلیف دی جس کی وجہ سے
مسلمان اس کے خلاف ہو گئے۔ اب چین شوزن برطرف کر دیا گیا ہے، سفید روسی فوج بھی برخاست کر دی
جائے گی۔ سن کیانگ کی گورنری کے لئے دوسرا قابل اور لائق آدمی مقرر کر دیا جائے گا۔ بالفعل وانگ
موسونگ کو اس واسطے روانہ کیا جاتا ہے تاکہ سن کیانگ کے حالات کی تحقیق کی جائے۔ مسلمانوں کو جو شکایات
ہوں وہ دور ہو جائیں۔ مرکزی حکومت مسلمانوں کے جذبات کا احترام کرے گی اور ہر معاملہ حکومت نانکنگ کے
پاس نمائندے بھیج کر طے ہو سکتا ہے۔[۵۵]

رسالہ "واقعاتِ رواں" نانکنگ آخر میں لکھتا ہے کہ چین شوزن کے برطرف کرنے اور سفید روسیوں کو
برخاست کرنے کے بعد وہاں سکون ہو گیا اور بعد میں کسی قسم کی شورش کی خبر نہیں آئی لیکن ادھر کشمیر کی طرف
سے جو خطوط کاشغری صاحب کے پاس آئے ہیں ان میں بیان کیا گیا ہے کہ کاشغر میں اسلامی حکومت قائم
ہو گئی ہے اور طرفان سے لے کر ختن تک مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ یہ خطوط تاجروں کے پاس سے آئے
ہیں جو دو مہینے سے اپنا ملک چھوڑے ہوئے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ جو کچھ ان خطوط میں بیان کیا گیا ہے وہ

---

۵۵ Current Events, Nanking, Volume VIII, No. 6, page 246.

عین شورش کے وقت کے حالات ہیں۔ ان حالات کا شملے کی اطلاع سے مقابلہ کیا جائے جو ۱۶ رجون ۱۹۳۳ء کے ٹائمز آف انڈیا میں شائع ہوئی تھی تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ صوبہ سن کیانگ اب تک چین سے علیحدہ نہیں ہوا ہے۔ مسلمانوں نے جن علاقوں پر قبضہ کر لیا ہے اور جن میں انھوں نے اپنا اقتدار قائم کیا ہے وہ صرف سن کیانگ[1] کا نصف حصہ ہے اور سن کیانگ کا شمالی حصہ مع ارومچی چینی حکام کے ہاتھ میں ہے۔ چونکہ اس صوبے کے مستقبل کے متعلق ہم کو بھی کچھ بیان کرنا ہے ہم یہاں شملے کی اطلاع مورخہ ۱۴ رجون ۱۹۳۳ء کا ترجمہ درج کر دیتے ہیں تاکہ سن کیانگ کی تصویر قارئین کے سامنے آ جائے۔ وہو ہذا:۔

۱۴ رجون ۱۹۳۳ء شملہ

کاشغر کی آخری خبر مورخہ ۲۵ مئی سے ظاہر ہوتا ہے کہ باغی سرداروں کے درمیان ایک عارضی صلح نامہ ۱۹ مئی کو ہو گیا تھا اور بالفعل چینیوں اور اوردومغانیوں پر حملہ روک دیا گیا۔ تاہم مقامی حالت ابتک ناقابل اطمینان ہے۔

آقسو کے ترکی سردار نے مقامی کمانڈر انچیف سے چارج لے لیا ہے۔ قرغذی سردار عثمان علی جنرل ہو گیا ہے۔ ٹوپن (مقامی حاکم) نے اپنا دفتر دیامن (شہر کے باہر منتقل کر دیا ہے اور دومغانی سردار ماجان ٹنگ ترکی تیمور کی فوجوں کی اکثریت کے ساتھ کاشغر جدید میں ہے۔ ماجان ٹنگ نے سوجن شو کو اپنے جنرل اسٹاف کا رئیس مقرر کیا ہے اور ٹوپن (مقامی حاکم) کے فرائض کو انجام دینے کے لئے اس نے یونس بیگ کو شریک کر لیا ہے۔

یارقند کے فتح ہونے کے متعلق پہلے جو خبر آئی تھی وہ غلط ہے۔ شہر کو حوالہ کر دینے کا انتظام تو ہو گیا تھا لیکن دومغانیوں کی امدادی فوج کے آنے سے یہ انتظام درہم وبرہم ہو گیا اور لڑائی پھر شروع ہو گئی......" (۱۶ رجون ۱۹۳۳ء ٹائمز اوف انڈیا)

---

[1] دیکھو نقشہ

اس کے علاوہ لندن ٹائمز نے بھی اس واقعے کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ ٹائمز آف انڈیا السٹریٹڈ ویکلی نے اپنی اشاعت مورخہ ۱۶ جولائی ۱۹۳۳ء میں ان تفصیلات کو نقل کیا ہے:۔

"جو تفصیلات شہر کاشغر پر قبضہ ہونے کے متعلق موصول ہوئی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرغنر کی بہت سی فوج آرٹوش سے آئی۔ ۲ مئی کو دریا کو پار کر کے پرانے شہر پر حملہ آور ہوئی اور ٹوشنک دروازے سے داخل ہو گئی اور چینی دیوار کو چھوڑ کر ٹوین (مقامی حاکم) کے دفتر میں جمع ہوئی جو ایک کچی اینٹ کی عمارت ہے۔ شہر پر قابض ہونے کے بعد قرغنریوں نے پہلے لوٹ مار کو منع کر دیا تھا۔ لیکن دوسرے دن تقریباً ایک سو چینی مارے گئے اور ان کا مال لوٹ لیا گیا۔ اسی روز دوپہر کو تیمور کے ماتحت تین سو ترک آئے ہیں اور قرغنریوں نے ان کو شہر کے اندر داخل ہونے کی اجازت دی۔ ٹوین (مقامی حاکم) نے جو اپنے دفتر میں مقید تھا باغیوں کی شرائط کو قبول نہیں کیا۔ چینیوں کی بڑی تعداد نے جو شہر میں محصور تھی آقسو سے آئے ہوئے دومغانیوں کی (۲۰ مئی) اطاعت قبول کر لی کیونکہ وہ یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ قرغنر ان پر قابض ہو جائیں۔"

اس کے بعد طوفان بے تمیزی برپا ہو گیا۔ چار ممتاز چینی ۱۲ مئی کو قتل کر دیئے گئے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد باغیوں کے سردار روپیہ جمع کرنے اور آپس میں لڑنے میں مشغول ہو گئے۔ ۱۸ مئی کو نزاع نے تشویش ناک صورت اختیار کر لی یعنی دومغانی سردار ماجان لشانگ نے تیمور کو گرفتار کر لیا۔ قرغنروں نے جو عثمان علی کے تحت ہیں ہیں جنگی مظاہرہ کر کے تیمور کو چھڑایا اور دوسرے دن قرغنر اور ترک دونوں نے مل کر دومغانیوں کے اوپر حملہ کیا جن میں سے کچھ قتل ہوئے کچھ گرفتار ہو گئے۔ یارقند میں بھی ابھی تک امن نہیں ہے۔ نئے شہر پر حملہ پھر شروع ہو گیا ہے......"

ان بیانوں سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شمالی سن کیانگ جس میں ارومچی، خولجہ، ایلی، ٹاچین، کبتائی، سولٹ وغیرہ مشہور شہر ہیں چینیوں کے تسلط میں ہے اور جنوبی سن کیانگ کے مشہور شہر آقسو، کیار، کاشغر

یارقند اورختن مسلمانوں کے ہاتھ میں ہیں۔ یہ مسلمان تین قبیلوں کے ہیں قرغز، ترک اور دومغان۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان میں آپس میں سخت اختلافات ہیں۔ قرغز اور ترک ایک طرف ہیں اور دومغان ایک طرف۔ لیکن دومغان میں اکثر چینی اور تھوڑے بہت ترک موجود ہیں۔ کاشغر کے دو شہر ہیں ایک جدید دوسرا قدیم۔ قدیم شہر عثمان علی کے ہاتھ میں ہے اور جدید ما چان ٹانگ اور سو چن شو قابض ہیں۔ یارقند جدید پر معلوم نہیں مسلمانوں نے قبضہ کرلیا ہے یا نہیں۔ آزاد اسلامی ریاست اس وقت تک قائم ہونا مشکل ہے جب تک دومغان اور قرغز دونوں متحد نہ ہو جائیں۔

**سن کیانگ کا مستقبل** سن کیانگ کی صورت حال آپ کے سامنے ہے۔ اب ہمیں اس پر غور کرنا ہے کہ اس کا مستقبل کیا ہوگا؟ اگرچہ اس وقت قطعی طور پر ہم سن کیانگ کی قسمت کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کرسکتے لیکن اس کے ماضی اور حال اور ان واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے جو مسئلہ سن کیانگ سے گہرا تعلق رکھتے ہیں کچھ اندازہ ضرور کرسکتے ہیں کہ کیا صورت ممکن ہوسکتی ہے۔ قارئین ان باتوں کو اپنے سامنے رکھیں جو جغرافی حیثیت واقعہ ٹین ٹان اور بیرونی اثرات کے عنوانات کے ماتحت ہم نے بیان کی ہیں اور اس اختلاف کو نظر انداز نہ کریں جو دومغان اور قرغز کے درمیان موجود تھا اور ہے۔ ان کی یہ مخالفت کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اس کی ابتدا غالباً یعقوب خاں کے بعد سے شروع ہوئی۔ قرغز، دومغان کو معمولی چینی سے بدتر سمجھتے ہیں اس بنا پر کہ ان میں چینی معاشرت کا اثر زیادہ ہے اور وہ چینیوں کے ساتھ معاملہ کرنے سے پرہیز نہیں کرتے ہیں۔ قرغز اور ترک دونوں میں ترکی رنگ گہرا ہے اور دونغان میں چینی رنگ۔ اگرچہ اس وقت دونغان، ترک اور قرغز سب نے مل کر گورنر جین شوزن کے خلاف شورش کی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان میں اتحاد عمل یا اتحاد مقصد ممکن ہے۔ دونغائیوں کا مقصد چینی ترکستان پر اپنا تسلط جمانا ہے اور قرغز اور ترک افغانستان اور ہندوستان کے ساتھ ملنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس معاملے میں وہ حکومت برطانیہ کی امداد کے بغیر کچھ نہیں کرسکتے۔ اگر انگریزوں سے مدد لے کر اپنے آپ کو چین سے علیحدہ کرنا چاہیں تو دو صورتوں سے خالی نہیں یا تو وہ کامیاب ہوں گے یا ناکامیاب۔ اگر کامیاب ہوئے تو یقیناً چینی ترکستان کی سیاست میں انگریزوں کا اثر غالب ہوگا۔ ایسی حالت میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کا برائے نام استقلال ان کے لئے مفید ثابت

ہوگا۔ 'آزادی' کا مفہوم ہم یہ نہیں سمجھتے کہ کوئی ملک ایک بیرونی حکومت سے علیحدہ ہوجائے اور دوسری بیرونی حکومت کے ماتحت رہے۔ چینی ترکستان میں انگریزوں کا قبضہ ہوجائے تو نہ صرف وہاں کے مسلمانوں کو پھر کبھی اٹھنے کا موقع نہیں ملے گا بلکہ افغانستان کو بھی خطرہ ہے کہ وہ اس کے آہنی پنجے میں اسیر نہ ہوجائے۔ یہ صورت نہ مسلمانوں کے لئے مفید ہوسکتی ہے اور نہ عالم اسلامی کے لئے۔

اور اگر قرغز اور ترک اس تحریک میں ناکام ہوئے یعنی 'کاشغریہ'[1] میں اپنی حکومت قائم نہ کرسکے یا ان کی قائم کی ہوئی حکومت ناپائدار ثابت ہوئی تو انھیں بہت سخت نقصان پہنچے گا۔ دنیائے اسلام غالباً یہ جانتی ہے۔ اس نے موجودہ شورش کے زمانے میں یہ جان لیا ہوگا کہ اس سے قبل یعقوب خاں نے کاشغریہ میں ایک مستقل حکومت قائم کی تھی جو ۱۳ سال تک رہی لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ ان دنوں کانسو اور شانسی کے مسلمانوں میں 'ماہوالونگ' کے زیر قیادت آزادی کی تحریک جاری تھی۔ اس نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور کاشغر میں اپنا اقتدار جمایا۔ اس کے متعلق عالم اسلامی کے سب سے بڑے ذہین مصنف علامہ شکیب ارسلان اپنی کتاب میں یوں لکھتے ہیں: "اگر ماہوالونگ[2] نہ ہوتا تو یعقوب خاں کچھ نہ کرسکتا۔ اس نے جو کاشغر میں ۱۳ سال تک حکومت کی وہ ماہوالونگ کی تحریک کی بدولت تھی۔ لیکن ان تحریکوں کے نتیجے کے متعلق جو ۶۰ سال پہلے اس سرزمین میں اٹھی تھیں علامہ شکیب ارسلان فرماتے ہیں: "وہ بغاوتیں جن کا علم مسلمانوں نے گذشتہ صدی میں بلند کیا ان کے لئے بہت مضر ثابت ہوئیں۔ اس سے ان کی ترقی رک گئی۔ اگر یہ تحریکیں رونما نہ ہوتیں تو حکومت چین میں ان کی آواز بلند ہوتی[3]....."

اگر یہ سوال کیا جائے کہ "آیا چینی ترکستان میں دولت اسلامیہ قائم ہوسکتی ہے؟" تو میرا جواب اثبات میں ہے کیونکہ موجودہ چین کی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر اس کے خلاف بغاوت کرنا بہت آسان ہے اور اس میں

---

[1] کاشغریہ اس علاقے کو کہتے ہیں جو مغربی چینی ترکستان میں واقع ہے۔

[2] حاضر العالم اسلامی، الجزء الاول صفحہ ۱۷۰۔

[3] حاضر العالم اسلامی، الجزء الاول صفحہ ۱۷۸۔

کامیابی کا بھی امکان ہے۔ البتہ یہ یقین نہیں کہ یہ آزاد دولت اسلامیہ زیادہ دن چل سکتی ہے۔ آزاد دولت اسلامیہ سے میرا مطلب ایک ایسی اسلامی حکومت ہے جس میں مسلمان اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں اور کسی غیر قوم کے ماتحت نہ رہیں، نہ وحشی چینیوں کے ماتحت، نہ بالشویکی روسیوں کے، اور نہ ملوکیت پسند انگریزوں کے۔ جب ہم چینی ترکستان کا نقشہ دیکھتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ یہ ملک کوہستان اور صحرا کے درمیان مقید ہے۔ ان کا مخرج یا چین ہے یا روس یا ہندوستان۔ اسلامی سلطنت کے قائم کرنے میں چینی ترکستان کے مسلمان بالشویکی روس سے مدد نہیں لیں گے کیونکہ جب تک وہ مسلمان ہیں یہ بات برداشت نہیں کر سکتے کہ ان کی مسجدیں ناچ گھر یا قمار خانے بن جائیں۔

یہ ہو سکتا ہے کہ انگریز ان کی مدد کریں لیکن اس بات کو طبیعت گوارا نہیں کرتی کہ چینی ترکستان پر انگریزوں کا تسلط ہو اور یہ وہاں کے باشندوں کو اپنا غلام بنائیں۔ حکومت برطانیہ کے ماتحت مسلمانوں کو وہ آزادیاں اور حقوق نہیں مل سکتے ہیں جو انھیں جمہوریت چین کے ماتحت حاصل ہیں۔ چینی حکومت اور مسلمانوں میں کوئی کشمکش نہیں ہے۔ موجودہ شورش بالکل مقامی اور شخصی ہے۔ جن وجوہ سے مسلمانوں کو شکایت پیدا ہو گئی ہے ان کا تدارک کسی اور تدبیر سے ہو سکتا ہے۔

چینی ترکستان میں پائدار دولت اسلامیہ اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک دونغان اور قرغز میں اتفاق اور اتحاد نہ ہو اور دوسرے ممالک اسلام کی حالت سازگار نہ ہو۔ ممالک اسلامی کی موجودہ حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ چینی ترکستان کے مسلمانوں کی کوئی عملی مدد کر سکیں یعنی اسلحہ اور روپیہ پہنچا سکیں۔ ترکی کو اس وقت اپنی ملت کی تعمیر سے فرصت نہیں ہے۔ شاہ نادر خاں کو شاہ امان اللہ خاں کے واپس آنے کا ڈر ہے۔ تونس کے مسلمان برابر "المدد" "المدد" کی صدا "الفتح" "القاہرہ" میں کر رہے ہیں فلسطینی عرب یہودی سیلاب سے بہت پریشان ہیں، ابن سعود کی حکومت مالی پریشانیوں میں مبتلا ہے، جاوا کے مسلمان حکومت ہالستان کے شکنجے میں ایسے دبے ہیں کہ ہل نہیں سکتے۔ رہے ہندوستان کے مسلمان ان کے متعلق میں کچھ نہیں کہتا کہ وہ کس طرف جا رہے ہیں۔ علاوہ اس کے ممالک اسلام کا اس وقت کوئی مرکز نہیں ہے جس پر وہ جمع ہو سکیں اور نہ ان کا کوئی متحدہ مقصد ہے جس کے لئے سب مل کر

سی کریں۔

اگر دونغان اور قرغز میں اتحاد نہ ہوا تو مجھے اندیشہ ہے کہ اس وقت چینی ترکستان میں وہی واقعہ پیش آئے گا جو ۹۰ سال قبل یون نان (yun-nan) کے مسلمانوں کو پیش آچکا ہے۔ گذشتہ صدی میں یعقوب خاں کی بغاوت کے علاوہ صوبہ یون نان میں بھی ایک شورش ہوئی جس کی ابتدا گورنر اور مسلم سرداروں کی مخالفت سے ہوئی تھی۔ یہ ۱۸۵۵ء سے ۱۸۷۳ء تک رہی۔ دو وین شوی یا محمد سلیمان نے چالیس[1] ہزار فوج تیار کرکے ڈالی (Dali) سے خروج کیا اور پایہ تخت یون نان فو (yun-nan-fu) پر حملہ آور ہوا۔ اس وقت چن یوی این (chin yueh yin) یون نان کا گورنر تھا۔ دو وین شوی کامیاب ہونے والا تھا کہ مسلمان سرداروں میں اختلاف ہوگیا۔ آخر بجائے اس کے کہ سب مل کر حکمران پر حملہ کریں آپس میں لڑنے لگے۔ دو وین[2] شوی (Tu wen shui) ایک طرف تھا اور دوسری طرف ماجولانگ (Ma ju lung) تھا۔ ایک نے تو شہر ڈالی کو اپنا مرکز بنایا اور دوسرے نے یون نان فو کو۔ ماجولانگ شاہی فوج کے ساتھ مل گیا اور دو وین شوی نے اپنا نمائندہ بھیج کر انگلستان[3] سے مدد مانگی۔ دو وین شوی کا انگلستان سے مدد مانگنا اس کی ناکامی کا باعث ہوا کیونکہ اس زمانے کی مانچو حکومت گو ظالم تھی اور مسلمانوں کے حقوق کا لحاظ بہت کم کرتی تھی لیکن اسے خود مسلمانوں کی تحریک سے اتنا خوف نہ تھا جتنا کہ انگلستان کی مداخلت سے۔ چنانچہ قبل اس کے کہ انگلستان کی مدد دو وین شوی کے پاس پہنچ سکے، شاہی فوج نے ماجولانگ اور دو وین شوی دونوں کا خاتمہ کرکے اس شورش کا استیصال کر دیا۔ اس بے نتیجہ تحریک میں چینی مسلمانوں کا سب سے بڑا ادیب 'مافوچو' یا حاجی محمد یوسف بھی شہید ہوگیا جسے یونان کے مسلمان اب تک روتے ہیں۔

---

[1] نضارۃ الہلال پیکین جلد پنجم عدد ۷، صفحہ ۱۷۔

[2] حاضر العالم الاسلامی، الجزء الاول، صفحہ ۱۷۹۔

[3] Douglas : China صفحہ ۲۴۵۔

اس واقعے کی بنا پر ہم اس وقت چینی ترکستان کے مسلمانوں کو یہ مشورہ نہیں دے سکتے کہ وہ برطانوی ہند کی مدد سے اپنی مستقل حکومت کاشغریہ میں قائم کریں کیونکہ مغربی ملوکیت اور سرمایہ داری کی حکومت چین کی سخت دشمن ہے۔ اگر عثمان علی خاں جو اس وقت کاشغر کا حکمران ہے انگریزوں سے مدد مانگے تو حکومت چین غالباً ایسی پالیسی اختیار کرے گی جو مسلمانوں کے لئے بہت مضر ہوگی یعنی وہ روس سے مدد لے کر اس شورش کا استیصال کرے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ دونغانیوں سے کہے کہ تم سن کیانگ کے حکمران بن جاؤ۔ اگر یہ صورت پیش آئی تو وہاں کے مسلمان آپس میں کٹ مریں گے۔ کوئی سچا مسلمان ہرگز یہ منظر دیکھنا نہیں چاہتا۔ علاوہ دونغان اور قرغز کے اتحاد کے ہیں نے چینی ترکستان میں آزاد اسلامی حکومت کے قائم رہنے کی شرط ممالک اسلامی کی عملی مدد قرار دی تھی۔ ۶۰ سال قبل جب یعقوب بے نے کاشغریہ میں اپنی سلطنت قائم کرنا چاہی تو دولت عثمانیہ[له] اور خدیو مصر نے اس کو روپیہ اور اسلحہ سے مدد دی تھی اس زمانے میں ممالک اسلامی کا شیرازہ اس قدر منتشر نہ تھا جتنا اب ہے۔ آج کل کوئی اسلامی ملک ایسا نہیں جو عثمان علی خاں کو ایک روپیہ یا ایک بندوق بھی بھیج سکے۔ اگر کوئی امید ہو سکتی ہے تو یہی ہے کہ شائد ایک دن ایسا آئے جب قرغز اور دونغان کے دل میں خدا اتحاد کی برکتوں کا احساس پیدا کر دے۔ دونغان کی بہت سی شاخیں کانسو اور ننگ ہیا میں بھی ہیں۔ کانسو کا خاندان 'ما' (Ma) دونغان ہے۔ ان دو قبیلوں کے ملنے کے معنی یہ ہیں کہ سن کیانگ، کانسو، ننگ ہیا اور چینگ ہائی چار صوبے ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں گے۔ اور اگر ممالک اسلامی بھی ان کی مدد پر ہوں تو چینی مسلمانوں کی آئندہ ریاست صرف کاشغریہ یا سن کیانگ کے اندر محدود نہ رہے گی بلکہ ان چار صوبوں پر مشتمل ہوگی۔

خیر یہ تو آئندہ کی بات ہے مگر موجودہ شورش سے جہاں تک ہم نے غور کیا ہے بالفعل کوئی نتائج حاصل ہونے کا امکان ہے۔ چینی اور غیر چینی اخباروں سے معلوم ہوتا ہے کہ فی الحال جنگی کارروائی تو روک دی گئی ہے لیکن قرغز اور ترک کاشغریہ میں قدم جمانے کی کوشش کر رہے ہیں اور چینی فوج جس

---

[له] الجامعۃ الاسلامیۃ یافا فلسطین مورخہ ۷۔ ۸۔

میں مسلمان اور غیر مسلمان شامل ہیں اروچی، خولجہ اور تاچن سے ہٹائی نہیں گئی ہے اور حکومت نانکینگ نے اپنے اصول اور دستور کے مطابق تحقیقاتی کمیشن بھیجا ہے۔ اس کے بعد غالباً حکومت نانکینگ ایک مسلمان گورنر مقرر کرکے چینی ترکستان بھیجے گی تاکہ مسلمانوں کو کوئی شکایت باقی نہ رہے یا کوئی ایسا چینی گورنر جو اسلامی رسوم سے واقف ہو اور افسروں میں بھی زیادہ تر مسلمان ہی رہیں گے۔ ان دونوں صورتوں میں پورا سن کیانگ حکومت چین کے ماتحت رہے گا لیکن اندرونی انتظامات گورنر اور مسلم افسروں کے ہاتھ میں چھوڑ دیے جائیں گے۔ ایک تیسری صورت یہ ہے کہ اگر قمر غذ اور ترک چینی حکومت سے صلح نہیں کرتے تو چینی ترکستان بالفعل دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ ایک شمالی جو چین حکومت کے ماتحت رہے گا اور دوسرا جنوبی جہاں کئی مسلمان حکمراں الگ الگ حکومت کریں گے، نہ تیمور عثمان علی کے ماتحت رہے گا اور نہ عثمان علی یونس بیگ کے ماتحت۔ یہ حالت کب تک قائم رہ سکے گی اس کے متعلق ہم اس وقت کوئی پیشین گوئی نہیں کر سکتے۔[۱]

---

[۱] اس مضمون کے مکمل ہونے کے بعد یہ خبر ملی کہ جن شوزن کو برطرف کرکے لیو وین لانگ Liu Wen Lung سن کیانگ کا گورنر مقرر ہوا اور تحقیقاتی کمیشن کا صدر وانگ موسنگ Wang mo sung اپنے کام سے فارغ ہو کر نانکینگ واپس آرہا ہے۔

# حضرت ابراہیم علیہ السلام کے شہر کے کھنڈر

## اثری تحقیقات سے طوفان نوحؑ کی تائید

اس وقت تک جو ترقی انسان نے اپنی سواریوں میں کی ہے ان میں سب سے تیز رفتار سواریاں ہوائی جہاز اور موٹر کار ہیں لیکن انسانی تخیل کی پرواز ان سواریوں سے بھی بہت زیادہ تیز ہے ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنے خیال کی تیز رفتاری سے فائدہ اٹھا کر ماضی کو دیکھیں' ان ٹیلوں پر جا کھڑے ہوں جو بابل و نینوا اور بنی عباس کے بغداد سے پہلے کے تمدن کی یادگاروں کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے خاموش ہیں اور ماضی کا قصہ کہنے کے لئے اپنی بے صدا اینٹ اور پتھر سے بولنے والی زبان میں آور[1] قوم کے مفاخر تمدنی بیان کرتے ہیں۔ بابل اور نینوا جو کلدانی اقوام کے تمدن کے چشم و چراغ تھے یہ دونوں شہر آور قوم کے کھنڈروں پر ہی آباد ہوئے تھے۔ آور ان سے پہلے کے تمدن کے مالک اور اسی ملک کے حاکم تھے مشرق میں جب ان کی سلطنت تھی تو دوسری کوئی سلطنت ایسی نہ تھی جو ان سے ہمسری کا دعوےٰ کرتی۔ ہم آج ان اینٹوں اور پتھروں کی زبانی ان کے حالات فراہم کر کے آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

ان ریت کے ٹیلوں اور کھنڈروں پر جب ہم غور کرتے اور ان کو تصور کی عینک سے دیکھتے ہیں تو ہمیں وہ زمانہ یاد آتا ہے جبکہ یہ شہر جو آج کھنڈروں اور ٹیلوں میں پوشیدہ ہے اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نہ صرف عراق بلکہ ایشیا کے بہت بڑے حصۂ ملک پر حکومت کر رہا تھا۔ اس کا مشہور برج زجورات آج بھی پانچ ہزار سال سے زمانے کی گردش کا مقابلہ کر رہا ہے۔ اگرچہ اپنی اگلی خوش نمائی کھو چکا ہے تاہم مضبوطی کے ساتھ اپنی جگہ قائم اپنے بانیوں کی عظمت دنیا کے سامنے ثابت کر رہا ہے۔ اس برج پر پہنچ کر

---

[1] آور' ایک قوم کا نام ہے۔

عجیب قدرت خداوندی کا ظہور ہوتا ہے۔ آسمان سے باتیں کرنے والی چوٹی پر چڑھنے والا انسان دور دور افق تک شہر کے کھنڈروں، ریت کے ٹیلوں کا ایک وسیع میدان دیکھتا ہے۔ اس شہر کی وسعت کا اندازہ کر کے قدیم ترین قوم آور کی عظمت و شوکت کا سکہ اس کے دل پر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ شہر کے آثار حد نگاہ تک دیکھ کر محسوس کرتا ہے کہ اپنے زمانے میں یہ شہر اپنی عظمت و بزرگی میں اس زمانے کے لندن، نیو یارک، پیرس، برلن وغیرہ سے کسی طرح کم نہ تھا۔ آج اس وسیع میدان میں اور اس کے قرب و جوار میں بھی آثار حیات کا کہیں پتہ نہیں ہے، نہ پانی ہے نہ گھاس، نہ کچھ کھانے کو میسر ہو سکتا ہے لیکن پانچ ہزار سال قبل اس جگہ کی یہ حالت نہ تھی۔ یہاں زندگی تھی اور اپنے حقیقی معنوں میں زندگی کے آثار تھے، حرکت تھی اور حرکت ہی حقیقت میں زندگی ہے۔ آج یہ جگہ میدان اور ریگستان ہے لیکن پانچ ہزار برس پہلے یہ ایک زندہ متحرک شہر تھا۔

فرض کرو اگر یہ انقلاب جو آج مشرق میں ہوا اس وقت مغرب میں ہوتا تو کیا ہوتا۔ جس طرح ہم یہاں ریگستان بے آب و گیاہ دیکھتے ہیں اور کسی قسم کے آثار حیات نظر نہیں آتے، غالباً مغرب میں یہ حالت نہ ہوتی۔ یہاں سبزہ ہوتا، چراگاہ ہوتے اور کم سے کم مویشی چرائے جاتے لیکن یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ اب ہمیں اس ویرانے کو دیکھنا چاہئے۔ خلیج فارس کے کنارے پر یہ شہر آباد تھا، کشتی سے بھی سفر کیا جاتا تھا لنگر گاہ شہر کے پاس تھا۔ یہاں قبائل شمر آباد تھے جن کی زبان نہایت سخت اور لہجہ کرخت تھا۔ یہی قبائل اس شہر کے مالک تھے۔ اون، کھالیں، ٹھیکریاں، عمدہ کتابت کے نمونے، جنتری وغیرہ کے نقوش جو اس ویرانے میں مدفون ہیں ان کے آثار وغیرہ پر غور کرنے سے اس قوم کی اعلیٰ معاشرت کا پتہ چلتا ہے۔ آج بھی ہم ان ساحلوں پر اس قوم کے مزدوروں کو نصف برہنہ بکری کی کھالوں کے کرتے پہنے دیکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ روز بروز جو کھدائی کا کام اس شہر کے کھنڈروں میں جاری ہے اور جو جدید آثار یہاں دستیاب ہوتے رہتے ہیں ان سے قوم آور کے حالات روز بروز زیادہ معلوم ہوتے جاتے ہیں جس سے ہماری پچھلی تحقیقات کی تصدیق ہوتی جاتی ہے۔ جن امور کا ہم تصور اور قیاس کرتے تھے ان کی تائید ہوتی ہے۔ روز بروز تحقیقات سے مزید ثبوت فراہم ہوتا جاتا ہے اور ہم قوم آور کی عظمت و شوکت سے واقف ہوتے جاتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوتا جاتا ہے کہ ان کے زمانے میں ان کا تمدن، حکومت، دوسری

دنیا کے مقابلے میں کس پائے کے تھے۔

نقشہ دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ جائے وقوع کے اعتبار سے یہ شہر کس قدر عمدہ جگہ پر واقع تھا۔ دریائے فرات کی، جنوب ومغربی سمت میں جہاں دجلہ آکر ملتا ہے یہ شہر آباد تھا اور اس کے پاس ہی سمندر تھا۔ اب سمندر اس سے دور ہٹ گیا ہے اور زمین نکل آئی ہے۔ سمندر کے پانی کے خشک ہونے اور زمین نکلنے کا عمل رفتہ رفتہ تدریجی طور پر ہوتا رہا ہے۔

علمائے طبقات الارض کا خیال ہے کہ خلیج فارس کی دونوں سمتوں میں جو ممالک ہیں آٹھ ہزار سال قبل یہاں پانی تھا۔ یہ پانی سمٹا، اطراف برآمد ہوئے اور نہایت زرخیز ممالک پیدا ہوگئے چنانچہ عراق عرب بھی اس میں سے ایک ملک ہے۔

توریت کی کتاب تکوین میں جس پانی کے خشک ہونے اور زمین برآمد ہوکر قابل زراعت ہونے کا ذکر ہے وہ یہی مقام ہے۔

بعض ایسی روایتیں جن کی تاریخی شہادت فراہم نہیں ہوئی سنی گئی ہیں کہ جب سمندر کے نیچے سے یہ زمین برآمد ہوئی اور سب سے پہلے یہ خطہ آباد ہوا تو پہلا شہر یہی مقام تھا جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ اسی کے کھنڈروں پر بابل ونینوا آباد ہوئے بلکہ یہی کہا جاتا ہے کہ طوفان نوح کے بعد جو شہر آباد ہوا وہ یہی شہر تھا لیکن علمائے آثار قدیمہ جنھوں نے شہر کے کھنڈروں سے مواد برآمد کر کے تحقیقات کی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس ملک میں جو سب سے پہلا شہر آباد ہوا وہ یہی شہر تھا۔ اس کا ثبوت روز بروز فراہم ہوتا جاتا ہے۔ یہ شہر حقیقت میں شروع میں ایک چھوٹا سا حقیر گاؤں تھا، پھر قصبے کی صورت اختیار کی اور رفتہ رفتہ عظیم الشان شہر ہوگیا قبائل سُمر اس شہر کے مالک اور بانی تھے جو بقول علامہ کرلی سامی اقوام میں سے تھے جو دجلہ اور فرات کے اطراف میں آباد تھیں۔ یہ لوگ فن کتابت سے واقف تھے، زراعت کا پیشہ کرتے تھے اور کان کنی اور دھاتوں کے استعمال سے آگاہ تھے۔ یہ سب چیزیں انھوں نے خود اپنی ذہانت سے معلوم کی تھیں کسی قوم اور قبیلے سے انھوں نے حاصل نہیں کیں بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ فن کان کنی میں کل اقوام کے استاد ہیں انھوں نے شہر، قصبے اور دیہات آباد کیے، فن کتابت سیکھا، اپنے پڑوسی ممالک کو سکھایا۔ فن حرب میں ماہر تھے،

حساب جانتے تھے۔ فرات کے اطراف میں ان کی چراگاہیں تھیں، مویشی پالتے اور فائدہ حاصل کرتے تھے۔
زمانے کے تغیرات ہیں کہ آج یہ جگہ ویران ہے۔ غرض جب پانی اس زمین سے ہٹا اور رفتہ رفتہ یہاں خشکی نمودار
ہوئی تو قبائل شمر نے ان پر قبضہ کیا، چراگاہ بنائی، کاشت شروع کی، شہد کی غرض سے مکھیاں اور دودھ کی
غرض سے مویشی پالے اور رفتہ رفتہ اس ملک میں اس زمانے کے موافق ایک عظیم الشان سلطنت قائم کرلی
جس کی نظیر اس وقت کوئی نہ تھی۔ قبائل شمر نے قانون قدرت کی پیروی کی، اپنی طبیعت کو استاد بنایا،
مفید باتیں حاصل کیں، مضر باتوں سے اجتناب کیا، رفتہ رفتہ ترقی کرتے گئے۔ اس زمانے میں آٹھ دس سال
پہلے قبائل شمر کو کوئی نہیں جانتا تھا سوائے چند علمائے آثار قدیمہ کے کہیں کوئی ان کا ذکر بھی نہیں کرتا تھا۔

لیکن آج قبائل شمر دنیا میں مشہور ہیں۔ تمام وہ لوگ جن کو آثار قدیمہ اور قدیم تاریخی حالات سے
دلچسپی ہے ان کو جانتے ہیں۔ روز بروز ان کے کارنامے علمائے آثار کے ذریعے سے دنیا میں نمودار ہوتے
جاتے ہیں۔ کھدائی کا کام برابر جاری ہے اور وہ ان قبائل کی شہرت میں برابر اضافہ کر رہا ہے۔

ان کی حالت سمجھنے کے لئے کہ وہ کیا تھے فرض کرو۔ آج شمالی امریکہ کسی وجہ سے برباد ہو جائے،
اس کے آثار سب کھنڈر ہو جائیں، دنیا رفتہ رفتہ اس کے تمدن کو بھول جائے۔ اب سے پانچ ہزار برس بعد
علمائے آثار ان کھنڈروں کو کھودیں اور شمالی امریکہ کے تمدن کو دنیا کے سامنے روشناس کریں تو اس وقت اہل امریکہ
کی جو وقعت ہوگی اسی وقعت و عظمت کے ہمارے سامنے آج اہل شمر مستحق ہیں۔

انگریزوں اور اہل امریکہ نے چند وفود ان آثار کی کھدائی کی غرض سے روانہ کئے۔ انھوں نے عجیب
عجیب حالات معلوم کئے اور کثرت سے تاریخی مواد فراہم کیا۔ اثری مہم کے انچارج مسٹر لیونارڈ ہیں۔ سنہ ۱۹۲۳ء
سے یہ کام شروع ہوا۔ تاریخ میں اس کھدائی سے نہایت ضروری اور اہم ترین باب کا اضافہ ہو گیا لیکن
سب سے پہلے یہ کام سنہ ۱۹۲۳ء میں ہی شروع نہیں ہوا بلکہ سنہ ۱۸۵۴ء میں انگریزی حکومت نے مسٹر ٹیلر قنصل بصرہ
کو حکم دیا تھا کہ وہ شہر آور کے کھنڈروں کا پتہ لگائے کیونکہ بعض ایسی تختیاں اس زمانے میں بھی دستیاب ہوئی
تھیں جن میں بعض اہم تاریخی واقعات منقوش تھے۔ ۵۵۰ ق۔م میں کوئی بادشاہ کہیں سے واپس لوٹ کر
برج زجورات میں اپنے تخت پر بیٹھا تھا جب ان الواح کی عبارت روشنی میں آئی تو مہذب و متمدن دنیا

میں ان کی تحقیقات کی طرف توجہ ہوئی۔ تورات جاننے والے لوگوں کو سخت تعجب ہوا جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے اور یہیں وہ واقعات پیش آئے جو توریت میں ان کے متعلق مذکور ہیں۔ مسٹر ٹیلر نے سب سے پہلے یہ امر ثابت کیا کہ یہ ایرک نامی یہودی عظیم کا آباد کیا ہوا شہر جس کے متعلق عرصے سے خیال کیا گیا تھا کہ وہ سوائے عالم خیال کے اور کہیں نہیں تھا ایک زمانے میں عالم وجود میں تھا اور اس کی جائے وقوع یہیں تھی۔ یہودی اور نصرانی شہر آور کے متعلق تین امور میں متفق ہیں:۔

(۱) انسانی تمدن سب سے پہلے باقاعدہ یہاں نمودار ہوا۔

(۲) طوفان کے بعد یہی شہر سب سے پہلے آباد ہوا، اور

(۳) حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اسی شہر میں پیدا ہوئے۔

علماء آثار قدیمہ نے جو مواد کھدائی کے ذریعہ حاصل کیا ہے اور اس پر بحث کی ہے وہ ان امور کی بہت کچھ تائید کرتے ہیں۔ ہم کو بھی اس پر کافی روشنی ڈالنا چاہیے۔

اگر ممکن ہوا تو ہم قوم آور کی ترقی وزوال کے حالات، ان کے زمانے کا تعین اور اس کا ثبوت پیش کریں گے۔ یہ شہر جس کے متعلق اقوام متفق ہیں کہ ایک زمانے میں عالم وجود میں تھا لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ اس کی جائے وقوع کہاں ہے دو ہزار سال تک انسان کے علم سے باہر رہا۔ پھر کیا وجہ ہوئی کہ وہ اس کی جگہ کے صحیح تعین اور پھر اس کی کھدائی سے اپنے خیال کی تصدیق فراہم کر سکا۔ دوسری صدی قبل مسیح کے ایک غیر مشہور مصنف نے جس کا نام یوپولیمس ہے اس شہر کا ذکر کیا تھا، تاہم تاریخ اس کے جائے وقوع کا تعین نہ کر سکی لیکن یہ معلوم ہو چکا تھا کہ یہ شہر دریائے فرات کے کنارے آباد تھا اور اس زمین پر آباد کیا گیا تھا جو سمندر سے نکلی تھی۔ عمر خیام مشہور اسلامی مہندس فلاسفر نے (جو اپنی رباعیات کی وجہ سے زیادہ مشہور ہے) اپنی تحریر میں ظاہر کیا تھا کہ یہ قطعہ زمین ایک تنگ سبزہ زار پر واقع تھا جو زرخیز اور بنجر زمین کے درمیان حد فاصل تھا۔ ان حالات کی بنا پر دریائے فرات کے کنارے یہ زمین تلاش کی گئی جہاں یہ کھنڈر ریت کے ٹیلوں کے نیچے مدفون ہے۔ ہم نے اس کی جگہ مقرر کی کہ ان حالات کی بنا پر یہی جگہ شہر آور کے وقوع کی ہے۔ دریائے فرات پاس ہے سمندر قریب ہے۔ جو زمین سمندر سے نکلی ہوئی ہوتی ہے مقابلتہً دیگر قرب وجوار کی زمین کے

زیادہ سرسبز ہوتی ہے۔ بڑے بڑے دریا جب طغیانی پر آتے ہیں تو آس پاس کے شہر بستیاں سب برباد کر دیتے ہیں یہی کیفیت شہر آور کی کسی وقت فرات نے کر دی تھی۔ پانچ ہزار سال کا زمانہ کافی زمانہ ہے جن جن حکومتوں نے اس درمیان میں اس ملک پر حکومت کی ان کی تاریخوں میں کہیں اس شہر کا ذکر نہیں ملتا۔ قبائل شمر، بابلی، آشوری، ایرانی، یونانی، اترک اپنے اپنے وقتوں میں اس ملک پر حاکم ہوتے رہے لیکن شہر آور کے کھنڈروں کا کہیں کسی نے ذکر نہیں کیا۔ لیکن اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو خیال امور تاریخی کی تحقیقات کی جانب اس زمانے میں ہے وہ قدیم حکومتوں کو نہ تھا۔ دوسری سب سے بڑی بات یہ بھی تھی کہ یہ دریا عرصے تک اسی زمین پر بہتا رہا اور کل شہر کو پانی کے نیچے رکھا۔ رفتہ رفتہ فرات اپنی جگہ سے ہٹا اور یہ زمین برآمد ہوئی۔ یہ عمل چند سالوں میں نہیں ہوا بلکہ ہزاروں اور سیکڑوں سال اس میں صرف ہوگئے۔ اس وقت یہ کھنڈر فرات سے پانچ میل دور جانب شرق واقع تھا۔

اس زمانے میں فرات اپنی جگہ سے تقریباً دس میل ہٹ گیا۔ قدیم زمانے میں جو ملک کا انتظام ہوگا وہ بہت اچھا ہوگا جیسا کہ عموماً دستور ہے لیکن گردش زمانہ کا اثر ہر چیز پر ہوتا ہے۔ آور شہر اور اس کا انتظام بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ نہیں رہا۔ اس کے ارکان نے جیسا چاہیے تھا حفاظت نہیں کی اور ملک تباہ ہوگیا۔ معلوم ہوتا ہے پانچ سو سال قبل مسیح میں یہاں بالکل ویرانی اور تباہی مسلط ہو چکی تھی یہاں بہت تھوڑے لوگ آباد تھے جو فقر و فاقے کی زندگی گزارتے تھے۔ بعد کو یہ لوگ بھی یہاں سے تلاش معاش میں چلے گئے، اور یہ جگہ بالکل ویران ہوگئی سوائے ان کے آثار کے اس ویران حصے میں کوئی ذی حیات باقی نہیں رہا۔ اس ویرانی اور تباہی کا بڑا سبب یہ بھی ہے کہ موسم گرما میں ہفتے کے کم سے کم پانچ دنوں میں سخت ترین آندھی آتی رہتی ہے جو اپنے ساتھ ریت لاتی اور لے جاتی ہے۔ اس زمانے میں آندھی کا مقابلہ میدان میں ناممکن ہوتا ہے۔ آنکھ، کان، ناک، منہ میں ریت گھس جاتی ہے اور انسان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس وقت وہ کیا کرے۔ عقل خبط ہو جاتی ہے اور سمجھ جواب دے دیتی ہے۔ یہ آندھی گرم بھی ہوتی ہے، سانس لینا انسان کے لئے دشوار ہو جاتا ہے۔ تاریکی کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ دن کو اپنا ہاتھ نہیں سوجھتا۔ ہمارے پاس بعض عربی روایات ایسی بھی ہیں کہ قوم عاد اسی طرح آندھی کی نذر ہوگئی اور سب بستی برباد ہوگئی

آج ان کی جائے وقوع اور ان کے آثار کا تعین کہیں نہیں ہو سکتا۔ یہی حالت قوم آد کی ہوئی جس سے قوم عاد کی تباہی کا ثبوت ملتا ہے اور حال معلوم ہوتا ہے اور اس عربی روایت کا بھی کہیں نہ کہیں آثار کے ذریعے کافی ثبوت ثبوت فراہم ہو جائے گا۔

ہم کو اس ملک میں موسم سرما میں اپنے مقفل گھروں کو ہفتے میں تین بار صاف کرنا پڑتا ہے اور باریک ریت بند کمروں میں داخل ہو جاتی ہے تو پھر وہ جگہ جو بالکل کھلی ہوئی ہو جہاں گرمی کی آندھیاں اپنے ساتھ ریت کے پہاڑ لے کر چلیں اور ہفتے میں پانچ پانچ مرتبہ ان کا دور ہو اس کا کیا حال ہو گا۔ ہم نے بعض بعض حالات ایسے بھی دیکھے ہیں کہ ریت نے تمام گھر بند کر دیا یعنی کہ اس کی چھت تک پہنچ گئی جس طرح آج ایک گھر ریت میں بند ہو کر پوشیدہ ہو سکتا ہے اسی طرح ایک ملک، ایک قوم فنا ہو سکتی ہے۔

اس ریت نے ایک فائدہ ضرور پہنچایا کہ آور قوم کے کھنڈر صحیح و سالم برآمد ہوئے، غارتگروں اور لٹیروں نے ان کو تباہ و برباد نہ کیا جس طرح کہ شام و مصر اور خود عراق کے دیگر شہر برباد کر دئے گئے۔ اس شہر کے آثار چار سو سال قبل مسیح میں جس حالت میں تھے اسی حالت میں آج برآمد ہو رہے ہیں زمانے کی دستبرد سے جو چیز فنا ہو گئی وہ تو ہو گئی باقی سب اشیاء بدستور موجود ہیں۔ اس وقت تک جو آثار برآمد ہوئے ہیں ان سے ہم زمانے کا تعین ۵۰۰ ۳ ق۔م سے ۴۰۰۰ ق۔م تک کا کر سکے ہیں جو آثار ہمارے سامنے ہیں ان میں مخطوطے اور دیگر اشیاء بھی شامل ہیں اور اب ہم ان سے اس زمانے کی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں۔

ہمیں قبائل شمر کی زبان کے متعلق بھی کچھ کہنا ہے جس کے بغیر اس زمانے کی تاریخ اور اس کے ماخذ کے سمجھنے میں سہولت نہیں ہو سکتی۔ اہل شمر نہ تو کاغذ استعمال کرتے تھے اور نہ جھلی پر لکھتے تھے نہ درختوں کے پتوں پر جیسا کہ اہل مصر اور شامی ممالک میں اس زمانے میں دستور تھا۔ ان کی تحریر کا دستور بہت سادہ تھا۔ وہ گارا بناتے اور اس کی تختی تیار کرتے جیسے صابون کی مستطیل ٹکیاں آج کل ہوتی ہیں اسی طرح ان کی تختیاں مٹی کی بنی ہوئی ہوتی تھیں۔ پھر کسی سخت قلم سے جیسے لوہے وغیرہ معدنی چیز کے اوزار سے وہ نقش کیا کرتے تھے۔ ابتدائی کتابت اس طرح ہوئی کہ چیزوں کی تصویریں بنایا

کرتے تھے۔ پھر تصویروں سے اصوات و آوازیں پیدا ہو کر ان کی صورتیں بنائی گئیں۔ اس قسم کی الواح مٹی کی دستیاب ہوئی ہیں اور ان پر اپنے اپنے زمانے کے نقوش ہیں۔ پھر صورتوں سے حروف اور حروف سے الفاظ بنائے گئے۔ ایسے الفاظ جن میں ایک سے زیادہ حروف شامل تھے وہ لکھے گئے۔ غرض اسی طرح اہل شمر کی زبان میں سب سے پہلے کتابت عراق میں ہوئی۔ اسی اصول پر سامی زبان سب سے پہلے مرتب ہوئی۔ سامی اقوام نے اسی طرح لکھنے کی ابتدا کی اور حرفوں سے لفظ اور لفظوں سے جملے بنائے۔ یہ زبان عرصے تک ان ممالک میں مروج رہی۔

یہ تمام اصول کتابت وغیرہ بابلیوں سے پہلے ہی مرتب ہو چکے تھے۔ اولیت کی جو فضیلت ہم اہل بابل کو دیتے تھے اس سے غالباً اب وہ محروم ہو چکے ہیں۔ یہ تحریر اور یہ زبان زمانے کے تغیر کے ساتھ ساتھ متغیر ہوتی ہوئی اس وقت تک قائم رہی کہ اس دنیا میں عبرانی اقوام ظاہر ہوئیں اور انھوں نے ابجد کے مطابق حروف و الفاظ ترتیب دیے۔ لیکن اہل بابل و نینوا کا طرز کتابت عرصے تک وہی رہا جو شمریوں کا تھا۔ جو کتابیں اشبال کے خزانے سے برآمد ہوئے ہیں ان سے اسی قسم کی کتابت پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ کتابیں اشوری اقوام نے نینوا میں جمع کیے تھے اور اس کا زمانہ ۶۰۰ ق۔م ہے۔ ان کتابوں سے ہم ۱۵۰۰ ق۔م کی تاریخ پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ ان کی تائید علمائے افلاک نے بھی کی ہے۔ اس طرح علمائے آثار قدیمہ اور علمائے فلکیات نے اپنی اپنی جگہ پر جو تحقیقات کی اس سے دونوں ایک ہی نتیجے پر پہنچے اور اس کا خلاصہ ہم ناظرین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:-

"قوم آور کی جو زیادہ سے زیادہ تاریخ ہم تعین کر سکتے ہیں وہ ۲۱۰۰ ق۔م ہے۔ اس سنہ میں بادشاہ مس انی پدا نامی تخت سلطنت پر بیٹھا تھا۔ یہی پہلا بادشاہ تھا جو قوم آور میں تخت نشین ہوا۔ اس بادشاہ کی تخت نشینی کی تاریخ ہم نے جملہ علمائے آثار کے اتفاق سے قائم کی ہے، اس میں زیادہ سے زیادہ سو برس کی غلطی ممکن ہے کہ سو سال قبل ہو یا سو سال بعد، اس سے زیادہ غلطی کا احتمال نہیں۔ مس انی پدا سے قبل کے بھی برتن اور بعض تمدنی سامان دستیاب ہوا ہے جو ۳۵۰۰ ق۔م کا ہے اور اس پر اس زمانے کے حکمراں خاندان کے نام بھی منقوش ہیں لیکن علما اس پر یقین نہیں کرتے۔ ان کے نام صاف و واضح

نہیں ہو سکے۔ ان کی حقیقت ابھی تک اسی طرح پوشیدہ ہے جس طرح ان آثار کی کھدائی سے قبل تھی۔ اس لئے ہم اس مضمون کو مس انی پدا کی تخت نشینی ہی سے شروع کریں گے اور اس مضمون میں ۲۵۰۰ ق۔م تک کے حالات ہی سے بحث کریں گے۔ اس زمانے میں قبائل شمر کی تمدنی حالت یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ نہایت اچھے صناع تھے۔ ڈھلائی کے کام میں ماہر تھے اور خنجر، خود اور بت بناتے تھے۔ ان کے سونے کے برتن، مختلف آلات وغیرہ جو دستیاب ہوئے ہیں وہ ان کی قوت ایجاد اور کاریگری پر دلالت کرتے ہیں۔ تقریباً پانچ سال ہوئے ایک جگہ کھدائی کے موقع پر ایک خنجر برآمد ہوا جو ان کے بادشاہ مس کلم دغ نامی کا تھا جس جگہ یہ خنجر برآمد ہوا اسی جگہ ۵۰ ٹکڑے سونے کے بھی ملے تھے۔ ان پر مٹی نے اس طرح اثر کر رکھا تھا کہ ان کی حقیقت نہیں معلوم ہو سکتی تھی۔ لیکن جب ان کو بالکل صاف کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان کے نقوش اطالوی فن کے عہد کمال سے زیادہ بہتر اور خوشنما ہیں۔ مس انی پدا کے زمانہ کے بعد ۲۵۰۰ ق۔م تک ہم کوئی ایسی چیز نہیں دیکھتے جس سے اس زمانے کی تاریخ مرتب ہو سکے۔ لیکن اس درمیان میں جو اہم واقعات پیش آئے وہ ظاہر کئے جاتے ہیں۔ ۲۹۰۰ ق۔م میں قوم آور ایشیا کے اکثر ممالک سے تجارتی تعلقات رکھتی اور وہاں آتی جاتی تھی۔ جو جواہرات عراق میں نہیں ہوتے تھے وہ دیگر ممالک سے لائے گئے تھے اور یہاں کی قیمتی اشیاء معاوضے میں دی گئی تھیں۔ اس وقت سونا، چاندی، تانبا، عقیق، لاجورد دیگر ممالک سے آئے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قوم آور فن تجارت میں کافی دست گاہ رکھتی تھی۔ اپنے ملک کی پیداوار دوسری ممالک کو لے جاتی اور وہاں سے قیمتی پیداوار اور مفید اشیاء لاتی تھی۔ جن ممالک سے ان کے تجارتی تعلقات ثابت ہوتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں: ایشیاء کوچک، شام، ایران، کوہ قاف، افغانستان اور ہندوستان وغیرہ۔ قدیم تاریخ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ۲۹۰۰ ق۔م کے قریب قوم آور کی کسی ایشیائی سلطنت سے جنگ ہوئی تھی جس میں قوم آور کو ایسی شکست ہوئی کہ مس انی پدا کے خاندان سے حکومت جاتی رہی۔ علمائے آثار اس کی تحقیقات کی طرف کامل انہماک سے متوجہ ہوئے۔ انھوں نے کھدائی کے ذریعے قوم آور کے وہ منڈر دریافت کر لئے جو بابلی لشکروں نے تباہ و برباد کر دئے تھے اور آج تک ان کے کھنڈر موجود ہیں۔ جس طرح ایک ورق کے بعد کتاب کا دوسرا ورق ہوتا ہے اسی طرح ان آثار کا حال ہے۔ قدیم آثار کے اوپر ان کے بعد

والے زمانے کے آثار ہیں۔ سب سے قدیم آثار سب کے بعد دستیاب ہوتے ہیں۔

بابلیوں کے آثار سے قبل جو آثار ہیں وہ قوم آور کے ہیں کیونکہ اہل بابل نے ان کی حکومت فنا کر کے اپنی حکومت قائم کی تھی چھ سو سال تک یہ قوم مغلوب رہی۔ ان کی عمارتوں اور مندروں سے مغلوبیت کے آثار نمایاں ہیں۔ بمقابلہ ان کے فاتحین کی عمارات کے ان کی عمارتیں پست اور ذلیل ہیں اور غلامی کا ثبوت دے رہی ہیں۔ لیکن ۲۳۰۰ ق۔م میں یہ قوم اس غلامانہ پستی سے باہر نکلی اور پھر اپنی سلطنت قائم کی۔ کامل آزادی کے بعد ترقی کرنا شروع کیا جو تمام آزاد اقوام کا خاصہ ہے اور آزادی کے بغیر کوئی قوم بھی دنیا میں ترقی نہیں کر سکتی۔ یہ کلیہ ہے جس کو زمانہ ہمیشہ سے ثابت کر رہا ہے اور کرتا رہے گا۔ قوم آور نے آزادی کے بعد اپنی گذشتہ عظمت و شوکت بہت جلد حاصل کر لی۔

واقعہ یہ ہوا کہ آور ماموا ایک حاکم تھا جس کا وہ مشہور خنجر ہے جو حال میں اس کے مدفن سے برآمد ہوا ہے اور ہم اس کا ذکر کر چکے ہیں۔ اس نے آور قوم کو دوبارہ زندگی بخشی اور خود بادشاہ ہوا۔ اس نے آور سلطنت کے استقلال کے بعد اس کے تمدن اور معاشرت کی طرف توجہ کی اور ان کو انتہائی ترقی پر پہنچایا۔ اس کے بادشاہ ہونے کے بعد اس قوم کے عجیب عجیب عمرانی کارنامے ظاہر ہوئے۔ اس نے اپنا نام بادشاہ اقوام شمر رکھا اور اپنے لقب میں اس کا بھی اظہار کیا کہ ملک آور کی چاروں آباد سمتوں میں اس کی شہنشاہی ہے۔ یہ بات بھی ظاہر کی کہ خلیج فارس سے بحر متوسط تک وہی مطلق العنان شہنشاہ ہے اور اس نے یہ عظیم الشان سلطنت محض اپنی قوت بازو اور اپنے لشکر کی کوشش و جانفشانی سے حاصل کی ہے جیسا عام طور سے دستور ہے کہ فاتحین اپنے رہنے کے مقامات کو مضبوط اور ناقابل تسخیر بنایا کرتے ہیں اسی طرح اس بادشاہ نے بھی اپنے شہر کی فصیل اسی طرح بنائی تھی جس طرح قیصر قسطنطین نے شہر روما میں بنائی تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ قیصر نے مٹی سے تعمیر کی ہوئی فصیل کو چونے کی عمارت میں تبدیل کر دیا اور بادشاہ آور ماموا نے شہر آور کی فصیل پختہ اینٹ اور مٹی سے بنائی تھی۔ اس فصیل کے دیکھنے سے اس بادشاہ کی عظمت و شوکت اور حسن مذاق کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ فصیل بھی ان ٹیلوں کے نیچے سے کھدائی میں برآمد ہو چکی ہے۔ جو ہم اس کھدائی کے کام پر بھیجی گئی تھی اس کا بڑا کام وسط شہر کی کھدائی کرنا اور معلومات حاصل کرنا تھا۔ چنانچہ کام کے

پہلے ہی سال میں انھوں نے ایک مندر کی فصیل کے آثار معلوم کرلیے ہیں۔ یہ مندر اس شہر کا سب سے بڑا مندر سمجھا جاتا ہے۔ یہ مستطیل ہے تین چوتھائی میل لمبائی میں اور چوتھائی میل چوڑائی میں۔ جس قدر کمرے اور مقامات اس مندر میں دریافت ہوئے ہیں سب میں چاند دیوتا کی پرستش کی جاتی تھی جس کا نام ان کی زبان میں دنار، تھا یا اس کی زوجہ کی جو ین جال سے موسوم تھی، پرستش ہوتی تھی۔ لفظ ین جال کے معنی ان کی زبان میں سیدہ عظیمہ کے تھے۔ شہر آور کی یہ خصوصیت ہے کہ وہاں چاند کی نقرئی شعاعیں اتنی صفائی سے ضیا پاشی کرتی ہیں کہ باریک حروف کی کتابت بھی آسانی سے پڑھی جاسکتی ہے۔ جب تحقیقات کرنے والے یہ منظر دیکھتے ہیں تو ان کے لئے یہ سمجھنا دشوار نہیں ہوتا کہ اسی خصوصیت کی وجہ سے آور قوم میں عبادت قمر کا جذبہ پیدا ہوا ہوگا۔ اسی دور میں جبکہ قوم آور مفتوح حالت میں تھی مشہور اور مضبوط ترین برج زجورات نامی تیار ہوا۔ اس کے پاس ہی کھجور کے باغات تھے اور چاند دیوتا کا مندر۔ گمان ہے کہ اس برج اور مندر کے پاس یا اس کے کسی حصے میں شاہان قدیم کے خزائن یا دیگر اندوختہ دستیاب ہو۔ اس کا فیصلہ مستقبل میں ان مہم والوں کے اعمال پر منحصر ہے۔ جب ۲۱۷۰ ق۔م میں بادشاہ ایپی سن خاندان آور بامو کے آخری تاجدار کو عیلامیوں نے گرفتار کرکے سلطنت آور کا دفعۃً خاتمہ کردیا۔ اس وقت شہر بابل آباد کیا گیا جس نے آور قوم کے عام آثار اور اعلام کو چھپا دیا۔ خاندان عموری اس پر حکومت کرنے لگا۔ یہ لوگ سامی غربی اقوام میں سے تھے۔ اس قوم نے اپنے زمانے میں انتہائی ترقی کی یہاں تک کہ قرب وجوار میں ان کے مقابلے کا کوئی بادشاہ نہ تھا۔ آور قوم مفتوح ہوچکی تھی، وہ عراق کے مختلف حصص میں پھیل گئی اور گمنامی کی زندگی گزارنے لگی۔ اس کے بعد قبائل شمر کا وجود تاریخ میں بحیثیت ایک حاکم اور زور بازو قوم کے نہیں ملتا۔

۱۹۲۸ء میں مہم والوں نے متمدن دنیا کو مطلع کیا تھا کہ عجیب وغریب انکشافات ہوئے ہیں اور آور کی تاریخ کے لئے نہایت عمدہ مفید مواد فراہم ہوا ہے لیکن وہ مواد سونے کی تختیاں یا ہتھیار وغیرہ نہیں ہیں جیسا کہ پہلے بادشاہوں کے حالات میں ذکر کیا جاچکا ہے۔ مگر مٹی کے روغنی برتن، صندوقچوں کی کاریگری، دیگر سامان اور اس قسم کی بہت سی چیزیں اس عہد کی جو دستیاب ہوچکی تھیں، اندازہ کیا گیا ہے کہ ۳۵۰۰ ق۔م زمانے کی ہیں۔ یہ آثار شمریوں کے آثار سے بھی بالکل مختلف ہیں جو اس ملک میں بعد میں

آباد ہوئے اور یہاں کے تمدن کو ترقی پر پہنچایا۔ یہ آثار مٹی کے ایک یکساں طبقے کے نیچے مدفون تھے جس کی دبازت ہر جگہ برابر تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ طبقہ ایک ہی زمانے میں دفعۃً دفن ہو گیا تھا۔ کئی طبقات کے ملنے سے یہ شکل پیدا نہیں ہوئی تھی اور ایک ہی طبقے کے دستیاب ہونے کا واضح مفہوم یہ ہے کہ بلاشبہ اسی طوفان عظیم کا نتیجہ ہے جس نے طوفان سے پہلے کے تمدن کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس لئے یہ قیاس بھی کیا جا رہا ہے کہ وہ طوفان جس کا ذکر تورات میں ہے وہی ہے جس کا اندیشہ دجلہ و فرات کے درمیانی شہروں میں درپیش تھا جس میں ہر سال طغیانی آتی تھی اس لئے گمان غالب یہ ہے کہ مٹی کا یہ مدفون طبقہ انھیں قدیم مقامی طوفانوں کا نتیجہ ہو گا۔

جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں اس میں شک نہیں رہتا کہ یہ وہی طبقہ ہے جو اس مشہور طوفان میں دفن ہو گیا تھا مگر جو دلائل ہمارے پاس موجود ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ جو طوفان اس طبقے کے دب جانے کا باعث ہوا۔ وہ وہی طوفان ہے جس کا ذکر کتاب تکوین میں ہے اور وہی طوفان ہے جو بعد میں تورات کے عقیدے میں عالم گیر طوفان بن گیا جس کو ہم طوفان نوح کہتے ہیں جس کے دلائل حسب ذیل ہیں:-

(۱) یہ آثار جو اب دریافت ہوئے ہیں وہ ان سے بھی قدیم ترین آثار ہیں جو قوم آور کے کھنڈروں میں اس وقت تک دستیاب ہو سکے ہیں۔ جو مٹی اور ریت آثار پر سے ہٹایا گیا ہے وہ دوسرے آثار کے مقابلے میں زیادہ قدیم معلوم ہوتا ہے۔

(۲) جس نوع کا تمدن اس طوفان میں تباہ ہو گیا اس کے آثار پھر قوم آور کے تمدن میں نہیں پائے گئے۔ قبل از طوفان تمدن کی امتیازی خصوصیات میں خاص قسم کی مٹی کے رنگین برتن ہیں جو بعد میں کہیں استعمال نہیں کئے گئے۔

(۳) ان آثار سے اوپر جو آثار ملے تھے ان میں اور قدیم ترین آثار میں بین فرق ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ قدیم آثار ان سے بھی نیچے دفن ہیں اور اس کے بعد کے اس کے مقابلے میں کم گہرائی میں دفن ہیں۔

یہ آثار جو قدیم ترین آثار کے مقابلے میں جدید کہے جا سکتے ہیں قوم شمر کے آثار ہیں۔ یہ قوم فن کتابت

سے واقف تھی اُس میں طوفان کی روایات مشہور تھیں اور ان کی کتابوں میں طوفان کا ذکر موجود ہے۔ یہ وہی طوفان ہے جو توراۃ کے سفر تکوین میں بیان کیا گیا ہے۔

طوفان کے خیال سے انھوں نے عمارتیں مضبوط بنائی تھیں اور فن تعمیر پر خاص توجہ رکھتے تھے چنانچہ برج زجورات کو بھی اسی خیال سے مضبوط بنایا تھا۔ ان آثار سے خصوصاً ان بابلی مٹی کی تختیوں سے جو خود صاحب کشتی کی لکھی ہوئی دستیاب ہو چکی ہیں ہم اس نتیجے پر ضرور پہنچتے ہیں کہ طوفان نوح اور یہ طوفان بہت کچھ مماثلت رکھتے ہیں۔ بہت ممکن ہے یہ ثابت ہو جائے کہ یہ طوفان جس کا ثبوت یہاں فراہم ہو رہا ہے وہی طوفان ہو جو طوفان نوحؑ کے نام سے عالم میں مشہور ہے۔ اس کشتی بان کا نام ناپستم لکھا گیا ہے۔ یہ نام نوحؑ کے مقابلے میں ہے اور اس کا بیان توراۃ کی عبارت سے کس درجہ مشابہ ہے۔

## لوح کی عبارت

چھ دن اور چھ رات سخت آندھی چلتی رہی جو رفتہ رفتہ خطرناک صورت اختیار کر گئی زمین پر طوفان آ گیا۔ ساتویں روز دن نکلتے پر آندھی بند ہوئی سمندر ساکن ہوئے، طوفان رک گیا۔ انسانوں کی جو جنگ ہوا اور پانی سے ہو رہی تھی بند ہو گئی۔ مجھے زمین نظر آئی میں نے روزہ رکھا۔ انسان کیچڑ اور گیلی زمین کی طرف لوٹنے کے لئے بیتاب تھے سوائے میدان کے کوئی چیز نہیں دکھائی دیتی تھی۔ کھیت صاف پڑے ہوئے تھے۔ مقدس نور میرے چہرے پر پڑ رہا تھا۔ راستہ نظر آنے لگا۔ ساتویں روز ایک کبوتر کو لیا اور کشتی سے اس کو چھوڑا لیکن اس کو کہیں زمین نہیں ملی کہ وہ اس پر قیام کر سکتا اور لوٹ آیا۔ پھر میں نے ایک کوے کو چھوڑا وہ گیا اور جہاں پانی اتر چکا تھا اور زمین برآمد ہو رہی تھی وہاں جا کر اس نے کچھ کھایا، آواز دی اور واپس نہیں ہوا۔ میں نے قربانی کی جس کی خوشبو مقدس معبود کو پہنچی۔ اس کی رحمت نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔

---

یہ عبارت اور کتاب تکوین توراۃ کی عبارت کس قدر مشابہ ہے۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے اگر ہم

اس قابل ہو جائیں کہ دونوں طوفانوں کو ایک ثابت کر سکیں۔ عبارت الفاظ اور واقعہ سب ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔ جو الفاظ دلدل گیلی زمین اور میدان کے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں وہ عراق کی ان زمینوں پر مستعمل ہیں جو مابین النہرین واقع ہیں۔ پھر پانی کا اترنا گرمی کی شدت مکھیوں کا ہجوم ان واقعات نے اس بیان کو کس قدر واضح اور ثابت کر دیا۔

---

# غزل

نالۂ دل اثر انداز نہیں ہے تو نہ ہو
لب ہلا لیتا ہوں آواز نہیں ہے تو نہ ہو

شکر کرتا ہوں ابھی حسرت پرواز تو ہے
اب اگر طاقت پرواز نہیں ہے تو نہ ہو

حسن اور عشق میں جذبات وہی ہیں موجود
کوہکن سا کوئی جاں باز نہیں ہے تو نہ ہو

نگہِ یاس سے افسانۂ دل کہہ دوں گا
پُر اثر گر مری آواز نہیں ہے تو نہ ہو

وہ تو افسانۂ دل غور سے سن لیتے ہیں
خلق اگر گوش بر آواز نہیں ہے تو نہ ہو

نظر اپنی ہے فقط تیرے کرم پر ساقی!
در توبہ بھی اگر باز نہیں ہے تو نہ ہو

راز ہی راز ہے جو کچھ بھی ہے معلوم ہمیں
اور دنیا میں کوئی راز نہیں ہے تو نہ ہو

آنکھوں آنکھوں میں تو ہے سلسلۂ ناز و نیاز
گفتگو ہوتی ہے آواز نہیں ہے تو نہ ہو

حسن کی ذات سے نسبت ہے یہی کیا کم ہے
عشق خود باعث اعزاز نہیں ہے تو نہ ہو

رہنمائی دلِ پر شوق کرے گا میری
کوئی غربت میں جو دمساز نہیں ہے تو نہ ہو

ہم تو حال غم دل اپنا کہے جائیں گے
وہ اگر گوش بر آواز نہیں ہے تو نہ ہو

دل تو میرا نگہ ناز کی جانب ہے حمید
دل کی جانب نگہ ناز نہیں ہے تو نہ ہو

---

# جذبات مجذوب

| | |
|---|---|
| سنبھل کر ذرا تیز گامِ محبت | مقامِ ادب ہے مقامِ محبت |
| مرے سامنے لو نہ نامِ محبت | چھلک جائے گا ہائے جامِ محبت |
| ارے اک نظر اس طرف بھی خدارا | بپاسِ مروت بنامِ محبت |
| زباں سے وہ کچھ بھی کہے جائیں مجھ کو | نگہ دے رہی ہے پیامِ محبت |
| نہ ہوگا ابد تک بھی پورا نہ ہوگا | مرا قصۂ ناتمامِ محبت |
| ٹھہر یادِ جاناں ٹھہر میرے دل میں | یہی ہے یہی ہے مقامِ محبت |
| زر و مال و عزت دل و جان و ایماں | ہبہ کر چکا ہوں بنامِ محبت |
| کہاں ان کی بزمِ طرب کے ہوں قابل | میں شوریدہ سر تلخ کامِ محبت |
| محبت کے بدلے محبت ستم ہے | نہ لے اف نہ لے انتقامِ محبت |
| چڑھیں دار پر یا چڑھیں طور پر ہم | رسائی سے بالا ہے بامِ محبت |
| یہ تھا کون غارت گرِ دین و ایماں | ارے لے لیا کس نے نامِ محبت |
| ازل ابتدا ہے ابد انتہا ہے | نہ صبحِ محبت نہ شامِ محبت |
| بہت دور پہنچا ہے مجذوب پھر بھی | بہت دور ابھی ہے مقامِ محبت |

---

# تنقید و تبصرہ

## کتب :-

تاریخ شاہجہاں پور | مولفہ جناب مولوی محمد صبیح الدین صاحب شاہ جہاں پوری تقطیع ۲۶×۲۰، ضخامت ۵۱۵ صفحات، کتابت و طباعت متوسط کاغذ معمولی قیمت اور ملنے کا پتہ درج نہیں، غالباً جناب مصنف سے شاہ جہاں پور محلہ گگرا خورد کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

یہ شاہ جہاں پور کی بہت مفصل تاریخ ہے۔ اور جناب مولف نے اسے نہایت محنت اور سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔ کتاب کے پہلے حصہ میں انھوں نے ہندوستان کی قدیم تاریخ پر اختصار کے ساتھ نظر ڈالی ہے۔ پھر شاہ جہاں پور کی تاریخ ابتدا سے آخر تک بیان کی ہے۔ اس میں انھوں نے اس شہر کی بنا اور بانی کے حالات، یہاں کی مشہور قدیم و جدید مشہور عمارتوں وغیرہ کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ دوسرے حصہ میں شاہ جہاں پور کے علما، مشائخ، حکما، قراء، اصحاب فنون لطیفہ، رؤسا، خواتین کے حالات ہیں، شعرا کے حالات ہیں، ان کے کلام کا انتخاب بھی درج ہے۔ غرض ہر حیثیت سے یہ اس شہر کی ایک مکمل تاریخ اور جناب مولف کی ہمہ گیری اور وسعت معلومات کی شاہد ہے۔ تاریخی حالات کے بیان کرنے میں انھوں نے حتی المقدور احتیاط سے کام لیا ہے۔ کتاب کے پہلے حصہ میں کہیں کہیں موجودہ سیاسی مسائل کا بھی ذکر آگیا ہے ایسے موقعوں پر ان کے خیالات بہت بے لاگ ہیں، کتاب کی زبان بھی بہت صاف و سلیس اور رواں ہے کتاب کے شروع میں جناب معین الدین صاحب شاہ جہاں پوری کا مقدمہ اور آخر میں جناب مولانا شرف الدین صاحب افصحی ٹونکی کی تقریظ بھی شامل ہے۔

---

انیس و دبیر کے پانچ مرثیوں کا مجموعہ | مرتبہ نظامی صاحب بدایونی، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم (۹،۱×۶×۴×۱۵) ۱۴۴ صفحے، لکھائی چھپائی کاغذ معمولی، قیمت عہ، ملنے کا پتہ نظامی پریس بدایون۔

ان میں تین مرثیے میر انیس کے ہیں جن کے مطلعے حسب ذیل ہیں۔

(۱) جب رن میں سربلند علی کا علم ہوا۔

۲۔ بخدا فارس میدان تہور تھا حُرؑ۔

۳۔ پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح۔

اور دو مرزا دبیر کے ہیں۔

۱۔ پیدا شعاع مہر کی مقراض جب ہوئی۔

۲۔ گلگونہ رخسار فلک گرد ہے رن میں۔

یہ پانچوں مرثیے مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب اردو میں داخل ہیں، نظامی صاحب نے طلبہ کی آسانی کے لئے ان کا مجموعہ ایک علیحدہ کتاب کی صورت میں شائع کر دیا ہے۔ آپ اس سے قبل میر صاحب کے مراثی بڑے اہتمام سے تین جلدوں میں شائع کر چکے ہیں جس کی تصحیح حضرت نظم طباطبائی مرحوم نے کی تھی۔ موجودہ مجموعہ میں بھی صحت کا خیال رکھا گیا ہے۔ گو کتابت کی بعض غلطیاں ہوگئیں اور ان کی وجہ سے صحت نامہ کی ضرورت پڑی۔ کتاب سے پہلے تب کا مختصر دیباچہ ہے، اس کے بعد مرثیے کی تعریف اور اس کا مفہوم، اور میر انیس اور مرزا دبیر کے مختصر حالات زندگی بیان کئے گئے ہیں، آخر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ اور اشخاص کے ناموں کی تشریح ہے۔ یونیورسٹی کے طلبہ کے علاوہ عام طور شائقین ادب کے لئے یہ مجموعہ ایک بیش بہا تحفہ ہے۔

---

**محشرستان** | (شائع کردہ مکتبہ عہد آفریں۔ حیدرآباد دکن تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۲۲۵ صفحے لکھائی چھپائی اوسط درجہ کی، کاغذ عمدہ، قیمت مجلد عا، غیر مجلد عہ)

یہ حضرت محشر عابدی کے بارہ افسانوں کا مجموعہ ہے، دو ایک افسانے تاریخی ہیں، باقی خیالی افسانہ نویسی کا جو معیار آجکل اردو میں ہے، اس کے لحاظ سے حضرت محشر صف اول میں جگہ پانے کے مستحق ہیں، آپ کے ان افسانوں کی زبان عام طور پر ستھری اور رواں ہے۔ اور اسلوب بیان زور دار

اثر سے خالی نہیں۔ قصہ کی ساخت اور ترتیب، سیرت نگاری وغیرہ میں سب افسانے یکساں نہیں ہیں اور یہ قدرتی بات ہے، کیوں کہ ان میں سے بعض بہ قول مولف غیر زبانوں سے ماخوذ ہیں، بعض ترجمہ ہیں۔ اور بعض طبع زاد ہیں۔ یہ بڑی فروگذاشت ہے کہ اپنے اور پرائے افسانوں میں تفریق نہیں کی گئی اس لئے یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ مولف کی طبیعت اور تخیل افسانے لکھنے کے لئے زیادہ مناسب ہے یا اخذ اور ترجمہ کے لئے۔ بہرحال اکثر افسانے ادبی اور فنی حیثیت سے قابل قدر ہیں، خدا کرے حضرت جوش ملیح آبادی کی یہ امید صحیح ثابت ہو جو انہوں نے کتاب کے تعارف میں ظاہر کی ہے کہ مولف ایک دن وہاں پہنچ جائیں گے، جہاں ہر بڑا افسانہ نویس پہنچ کر رہتا ہے۔

---

**روح ادب** | مولفہ سید حیدر عباس صاحب حیدر بی اے منشی فاضل رام نگر اسٹیٹ بنارس تقطیع چھوٹی حجم ۵۰ صفحے، لکھائی چھپائی، کاغذ عمدہ، قیمت ۸؍

اس چھوٹے سے رسالہ میں ان اغلاط کی تصحیح کی گئی ہے جو اردو بولنے والوں میں عام طور پہ رائج ہیں، یہاں تک کہ پڑھے لکھے لوگوں کی زبان پر بھی چڑھ گئی ہیں، بعض لفظوں کی تصحیح کے ساتھ ان کے معنی کی تشریح بھی کر دی گئی ہے۔ مولف نے نہایت مفید کام انجام دیا ہے، مگر کتاب کا نام ضرورت سے زیادہ بلند آہنگ ہے۔ اور قیمت بھی کچھ زیادہ ہے۔

---

**بچوں کا قاعدہ** | مرتبہ عبد الغفار مدہولی، شائع کردہ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، تقطیع ۲۰×۳۰/۸ حجم ۴۰ صفحے، کاغذ اور چھپائی عمدہ۔ لکھائی نہایت نفیس، تصاویر رنگین اور سادی اوسط درجے کی قیمت صرف چار آنے ۴؍۔

بچوں کو اردو کی الف، بے پڑھانا غالباً طریق تعلیم کا سب سے مشکل مسئلہ ہے، شکر ہے کہ اب قابل اور تجربہ کار معلم اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، موجودہ قاعدہ میں مروجہ طریق صوت کو کہانی کے طریقے کے ساتھ ملا کر بچوں کے لئے بڑی آسانی پیدا کر دی گئی ہے۔ یہ قاعدہ

جامعہ ملیہ کے ابتدائی مدرسہ میں پڑھایا جارہا ہے۔ اور بہت کامیاب ثابت ہوا ہے ہمیں امید ہے کہ مکتب کے مدرس اور وہ سب لوگ جو بچوں کو الف بے پڑھانا چاہتے ہیں، اس قاعدے کو منگا کر آزمائش کریں گے، کیا عجب کہ وہ اس کی مدد سے اپنے اور بچوں کے وقت میں کفایت کرسکیں، اور بہت سی بیکار محنت اور الجھن سے بچ جائیں، اس کے ساتھ ایک ۴۰ صفحے کا چھوٹا سا رسالہ، "رہنمائے قاعدہ" کے نام سے بھیجا جاتا ہے جس میں قاعدہ کو پڑھانے کا وہ طریقہ درج ہے جس کا تجربہ جامعہ ملیہ میں کیا گیا ہے۔ رہنمائے قاعدہ کی قیمت ۳ ہے اور یہ بھی مکتبہ جامعہ ملیہ سے مل سکتا ہے۔

---

**حیات نو** یہ حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت کا سہ ماہی تعلیمی اور ادبی رسالہ ہے، پہلے نمبر کو دیکھ کر یہ امید ہوتی ہے کہ اگر مالی دشواریاں نہ پیش آئیں تو یہ رسالہ اسکولوں کے سب تعلیمی سالوں سے سبقت لے جائے گا۔ نظم اور نثر کے ۲۲ مضامین ہیں جن میں مولانا حالی، مولوی وحید الدین سلیم، حضرت حفیظ جالندھری، حضرت جوش ملیح آبادی کی نظمیں ہیں، خواجہ غلام الحسنین صاحب اور شیخ بدر الاسلام صاحب کے متعدد مقالے ہیں، چند طالب علموں کے مضمون ہیں، کچھ لطیفے، کھیل معمے، نوٹ، خبریں، خصوصاً حالی مسلم ہائی اسکول کی خبریں ہیں۔ غرض بڑی سائز کے ۴۶ صفحوں میں ایسا رنگا رنگ اور دلچسپ مسالہ جمع کردیا گیا ہے کہ بے اختیار مدیر کے حسنِ ذوق اور حسنِ انتخاب کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ صرف ایک چیز بہت بے تکی ہے اور وہ پہلے صفحہ پر جلی قلم سے انسپکٹر مدارس اور ڈپٹی کمشنر کا شکریہ ہے محض اس بات پر کہ ان دونوں حضرات نے رسالہ کی اشاعت کی اجازت دے دی۔ یوں تو پوسٹ ماسٹر، مہتمم مطبع، کاتب، سنگ ساز، ہشین مین اور بہت سے لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہئے تھا، جنھوں نے اپنا فرض اسی طرح ادا کیا جیسے انسپکٹر صاحب اور ڈپٹی کمشنر صاحب نے، تعجب ہے کہ سالانہ چندہ کہیں درج نہیں، غالباً منیجر صاحب سے معلوم ہوسکتا ہے۔

---

**روح تعلیم** | ایک پندرہ روزہ تعلیمی رسالہ ہے جو کلکتہ سے مرزا سجاد علی خاں اختر بی اے، بی ٹی (علیگ) کی ادارت میں انگریزی اور اردو میں شائع ہونا شروع ہوا ہے، پہلے نمبر میں ۲۰×۳۰/۸ تقطیع کے ۲۴ صفحے ہیں جن میں سے ۱۶ صفحوں میں اردو کے اور ۸ صفحوں میں انگریزی کے اچھے خاصے مفید مضامین ہیں۔ جو قریب قریب سب مدیر کے لکھے ہوئے ہیں سالانہ چندہ پانچ روپیہ اور ایک پرچہ کی قیمت ۵؍ ہے، مدیر روح تعلیم دہلی پنجابی اسکول نمبر ۵۔ فیرس لین کلکتہ سے مل سکتا ہے۔

---

**نقیب پندرہ روزہ** | مدیر صغیر احسن صاحب ناصری۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۸، ۸ صفحات، قیمت سالانہ چندہ عا، مقام اشاعت پھلواری شریف ضلع پٹنہ،

یہ اخبار پندرہ روزہ اخبار امارت کا نعم البدل معلوم ہوتا ہے، جو امارت شرعیہ صوبہ بہار کا ترجمان تھا، اس کی پالیسی مضامین کی ترتیب، تہذیب و شائستگی سنجیدگی، متانت غرض ہر چیز وہی ہے جو جریدۂ امارت میں تھی، اس اخبار کی کامیابی کے لئے ہم دل سے دعا کرتے ہیں۔

---

**مقدمہ تاریخ ہند قدیم، جلد اول** | مصنفہ اکبر شاہ خانصاحب نجیب آبادی تقطیع ۲۰×۲۶/۸، حجم ۲۱۲ صفحے قیمت عہ، ملنے کا پتہ۔ منیجر مکتبہ عبرت، نجیب آباد۔

فاضل مصنف کے علمی ذوق سے اردو زبان اور ہندوستان کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات بخوبی واقف ہیں، اس مقدمہ کی تصنیف کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف ہندوستان کی نہیں بلکہ تمام دنیا کی قدیم تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔ اور اس میں بہت سے ایسے مسائل پر بحث کی گئی ہے جو پرانے زمانے کا حال پڑھتے ہوئے خیال میں آتے ہیں۔ فاضل مصنف نے اس میں چند مباحثے بھی شامل کر دیے ہیں، جو ان کے اور ان کے علم دوست احباب کے درمیان خط و کتابت کے ذریعہ سے ہوئے، اور اس سبب سے ایک بے تکلفی سی پیدا ہو گئی ہے جو کتاب کو اور بھی دلچسپ بنا دیتی ہے۔

لیکن ہماری رائے میں اس کتاب کی علمی وقعت بہت زیادہ ہو جاتی اگر فاضل مصنف نے اپنے موضوع کو زیادہ محدود رکھا ہوتا، اور ایسے مسائل کو جیسے انسانی عمر کا پیمانہ جن پر محض وقت گذارنے کے لئے گفتگو کی جا سکتی ہے، علمی حیثیت دینے کی کوشش نہ کی ہوتی۔ مضمون کی ترتیب یا تو صحیح نہیں یا ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر پہلے اٹھارہ باب خارج کر دئے جائیں۔ تو اصل کتاب کو کوئی نقصان ہوگا۔ لیکن مضامین کے انتخاب میں فاضل مصنف نے ممکن ہے ایسے لوگوں کی دلچسپی کا لحاظ کیا ہو جن سے وہ واقف ہیں اور جن کے مذاق کا ہم کو کچھ علم نہیں۔ دیباچے اور کتاب کے دوران میں بھی فاضل مصنف نے اپنے ذاتی معاملات کا بہت ذکر کیا ہے، اور یہ بات ہمیں ایک علمی تصنیف میں مناسب معلوم نہیں ہوتی، ہر مسئلے میں خیال ہوتا ہے کہ فاضل مصنف اپنے خاص احباب سے مخاطب ہیں، اور وہ ہر مسائل کے انھیں پہلوؤں پر بحث بھی زیادہ کرتے ہیں، جن پر کسی دوست سے خط و کتابت گفتگو ہوتی ہے۔

اکثر مقامات پر بحث کی طوالت سے خاصی الجھن ہوتی ہے۔ اور جہاں مختلف علما اور مورخین کے اقوال بیان کئے گئے وہاں تو عقل گم ہو جاتی ہے، ہمارے نزدیک مصنف کا فرض یہ ہے کہ وسیع مطالعے کے باوجود اپنی رائے بھی رکھے، اور اگر دوسروں کی رائے یا ان کے اقوال بیان کرے تو اس طرح سے کہ پڑھنے والے کے لئے ان کا سمجھنا اور بھی آسان ہو جائے، کسی مسئلے پر پچاس آدمیوں کی رائے الگ الگ لکھ دینا اس مسئلہ کو حل کرنا نہیں بلکہ اور الجھا دینا ہے۔ جو شخص معاملہ کو خود سمجھتا ہے اور دوسروں کو سمجھانا چاہتا ہے وہ یہ طریقہ اختیار نہیں کرتا، اگر پچاس آدمیوں کے خیالات بیان کرنا ضروری ہوں تو انھیں کسی خاص ترتیب اور مفصل تشریح کے ساتھ بیان کرنا چاہئے۔ اگر مطالعے کی وسعت ہی ظاہر کرنا ہو تو آخر یا شروع میں کتب حوالہ کی فہرست دینا بہت زیادہ مفید ہوتا ہے۔

ان اعتراضات سے ہمارا مطلب صرف یہ ہے کہ یہ تصنیف علمی تحقیق اور علمی طرز بیان کا اچھا نمونہ نہیں ہے۔ لیکن ان لوگوں کے لئے جو زیادہ دقیق علمی بحث سے گھبراتے ہیں، یہ تصنیف بہت مناسب ہے، اکبر شاہ خاں صاحب بہت سلیس زبان لکھتے ہیں، اور کتاب میں بہت سے مسائل ایسے ہیں جنھیں خالص تاریخی بحث میں تو شامل نہ کرنا چاہئے تھا، لیکن وہ اکثر اردو داں حضرات کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

# دنیا کی رفتار

## ہندوستان

اوائل مئی میں مہاتما جی نے قید خانے سے نکلتے ہی قائم مقام صدر کانگریس کو یہ مشورہ دیا کہ وہ تحریک نافرمانی کو چھ ہفتے کے لئے ملتوی کر دیں چنانچہ ایسا ہی ہوا، مگر اس مدت کے گذرنے پر بھی مہاتما جی کے جسم پر ورزے کا اثر باقی تھا اور وہ کسی مجلس شوریٰ میں شریک نہیں ہو سکتے تھے، اس وجہ سے تحریک چھ ہفتے کے لئے پھر ملتوی کی گئی، اور یہ اعلان ہوا کہ وسط جولائی میں کارکنان کانگریس کا ایک نجی جلسہ ہوگا جس میں یہ طے ہوگا کہ آئندہ کیا کیا جائے۔ مہاتما جی کے پاس ان کی رہائی کے بعد ہی لوگوں کے خطوط آنے لگے تھے، کہ تحریک نافرمانی کو ملتوی کر دینا چاہئے، اور کوئی دوسری صورت نکالنی چاہئے مہاتما جی کوئی فیصلہ اس وقت تک نہیں کرنا چاہتے تھے جب تک وہ ان لوگوں سے جو مختلف صوبوں میں کانگریس کا کام کر رہے تھے مشورہ نہ کر لیتے، بایںہمہ اخبارات میں یہی خبر گرم تھی کہ تحریک نافرمانی باحسن وجوہ ختم کر دی جائے گی۔

۱۲ جولائی کو پونا میں جلسہ ہوا جس میں مختلف صوبوں کے تقریباً دو سو کارکن موجود تھے پہلے تو مہاتما جی نے لوگوں کو مدعو کرنے کی غرض و غایت بتائی جو یہ تھی کہ وہ صحیح طور پر اندازہ کرنا چاہتے کہ قوم تحریک کو جاری رکھنے کے لئے تیار ہے یا نہیں اور عام طور پر آئندہ لائحہ عمل کے متعلق لوگوں کے کیا خیالات ہیں۔ چنانچہ انہوں نے یہ درخواست کی کہ ہر صوبہ کا ایک نمائندہ اپنے صوبہ کی کیفیت بیان کرے دو دن تک یہ سلسلہ جاری رہا اور مقرر پر مقرر کھڑا ہو کر یہی کہتا تھا کہ کام کرنے والے تھک گئے ہیں، آدمی نہیں ملتے، تحریک نہیں چل سکتی، خصوصاً بمبئی کے کارکن تحریک کو ملتوی کر دینے پر بہت زور دے رہے تھے۔ انہوں نے یہ تو نہیں کہا کہ وہ لوگ تھک گئے ہیں بلکہ ان کی

تقریروں سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ کانگریس کے موجودہ مطمح نظر سے بمبئی کی مزدور جماعت کے دلوں
میں کوئی جوش نہیں پیدا ہوتا، اور وہ موجودہ حالات میں تحریک میں شریک نہیں ہونا چاہتے۔
اس لئے ان کا خیال تھا کہ تحریک کو جو دم توڑ رہی ہے۔ تھوڑے دنوں میں بالکل مردہ ہو جائے
گی، اپنے ہاتھوں ہی سے دفن کر دیا جائے۔ اور کوئی دوسری صورت ایسی نکالی جائے۔
جس سے مزدور اور کسان کانگریس میں جوش وخروش کے ساتھ شریک ہو جائیں اس
کی صورت ان کے خیال میں صرف یہ ہو سکتی تھی کہ کانگرس کا مطمح نظر بدل دیا جائے، اور بجائے
اس کے کہ ایک مبہم اور غیر متعین مقصد پیش نظر ہو، جیسا کہ آج کل ہے، ایک ایسا لائحہ عمل تیار کیا جائے
جس کا بڑا عنصر کسانوں اور مزدوروں کی حالت کا سدھارنا ہو، آجکل کانگریس میں زمینداروں اور
کارخانوں کے مالکوں کا اثر بالواسطہ یا بلا واسطہ اتنا بڑھا ہوا ہے کہ کسانوں اور مزدوروں سے
اس میں شرکت کی توقع بالکل بیکار ہے۔ ان کی مدد اور حمایت حاصل کرنے کے لئے جس تبدیلی کی
ضرورت ہے وہ ان لوگوں کے خیال میں اسی وقت ممکن ہے جب تحریک نافرمانی ملتوی کر دی جائے اور
ٹھنڈے دل سے نئے لائحہ عمل پر غور کیا جائے۔

دوسرے صوبوں کے نمائندوں میں سے بھی ایک دو کے یہی خیالات تھے لیکن عام طور پر
لوگ یہی کہتے رہے کہ ۳۲ء کی تحریک بغیر تیاری کے شروع کر دی گئی تھی اور کام کرنے والوں میں
اب بالکل دم نہیں رہا ہے، تیسرے دن مہاتما جی نے ایک طویل تقریر کی جس میں شروع سے آخر
تک لوگوں کے جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی گئی تھی، اس تقریر کا مضمون یہ تھا کہ جب تک حکومت
ہند سے کوئی سمجھوتا نہ ہو جائے تحریک نافرمانی کو ملتوی کرنے میں بڑی ذلت کا سامنا ہے۔ یہ معلوم کرنے
کے بعد عام طور پر قوم تحریک میں جوش کے ساتھ شریک ہونے کے لئے تیار نہیں ہے انہوں نے یہ تجویز
پیش کی کہ بجائے جماعتی نافرمانی کے انفرادی نافرمانی رائج کی جائے۔ اور جو لوگ مناسب سمجھیں خود
اپنی ذمہ داری پر حکومت کے قوانین کی نافرمانی کریں اس طرح بات بھی رہ جائیگی اور جو لوگ تھک گئے
ہیں۔ ان کو آرام کرنے کا موقع بھی مل جائے گا، اس تقریر کا تو اتنا زیادہ اثر نہیں پڑا لیکن اس کے

بعد جو تقریر پنڈت مالوی جی نے کی اس سے لوگ بہت متاثر ہوئے، انھوں نے سرے سے اسی بات سے انکار کیا کہ قوم تھک گئی ہے اور یہ دعویٰ کیا کہ جتنے آدمیوں کی ضرورت ہوگی وہ فراہم کریں گے انھوں نے مہاتما جی کی انفرادی نافرمانی کی تجویز کی بھی مخالفت کی اور یہ کہا کہ کسی قسم کی تبدیلی شکست کی مرادف ہوگی، وہ یہ چاہتے تھے کہ اگر حکومت سے کوئی سمجھوتا نہ ہو تو جماعتی نافرمانی کی تحریک پھر شروع کی جائے۔ مالوی جی جیسی مشہور اعتدال پسند کی زبان سے اس قسم کی پرجوش تقریر سنکر بھلا کار کنان کانگریس کے گرم خون میں کیوں کر نہ جوش آتا نتیجہ یہ ہوا کہ جب رائے لی گئی تو نہ تو تحریک کے التوا کی تجویز منظور ہوئی اور نہ انفرادی نافرمانی کی بلکہ کثرت آرا سے یہ طے پایا کہ حکومت سے سمجھوتا نہ ہونے کی صورت میں جماعتی نافرمانی پھر شروع کی جائے، اس کے بعد مہاتما جی کو اس کی اجازت دی گئی کہ وہ وائسرائے سے غیر مشروط ملاقات کی درخواست کریں، اور ممکن ہو تو ایسے سمجھوتے کی کوشش کریں جس سے کانگریس کے وقار کو ٹھیس نہ لگے۔

اس طرح تمام اخبارات کی پیشین گوئیوں پر پانی پھر گیا۔ اور ایسا فیصلہ ہوا کہ جس کی کسی کو توقع نہ تھی، اس جلسہ کی کارروائی میں ایک بات یہ عجیب وغریب تھی کہ تحریک کی التوا کے موافق زیادہ تر نوجوان تھے، اور مخالف زیادہ تر بوڑھے۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ بڈھوں کا خون ٹھنڈا ہوتا ہے اور نوجوانوں کا گرم، اس لئے بادی النظر میں یہ معلوم ہوگا کہ اس جلسہ کے شرکا سے متعلق یہ قاعدہ کلیہ غلط ثابت ہوا لیکن واقعہ یہ نہیں ہے بلکہ اس عجیب وغریب صورت حال کی وجہ کچھ اور ہے۔ کانگریس کے وہ رہنما جو اب بوڑھے ہوگئے ہیں اس دور کی یادگار ہیں جب ملک میں سیاسی بیداری کا نام ونشان نہ تھا، اور اس کی ضرورت تھی کہ لوگوں کے جذبات کو طرح طرح سے ابھارا جائے۔ ان رہنماؤں نے پچھلے پندرہ سال کے عرصہ میں دوسروں کے جذبات کے ابھارنے کی جو کوششیں کیں ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود بھی جذبات کے بندے ہوگئے، اب ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آجکل کے نوجوانوں کے دلوں میں اس قسم کے جذبات پیدا ہی نہیں ہوتے جن سے خود ان لوگوں کے دل معمور ہیں، محض کانگریس کا نام یا اس کی ساکھ رکھنے کی خواہش نوجوانوں کو اتنی نہیں

ہے جتنی بوڑھوں کو۔ بوڑھوں کا تمام تر سرمایہ ماضی کے کارنامے ہیں۔ اور نوجوانوں کی زندگی اب شروع ہوئی ہے، نوجوانوں کا میدان عمل مستقبل ہے ان سے پارینہ بتوں کی پرستش کی توقع باطل ہے، آجکل کے نوجوانوں میں اشتراکیت کی ہلکی سہی لیکن ایک لہر ضرور دوڑ رہی ہے، اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جنھوں نے اشتراکیت کے نظریوں پر ہر ہر پہلو سے غور کیا ہو، لیکن ان کے جذبات کو اگر کوئی چیز ابھارتی ہے تو وہ اشتراکی حکومت کی خواہش ہی، یہ خواہش ابتدائی حالت میں ہی اور ابھی تک ایک دھندلی خواب کی سی کیفیت رکھتی ہے، لیکن اتنا ضرور ہے کہ پرانی تحریکوں اور پرانے رہنماؤں کا اثر نوجوانوں کے دلوں سے کم ہوتا جاتا ہی۔ کانگریس میں نوجوان شریک ہیں ان کی بھی کم وبیش یہی کیفیت ہے اور یہی وجہ ہی کہ انھیں موجودہ تحریک نافرمانی سے اتنا لگاؤ پیدا نہیں ہوتا ہے جتنا ان بوڑھوں کو جن کا سرمایہ حیات یہی تحریک ہی۔

پونا کانفرنس کے اس فیصلہ کے بعد گاندھی جی نے وائسرائے کو ایک تار دیا جس میں غیر مشروط ملاقات کی درخواست کی تھی اور ملاقات کا مقصد صلح کے امکانات پر گفتگو کرنا بیان کیا تھا، وائسرائے نے اس وقت ملاقات سے انکار کر دیا۔ جب تک مہاتما جی تحریک نافرمانی کو فسوخ نہ کر دیں وہ ستیاگرہی ہیں اور ان کو صلح کے لئے ہاتھ بڑھانے میں عار نہیں لیکن حکومت ہند سے جو سراسر جبر وتشدد پر مبنی ہے یہ توقع کرنا کہ وہ ایسے وقت میں جب تحریک نافرمانی نزع کی حالت میں ہے کسی اخلاقی یا روحانی اثر سے متاثر ہو کر صلح کے لئے پیش قدمی کرے گی ایک امید موہوم سے زیادہ نہیں۔ ۱۵ر جولائی کو وائسرائے کا انکاری جواب مل گیا تھا لیکن چونکہ تحریک نافرمانی یکم اگست تک ملتوی کی جاچکی تھی اس لئے کسی فوری کارروائی کی ضرورت نہیں سمجھی گئی اور لوگ پونا کے فیصلہ پر غور کرنے اور آئندہ کے لئے تیاری کرنے کے لئے اپنے اپنے مرکز پر پہنچ گئے، گاندھی جی نے بھی احمد آباد کا رخ کیا اور اپنے آشرم سے قریب ہی قیام فرمایا۔ اپنی ایک قسم کی وجہ سے وہ آشرم میں قیام تو نہ کر سکے لیکن دن کا بیشتر حصہ ان کا آشرم میں ہی گذرتا تھا چند دنوں کے بعد یک بیک یہ خبر شائع ہوئی کہ مہاتما جی نے اپنے آشرم کو بند کر دیا، اور اسکی

وجہ انھوں نے یہ بیان کی کہ تحریک نافرمانی کی وجہ سے بہت سے لوگوں کی تمام جائداد تلف ہوگئی ہے
اور چونکہ میرے پاس سوائے آشرم کے اور کوئی جائداد مادی نہیں ہے اس لئے میں اسے خود ہی بند کرتا
ہوں، دو تین دن کے بعد یہ معلوم ہوا کہ یہ محض پیش بندی تھی، اور آشرم والوں سے مہاتماجی کوئی
اور کام لینا چاہتے تھے، تجویز یہ تھی کہ اپنے آشرم کے ان افراد کے ساتھ جو تیار ہوئے مہاتماجی پاپیادہ
بڑدولی کے تعلقے کا دورہ کرنا چاہتے تھے، اور ان کا مقصد ان کسانوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار تھا۔ جو تحریک
نافرمانی میں بالکل تباہ ہوگئے تھے حسب معمول انھوں نے حکومت کو اپنے اس ارادے کی اطلاع دیدی
تھی چنانچہ روانہ ہونے سے پہلے ہی وہ اور ان کے ۳۴ ساتھی گرفتار کرلئے گئے، یہ گویا انفرادی نافرمانی
کی وجہ تھی، مہاتماجی کو دوسرے روز پولیس پونا لے گئی لیکن وہاں پہنچتے ہی ان کو اس حکم کے ساتھ رہا کر
دیا کہ وہ ایک مخصوص علاقے سے باہر لیکن پونا کے حدود کے اندر قیام کریں، انھوں نے اس حکم کی نافرمانی
کی اور ممنوعہ علاقے کے اندر ہی بیٹھے رہے چنانچہ رہائی کے ایک گھنٹے بعد ہی پھر گرفتار کرلئے گئے، مقدمہ
عدالت میں پیش ہوا، اور ایک سال کی سزائے قید ملی اسطرح تین مہینے کی آزادی کے بعد مہاتماجی پھر
اپنے پرانے مسکن، یرودا جیل میں پہنچ گئے۔

الغرض نافرمانی کی تحریک کا اثر ملک میں بہت ہی خفیف نظر آتا ہے مشہور کانگرسی رہنماؤں میں
سے ابھی صرف سریجت راجگوپال اچاری اور مسٹر آنے اس سلسلہ میں گرفتار ہوئے ہیں، کانگرس کے
کارکنوں میں سے شاید مشکل سے ایک سو آدمیوں نے اب تک اس نافرمانی میں حصہ لیا ہوگا، بظاہر کوئی
امید معلوم نہیں ہوتی، کہ اس سے زیادہ جوش کا اظہار کیا جائے گا۔ کانگرس والے کچھ تو تھکے ہارے ہیں۔
کچھ کاونسلوں میں جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اور نوجوان کانگرسی کچھ اور ہی خواب دیکھ رہے ہیں، اگرچہ
ابھی تک نہ تو کاونسل میں جانے والوں نے کوئی عملی قدم اٹھایا ہے اور نہ نوجوانوں نے، لیکن وہ دن دور نہیں
ہے جب دو جماعتیں دو مختلف وجوہ کی بنا پر کانگرس کی موجودہ راہ سے الگ ہو کر اپنے لئے نئی راہیں
ڈھونڈیں گی، کون کہتا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اور سیاسی تحریک کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔

# ممالکِ غیر

**معاشی کانفرنس** جولائی کے پرچے میں ہم نے ان مسائل کا تذکرہ کیا تھا جن کے حل کرنے کے لئے دنیا کے ۶۶ ملکوں کے نمائندے لندن میں جمع ہوئے تھے، ساری دنیا کی نگاہیں اس کانفرنس پر لگی ہوئی تھیں، اور امید تھی کہ معاشی کساد بازاری کو ختم کرنے کے لئے شاید دنیا کے مدبّروں کی یہ متحدہ کوشش کوئی راہ نکال سکے گی، لیکن کانفرنس شروع ہوئی اور ختم بھی ہوگئی، بین الاقوامی تعاون پر قومی خودغرضی غالب آئی، معشیت عالم کے جاں بلب مریض کو روبصحت کرنے کے لئے ضرورت تھی کہ اس کے جسم میں اعتماد باہمی کے خون کی پچکاری دی جاتی، سب معالج اس پر متفق ہوئے مگر کوئی تندرست قوم نہ ملی جس کے جسم سے یہ خون لیا جاتا، سب کے خون میں خودغرضی اور شبہ کے جراثیم بھرے پڑے تھے، چنانچہ ۶۶ قوموں کے ۱۶۸ نمائندے لندن میں جمع ہوئے اور مختصر روداد یہ ہے کہ۔ نشستند، گفتند و برخاستند۔

ناظرین کو یاد ہوگا کہ ۱۹۲۷ء میں بھی تمام دنیا کی ایک معاشی کانفرنس جینوا میں ہوئی تھی۔ اس کانفرنس اور اس کانفرنس کے ارکین کی فہرست پر نظر ڈالیئے تو معلوم ہوجائے گا کہ اس چھ سال میں معاشی دنیا انفرادی آزادی سے ہٹ کر قوم پرستی کی طرف کس تیزی سے بڑھی ہے۔ پہلی کانفرنس میں بڑے بڑے ساہوکار، کارخانوں کے مالک اور تاجر تھے اور اس دوسری میں حکومتوں کے نمائندے، پہلی کانفرنس کی ساری کارروائی کا خلاصہ یہ تھا کہ معاشی زندگی میں تنگ قوم پرستی کا غلبہ سخت مضرتیں پیدا کر رہا ہے اور عالمگیر تجارت میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کرتا ہے، اسے جہاں تک ہوسکے ہٹانا چاہئے، دوسری کانفرنس میں حکومتوں کے نمائندے اپنے اپنے ملک کے فائدے کے لئے تجاویز لے کر آئے تھے اور جب یہ دوسروں کو پسند نہ ہوئیں تو خود اپنی قومی معشیت کو کافی بالذات بنانے اور ہوسکے تو دوسروں کو نیچا دکھانے کا تہیہ کرکے واپس گئے ہیں پہلی کانفرنس کی قراردادیں شرمندۂ عمل نہ ہوسکی تھیں، دوسری کانفرنس سے جو لوگ بچھڑے

ہیں وہ اپنے اپنے ملک کو فوجی جنگ میں نہ سہی معشیت کے تباہ کن معرکوں میں ضرور مبتلا کر سکیں گے۔

کانفرنس کے شروع ہونے سے دو مہینے پہلے مسٹر میکڈانلڈ امریکہ تشریف لے گئے تھے بظاہر ان میں اور صدر جمہوریت میں جو گفتگو ہوئی وہ بہت حوصلہ افزا تھی، مسٹر میکڈانلڈ میٹھی میٹھی باتیں کرنے میں استاد کامل ہیں۔ خیال تھا کہ ان کے امریکہ تشریف لیجانے کا نتیجہ یہ ضرور ہوگا کہ امریکہ قرضۂ جنگ کے معاملے کو بھی اس کانفرنس میں یکسو کردے گا، لیکن میٹھی باتوں سے تو آموز بہلتے ہیں، امریکہ اپنی ضد پر اڑا رہا کہ اس کانفرنس کو قرضۂ جنگ کے مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں، اور میکڈانلڈ نے افتتاحی تقریر میں قرض کا ذکر کیا تو امریکی نمائندے سخت برہم ہوئے۔ کانفرنس شروع ہونے کے دوسرے دن برطانیہ نے امریکہ کو ۱۷ کروڑ کی قسط کی جگہ ایک کروڑ ڈالر قرضہ کے حساب میں ادا کئے، دوسرے ملکوں نے بھی اس کی تقلید کی چنانچہ ۱۵ جون کو جو قسطیں واجب الادا تھیں ان میں ۸ فیصدی ادا ہوئیں اور وہ بھی سونے کی جگہ چاندی دے کر۔ اگرچہ قرضداروں کے سر سے ۱۵ جون کا خوف یوں آسانی ٹل گیا لیکن قرض کا قصہ ابھی باقی ہی اور اس قسط کا ایک جزو ادا کرکے برطانیہ اور اکثر ممالک نے قرض کے وجود کو پھر تسلیم کرلیا ہے۔

ادائے قرض پر اس شدید اصرار نے کانفرنس کی فضا تو پہلے ہی دن سے بگاڑ دی اور پھر آخر تک کسی کے سنبھالے نہ سنبھلی۔

برطانوی وزیر مال نے قرضہ جنگ اور قیمتوں کے اتار کو دنیا کی موجودہ بد حالی کی وجہ بتلایا۔ تو امریکہ کے نمائندے مسٹر ہل نے معاشی قوم پرستی اور بیجا محاصل کو اس کا ذمہ دار گردانا یہ عجیب بات تھی کہ امریکہ کا نمائندہ ادھر قوم پرستی کی برائی کر رہا تھا اور ادھر امریکہ میں ایک ایسے قومی معاشی منصوبہ کی تکمیل ہو رہی تھی، جس کا مقابلہ اگر کیا جاسکتا ہے تو روس کی اشتراکی یا اٹلی کی فاشستی معیشت سے، ساری معاشی زندگی پر صدر کو نہایت وسیع اختیارات دے دئے گئے ہیں۔ اور وہ قیمتوں پر، اجرتوں پر، اوقاتِ کار پر، وسعتِ کاروبار پر، ان اختیارات سے

پورا پورا اثر ڈال رہا ہے ۔ اور رفتہ رفتہ امریکہ کی معاشی زندگی آزاد انفرادی سرمایہ داری سے ایک منظم ریاستی اور پابند قومی معشیت کی شکل اختیار کرتی جاتی ہے ۔

یہ دورخی امریکہ نے پہلے دن سے اختیار کی تھی ۔ مسٹر ہل جو کانفرنس کر امریکی نمائندوں کے سردار تھے ۔ قوم پرستی کے سخت مخالف اور بین الاقوامی تجارت کو پابندیوں سے چھڑانے کے بڑے حامی تھے ۔ ادھر صدر جمہوریہ کے مشیر خاص پروفیسر مولی قومی معشیت کو بین الاقوامی تجارت پر فوقیت دے رہے تھے ، امریکہ چاہتا یہ تھا کہ پروفیسر مولی کی بات مان کر گھر کی حالت درست کرے ۔ ڈالر کا تعلق سونے سے کاٹ کر ڈالر کی قدر مبادلہ گھٹائے یعنی امریکہ میں مال کی قیمت بڑھائے ، تاکہ قیمتوں کے بڑھنے سے کاروبار کو فروغ ہو ۔ بین الاقوامی تجارت میں بھی امریکہ کا حصہ اس طرح بڑھے کہ ڈالر کی قدر مبادلہ کم ہونے سے دوسرے ممالک کے لوگ امریکہ سے مال خریدیں ۔ دوسری طرف مسٹر ہل کی رائے دنیا کے سامنے پیش کرا کر اپنے مال کے لئے دنیا میں منڈیاں پیدا کرے ، اور قرضہ جنگ کے دباؤ سے دوسرے ممالک میں اپنی تجارت کے لئے رعایتیں حاصل کرے ۔

یورپ کے ممالک کو اصرار تھا کہ قرضہ کا قصہ ختم کرو ، اور ڈالر کی قیمت کو کسی ایک نقطے پر قائم کرو ۔ تاکہ ہم بھی تو کچھ دم لے سکیں ، لیکن جس طرح مدت سے ان معاملات پر سمجھوتا نہیں ہوا اس کانفرنس میں بھی نہ ہو سکا ۔ اور کیسے ہوتا جب امریکہ اپنی فکر میں تھا اور برطانیہ اپنی نوآبادیوں سے مل کر ساری دنیا کے مقابلے میں اپنی ایک علیحدہ معاشی دنیا بنانے کی تدبیریں کر رہا تھا ۔

چنانچہ قومی خود غرضیوں کے اس طوفان میں امید کی کشتی غرق ہو گئی ، اور اب جو باقی رہا ہے وہ یہ کہ گیہوں پیدا کرنے والے بعض ملک مل کر یہ کوشش کر رہے ہیں کہ رقبہ کاشت کو کم کر کے گیہوں کی قیمت بڑھائیں ۔ اور اس معاملہ میں بھی امریکہ کی یہ دھمکی پہلے سے موجود ہے کہ اگر باہمی سمجھوتے سے بات طے نہیں ہوئی تو ہم اپنے بے حساب ذخیرۂ گندم کو یورپ میں کوڑیوں کے مول بیچیں گے ۔

**جرمنی اور آسٹریا** ان دونوں ملکوں میں ایک ہی قسم کے لوگ بستے ہیں، زبان ایک ہی، تمدن ایک، ظاہر ہے کہ دونوں میں اس کی خواہش ہوگی کہ مل کر ایک متحد ریاست بن جائیں، جو دنیا میں المانی مشن کی علم بردار ہو، لیکن تمدنی اور لسانی اعتبار سے جو تجویز پسندیدہ ہے وہ اب تک سیاسی اور عملی وجوہ سے ناقابلِ عمل رہی ہے، اور تاریخ میں یہ اس حقیقت کی تنہا مثال نہیں کہ اعلیٰ تمدنی مصالح پر ادنیٰ عملی دشواریاں غالب آجاتی ہیں۔

جب بسمارک جدید جرمن ریاست کی بنیاد ڈال رہا تھا، تو آسٹریا ایک ذرا سے اشارے پر اس میں شریک ہونے کو تیار تھا۔ لیکن بسمارک نے یہ اشارہ بھی نہ کیا، اس لئے کہ آسٹریا کیتھولک ہے۔ اور بسمارک نہیں چاہتا تھا کہ بویریا اور رہائن کے خطے کے کیتھولک عنصر کو جرمن ریاست میں اور تقویت پہنچے، وہ پروٹسٹنٹ پروشیا کو جرمن ریاستوں کا سردار بنانا چاہتا تھا، اس لئے آسٹریا کو الگ ہی رکھا گیا۔ علاوہ بریں یہ بات بھی تھی کہ اس وقت آسٹریا کے ساتھ اور متعدد نسلوں کے لوگ بھی اس اتحادِ المانی میں شریک ہو جاتے، اور بسمارک ایک خالص المانی ریاست بنا رہا تھا، اور اس میں دوسری نسلوں کو شامل کر کے پھوٹ کا بیج بونا نہیں چاہتا تھا۔

لیکن جنگ عظیم نے صورت حال بالکل بدل دی۔ جرمنی میں پروشیا کا پہلا ساز ور نہ رہا آسٹریا سے بھی اس کے غیر المانی علاقے جدا ہو گئے۔ آسٹریا کے ساتھ اتحاد ہو سکے تو جرمنی کو اب شکست کے بعد وہ چیز حاصل ہو جائے جو فتح سے بھی بمشکل حاصل ہوتی۔ اِدھر آسٹریا کے لئے زندگی کا سامان ہو جائے، اس لئے کہ اب نہ اس کی تجارت کے لیے کوئی منڈی ہے اور نہ آرام اور سکون کی زندگی کے لئے کافی معاشی وسائل۔ چنانچہ جنگ ختم ہونے کے بعد سے برابر ان دونوں ملکوں میں اتحاد سیاسی کی کوشش جاری ہے۔

فرانس اور اس کے حلیفوں نے اس اتحاد کی بڑی سختی سے مخالفت کی ہے، کہ جرمنی کا قوت پکڑنا انھیں نہیں بھاتا، صلح نامہ ورسائی اور صلح نامہ سان جرمین دونوں میں اس اتحاد کے خلاف واضح دفعات شامل کئے گئے ہیں۔ لیکن صلح ناموں کے دفعات سے ایسے مسائل ختم نہیں کئے جا سکتے،

آسٹریا کو اپنی بے بسی کا احساس ہے اور اس نے صلح کے بعد سے برابر یہ کوشش کی ہے کہ جرمنی سے مل جائے، لیکن جب اندرونی واقعات اور مالی ضروریات دوسرے ملکوں سے مدد لینے پر مجبور کرتی ہیں تو عارضی طور پر اس خواہش کو دبا دیا جاتا ہے۔

لیکن اس وقت کچھ حالت اور نظر آتی ہے، پہلے آسٹریا اتحاد کا بہت خواہاں تھا، اس وقت جرمنی اس کے درپے ہے اور آسٹریا کی موجودہ حکومت نہایت سختی سے اس کی مخالفت کر رہی ہے اور اس سلسلے میں سرحد پر گولی چلنے کی نوبت بھی آچکی ہے۔ جس سے معمولی حالات میں جنگ کا آغاز ممکن تھا۔

عجیب بات ہے کہ آسٹریا کا موجودہ وزیر اعظم (ڈول فس) جو جرمن اتحادی کوششوں کی اس قدر شدت سے مخالفت کر رہا ہے، خود بھی پہلے اتحاد کا بڑا حامی تھا۔ ابھی کوئی سال بھر پہلے ڈول فس نے اتحاد کی تائید کی تھی، لیکن احتیاج بری بلا ہے۔ ڈول فس کا جوش اتحاد فرانس سے سوا چار کروڑ ڈالر کا قرضہ لینے کی خاطر ٹھنڈا پڑ گیا۔ اور آج وہ اس اتحاد کا سخت مخالف ہے۔ لیکن آسٹریا کی طرف سے جتنی سرد مہری ہے۔ جرمنی میں اسی قدر گرم جوشی، اور ہونا بھی چاہیئے اس لئے کہ آسٹریا سے اتحاد کی کوشش میں کامیابی کی اس سے زیادہ امید ہے جتنی پولینڈ یا فرانس یا اٹلی سے جرمن علاقے واپس لینے کی۔ چنانچہ جرمنی کوئی ۶۰ لاکھ ڈالر آسٹریا میں تبلیغ و اشاعت کے کام پر صرف کر چکا ہے، اور ملک کے گوشہ گوشہ میں جرمن قومی اشتراکی (نازی) مبلغ اتحاد کا پیغام پہنچا چکے ہیں۔ اور ہر چند ڈول فس بھی ترکی بہ ترکی جواب دے رہا ہے۔ اور جرمن اتحاد کے مقابلہ میں آسٹروی قوم پرستی کی تبلیغ میں سخت کوشاں ہے۔ لیکن گمان یہی ہے کہ قومی اشتراکیت اور جرمن اتحاد کا تخیل زیادہ قوی ثابت ہوگا، اور دیر سویر آسٹریا میں بھی قومی اشتراکی جماعت برسر اقتدار آجائے گی، اور اس کے ساتھ ہی دونوں ملکوں کا اتحاد صلحناموں میں سرمو تغیر کیے بغیر ایک واقعے کی صورت میں دنیا کے سامنے ہوگا۔

**جاپان** | جمعیت اقوام نے جاپان کو قصور وار ٹھہرایا، جاپان نے جمعیت کو چھوڑ دیا، اراکین جمعیت نے اپنی ناخوشی کا اظہار کیا۔ لیکن جاپان کا تسلط چین پر قائم ہوگیا۔ اور چینی اب براہ راست بلا جمعیت کی وساطت کے جاپان سے صلح کی بابت بات چیت کر رہے ہیں، جاپان نے ملک بھی فتح کیا اور یہ بھی عملاً منوالیا کہ منچوریا کے مسئلے میں دوسری قوموں کو بولنے کا کوئی حق نہیں، چین نے دیکھ لیا کہ جمعیت پر۔ بھروسہ کرنا اپنے کو دھوکا دینا ہے۔ آخر کار خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونا پڑتا ہے اور اگر یہ کمزور ہیں تو کوئی سہارا کام نہیں دیتا۔

چین کو امریکہ پر بڑا بھروسہ تھا، جمعیت اقوام بھی امریکی تعاون کی توقع ہی پر احتجاج کرتی تھی۔ لیکن کامیابی عجیب طلسم ہے۔ امریکہ کا رنگ بھی بدل گیا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدر روزویلٹ نے اس معاملہ میں ہوور کے مسلک کو چھوڑ کر پھر پرانی ولسن کی سیاست اختیار کرلی، اور چین میں جاپان کے "اغراض خاص" کا اعتراف کرلیا۔ شاید یہ محض اتفاقی امر نہ تھا کہ جاپان نے چین میں اپنا نیا اقدام فوجی اس وقت کیا جب ان کا سفیر خاص وائی کونٹ ایشی واشنگٹن میں صدر امریکہ سے سیاسی اور معاشی مسائل پر تبادلہ خیال کرنے کے لئے گیا ہوا تھا۔

اپنی اس فوجی اور سیاسی کامیابی پر پھول کر اگر جاپان پاؤں پھیلائے تو کیا تعجب ہے، چنانچہ اب جاپان کا مطالبہ ہے کہ ۱۹۳۵ء میں برطانیہ امریکہ اور جاپان کے بحری جہازوں کی نسبت ۱۰۔ ۱۰۔ ۱۰ کی یعنی سب کی ایک سی حیثیت ہونی چاہئے، حالانکہ یہ پہلے لندن کانفرنس میں ۱۰۔ ۱۰۔ اور ۷ کی نسبت طے پا چکی ہے۔ اور اس سے پہلے واشنگٹن کانفرنس میں۔ ۵۔ ۵۔ اور ۳ کی نسبت قرار پائی تھی۔ غرض بات بہت قرین قیاس ہے کہ جاپان اپنی قوت کو بڑھا کر رفتہ رفتہ ایشیا کے لئے ایک منرو اصول منوالے گا، جس کی رو سے مغربی ممالک کو ایشیا کے معاملات میں مداخلت کا بالکل اختیار نہ رہے گا، اور یہ تنہا ان کے ساتھ جو سلوک چاہے کرے گا۔

# ممالکِ اسلامی

**عراق** | چند دنوں سے اخبارات میں اسوری قبائل اور حکومت عراق کی کشمکش کا ذکر آرہا ہے ۔
یہ قبیلے قدیم اسوری اور بابلی تمدن کی رہی سہی یادگار ہیں ۔ اور مذہباً عیسائی ہیں ۔ یہ لوگ عراق، شام
اور ایشیائے کوچک کی سرحد پر عرصہ دراز سے آباد ہیں اور تینوں حکومتوں کی آنکھوں میں کھٹکتے ہیں
جب حکومت برطانیہ نے عراق کو سن رشد کی سند دے کر اپنی نگرانی سے آزاد کیا ۔ اور یہ مسئلہ
جمعیت اقوام کے سامنے پیش ہوا تو اسوری قبائل نے انتظامی خود مختاری کا مطالبہ کیا لیکن جمعیت
نے ان کے حق کو تسلیم نہیں کیا ۔ پھر اس کے بعد جب عراق اور شام کی سرحد کے تعین کا مسئلہ
پیش آیا تو اس وقت بھی ان کی شنوائی نہیں ہوئی ، اور سرحد اس طرح مقرر کردی گئی ، کہ ان کی بیشتر
تعداد حکومت عراق کے ماتحت آگئی ۔ ان قبائل نے اپنے حقوق کا مطالبہ جاری رکھا اور حکومت سے
ان کا جھگڑا ابھی کم وبیش چلتا رہا ۔ اوائل اگست میں یک بیک یہ خبر شائع ہوئی کہ ان قبائل اور
عراقی فوج کے درمیان جنگ ہوی جس میں تقریباً سو اسوری اور کوئی بیس فوجی کام آئے ۔ حالات
کا جہاں تک پتہ چلتا ہے یہ ہیں کہ اس مقابلے سے کچھ دن پہلے ان قبائل نے سرزمین عراق سے ہجرت
کرکے شامی حکومت کے زیر سایہ آباد ہونے کی کوشش کی ، ان کو یہ توقع تھی کہ شام پر چونکہ ابھی فرانس
کا اقتدار باقی ہے اس لئے وہاں ان کی پذیرائی ہوگی ، اور یہ اپنے ہم مذہب اور ہم نسل ساتھیوں
کے جوار میں آرام سے زندگی بسر کرسکیں گے کہا یہ جاتا ہے کہ ان قبائل میں سے جو قبیلے زمین شام میں
آباد تھے انھوں نے عراقی قبائل کو اس قسم کی توقع دلائی تھی ، اور انھیں دعوت بھی دی تھی ۔ جب یہ
لوگ اپنا ساز و سامان لے کر وہاں پہنچے تو حکومت شام کو یہ خطرہ ہوا کہ کہیں طویلے کی بلا بندر کے سر
نہ پڑجائے ۔ چنانچہ انھوں نے ان قبائل کو اپنی زمین پر آباد ہونے کی اجازت نہیں دی ، اور انھیں
الٹے پاؤں واپس ہونا پڑا ، ادھر عراق کی حکومت نے جو میدان خالی پایا تو اس علاقہ پر قبضہ کرلیا
جسے چھوڑ کر یہ قبائل چلے گئے تھے ، اب جو ان قبائل نے واپس آنا چاہا تو عراقی فوج نے ان

کو روکا اور یہ مطالبہ کیا کہ یہ لوگ اپنے ہتھیار حکومت کے حوالے کردیں۔ ورنہ انھیں آنے کی اجازت نہ دی جائے گی، ان لوگوں نے اس سے انکار کیا اس لئے کہ انھیں حکومت عراق پر اعتماد نہ تھا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ لوگ مارے گئے، باقی سے اسلحہ چھین لئے گئے اور انھیں بھاگ کر پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی، اس لڑائی کے حالات اور اس کے بعد کی جو کیفیت اخباروں سے معلوم ہوتی ہے اس سے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ حکومت عراق نے غیر ضروری سختی سے کام لیا ہے، کہا یہ جاتا ہے کہ نہ صرف فوج نے بلکہ عوام نے بھی ان قبائل کے قتل وغارت میں حصہ لیا، اب یہ خانماں برباد کچھ تو پہاڑوں میں چھپے ہوئے ہیں اور کچھ سب مال و متاع کھو کر مجبوراً خاموش ہیں۔

اس واقعہ کی وجہ سے شاہ فیصل جو سفر یورپ میں مصروف تھے فوراً بغداد واپس آگئے اب انھوں نے خود اپنی نگرانی میں اس علاقے میں امن قائم کرنے کی کوشش شروع کی ہے - ان قبائل کے سب سے بڑے پیشوا کو حکومت عراق نے اپنی سرزمین سے خارج کردیا ہے اور آجکل وہ جزیرۂ قبرس میں مقیم ہیں، ان کے بیانات سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عراق کی حکومت نے کسی قسم کا ظلم ان لوگوں پر اٹھا نہیں رکھا۔ سرحدی قبائل پر جو مصیبتیں نازل ہوتی رہتی ہیں، اس کی شہادت آئے دن ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد پر ملتی رہتی ہے، ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا ہے کہ ترکی اور ایران کی حکومتوں نے کردوں کے ساتھ اسی قسم کا معاملہ کیا، اور ان کی بیشتر تعداد تلوار کے گھاٹ اتاری گئی اب عراق کی حکومت اسوری قبائل کو بیخ و بن سے اکھیڑنے پر آمادہ نظر آتی ہے۔ آجکل قوم پرستی اور نسل پروری کی دنیا میں کچھ ایسی ہوا چلی ہوئی ہے کہ چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے لئے عرصہ حیات تنگ ہوتا جارہا ہے، ارمنی ختم ہوگئی، کردوں کا زور ٹوٹ چکا۔ جرمنی سے یہودی نکالے جارہے ہیں، اور اب اسوری قبائل پر یہ آفت نازل ہوئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ان چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے ساتھ اکثریتوں نے جو برتاؤ کیا ہے اس میں کچھ قصور خود ان جماعتوں کا بھی ہے، ارمنی غدار تھے، کرد لٹیرے تھے، جرمنی کے یہود جرمن قوم کی دولت پر قابض تھے۔ اور اسوری قبائل عراق کی خود مختاری میں خلل ڈال رہے تھے، لیکن

ایک طریقہ یہ بھی تو تھا کہ ان کے ساتھ نرمی سے معاملہ کیا جاتا، یا صرف اتنی سختی کی جاتی جتنی بالکل ضروری ہوتی، ایک جماعت کو بلا امتیاز مجرم و غیر مجرم محض ایک خاص نسل یا خاص قبیلے سے منسوب ہونے کی وجہ سے طرح طرح کے مظالم کا نشانہ بنانا کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہو سکتا۔ اسی سلسلہ میں یہ خبر ملی کہ عراق کے وزیر داخلہ نے ایک نئی جماعت کے قیام کی اجازت دی ہے اس جماعت کا نام غالباً "جمعیت دفاع قومی" ہوگا اور اس کا مقصد عراق کو خارجی عناصر سے پاک کرنا، اس کا ظاہری امتیاز اس کے اراکین کی قمیصوں کا رنگ ہے۔ جو جرمنی کی "نازی" جماعت کی تقلید میں خاکی رکھا گیا ہے۔ مقصد بھی اگر خبر صحیح ہے، اسی جماعت کا سا ہے اور ممکن ہے طریقہ بھی وہی اختیار کیا جائے۔ ابھی تک عوام نے اس طرف توجہ نہیں کی ہے۔ صرف تعلیم یافتہ خواص نے اس تحریک کو اٹھایا ہے، مگر کوشش شرط ہے۔ عوام کو شامل ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ زمانے کی یہ ستم ظریفی بھی قابل غور ہے کہ جو قومیں یا جماعتیں جو عرصہ کی مظلومیت سے نجات پاتی ہیں۔ اقتدار ملتے ہی خود ظالم بن جاتی ہیں اب تک یہ خیال تھا کہ ظلم و استبداد صرف یورپ کی قوموں کا خاصہ ہے، لیکن جاپان کی مثال نے اس کی کافی تردید کر دی، اور اب ترکی، ایران اور عراق کی حکومتیں بھی اس میدان میں قدم رکھ چکی ہیں۔ حکومت کا نشہ جب چڑھتا ہے تو دل اور دماغ کا توازن باقی نہیں رہتا اس وبا سے نہ مشرق محفوظ ہے اور نہ مغرب، نہ عالم اسلامی، اور نہ عالم مسیحی، دیکھئے دنیا کو کب اس سے نجات ملتی ہے۔

# شذرات

خدا کا شکر ہے کہ یہ ستمبر کا پرچہ شروع ستمبر میں شائع ہو رہا ہے، ہم اپنی طرف سے پوری کوشش کریں گے کہ آیندہ سے ہر مہینہ کا پرچہ اس مہینہ کی پہلی تاریخ کو یہاں سے روانہ ہو جایا کرے، قارئین کرام میں سے جن صاحب کے پاس ۱۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے وہ دفتر کو اطلاع دے دیا کریں تاکہ اگر ان کی کاپی بھیجی جا چکی ہے اور راہ میں گم ہو گئی ہے تو ایک اور کاپی بھیجی جائے۔

---

مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے ٹریننگ کالج سے ایک سوالنامہ آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد ایک اہم مسئلہ پر غور کر رہے ہیں، اس میں باہر کے لوگوں سے بھی مشورہ چاہتے ہیں بعض حضرات کی تجویز ہے کہ مسلم یونیورسٹی کا اسکول "جدید طریقے پر چلایا جائے جو آجکل کی تعلیم اور مقابلے کا مقتضا ہے"۔ اسکی تفصیل آگے چل کر کی گئی ہے کہ یہ اسکول امرا اور عمائد کے لڑکوں کی تعلیم کے لئے مخصوص کر دیا جائے تاکہ جو مسلمان اپنے بچوں کو پہاڑ کے مدرسوں یا کرسچین کے اسکولوں میں بھیجا کرتے ہیں وہ آئندہ سے علیگڈھ بھیجا کریں اس صورت میں حسب ذیل تبدیلیاں کرنا پڑیں گی۔

۱۔ یہ مدرسہ تقریباً خالص اقامتی مدرسہ رہے گا۔ صرف ۱۰ فیصدی غیر مقیم طلبہ ہوں گے، کل مدرسہ میں طلبہ کی تعداد تین سو سے زیادہ نہیں ہوگی۔

۲۔ اس پر بہت زور دیا جائے گا کہ دارالاقامہ میں اتالیق طلبہ کی تعلیم و تربیت کے ہر جزو کی نگرانی کریں گے دارالاقامہ کے نگران کی مدد کے لئے ایک خاتون ہوگی جو بچوں کے کھانے پہننے، صفائی وغیرہ کی دیکھ بھال کرے گی۔

۳۔ جو لڑکے کیمبرج جونیر اور سینیر کا امتحان دینا چاہیں گے انکی تعلیم کے لئے خاص انتظام کیا جائے گا۔

۴۔ سب لڑکوں کے رہنے سہنے کا انتظام اعلیٰ پیمانہ پر کیا جائے گا جیسا کہ اب انگلش ہاؤس میں ہے۔

۵۔ ہر طالب علم کے مصارف تعلیم تقریباً ایک ہزار روپیہ سالانہ ہوں گے۔

---

چونکہ اس مسئلہ سے مسلمانوں کو عام طور پر دلچسپی ہوگی اسلئے ہم ان صفحات میں اس پر مختصر سی بحث کرنا چاہتے ہیں اول تو ہمیں اس بات پر سخت تعجب ہے کہ امرا اور عمائد کی جداگانہ تعلیم کی تحریک اس جمہوریت کے دوران میں اٹھی ہے اور وہ بھی ایک اسلامی تعلیم گاہ سے۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ تعلیم طرز تمدن اور طرز معاشرت کی پابند ہوتی ہے تعلیم کا عمائدی (Aristocratic) نصب العین یورپ میں اسوقت تک مانا جاتا تھا، جب تک حکومت اور قیادت صرف امراء کے طبقہ تک محدود تھی۔ انقلاب فرانس کے بعد سے حقوق یوں کہنے کو تو کل جمہور کے لئے عام ہو گئے لیکن عملاً اتنا ضرور ہوا کہ امرا کے ساتھ متوسط طبقہ ان میں شریک ہو گیا یعنی سب لوگ نہ سہی پھر بھی بہت سے سیاسی غلامی سے آزاد ہو گئے۔ آزادی کی ہوا لگتے ہی انسانی طبیعت تمدن کی مادی اور روحانی نعمتوں کو ڈھونڈنے لگی اور تعلیم و تہذیب ایک بڑے حلقے میں پھیل گئی۔ انیسویں صدی کے آخر تک امیروں کی علیحدہ اور مخصوص تعلیم صرف انگلستان تک محدود رہ گئی، اور بیسویں صدی کے آغاز سے وہاں بھی اس پر ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں۔ کم سے کم اصولی حیثیت سے تعلیم کا یہ نظریہ اب یورپ اور امریکہ میں رد ہو چکا ہے۔ اور اسلامی تاریخ میں تو اول سے آخر تک اس کی مثال نظر نہیں آتی کہ عمائدی تعلیم کا اصول کبھی تسلیم کیا گیا ہو۔ البتہ زوال کے زمانے میں امرا اپنے بچوں کو گھروں پر تعلیم دلانے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دن میں سرے سے تعلیم ہی مفقود ہو گئی۔

اب بیسویں صدی کا ایک ثلث گذر جانے کے بعد تعلیم کے اس مردود نصب العین کو ہندوستان میں مقبول بنانے کی کوشش ہو رہی ہے۔ پہلے ایس، آر، داس آنجہانی نے ایک "پبلک اسکول" کی تجویز بڑے زور شور سے اٹھائی، اور اب اس کے بعد علی گڑھ میں کسی صاحب کو یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ مسلمانوں کا ایک اس قسم کا اسکول قائم کیا جائے۔ ہم جن وجوہ سے اس تجویز کے مخالف ہیں انکو مختصر طور سے لکھتے ہیں۔

۱۔ اس قسم کی تعلیم اسلام اور جمہوریت کے منافی ہے اور وسعتِ قلب کی جگہ جو تہذیب و شائستگی کا جوہر ہے، تنگدلی پیدا کرتی ہے۔

۲۔ مسلمانوں کا قومی افلاس اس کی اجازت نہیں دیتا کہ صاحبانِ مقدرت بھی بیکار اس قدر روپیہ اپنے بچوں کی تعلیم پر صرف کریں جس سے اور بہت سے بچوں کی تعلیم ہو سکتی ہے۔

۳۔ مسلم یونیورسٹی میں طلباء کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے۔ اگر اس یونیورسٹی کو قائم رکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے تو اس کے ساتھ کئی بڑے اسکولوں کی ضرورت ہے تاکہ ان سے یونیورسٹی کے لئے طالب علم مل سکیں نہ یہ کہ جو اسکول موجود ہے اس کے طلبہ کی تعداد اور محدود کر دی جائے۔

۴۔ یونیورسٹی کا سرمایہ امیروں اور غریبوں کے مشترکہ چندے سے جمع ہوا ہے اس کے ایک حصے کو صرف امیروں کی تعلیم پر صرف کرنا کسی طرح جائز نہیں۔ اور اسے ملتِ اسلامی ہرگز گوارا نہیں کرے گی۔

۵۔ تین سو کی تعداد میں ایسے لڑکوں کا جمع ہونا بہت مشکل ہے جن کے والدین ایک ہزار روپیہ سال ان کی تعلیم پر صرف کر سکیں۔ جو لوگ اپنے بچوں کو پہاڑوں کے مدرسوں میں اکرانیوں کے مدرسوں میں بھیجتے ہیں وہ انھیں علی گڑھ نہیں بھیجیں گے کیونکہ یا تو انھیں بچوں کی صحت کا خیال ہوتا ہے یا یہ کہ ان پر حکمراں قوم کے سستے نقلی نمونوں کی برکت سے مغربی تمدن کا ظاہری رنگ چڑھ جائے۔ ان لوگوں کو اپنے بچوں کی عمائدی تعلیم مدنظر نہیں ہوتی اس لئے کہ ہندوستان میں کرانیوں کا شمار عام طور پر عمائد میں نہیں کیا جاتا۔

---

اگر تھوڑی دیر کے لئے عمائدی تعلیم کے نصب العین کو مان بھی لیا جائے، تب بھی ہندوستان میں اس کی گنجائش کسی طرح نظر نہیں آتی اس لئے کہ یہاں عمائد کا طبقہ اس معنی میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے جو (Aristocracy.) کے لفظ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اس سے مراد وہ طبقہ ہے جو پشتہا پشت سے حکومت، قیادت، دولت، تہذیب اور شائستگی کا مالک ہے۔ اور اس وجہ سے اس میں بعض مخصوص اخلاقی صفات پیدا ہو گئی ہیں۔ جو اوروں میں نہیں پائی جاتیں۔ ہندوستان دو سو سال سے تنزل کے دور سے گذر رہا ہے۔ ظاہر ہے تنزل پذیر قوموں میں سب سے بدتر حالت امرا کی ہوتی ہے جیسا کہ حالی نے کہا ہے۔

تباہی ہے آتی کسی قوم پر گر ۔۔۔ تو مسخ ان میں ہوتے ہیں پہلے تونگر

اس لئے یہاں امرا کے اکثر قدیم خاندانوں پر تو عمائد کی تعریف صادق آ ہی نہیں سکتی کیونکہ ان کو زمانے نے خاک میں ملا دیا اور ملا رہا ہے۔ اب رہے وہ لوگ جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب عظیم کے بعد ابھرے ہیں ان میں البتہ علم اور دولت وغیرہ موجود ہیں لیکن دوسری صفات جو عمائد کے لئے ضروری ہیں ابھی تک پیدا نہیں ہوئیں اس لئے کہ ان کا پیدا ہونا پشتہا پشت کا کام ہے ایسے ہنگاموں میں وہی لوگ زیادہ بڑھتے ہیں جو زمانہ شناس، من چلے اور اخلاقی قیود سے ایک حد تک آزاد ہوتے ہیں۔ ان لوگوں میں یقیناً ترقی کی خلقی صلاحیت ہوتی ہے لیکن انھیں وہ راہیں طے کرنے کے لئے ایک مدت درکار ہوتی ہے جن کی منزل مقصود شان ریاست اور جوہر شرافت ہے۔ غرض ہندوستان میں گو انفرادی حیثیت سے کچھ لوگ موجود ہوں جو دولت کے ساتھ عمائد کی دوسری صفات کے بھی حامل ہیں لیکن ان کا کوئی علیحدہ طبقہ نہیں ہے، اور نہ ان کے امتیاز کا کوئی مسلمہ معیار ہے ایسی صورت میں یہاں تو عمائدی تعلیم کا نام ہی لینا بے معنی ہے۔ غرض یہ تجویز ایک شیخ چلی کا منصوبہ ہے جس کا عمل میں آنا محال ہے اگر یہ آگے بڑھی تو نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ مسلم یونیورسٹی کی عام مخالفت جو خدا خدا کر کے اب کم ہوئی ہے پھر بڑھ جائے گی۔ جتنا سرمایہ اور جتنی سعی اس میں صرف ہوگی اس سے کم میں موجودہ اسکول کی اصلاح اور ترقی اس حد تک ہو سکتی ہے کہ یہ ہندوستان کا بہترین مدرسہ بن جائے۔

---

ہمیں امید ہے کہ وہ حضرات جو قومی تعلیم کے مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں اس مسئلہ کے متعلق اپنی رائے اس پتہ سے روانہ کریں گے۔

Secratary

School Reorganization Comitte

Training College

Aligarh

ٹیلیفون نمبر ۵۵۶۶

طب یونانی کا تازہ کرشمہ

انسان کی زندگی کا مدار خون پر ہے۔ خون اگر خراب ہوگیا ہی تو آدمی کی تندرستی قائم نہیں رہ سکتی۔ **ہندوستانی دواخانہ دہلی "مصفی"** ایجاد کرکے تمام ملک کو مقابلہ کی دعوت دیتا ہے اور بلاخوف تردید دعوی کرتا ہے کہ صفائی خون کے لئے "مصفی" سے بہتر دوا آج تک نہ ایشیا پیش کر سکا ہے اور نہ یورپ۔

"**مصفی**" ہندوستان کی جڑی بوٹیوں کا خلاصہ ہے اور مسیح الملک ثانی حکیم حاجی محمد احمد خاں صاحب کے مشورہ سے جدید سائنٹفک طریق پر تیار کیا گیا ہے۔ خون کی خرابی سے پیدا ہونے والے ہر مرض کی تیر بہدف دوا ہے۔ کھجلی، داد پھنسیاں وغیرہ حتی کہ سوزاک آتشک اور جذام کا زہریلا مادہ بھی اس کے استعمال سے ہمیشہ کے لئے نابود ہو جاتا ہے۔ اس کی ایک خوراک چار کا ایک چمچہ ہے، اور بلحاظ نفع "**مصفی**" درحقیقت اکسیری چیز ہے۔

---

قیمت بارہ خوراک کی شیشی صرف بارہ آنے، محصول ڈاک علاوہ ہوگا

**ترکیب استعمال**۔ ایک خوراک صبح، ایک شام تھوڑے پانی میں ملاکر، اور اگر مرض کا جوش زیادہ ہو تو دن میں تین مرتبہ استعمال کیا جائے۔

---

**ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۲۲ دہلی سے طلب کیجئے**

بقائے صحت کے لئے ایک اچھی دوا
OKASA
اوکاسا
دماغی کام کرنے والوں کیلئے ایک بہترین چیز ہے
اوکاسا کے استعمال سے چہرہ کا رنگ نکھر جاتا ہے چستی و توانائی بڑھ جاتی ہے۔
اوکاسا کے استعمال سے جھریاں اور سفید بال نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔
اوکاسا کے استعمال سے اعضائے رئیسہ نئی قوت محسوس کرنے لگتے ہیں۔
اوکاسا کے استعمال سے اضمحلال، چڑچڑاپن، نیز دوسری اعصابی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں اور
آدمی کی تمام زائل شدہ قوتیں عود کر آتی ہیں۔
اس سے پہلے کہ
بحالی قوت کا وقت گذر جائے، اوکاسا کا استعمال شروع کر دیجئے
سو ٹکیوں کا بکس دس روپے (عہ) .......... آزمائش کیلئے تیس ٹکیاں چار روپے (للعہ)
اوکاسا کے اثرات سے مکمل فائدہ حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ نئی اور تازہ اوکاسا کی گولیاں استعمال
کی جائیں، اس کی شناخت یہی ہے کہ تازہ اوکاسا کے ڈبہ پر ایک سرخ فیتہ ہوتا ہے۔
اوکاسا ہر دوا فروش سے مل سکتی ہے، یا ذیل کے پتہ سے بھی منگا سکتے ہیں۔
اوکاسا کمپنی برلن (انڈیا) لمیٹڈ، نمبر ۱۲ ریمپرٹ رو فورٹ، پوسٹ بکس نمبر ۴۹۶، بمبئی

نمبر ۱۰۵۲

رجسٹرڈ

# جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

نمبر ۴

بابت ماہ اکتوبر ۱۹۳۳ء

جلد ۲۱

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

A.H. Faruqi

1927.

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری　　ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

| نمبر ۴ | بابتہ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۳ عیسوی | جلد ۲۱ |
|---|---|---|

## فہرست مضامین



(محمد مجیب بی اے آکسن پرنٹر و پبلشر نے جامعہ پریس میں چھپوا کر شائع کیا)

# سیرۃ النبی

## (مجلد سوم)

سیرۃ النبی اس صدی میں اردو کی مخصوص تصانیف میں سے اور دار المصنفین اعظم گڈھ کا ایک اہم علمی کارنامہ ہے اس کی پہلی دو جلدوں پر جو علامہ شبلی مرحوم کی لکھی ہوئی تھیں رسالہ جامعہ میں آج سے بہت پہلے تنقید شائع ہو چکی ہے۔ اس درمیان میں سیرۃ مذکور کی تیسری اور چوتھی جلدیں بھی شائع ہو گئیں جو علامہ موصوف کے شاگرد اور جانشین سید سلیمان صاحب ندوی کی تالیف ہیں۔ اس لئے ان دونوں جلدوں پر بھی ایک تنقیدی نظر ڈالنی ضروری ہے۔

تیسری جلد تمامتر معجزات کے متعلق ہے۔ اس میں پہلے معجزے کی حقیقت اور اسکے امکان وقوع پر قدیم وجدید فلسفے سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور پھر آنحضرت صلعم کے معجزات نہایت بسط اور تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں پوری جلد آٹھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ میرے خیال میں عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں سے کسی میں بھی نفس معجزہ پر ایسی مفصل کتاب آجتک نہ لکھی گئی ہوگی۔

اس کتاب کے مطالعے کے وقت اس کی جو باتیں مجھ کو حقیقت کے خلاف معلوم ہوئیں ان کو اختصار کے ساتھ لکھتا ہوں۔

**عالم مثال** | فلسفۂ قدیمہ سے معجزے کے امکان اور اس کے وقوع کی بحث میں سید صاحب نے امام ربانی اور شاہ ولی اللہ صاحب کے عالم مثال کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے جس کی مختصر کیفیت انھیں کے الفاظ میں یہ ہے:۔

"ایک تو یہ عالم اجسام جس کو تم مادہ اور مادیات کہتے ہو۔ دوسرا عالم ارواح یا عالم غیب جو مادی اور مادیات سے منزہ اور مافوق ہے اور تیسرا عالم مثال یا عالم برزخ۔ یہ وہ عالم ہے

جہاں عالم اجسا داور عالم ارواح ۔ عالم شہادت اور عالم غیب دونوں کے اوصاف اور قوانین مجتمع ہوجاتے ہیں (سیرۃ النبی طبع دوم مجلد سوم صفحہ ۲۶)

کیا حقیقت میں ایسا کوئی عالم ہے؟ کیا شاہ ولی اللہ صاحب جو قرآن کے مترجم بھی تھے اور ماہر بھی اس عالم کے وجود پر اس سے ایک حرف کی بھی سند لاسکے؟ کیا اللہ جس نے عالم جسمانی اور عالم روحانی دونوں کی پوری پوری تفصیلات اپنی کتاب میں ذکر کی ہیں اتنے بڑے عالم سے جو دونوں کا جامع ہے بالکل خاموش رہ گیا؟

خود سید صاحب جنھوں نے اس عالم مثال سے معجزے کی بحث میں جابجا کام لیا ہے۔ ماشاءاللہ قرآن کے بڑے عالم ہیں وہی کوئی آیت اس کی سند میں پیش کردیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ان ارباب معرفت کا یہ عالم مثال بھی افلاطون کے عالم اعیان کی طرح محض خیالی ہے اور بس۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے جن روایات سے اس عالم کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ان سے اگر اس کا پتہ چل سکتا تو ان سے بہت پہلے رُواۃ حدیث نے اس عظیم الشان عالم کا انکشاف کرلیا ہوتا۔

**لیڈر کی شہادت** | اس کتاب میں سید صاحب کے ایک رفیق کار نے جو فلسفۂ جدیدہ کے ماہر ہیں معجزے کا ثبوت دیتے ہوئے پراسرار واقعات کی عمومیت دکھلانے کے لئے الہ آباد کے انگریزی اخبار لیڈر سے مندرجہ ذیل واقعہ نقل کیا ہے۔

"بردوان میں ایک عجیب پراسرار واقعہ پیش آیا جس نے لوگوں میں کافی سنسنی پیدا کردی ہے۔ لالہ کندن لال کپور ایک کھتری زمیندار ۱۱ ماہ حال کو ۷ بجے شام کے وقت مرا۔ متوفی چونکہ سوریہ کھتری تھا اس لئے جب تک دوسرے دن صبح آفتاب نہ نکل لیا اس کی لاش جلائی نہ گئی۔ جلانے سے پہلے اس کے لڑکے انند لال نے ایک خالی کمرے میں جہاں کوئی اور نہ تھا لاش کا فوٹو لیا۔ لیکن اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ اس کے فوٹو پر پانچ اور دھندلی تصویریں آگئی ہیں۔ ان تصویروں میں سے دو کو تو خاندان

کے لوگوں نے پہچانا تھا کہ متوفی کی پہلی بیوی اور لڑکے ہیں جن کو مرے ہوئے کئی سال ہو چکے ہیں. باقی تصویریں جو زیادہ روشن نہ تھیں پہچانی نہیں جا سکیں۔ (صفحہ ۱۴۴)

جو لوگ ذرا بھی اخبار نویسی کا تجربہ رکھتے ہیں وہ اس بات کو خوب جانتے ہیں کہ اخبارات اپنی شہرت کے لئے اکثر عجیب وغریب اور جھوٹی باتیں تصنیف کر کے لکھا کرتے ہیں تاکہ حمقا اور عجائب پرستوں میں ان کے اخبار کا چرچا ہو۔ بلکہ بعض اخبارات تو اس قسم کا ایک مخصوص کالم رکھتے ہیں فلسفی صاحب نے اگر ذرا بھی غور و فکر سے کام لیا ہوتا تو اس یقین پر پہنچنا مشکل نہ تھا کہ مذکورۂ بالا واقعہ عقلاً اور شرعاً بالکل محال ہے کیونکہ جو مردے برسوں پہلے جلائے جا چکے ہیں وہ کس عقل اور کس شرع کی رو سے کسی مردہ لاش کی حفاظت کے لئے آ سکتے ہیں۔ بفرض محال اگر ان کی روح آئے تو پھر اس کی صورت کشی فوٹو کے ذریعے کیسے ہو سکتی ہے۔

اعظم گڈھ سے بردوان ایک دن سے زیادہ کا سفر نہ تھا کاش وہ خود اس پراسرار واقعے کی تحقیق کے لئے وہاں چلے گئے ہوتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ اس قسم کا یا تو کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں ہے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ فن تصویر کشی کا کوئی شعبدہ تھا اور بس۔

لندن کے ایک مشہور جریدہ نگار مسٹر اسٹڈ نے جن کو روحانیات سے شغف تھا اپنی تصویر اس قسم کی کھنچوائی تھی جس کے ارد گرد چند روحانیوں کے بھی چہرے نظر آتے تھے مگر دہیں کے ایک نامی سائنسداں نے ان کے اس فریب کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا اور ثابت کر دیا کہ یہ فوٹوگرافی کی ایک "ٹرک" ہے اور کچھ نہیں۔

ثبوت معجزہ | حقیقت یہ ہے کہ معجزہ اپنے امکان یا نفس وقوع میں فلسفۂ قدیم وجدید کے ان تمام دلائل کا جو اس کتاب کے دو سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں قطعاً محتاج نہیں ہے۔ وہ جب واقع ہوتا ہے تو کٹر سے کٹر منکر بھی اس کے ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے کیونکہ مشاہدات یقینیات میں سے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کی کوئی دوسری توجیہ نکال لے جس طرح فرعون اور آل فرعون حضرت موسیٰ ؑ کے معجزات کو دیکھ کر انکار نہ کر سکے بلکہ ان کو جادو کہنے لگے۔ سورۂ نمل میں ہے :۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰيٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۚ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ

جب ان کے پاس ہماری نشانیاں چشم دید آگئیں تو وہ بول اٹھے کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے۔ اور باوجود اس کے کہ ان کے دلوں کو یقین ہو چکا تھا ظلم اور سرکشی سے ان کے منکر ہو گئے۔

مرکز بحث | اصل بحث یہ ہے کہ بعد از وقوع معجزہ ان لوگوں کو جنھوں نے مشاہدہ نہیں کیا ہے اس کا یقین کس طرح دلایا جائے اور اپنے اپنے انبیار اور اولیار کی طرف ان کے معتقدین نے جو جو معجزات اور کرامات منسوب کر رکھے ہیں وہ کہاں تک قابل قبول ہیں۔

ہیوم کا قول ہے :۔

"جس معجزے کی بنا کسی انسانی شہادت پر ہو وہ حجت واستدلال کے بجائے محض تمسخر انگیز ہے۔"

"مذہب کے نام سے لوگ ہمیشہ مضحک وخرافات افسانوں کے دام میں آجاتے ہیں۔

صفحہ ۱۳۲"

لیکن سید صاحب کہتے ہیں کہ معجزات کا ثبوت روایتی شہادتیں ہیں۔

"اسلامی روایات اور صحیح معجزات (غالباً احادیث) نبوی کی شہادت اس قدر بلند ہے کہ دنیا کی کوئی تاریخی روایت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اور اس سے معجزات اور خوارق عادات کا قوی ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ صفحہ ۲۰۲"

بحث روایت | بالعموم ہماری روایات کا سلسلۂ اسناد چھ چھ اور سات سات راویوں تک پہنچتا ہے مثلاً میں نے سنا زید سے اس نے سنا عمرو سے اس نے سنا بکر سے اس نے سنا خالد سے اس نے سنا اصغر سے اس نے سنا اکبر سے الخ۔ اتنے واسطوں سے جو بات بیان کی جائے وہ نہ شہادت ہے نہ علم ہے اور تاوقتیکہ متواتر نہ ہو اس سے نہ یقین پیدا ہو سکتا ہے نہ اذعان۔ کیونکہ اگر آپ خود اپنا چشم دید واقعہ مجھ سے بیان کریں تو میرے پاس اس کے صدق وکذب جانچنے کا ایک معیار ہے وہ یہ کہ میں آپ کو جانتا ہوں اور آپ کا ایک اعتبار میرے ذہن میں قائم ہے۔ لیکن جب آپ نے اپنا چشم دید واقعہ نہیں بیان کیا بلکہ یہ فرمایا کہ میں نے زید سے سنا تو وہ معیار آپ نے مجھ سے چھین لیا کیونکہ میں زید کو نہیں جانتا۔ اب اس

قول کے صدق و کذب کا فیصلہ آپ کے اوپر رہا کہ آپ زید سے واقف ہیں مگر جب آپ نے یہ کہا کہ زید نے اس کو عمرو سے سنا تھا تو آپ کے پاس بھی کوئی معیار نہ رہا۔ لہذا جب روایت کا سلسلہ دو سے تین تک پہنچ گیا تو نہ متکلم کے لئے وہ حجت ہے نہ سامع کے لئے کیونکہ دونوں میں سے کسی کے پاس اس کے جانچنے کا معیار نہیں ہے۔

جواب میں آپ کہیں گے کہ ان روایات کے سلسلہ اسناد میں جو رواۃ ہیں وہ سب کے سب جانچے ہوئے ثقہ اور معتبر ہیں لیکن وہ میرے اور آپ کے جانچے ہوئے نہیں ہیں کہ ہمارے لئے ان کا بیان حجت ہو بلکہ ان کی ثقاہت کی خبر بھی ہم تک بذریعہ روایت ہی کے پہنچی ہے۔ لہذا ان کا اعتبار روایت پر موقوف ہے اور روایت کا اعتبار ان کے اوپر اور یہ دور ہے۔ علاوہ ازیں اس بات کا قطعی فتویٰ کہ فلاں ثقہ ہے، یا صدوق ہے یا عدول ہے اصولاً اور دیانتاً صحیح نہیں کیونکہ باطن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ میں نے فلاں کو بعض باتوں میں تجربہ کیا اور سچا پایا۔ بہرحال روایت خود اہل روایت کے نزدیک بھی یقینی چیز نہیں ہے زیادہ سے زیادہ ظنی تسلیم کی گئی ہے۔

**ایک غلط فہمی کا ازالہ** | سید صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"متواتر، مشہور اور مستفیض خبروں کو چھوڑ کر خبر احاد تک تم روزانہ یقین کرتے ہو۔ خطوط، تار، اخبارات آجکل کی زندگی کا جزو ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر تم کو کامل وثوق ہے۔ رائٹر ایجنسی کے تاروں اور سنجیدہ اخباروں کے کالموں میں عجیب سے عجیب حیرت افزا واقعات، ایجادات و طبی علاجات عموماً بیان ہوتے رہتے ہیں اور لوگ ان کو تسلیم کرتے ہیں۔ آج تمام تجارت کا دارومدار انھیں تاروں پر ہے۔ شدید مالی خطرات کا موقع ہے مگر ہر بیوپاری اور تاجر بخوشی اس خبر احاد کا یقین کر لیتا ہے اور اپنی تمام دولت اس کی نذر کر دیتا ہے اور کبھی یہ عقلی مباحث اور تشکیک نہیں پیش کرتا کہ ممکن ہے کہ کسی نے غلط کہہ دیا ہو، ممکن ہے غلط لکھا گیا ہو، ممکن ہے نامہ نگار جھوٹ بولتا ہو، ممکن ہے کاتب نے خود گھڑ کر لکھ دیا ہو۔ تمام

احتمالات عقلی قائم ہو سکتے ہیں مگر عملی یقین پر ان احتمالات کا مطلق اثر نہیں پڑتا۔

ہم شفا خانوں میں جاتے ہیں اور عطاروں اور کمپونڈروں سے دوائیں لے کر باطمینان تمام ان کو استعمال کرتے ہیں حالانکہ معلوم ہے کہ ان شفا خانوں میں اکسیر اور سنکھیا دونوں کی بوتلیں پہلو بہ پہلو رکھی ہیں ممکن ہے کہ تنہا دوا بنانے والے کی یہ اطلاع کہ دوا تمھارے نسخے کے مطابق ہے غلط ہو اور اس لئے اس کے استعمال سے احتراز لازم ہے مگر کبھی یہ خدشہ ہمارے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آتا اور ہم خوشی خوشی اپنی جان کو خبر احاد کے یقین کی نذر کر دیتے ہیں۔ پھر معجزات اور مذہب ہی کے باب میں شہادت کے مسئلے پر تمام عقلی احتمالات اور شکوک کا ازالہ ضروری کیوں تصور کیا جاتا ہے۔" صفحہ ۸۰۔

ہر چند کہ سید صاحب کے اس بیان میں مبالغہ ہے کیونکہ اخبارات اور روزانہ معاملات کے بارے میں بعض خبروں میں جو قرائن کے خلاف ہوتی ہیں ہم شک کرتے ہیں اور کمپونڈروں کی غلطی سے کبھی کبھی موتیں بھی واقع ہو جاتی ہیں لیکن پھر بھی ان کا یہ کہنا صحیح ہے کہ ہم خبر احاد پر زندگی کے روزانہ کاروبار میں عملدرآمد کرتے ہیں۔ مگر مذہبی خبروں میں اور ان میں فرق یہ ہے کہ ان کے ماقبل اور متعلقات سے ہم بذات خود واقف ہوتے ہیں اس لئے یہ یقین محض خبر احاد کی بنیاد پر نہیں ہوتا بلکہ خارجی قرائن سے ہوتا ہے مثلاً شہر کے کسی محلے میں میرا کوئی عزیز سخت بیمار ہے جس کی عیادت کو میں خود بھی جایا کرتا ہوں اور صبح اور شام اس کی کیفیت آنے جانے والوں سے بھی مجھے معلوم ہوتی رہتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر ایک شخص جو وہاں آتا جاتا ہے اور جس کو میں بھی جانتا ہوں آکر کہے کہ اس مریض کا انتقال ہو گیا تو میں ان خارجی قرائن کی بنیاد پر اس کو صحیح سمجھوں گا۔

اسی طرح ایک بیوپاری کسی کارخانے سے مال منگوایا کرتا ہے۔ اس کو بار بار کا تجربہ ہے۔ وہ نہ صرف اس کارخانے کی مہر بلکہ اس کے کاغذ اور طرز تحریر سے بھی واقف ہے۔ اب اس نے وہاں سے کوئی مال طلب کیا اس پر کوئی خط اس کارخانے کا قیمت کی طلبی یا اور کسی چیز کے متعلق آتا ہے تو وہ ان سابقہ قرائن سے اس کو صحیح سمجھتا ہے اور روپیہ بھیج دیتا ہے۔

عام حالات میں یہی ہوتا ہے لیکن جب انھیں معاملات میں سے کوئی معاملہ عدالت میں پہنچ جاتا ہے تو پھر خبر احاد سے مطلق کام نہیں چلتا۔ رجسٹری شدہ دستاویزوں کے بھی کاتب اور گواہ بلائے جاتے ہیں اور ان سے تصدیق کرائی جاتی ہے اور بجز چشم دید شہادت کے سنی سنائی بات وہاں کوئی نہیں مانی جاتی۔

کیا سید صاحب یہ چاہتے ہیں کہ ادنیٰ ادنیٰ دنیاوی معاملات میں جو احتیاطیں معمولی عدالتیں برتتی ہیں وہ مذہب اور معجزات کے بارے میں نہ برتی جائیں اور عام اخباری خبروں کے درجے میں ان کو رکھ لیا جائے کہ جی چاہا تو مان لیا نہیں تو انکار کر دیا۔

سید صاحب لکھتے ہیں:-

"یہ کیسی زبردستی ہے کہ جس طرز استدلال پر دنیائے یقین کا عملی کاروبار چل رہا ہے اس کو اگر مذہب استعمال کرے تو دعیان عقل کی جبین متانت پر بل پڑ جائے" صفحہ ،،۔

سبب یہ ہے کہ دنیائے یقین کے عملی کاروبار کی بعض باتوں میں اگر ہم شک کریں یا ان کا انکار کردیں تو کوئی ملزم ٹھہرانے والا نہیں ہے لیکن مذہب اور معجزات کی کسی روایت میں شک لائیں یا انکار کریں تو آپ ہی کفر کا فتویٰ دینے لگیں گے۔

خاتم النبیینؐ کے معجزے | لیکن فلسفہ قدیم اور جدید کی یہ ساری بحثیں اس وقت کارآمد ہوسکتی ہیں جب حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے حسّی معجزات کا جو خوارق عادات ہوتے ہیں صدور ہوا ہو۔ لہذا اصلی بحث یہ ہے کہ اس قسم کے معجزے آنحضرتؐ کو دئے بھی گئے تھے یا نہیں۔ قرآن اس سے انکاری ہے۔ چنانچہ بار بار کفار نے معجزے طلب کئے اور ان سے انکار کیا گیا۔

| | |
|---|---|
| وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ﴿۱۳﴾ | اور کفار کہتے ہیں کہ اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتاری گئی۔ |
| قَالُوا لَوْلَا أُوتِيَ مِثْلَ مَا أُوتِيَ مُوسَىٰ ﴿۲۸﴾ | کفار نے کہا کہ کیوں نہ اس کو ایسی کوئی نشانی دی گئی جیسی موسیٰ کو دی گئی تھی |
| وَقَالُوا لَوْلَا يَأْتِينَا بِآيَةٍ مِّن رَّبِّهِ ﴿۱۶﴾ | اور کافروں نے کہا کہ وہ اپنے رب کی طرف سے ہمارے پاس کیوں کوئی |

| نشانی نہیں لاتا۔

ان سب کے جواب میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:۔

وَمَا مَنَعَنَا اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰیٰتِ اِلَّآ اَنْ کَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۵۹ | اور نشانیوں کے بھیجنے سے کوئی شے ہم کو مانع نہ ہوئی بجز اس کے کہ اگلوں نے ان کو جھٹلایا۔

کیونکہ معجزہ دکھلانے کے بعد اتمام حجت ہوجاتا ہے اور پھر اگر کوئی قوم ایمان نہیں لاتی تو اس کی ہلاکت لازمی ہوجاتی ہے جیسا کہ قرآن کی متعدد آیات میں تصریح ہے۔ اس لئے یہ سلسلہ تبلا رحمۃ للعالمین کے عہد میں بند کر دیا گیا۔

خود رسول اللہ لوگوں کے ایمان لانے کی امید پر رجحان رکھتے تھے کہ کوئی ایسی نشانی ملے جیسی یہ لوگ طلب کرتے ہیں۔ اس پر اللہ نے کسی قدر عتاب کے ساتھ فرمایا۔

وَاِنْ کَانَ کَبُرَ عَلَیْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِیَ نَفَقًا فِی الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِی السَّمَآءِ فَتَاْتِیَهُمْ بِاٰیَةٍ ۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَی الْهُدٰی فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ۳۵ | اور اگر ان کی روگردانی تجھ پر گراں گزرتی ہے تو جو تجھ سے ہو سکے تو زمین کے اندر کوئی سرنگ تلاش کر یا آسمان پر کوئی سیڑھی لگا اور ان کے لئے کوئی نشانی لا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو ان کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔ تو جاہل لوگوں میں سے نہ بن۔

سید صاحب لکھتے ہیں:۔

"کفار کے اس بار بار کے اصرار سے کہ پیغمبر ہم کو معجزہ کیوں نہیں دکھاتے بعض نادان یہ سمجھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے ان کو کوئی معجزہ نہیں دکھایا کہ اگر وہ کوئی معجزہ دیکھ چکے ہوتے تو بار بار معجزے کے لئے اصرار نہ کرتے لیکن یہ استدلال سرتاپا غلط ہے۔ ان کو نفس معجزہ مانگنے پر نہیں بلکہ مادی اور ظاہری معجزات طلب کرنے پر تنبیہ کی گئی ہے" صفحہ ۲۱۳۔

لاریب۔ ظاہری اور مادی معجزات ہی سے قرآن نے انکار کیا ہے ورنہ عقلی معجزہ تو خود قرآن ہی ہے جس کا وہ تصریح کے ساتھ اظہار کرتا ہے بلکہ یہاں تک کہتا ہے۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤی اَنْ یَّاْتُوْا | کہدے کہ اگر جن و انس اس بات پر متفق ہو جائیں کہ قرآن کے

| | |
|---|---|
| بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۞ | مانند کوئی کلام بنائیں تو وہ ویسا نہیں بنا سکیں گے اگرچہ ایک دوسرے کے مددگار کیوں نہ ہوں۔ |

اس کے بعد اس دعوے کے ثبوت میں سید صاحب صحیح بخاری کی یہ حدیث نقل کرتے ہیں:۔

| | |
|---|---|
| ما من نبی من الانبیاء الا اعطی من الآیات ما مثله آمن علیه البشر و انما کان الذی اوتیت وحیا أوحاه الله الی۔ | پیغمبروں میں سے ہر پیغمبر کو اللہ نے اس قدر معجزے دئے جن کو دیکھ کر لوگ ایمان لائے لیکن مجھے جو معجزہ دیا گیا ہے وہ صرف وہ وحی ہے جس کو اللہ میری طرف بھیجتا ہے۔ |

اس حدیث کے حسب ذیل نکات سید صاحب نے حل کئے ہیں۔

"(۱) ہر پیغمبر کو کوئی نہ کوئی معجزہ عطا ہوا ہے۔

(۲) دیگر انبیاء علیہم السلام کے معجزات وقتی اور عارضی تھے اور آنحضرت کا معجزہ اعظم یعنی قرآن مجید قیامت تک رہے گا۔

(۳) چونکہ وہ معجزے وقتی اور عارضی تھے اس لئے ان سے جو اثر پیدا ہوا وہ بھی وقتی اور عارضی تھا برخلاف اس کے قرآن مجید چونکہ ہمیشہ دنیا میں قائم رہنے والا ہے اس لئے اس کا اثر بھی دائمی اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔" صفحہ ۲۶۱

مگر اس حدیث میں جو سب سے ضروری نکتہ تھا یعنی یہ کہ حضور اکرمؐ نے " انما " کے لفظ سے حصر فرمادیا کہ مجھے بجز وحی کے اور کوئی معجزہ نہیں دیا گیا ہے اسی کو چھوڑ دیا۔

اب اس کے برخلاف سید صاحب قرآن مجید سے آپ کے ظاہری معجزات پانے کا ثبوت پیش کرتے ہیں:۔

"بعض کم سواد اس دعوے کی جرأت کرتے ہیں کہ قرآن مجید کی آیتیں آپ کو معجزات اور نشانیوں سے معرا ظاہر کرتی ہیں لیکن اس سلسلے میں غور کے قابل سب سے پہلی بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے آپؐ کے متعلق آپؐ کے زمانے کے کافروں کے جو اقوال تردید کی غرض سے نقل

کئے ہیں ان میں متعدد موقعوں پر آپ کو نعوذ باللہ کاہن اور ساحر کہا گیا ہے ........ اگر امورِ غیب کی قبل از وقت اطلاع نہیں دیتے تھے اور معجزات و خوارق کا صدور آپ سے نہیں ہوا کرتا تھا تو کفار آپ کو کاہن اور ساحر کے خطابات سے کیوں یاد کرتے تھے" صفحہ ۴۵۰۔

مجھے حیرت ہے کہ سید صاحب نے کفار کے ساحر اور کاہن کے الفاظ سے رسول اللہؐ کو صاحبِ معجزہ قرار دینے کی کیسے جرأت کی درآنحالیکہ خود وہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے ان الفاظ کو قرآن نے تردید کے لئے نقل کیا ہے۔ علاوہ ازیں وہ آنحضرتؐ کو کاہن، ساحر اور شاعر صرف قرآن ہی کی بنا پر کہتے تھے نہ کہ خوارق عادات کے صدور پر۔

کاہن اس لئے کہ قرآن میں غیب کی خبریں ہیں اور ان کے خیال میں غیب کی خبر دینے والا کاہن تھا۔

شاعر اس لئے کہ قرآن کا انداز بالکل اچھوتا تھا جو ان کے طرزِ کلام سے ملتا جلتا نہ تھا۔

ساحر اس لئے کہ دلکش یا مزدور کلام کو وہ جادو کہتے تھے اور قرآن کو ایسا ہی سمجھتے تھے چنانچہ سورۂ مدثر میں مکہ کے اس سردار کا قول ہے جو قرآن کو جانچنے کے لئے آیا تھا۔

| | |
|---|---|
| اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۔ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۔ | یہ قرآن نہیں ہے مگر جادو جو منقول ہوتا چلا آرہا ہے اور یہ نہیں ہے مگر انسان کا قول۔ |

اب علاوہ ان آیات کے جو خاتم النبیینؐ کو کسی حسی معجزہ دئے جانے کی نفی کرتی ہیں میں ایک ایسی آیت نقل کرتا ہوں جو اس بحث کا قطعی فیصلہ کر دیتی ہے اور جس کو سید صاحب نے اپنی اس آٹھ سو صفحات کی طویل و عریض کتاب میں کہیں نقل نہیں کیا ہے۔ وہ یہ ہے:

| | |
|---|---|
| وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ‎۲۰۳ | اور جب تو ان کے پاس کوئی نشانی نہ لایا تو انھوں نے کہا کہ تو نے کوئی نشانی کیوں نہ چنی۔ |

اس میں تصریح کر دی گئی ہے کہ جس قسم کی نشانی یعنی حسی معجزہ وہ طلب کرتے تھے اس قسم کی کوئی نشانی خاتم النبیین نہیں لائے۔ غرض قرآن کریم اور صحیح بخاری کی حدیث جو اوپر گذر چکی ہے دونوں

اس بات پر متفق ہیں کہ آنحضرت ؐ کو سوائے قرآن کے جو عقلی معجزہ ہے کوئی حسّی نشانی نہیں دی گئی۔

| قرآن مجید میں خاتم النبیین کا کوئی ظاہری معجزہ نہیں ہے | سید صاحب نے اپنی کتاب کے تقریباً سو صفحوں میں ان آیات و دلائل نبوی کا بیان لکھا ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہوئی ہیں۔ اب ہم کو ان کا |
|---|---|

جائزہ لینا ہے کہ آیا قرآن کی تصریحات کے برخلاف ان میں کوئی حسی معجزہ تو نہیں ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ کفار عصائے موسیٰ، ید بیضا اور احیاء موتیٰ کی نوعیت کے حسی معجزے چاہتے تھے۔

| قَالُوا لَوْلَآ أُوتِيَ مِثْلَ مَآ أُوتِيَ مُوسَىٰ ۲۸/۴۸ | انھوں نے کہا کہ اس کو ایسا معجزہ کیوں نہ دیا گیا جیسا موسیٰ کو دیا گیا تھا۔ |
|---|---|
| فَلْيَأْتِنَا بِآيَةٍ كَمَآ أُرْسِلَ الْأَوَّلُونَ ۲۱/۵ | چاہیے کہ وہ ہمارے پاس کوئی ایسی نشانی لائے جیسی اگلے رسول دے کر بھیجے گئے تھے۔ |

ان میں سب سے پہلے سید صاحب نے معجزۂ قرآن کو لکھا ہے جس کے بارے میں ہم بھی متفق ہیں کہ یہ عقلی معجزہ دائم و قائم خاتم النبیین کو دیا گیا اور قرآن نے اس کو مصرح بیان کیا۔ پھر وہ آپ کی امیت کو بھی معجزہ قرار دیتے ہیں لیکن یہ اگر معجزہ ہے تو جملہ عرب اس میں شریک تھے کیونکہ وہ سب امی تھے۔

ذات نبوی کی حفاظت کا وعدہ بھی معجزات ظاہری میں نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی مہربانیوں میں سے ایک مہربانی تھی۔ اسی طرح جنوں کا حضور اکرم کی خدمت میں آکر مسلمان ہونا بھی معجزہ نہیں ہے اس لیے کہ آپ جن و انس سب کی طرف مبعوث کیے گئے تھے جس طرح انسان آپ کے پاس آکر مشرف باسلام ہوتے تھے اسی طرح جن بھی۔ غلبۂ روم کی پیشین گوئی اور دیگر پیشین گوئیاں یا اخبار بالغیب جو انھوں نے قرآن سے نقل کی ہیں وہ سب کی سب اگر وجہ اعجاز ہو سکتی ہیں تو قرآن کے لیے جس نے ان امور کا بیان کیا نہ کہ رسول کے لیے۔ اسی طرح ہجرت کا موقع دکھلانا، فرشتوں سے امداد کرنا، لڑائیوں میں فتوحات دینا، میدان جنگ میں پانی برسا دینا وغیرہ وغیرہ جملہ امور نصرت و تائید الٰہی ہیں ان کا شمار معجزات میں اور خاص کر ان معجزات میں جن کو کفار طلب کرتے تھے نہیں ہو سکتا۔ مکہ سے بیت المقدس تک ایک رات میں سفر نہ کفار نے دیکھا نہ مسلمانوں نے بلکہ ابھی تک یہی بحث ہے کہ یہ خواب میں تھا یا بیداری میں۔ پھر

اس کو معجزہ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ حیرت یہ ہے کہ سید صاحب نے طیر ابابیل کی نشانی کو بھی آنحضرت صلعم کا معجزہ قرار دیا ہے۔ کیا حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے بنائے ہوئے کعبے کا جو بیت اللہ ہے یہ حق نہیں تھا کہ اللہ دشمنوں سے اس کی حفاظت کرتا۔ پھر یہ اگر معجزہ ہے تو بیت اللہ کا ہے۔ رسول اللہ تو اس وقت تک پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

غرض جتنے معجزات سید صاحب نے قرآن کریم سے نقل کئے ہیں ان میں سے کوئی بھی حسی معجزہ نہیں ہے جو قرآن کی تصریحات کے برخلاف پڑے۔

**شق القمر** | بے شک ایک شق القمر ہے جو حسی ہو سکتا تھا اور جس کو نہ صرف زمین بلکہ سبعہ سیارہ اور آسمانوں کے باشندے بھی دیکھ سکتے تھے مگر وہ قطعاً قرآن سے ثابت نہیں کیونکہ قرآن میں تصریح ہے کہ چاند قیامت کے قریب شق ہوگا۔ اس کا بیان قرآن میں صرف ایک ہی جگہ سورۂ قمر میں ہے۔

| | |
|---|---|
| اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ | قیامت قریب آئی اور چاند پھٹا۔ |

یعنی جوں ہی قیامت قریب آئے گی چاند پھٹ جائے گا۔

| | |
|---|---|
| وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ | اگر وہ (قیامت کی) کوئی نشانی دیکھیں گے تو بھی منہ پھیر لیں گے اور کہیں گے کہ یہ جھوٹ ہے جو ہمیشہ سے چلا آرہا ہے۔ |

یعنی قرب قیامت کی نشانی شق قمر دیکھ لینے کے بعد بھی یہ منکرین قیامت کے قائل نہ ہوں گے اور اس کو جھوٹ ہی قرار دیتے رہیں گے۔

یہاں آیت کے لفظ سے غلط فہمی ہوئی ہے۔ لوگوں نے آیت کے معنی آیت رسول لئے حالانکہ یہاں رسول کا مطلقاً ذکر نہیں بلکہ قیامت کا ہے اس لئے آیت سے آیۃ الساعۃ ہی مراد ہو سکتی ہے اور سحر بمعنی کلام مزوّر بنائی ہوئی بات یعنی جھوٹ کے جا بجا قرآن میں مستعمل ہے مثلاً

| | |
|---|---|
| وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ؁ | اور جو تو کہے کہ تم مرنے کے بعد اٹھائے جاؤ گے تو ضرور یہ کافر کہیں گے کہ یہ تو نہیں ہے مگر کھلا ہوا جھوٹ۔ |

سید صاحب لکھتے ہیں:۔

"بعض عقل پرست مسلمانوں نے قربِ قیامت کی مناسبت سے یہ تاویل کی ہے کہ آنحضرتؐ کے عہد میں شق قمر کا ثبوت نہیں ہوا تھا بلکہ یہ قیامت کے واقعے کا ذکر ہے لیکن اس حالت میں اول تو بے قرینہ ماضی کو 'چاند پھٹ جائے گا' کے معنی میں لینا پڑے گا دوسرے یہ کہ اگر یہ قیامت کا واقعہ ہوتا تو اس کے بعد یہ کیوں ہوتا کہ یہ کافر اگر کوئی بھی نشانی دیکھیں تو منہ پھیر لیں اور کہیں کہ یہ تو جادو ہے جو ہوتا آیا ہے۔ قیامت سامنے آجانے کے بعد اس کے انکار کے کیا معنی اور اس کو ستمر جادو کہنا کیونکر صحیح ہوسکتا ہے۔ اس کے علاوہ مستند اور صحیح روایات کی کیوں کر تردید کی جاسکتی ہے"۔ صفحہ ۵۰۶۔

بس اصلی وجہ یہی مستند اور صحیح روایات ہیں جو اس کھلی ہوئی آیت کے سمجھنے سے مانع ہیں آخر اس میں کیا قباحت ہے کہ قرآن کی آیت جس معنی میں ہے اس کو اسی میں رہنے دیجئے اور صاف صاف کہہ دیجئے کہ شق القمر کا معجزہ قرآن سے ثابت نہیں ہے ہاں ۳۲ روایتیں اس پر ضرور شاہد ہیں کیونکہ آپ کے نزدیک جیسا کہ آگے چل کر میں نقل کروں گا اس مستند ذخیرۂ احادیث کو خود اللہ نے معجزے کی حفاظت کے لئے منتخب فرمایا ہے۔

**بدر میں فرشتوں کا نزول** اللہ کے افضال وعنایات میں سے یہ امر بھی تھا کہ اس نے بدر نیز دوسرے غزوات میں بھی اپنے نبی کی امداد کے لئے فرشتے اتارے۔ ان کے اتارنے کی حقیقت اور اس کی نوعیت اور اس کے متعلق سنت اللہ ان سب امور کی قرآن میں کئی جگہ تفصیل کی گئی ہے لیکن سید صاحب نے قطعاً اس کی طرف اعتنا نہ کی۔ ان کے خیال میں فرشتوں کی فوج پرا باندھے ہوئے آسمانوں سے چلی اور آکر مسلمانوں کے ساتھ مل گئی اور کفار پر یکدم بول دیا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"جب دونوں صفیں گتھ گئیں تو خدا کے حکم سے مسلمانوں کی تعداد دشمنوں کی آنکھوں میں ان کی اپنی تعداد سے بھی دونی نظر آنے لگی ...... یہ مسلمانوں کی تعداد بڑھ کیوں کر گئی تھی۔ کیا آسمان سے فرشتے اتر آئے"۔ صفحہ ۵۲۸۔

اس کے بالکل خلاف انھیں کی زبان سے دوسرا معجزہ سنئے:۔

"اس معرکے میں سن چکے ہو کہ کافروں کی تعداد مسلمانوں سے تگنی تھی ایسی حالت میں مسلمانوں کا بزدل ہونا لازمی تھا خدا نے اپنی قدرت کاملہ کا یہ تماشا دکھایا کہ مسلمانوں کی نگاہوں میں کچھ ایسا تغیر کر دیا کہ وہ مسلمانوں کو بہت تھوڑے معلوم ہونے لگے۔ ادھر کفار کو مسلمان تھوڑے نظر آتے تھے مقصود یہ تھا کہ رؤسا کفار میدان سے بھاگ کر جانیں بچا کر نہ جانے پائیں۔ اس کی تدبیر یہ کی کہ مسلمان اپنی اصلی تعداد سے بھی ان کو کم نظر آنے لگے" صفحہ ۵۲۷۔

یعنی ایک ہی حالت میں جبکہ بدر میں دونوں فوجیں گتھی ہوئی تھیں کفار مسلمانوں کو اپنی تعداد سے دونا یعنی کم و بیش دو ہزار دیکھتے تھے اور پھر ان کو ان کی اصلی تعداد یعنی ۳۱۴ سے بھی کم دیکھتے تھے۔

کیا ان دونوں سے ایک تیسرا معجزہ جمع بین الضدین کا نہیں پیدا ہوتا جس کو سید صاحب کی طرف منسوب کرنا چاہئے۔

آپ کہیں گے کہ ان دونوں باتوں پر قرآن کی آیتیں ناطق ہیں۔ میں صرف یہ عرض کرتا ہوں کہ قرآنی آیات کو اس سے زیادہ معقولیت کے ساتھ سمجھنے کی ضرورت ہے۔

آیات موسوی | سورہ بنی اسرائیل کی تفسیر کرتے ہوئے آیت

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ تِسْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ | اور ہم نے موسیٰ کو نو کھلی ہوئی نشانیاں دیں۔

کا ترجمہ سید صاحب نے لکھا ہے کہ

"اور ہم نے کوہ طور پر موسیٰ کو نو کھلے ہوئے احکام دئے" صفحہ ۳۴۰

پھر اس کے ثبوت میں مندرجہ ذیل حدیث نقل کی ہے:۔

"صحیح احادیث میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ آنحضرتؐ تشریف فرما تھے۔ سامنے سے دو یہودی گزرے۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ چلو اس پیغمبر سے کچھ سوال کریں۔ دوسرے نے کہا کہ پیغمبر نہ کہو سن لے گا تو اس کی چار آنکھیں ہو جائیں گی (یعنی خوش ہوگا)۔ اس کے بعد وہ آپ کی خدمت میں آئے اور دریافت کیا کہ موسیٰ کو نو آیتیں کونسی دی گئیں۔ آپ نے فرمایا

وہ یہ ہیں۔ [1]کسی کو خدا کا شریک نہ بناؤ، [2]زنا نہ کرو، [3]کسی بے گناہ کو قتل نہ کرو، [4]چوری نہ کرو، [5]جادو نہ کرو، [6]کسی حاکم کے پاس بے جرم کی چغلی نہ کھاؤ، [7]سود نہ کھاؤ، [8]کسی پاک دامن پر تہمت نہ لگاؤ، اور [9]میدان جہاد سے نہ بھاگو (اس نویں حکم میں راوی کو شک ہے)، اور خاص تمھارے لئے اے یہود! یہ [10]دسواں حکم ہے کہ سبت کے دن زیادتی نہ کرو۔ یہ سن کر دونوں یہودیوں نے آپ کے دست و پا کو بوسہ دیا۔ یہ حدیث جامع ترمذی، مسند احمد، نسائی، ابن ماجہ، ابن جریر میں ہے۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو دو جگہ نقل کیا ہے اور دونوں جگہ کہا ہے کہ "حدیث حسن صحیح"۔ ۲ صفحہ ۱۳۴

حضرت موسیٰ کے تسع آیات کی تفسیر توریت کے احکام عشرہ کے ساتھ جو اس حدیث میں کی گئی ہے اور جس کو ترمذی نے "حسن صحیح" کہا ہے نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں ہے بلکہ قرآن کی رو سے اس کا صحیح ہونا قطعاً ناممکن ہے کیونکہ حضرت موسیٰ کو یہ نو نشانیاں اس وقت ملی تھیں جب مدین سے مصر جاتے ہوئے اللہ نے ان کو فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا تھا اور اس وقت نہ توریت نازل ہوئی تھی نہ اس کے احکام عشرہ تھے۔

ان دونوں باتوں کی تصریح قرآن میں موجود ہے۔ سورۂ نمل میں ہے:-

| | |
|---|---|
| فِیْ تِسْعِ اٰیٰتٍ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَقَوْمِهٖ | نو نشانیاں لے کر فرعون اور اس کی قوم کی طرف |

پھر سورۂ اعراف میں جس میں حضرت موسیٰؑ کا قصہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ان نشانیوں کی تفصیل کر دی ہے یعنی [1]عصا، [2]ید بیضا، [3]قحط، [4]نقص ثمر، [5]طوفان، [6]ٹڈی، [7]جوں، [8]مینڈک، [9]خون۔

اس کے مدتوں بعد حضرت موسیٰؑ اللہ کے حکم سے بنی اسرائیل کو مصر سے لے کر نکلتے ہیں۔ فرعون مع اپنے لشکر کے ان کا پیچھا کرتا ہوا سمندر میں غرق ہوتا ہے اور حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لئے ہوئے کوہ طور کی طرف آتے ہیں۔ وہاں اللہ ان کو میقات پر بلاتا ہے اور بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر توریت عطا کرتا ہے۔

| | |
|---|---|
| یٰمُوْسٰۤی اِنِّی اصْطَفَیْتُكَ عَلَی النَّاسِ بِرِسٰلٰتِیْ وَبِكَلَامِیْ فَخُذْ مَاۤ اٰتَیْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِیْنَ وَكَتَبْنَا لَهٗ فِی الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِیْلًا | اے موسیٰ میں نے تجھ کو لوگوں پر اپنی پیغمبری اور ہمکلامی کے لئے چن لیا۔ سو جو کچھ تجھ کو دیتا ہوں اس کو لے اور شکر کر۔ اور ہم نے اس کے لئے تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور ہر شے کی |

بِكُلِّ شَيْءٍ | تفصیل لکھی

علاوہ بریں اس حدیث سے زیادہ دور نہیں صرف دس ہی صفحے پہلے یعنی صفحہ ۴۷۰ میں سید صاحب نے خود توریت کے احکام عشرہ گنائے ہیں۔ ذرا غور سے دیکھئے تو ان میں اس حدیث کا پانچواں حکم "جادو نہ کر" کہیں ہے۔

روایتی معجزے | اس کے بعد ساری کتاب صفحہ ۴۸۵ سے آخر تک ان معجزات کے ذکر سے بھری گئی ہے جو کتب حدیث میں بیان کئے گئے ہیں مثلاً بت خانوں سے غیبی آوازیں، پتھروں سے سلام کی آواز، کھانوں سے تسبیح کی آواز، ستون کا رونا، اشارے سے بتوں کا گر جانا، درخت کا چلنا اور اس سے آواز آنا، خوشۂ خرما کا درخت سے اتر کر آنا اور پھر واپس چلا جانا، ایک بکری اور دو سیر آٹے میں ہزاروں آدمیوں کا شکم سیر ہو کر کھا لینا، انگلیوں سے پانی کا چشمہ بہہ نکلنا وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ سب مستند اور صحیح روایتیں ہیں۔ اسی طرح بہت سے ان معجزوں کو بھی بیان کیا ہے جن کا کتب حدیث میں ذکر ہے مگر ان کی روایتیں کمزور یا موضوع ہیں اس لئے ان کو رد کیا ہے۔

میں قرآن کریم کی تصریحات کے بعد کہ خاتم النبیین کو اس قسم کے حسی معجزے نہیں دئے گئے ان روایات کے متعلق کسی قسم کی بحث غیر ضروری سمجھتا ہوں۔

سید صاحب لکھتے ہیں کہ

"دوسرے مذاہب کے پاس ایک ہی مستند چیز یعنی ان کا صحیفہ ہے جس میں ان کے ربانی احکام، ان کے پیغمبروں کے اقوال، حالات، سوانح، معجزات سب کچھ ملے جلے ہیں لیکن اسلام کے قبضے میں دو چیزیں ہیں ایک صحیفۂ الٰہی جس میں صرف خدائی احکام و مطالب ہیں۔ دوسرے حدیث و سنت جس میں پیغمبر کے حالات، اقوال اور معجزات وغیرہ الگ اور مستقل حیثیت سے مذکور ہیں اور وہ بجائے خود روایتی اسناد کے لحاظ سے دوسرے مذاہب کے صحیفوں سے کہیں بلند تر ہے اس لئے خدا نے پیغمبر کے ان دلائل و معجزات کو عدم اہمیت کے باعث بہ تفصیل اپنے صحیفے میں جگہ دینے کی ضرورت نہ سمجھی بلکہ اس کے لئے احادیث کے مستند ذخیرہ

روایات کی موجودگی کو کافی قرار دیا ہے۔ صفحہ ۴۵۔

یہاں سید صاحب سے صرف یہ سوال ہے کہ اس منشاء ایزدی کو آپ نے کس طرح معلوم کیا؟ کیا کس "وحی محمدیؐ" سے سمجھا؟ پھر یہ کہ "احادیث کے مستند ذخیرے کی موجودگی" کیا ظہور معجزات کے وقت تھی؟ ہم کو تو جہاں تک معلوم ہے روایات کے چھ خزانے جو صحاح ستہ کے نام سے مشہور اور اہل سنت میں متداول اور مقبول ہیں وہ تیسری صدی ہجری اور اس کے بعد مدون ہوئے ہیں۔

آخر میں سید صاحب کو ایک امر کی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں کہ انھوں نے مضامین کا بار بار اعادہ کیا ہے اور ایک ہی بات کو کئی کئی طرح سے بیان کیا ہے مثلاً کتاب زیر تنقید کے صفحہ ۲۱ سے صفحہ ۱۵ تک صرف چھ صفحات میں قرآن کریم کی تین آیتیں معہ ترجمہ و تفسیر کے تین تین بار دہرائی گئی ہیں۔ اس سے نہ صرف غیر ضروری طوالت ہوتی ہے بلکہ بلند پایہ تصانیف میں یہ بہت معیوب ہے۔

جس محنت اور کوشش، جستجو اور کاوش سے سید صاحب نے اس کتاب کو مرتب کیا ہے وہ نہایت قابل تعریف ہے مگر مجھ کو ان کی قدامت پرستی اور تقلید سے جس کی ہر جگہ انھوں نے حمایت کی ہے شدید اختلاف ہے کیونکہ اس کے باعث حق پرستی اور قرآن سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔

---

ؐ وحی محمدی کا لفظ اسی کتاب میں مجھ کو نظر پڑا۔ غالباً یہ ترکیب خود سید صاحب نے ایجاد کی ہے۔ پہلے مجھ کو خیال ہوا کہ قرآن کو توریت و انجیل سے ممتاز رکھنے کے لئے یہ ترکیب اختیار کی گئی ہے مگر جب کہیں میں نے اس میں وحی موسوی اور وحی عیسوی کا لفظ نہ دیکھا تو یہی سمجھنا پڑا کہ سید صاحب نے اپنی اس شیفتگی کے اظہار کے لئے جو ذات محمدی کے ساتھ ان کو ہے وحی الہٰی کو چھوڑ کر وحی محمدی کو اختیار کیا ہے۔

# عربی اور فارسی شاعری کے امتیازات

(بسلسلہ ماہ اگست)

(۴)

## عشقیہ رنگ

حالت عشق کا اخفا | ابتدائے محبت میں عاشق کی جانب سے اخفائے حال کی سعی لاحاصل مذہب عشق کی ایک پرانی رسم ہے۔ اس منزل کا ہر رہرو ابتدا میں اس کی سخت احتیاط کرتا ہے۔ فارسی کی عشقیہ شاعری نے اس میدان میں بہت وسعت اور مضمون آفرینی سے کام لیا ہے۔ عربی رنگ تو اس اخفا کی لذت و چاشنی سے قطعاً ناآشنا ہے، وہ اپنی بیباکی طبع کی بنا پر پہلے ہی قدم میں اس کا اظہار اپنے لئے باعث فخر و نمود تصور کرتا ہے۔

علقتها عرضا واقتل قومها زعما لعمر ابیک لیس بمزعم

یعنی "جس وقت میرا اور اس کا سامنا ہوا فوراً میں نے اپنے عشق کا اظہار اس سے کر دیا اور میں اس کی قوم سے امید وصال لڑتا ہوں لے مخاطب تیرے باپ کی عمر کی قسم یہ ایک ایسی امید ہے جو حاصل ہونے کے قابل نہیں کیونکہ عداوت فریقین مانع وصال ہو گی۔"

فارسی رنگ کے مقابلے میں ضرور اس پر تنگ ظرفی کا طعنہ دیا جا سکتا ہے۔ فارسی شاعر کو اس میدان میں قدم قدم پر حکمت عملی سے کام لینا پڑتا ہے۔ محبوب کی حالت اور خیریت مزاج معلوم کرنے کے لئے بظاہر تو اس سے آب نظر آتا ہے لیکن اس حالت میں بھی وہ رازداری کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتا، مختلف تدبیروں اور حیلوں سے اپنے اضطراب کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے، ہر مجلس اور ہر انجمن میں شریک ہوتا ہے۔ دنیا کی باتیں چھیڑتا ہے، باتوں ہی باتوں میں اپنے محبوب کی خیریت بھی معلوم کر لیتا ہے۔

بہ ہر جا میروم، اول حدیث شکوہ اں پرسم کہ حرف آں مہ نامہرباں را در میاں پرسم (نظیری)

رقیبوں سے گفتگو کرتا ہے تاکہ درمیان گفتگو محبوب کی حالت کا کچھ پتہ چل سکے۔

یارانہ با رقیب بے گفتگو کنم　　تا درمیان تفحص احوال او کنم (غضنفری)

بزم میں معشوق سامنے بیٹھا ہے لیکن عاشق شوق دیدار میں جاں بلب ہے۔ وہ صرف اس وجہ سے اس کی طرف نگاہ بھر کر نہیں دیکھ سکتا کہ کہیں غیر معاملے کی تہ کو نہ پہنچ جائے اور سارا حال کھل جائے۔

ز شوق میرم و سوئے تو ننگرم در بزم　　برائے آنکہ فتد غیر در گمان دگر

سعدی نے اس مفہوم کو ذرا شوخ اور رنگین الفاظ میں بیان کیا ہے۔

دل و جانم بتو مشغول و نظر در چپ و راست　　تا ندانند رقیباں کہ تو منظور منی

خسرو نے اس انداز میں ایک اور بات پیدا کی ہے یعنی اتفاق سے جب نظریں چار ہو جاتی ہیں تو فوراً میں اپنی نظر کو ہٹا لیتا ہوں۔

خوش آں زماں کہ بہ رویش نظر نہفتہ کنم　　چو سوئے من نگرد او، نظر بگرداندم

اظہار عشق کا موقع اول تو اس وجہ سے نہیں آتا کہ عاشق کے دل میں اس کے اظہار کی جرأت نہیں ہوتی۔ دوسرے وہ یہ خیال کرتا ہے کہ اظہار محبت کے بعد پھر کہیں جائے عافیت اور گوشۂ امن نہیں مل سکتا کیونکہ جب محبوب کو عشق عاشق کا پتہ چل جاتا ہے تو پھر وہ ایذا رسانی سے باز نہیں آتا۔

کسے کہ پیش تو اظہار آشنائی کرد　　ترا بدشمنی خویش رہنمائی کرد (عرفی ترشیزی)

اخفائے حال کا وہ موقع عجیب وغریب ہوتا ہے جبکہ معشوق خود ناز و غمزے کے عالم میں متبسمانہ انداز سے استفسار حال کرتا ہے اور عاشق بے چارہ ذلت و رسوائی اور رقیبوں کے خوف سے اخفا کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اس کا اخفا کچھ اس انداز سے ہوتا ہے کہ معشوق اس کے چہرے کی متوحش حالت سے دل کا چور معلوم کر لیتا ہے اس موقع پر اس کو چھیڑ چھاڑ کی سوجھتی ہے، نئے نئے غمزے اور انداز سے اس کی دلی کیفیت کی چھان بین کرتا ہے اور عاشق کے دل پر ایک عجیب ہوش ربا کیفیت طاری ہو جاتی ہے، شرم و حیا سے چہرے پر ایک رنگ جاتا ہے اور ایک آتا ہے، طبیعت میں انفعالی کیفیت کا اثر رونما ہو جاتا ہے، نہ تو اقرار کرتے بنتا ہے اور نہ اخفا کی کوئی تدبیر سمجھ میں آتی ہے۔ غرض یہ کہ عاشق کے لئے یہ موقع عجیب پریشانی اور تحیر کا

ہوتا ہے۔ فارسی شاعری میں اس موقع کی تفصیلات مکمل طریقے سے موجود ہیں بلکہ ان تفصیلات میں مضمون آفرینیاں بھی خوب پائی جاتی ہیں۔

سوز و گداز | ابن رشیق اور ابن قدامہ نے عشقیہ انداز کو مدنظر رکھتے ہوئے عشقیہ شاعری میں سوز و گداز کے رنگ کو سب پر مقدم رکھا ہے اور وجہ تقدیم بھی صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ منزل عشق میں قدم رکھنے کے بعد طبیعت میں سوائے سوز و گداز اور رقت کے کچھ باقی نہیں رہتا۔

ع دو عالم باختن نیرنگ عشق است (عرفی)

دل پر صلح و امن اور راز و نیاز کی تجلیات پرتو فگن ہونے لگتی ہیں، دشمنی و عداوت کا اثر تک باقی نہیں رہتا، بغض و کینے کی جگہ محبت و دوستی اور مہر و اخلاص کے عام جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

زیں عشق بہ کونین صلح کل کردم     تو خصم باش و زما دوستی تماشا کن

ع مہر تو نگذاشت جا در دل من کینہ را

عشقیہ شاعری کی ساری اثر انگیزی سوز و گداز کے پردے میں پوشیدہ ہے۔ جذبات جس قدر سوز و گداز میں ڈوبے ہوئے نکلیں گے اسی قدر کیف و تاثر کے انداز زیادہ پائے جائیں گے۔ سوز در حقیقت میں وہ نغمہ ہے جس کا اثر دل میں تیر کی طرح جاگزیں ہو جاتا ہے، دلوں میں کشاکش اور اضطراب کی ایک لہر سی پیدا کر دینا اس کے خصائص میں شامل ہے۔ اردو علم ادب میں میر کے کلام میں نہ تو فلسفیانہ مسائل کا حل پایا جاتا ہے اور نہ کوئی ایسی خاص بات ہے جو ان کے کلام کو دوسروں سے ممتاز کر سکے لیکن جو مقبولیت عامہ اس کو حاصل ہے اس میں اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ان کا کلام از ابتدا تا انتہا مجموعہ ہے رقت و درد اور سوز و گداز کا۔ ان کی شاعری کا ہر لفظ اپنی جگہ پر اثر انگیزی کے اعتبار سے تیر و نشتر کا مرادف ہے۔ چھوٹے چھوٹے سے الفاظ اور فقرے ہیں لیکن اثر انگیزی کی وہ شدت ہے جس نے سب کے کلام کو پھیکا کر دیا۔

انسان کے دل میں جس وقت گداز کی قوت نشو و نما پاجاتی ہے تو پھر اس کی نظریں ایک مرکز پر اکثر جمع ہو جاتی ہیں اور عشق کا خاصہ چونکہ یہی ہے کہ انسان کی تمام فعالی قوتیں ایک نقطے اور ایک مرکز پر جمع

ہو جائیں اس لئے درد و رقت اور سوز و گداز کا پیدا ہو جانا حقیقت میں منزل عشق کی قربت کی دلیل ہے۔

صوفیہ کے نزدیک منزل عشق میں صرف گداز اور راز و نیاز کی تخلیق ہی کتاب عشق کی تکمیل کے لئے کافی ہے، سوز و گداز چونکہ نتیجہ ہوتا ہے عشق و محبت کے غلبے کا اور عشق کا مادہ حضرت انسان سے گذر کر عام حیوانات تک میں اسی انداز سے پایا جاتا ہے لہٰذا اس صغریٰ اور کبریٰ کی ترتیب میں بدیہی طور پر یہ نتیجہ نکل آتا ہے کہ سوز و گداز اور راز و نیاز صرف نوع انسانی کے ساتھ مخصوص نہیں، جانور بھی اس صفت میں برابر کے شریک ہیں بلکہ جدید تحقیقات کی رو سے نباتات بھی اس صفت سے خالی نہیں۔

عشقیہ شاعری کی اثر انگیزی کا تو راز ہی نغمہ سوز میں نہاں ہے۔ اس کو یوں سمجھئے کہ کوئی شخص آپ کے سامنے آکر یوں کہے کہ میں نے تو آپ کے لئے طرح طرح کی باتیں برداشت کیں لیکن آپ میری ہمنوائی ذرا نہیں کرتے چونکہ اس بیان میں کوئی سوز و گداز اور رقت و درد نہیں اس لئے اس میں وہ کیف و اثر انگیزی نہیں پیدا ہو سکتی جو اس شعر کے ہر لفظ میں پوشیدہ ہے۔

بہر تو شنیدہ ام سخنہا شاید کہ تو ہم شنیدہ باشی (ولی)

چونکہ ہر لفظ سوز و اضطراب کا سرمایہ دار ہے اس لئے کیف پنہانی بھی اپنی جگہ پر اچھی طرح موجود ہے۔ خسرو، حافظ، سعدی، نظیری اور فغانی وغیرہ کے عشقیہ کلام کی ساری لذت و چاشنی صرف اسی سوز و گداز کی کشش ہے۔

شاعری کی بحث کو تھوڑی دیر کے لئے علیحدہ کر دیجئے۔ عام انداز گفتگو پر ایک نظر ڈال جائیے وہی گفتگو اپنی تاثیر کے اعتبار سے کامیاب نظر آئے گی جس کے اندر سوز و درد کے انداز زیادہ پائے جائیں گے۔ عرب کی عشقیہ شاعری اور اس کے طرز بیان پر آپ ایک گہری نظر ڈالئے آپ کو واردات عشق کی بوقلمونی اور محبت کی جذباتی تحلیل اس کے ہر لفظ سے ظاہر ہوگی لیکن سوز و گداز اور راز و نیاز کی وہ چاشنیاں جو عشقیہ رنگ میں ایک خاص مرتبہ رکھتی ہیں کہیں آپ کو نظر نہ آئیں گی۔

تسلت عمایات الرجال عن الصبا ولیس فوٴادی عن ہواک بمنسل

یعنی "لوگوں کی گمراہی عشق عہد شباب گذر جانے کے بعد جاتی رہتی ہے مگر میرا دل تیری محبت سے جدا ہونے

والا نہیں ہے" اس شعر میں جذبۂ عشق کی فراوانی اپنی انتہائی صورت میں پائی جاتی ہے لیکن سوز و گداز جس چیز کا نام ہے اس کا کوسوں پتہ نہیں۔

اس دور کی شاعری کو چھوڑ دیجئے" بنو امیہ کے عہد کی نیم غلامانہ شاعری کو جانے دیجئے، عباسی عہد کی عربی شاعری کو لے لیجئے جس نے اپنے آپ کو ایرانی رنگ میں رنگ لیا تھا۔ اس میں بھی وہ سوز و گداز جو ایرانی شاعری کے لئے مخصوص ہے آپ کو کہیں نظر نہ آئے گا۔

ابرحت یا مرض الجفون بممرض مرض الطبیب لہ وعید العود

"اے بیماری چشمان یار تو نے مجھ پر ایسی زیادتی کی کہ میرا طبیب بھی بسبب زیادتی مرض بیمار ہو گیا اور اسی کے ساتھ تمام تیمار دار بھی مبتلائے مرض ہو گئے یہاں تک کہ ان کی بھی عیادت کرنا پڑی"

متنبی کا یہ مشہور شعر ہے۔ شدت محبت کی انتہا پائی جاتی ہے لیکن وہ سوز جو طبیعت میں ایک اضطرابی لہر پیدا کر دیتا ہے اس میں نہیں۔

فارسی شاعری نے اپنے عشقیہ رنگ میں جو سوز و گداز پیدا کیا ہے تمام دنیا کی عشقیہ شاعری اس انداز مستانہ سے خالی ہے۔ عربی شاعری کو چھوڑئے انگریزی کی تمدن آشنا شاعری پر ایک گہری نظر ڈال جائیے وہ بھی فارسی شاعری کے پر گداز رنگ کے سامنے بالکل پھیکی اور بے حقیقت سی معلوم ہوگی۔ محبوب کا عاشق کی نظروں کے سامنے سے اٹھ کر جانا اور عاشق کا مختلف حیل و تدابیر سے اس کو روکنا ایک فرسودہ اور عام خیال ہے لیکن جب اسی عمومی رنگ کو سوز و گداز اور رقت و درد کے انداز میں بیان کیا گیا تو وہی رنگ تیر و نشتر بن گیا۔

می روی و گریہ می آید مرا ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

کیا اس شعر کے خاص انداز اور تیور درد آشنا طبائع کو بے خودی کے عالم میں پہنچانے کے لئے ناکافی ہیں۔

پروانہ و شمع اور گل و بلبل کی یکجائی پر عاشق مہجور کی جب نظر پڑتی ہے تو اس کا غمزدہ دل خیال دوست میں مضطرب سا ہو جاتا ہے اور اس حالت میں وہ اپنی دلی کیفیت سے مجبور ہو کر محبوب کو عالم تصور میں پکارنے لگتا ہے۔

پروانہ و شمع و گل و بلبل ہمہ جمع اند — اے دوست! بیا رحم بہ تنہائی ما کن (حافظ)

اسی مضمون کو ایک اور شاعر نے ذرا انداز بدلتے ہوئے کہا ہے۔

امشب بیا تا در چمن سازیم پر پیمانہ را — تو شمع و گل را داغ کن، من بلبل و پروانہ را

یعنی اے محبوب! تو آج کی رات چمن میں تشریف فرما ہو تاکہ آج اس جگہ بزم عیش و نشاط برپا کریں، تو شمع و گل کو رشک سے جلا اور میں پروانہ و بلبل کو۔

ان دونوں شعروں کے گہرے تاثرات پر ایک نظر ڈالنے کے بعد یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ ان کے تمام تاثرات نتیجہ ہیں صرف سوز و گداز کی آمیزش کا۔ اگر اس مفہوم کے بیان میں ایسے الفاظ کا انتخاب نہ کیا جاتا تو یقیناً ان کی کیفیت محل شبہ میں آجاتی۔

سوز و گداز اور رقت و درد کے انداز عموماً عشق و محبت کے غلبے کے بعد پیدا ہوتے ہیں کیونکہ آتش عشق تمام جذبات کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے اور ان سب کے بجائے سوز و رقت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اس عینی مشاہدے کے بعد یہ نتیجہ نہایت آسانی سے نکل آتا ہے کہ جس ملک میں عشق و محبت کے چرچے مع اپنی تمام رنگینیوں کے زیادہ ہوں گے وہاں کی شاعری میں سوز و گداز کا رنگ بھی مع اپنی تمام کیفیات کے نمایاں طریقے سے پایا جائے گا۔

ایران کی آب و ہوا میں عشق و محبت کی تخلیق کا مادہ "حسن پرست" فطرت نے خاص طریقے سے ودیعت کیا تھا۔ یہ اسی کا فیضان ہے کہ اگر ایک طرف غلامان مجاز نظر آتے ہیں تو دوسری جانب بندگان حقیقت۔

بہار انگیز ایران کا ہر بچہ کتاب عشق کا کچھ حصہ گہوارۂ طفلی میں ہی ختم کر لیا کرتا تھا اور عالم پیری تک اسی کتاب کے مطالعے میں منہمک رہتا تھا۔

ع ز طفلی تا بہ پیری عشق ورزہ (جامی)

عشق مزاج ایران کے نزدیک کائنات کی تمام چہل پہل اور فضا کی ساری رنگینیاں نتیجہ ہیں صرف عشق و محبت کی اثر انگیزی کا۔

ع جہاں پر فتنہ از غوغائے عشق است

زندگی کی ساری لذتیں اس کے نزدیک دل کے اضطراب میں پوشیدہ ہیں بغیر اس کی چاشنی کے دنیا کی ساری نعمتیں اس کے لئے پرِ کاہ کے برابر بھی نہیں۔ وہ اس دل کو جو تیرِ عشق کا زخم خوردہ نہ ہو دل ہی کہنے کے لیے تیار نہیں۔

دل فارغ ز دردِ عشق، دل نیست  تن بے درد دل جز آب گِل نیست

بلکہ دردِ عشق کی تخلیق کے لئے وہ ہر وقت دست بدعا رہتا ہے۔

غم عشق از دل کسں کم مبادا  دل بے عشق در عالم مبادا

اور اس کی وجہ بھی اسی کی زبان عشق بیان سے سننے میں لطف آتا ہے۔

ع کہ باشد عالمے خوش عالم عشق

اس کی آنکھیں ہر قدم پر ایک ہوش ربا جلوہ اور صبر آزما منظر کی تمنی رہا کرتی ہیں وہ سکون کے بجائے اضطراب کی خواہش کرتا ہے۔ خلش زخم سے اس کو جو لذت حاصل ہوتی ہے وہ اس کے اندمال سے نہیں بلکہ اس کا اندمال اس کے لئے باعث صد آزار ہوتا ہے۔

بگذر مسیح از سر ما کشتگان عشق  یک زندہ کردن تو بصد خون برابر است

اس کا دل ہر وقت ایک کیف سرمدی کی آرزو میں سرگرداں اور پریشان رہا کرتا ہے۔ اس کو ایک ایسے آزار کی تلاش رہتی ہے جس کا کرب و اضطراب اس کو ہر وقت ماہی بے آب بناتے اور روئے حبیب کی تجلیاں ہر جگہ اس کو عکس نگن معلوم ہوتی ہیں۔

ع ہر جا کہ ہست پرتو روئے حبیب است (حافظ)

ع جمال اوست ہر جا جلوہ کردہ (جامی)

حسن کے شرارے اس کے خرمن دل کو ہر وقت خاکستر بناتے رہتے ہیں، وہ اس راستے کی آبلہ پائی کو دیکھ کر گھبراتا نہیں بلکہ راہ کو پرخار دیکھ کر مستی کے عالم میں دوریٔ منزل کی دعا کرتا ہے۔ سوز عشق کی تخلیق کے بعد منزل محبت کے سربستہ رازوں کی وہ اس خوبی سے عقدہ کشائی کرتا ہے کہ مرغ عقل کی پرواز وہاں تک نہیں ہو سکتی۔

کنم از سوز عشق آں نکتہ را نی      کہ سوزد عقل از حسن نکتہ دانی

اس کے سوز عشق میں وہ حرارت پنہاں ہوتی ہے کہ اگر ایک مرتبہ حضرت مسیح بھی مع اپنے تمام سامان مداوا کے فلک چہارم سے اس کے علاج کے لئے اتر آئیں تو وہ خود بھی اسی سوز میں گرفتار ہو جائیں۔

مریض عشق را نازم کہ از بہر علاج او      مسیح ار بر سر بالیں رود بیمار می گردد

اس کا دل و دماغ ہر وقت مئے عشق کے نشے سے بیگانۂ صبر و ہوش بنا رہتا ہے۔ اس عالت میں اول تو غم دنیا اس کے دل میں آتا ہی نہیں اور بفرض محال اگر آ بھی گیا تو وہ معشوق کی محبت کی شکل میں جلوہ نما ہوتا ہے۔

در دل ما غم دنیا غم معشوق شود      بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما (عرفی)

جب "روئے نکو" اس کے حسن پرست دل کے نزدیک "معالجۂ عمر کوتہ" کا مرتبہ پائے ہوئے ہے تو پھر اس کے عشق کی سرمستیوں کا کون مقابلہ کر سکتا ہے۔

روئے نکو معالجۂ عمر کوتہ است      ایں نسخہ از بیاض مسیحا نوشتہ ایم (نظیری)

ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک لاکھوں علما و فضلا اور عاقل و فرزانہ زینت بخش جہان آب و گل ہوئے لیکن آج ان میں سے اکثر کے نام و نشان سے بھی ہمارے دماغ آشنا نہیں۔ اس گمنامی کا باعث بظاہر تو دورِ زمانہ معلوم ہوتا ہے لیکن ایران کا تبکدۂ عشق ان کی گمنامی کی وجہ بیگانگی عشق اور ناآشنائی محبت قرار دیتا ہے۔

ہزاراں عاقل و فرزانہ رفتند      وے از عاشقی بے گانہ رفتند
نہ نامے ماند ز ایشاں نہ نشانے      نہ در دست زمانہ داستانے

اس فرش خاک پر نوع بنوع مرغان خوش نوا خوش پیکر اپنی نغمہ سنجی اور ترانہ نوازی سے داد خوش نوائی دے رہے ہیں مگر ان میں سے کتنے ہیں جن کی شکل و صورت سے ہم واقف ہیں لیکن ان کے مقابل پروانہ و بلبل کے نام اور ان کی مکمل حالت سے ہر شخص آگاہ ہے۔ اس کی وجہ بھی وہی ہے جو ابھی بیان کی جا چکی ہے یعنی اول الذکر بیگانگی عشق کی وجہ سے دور از نام و نشان رہے اور ثانی الذکر شمع و گل کی شیفتگی کی وجہ سے آشنائے خلق ہوئے۔

بسا مرغان خوش پیکر کہ ہستند — کہ خلق از ذکر ایشاں لب بہ بستند
چو اہل دل ز عشق افسانہ گویند — حدیث بلبل و پروانہ گویند

اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ ہر شخص سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

بنہ در عشق بازی داستانے — کہ باشد از تو در عالم نشانے

اس مشرب کو وہاں اتنی ترقی ہوئی کہ مرید جب پیر و مرشد کے سامنے دست بیعت دراز کرتا ہے تو پیر سب سے پہلے اس سے یہ کہتا ہے۔

ع برو عاشق شو، آنگہ پیش من آے

بوڑھے، جوان، رند، صوفی، غنی اور فقیر سب اسی رنگ میں مست تھے۔ ہر شخص اسی میں فنا ہونے کی تمنا کرتا تھا۔ کسی کو اس مرض سے شفا یابی کی خواہش نہ تھی۔

ع من نہ خواہم تندرستی خویش را

جب مریض کو طبیب دیکھنے آتا ہے تو عاشق مزاج مریض، طبیب کا حسن و جمال دیکھ کر مبہوت سا ہو جاتا ہے اور اسی حالت میں سب کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

ع خوش طبیبے ست بیا تا ہمہ بیمار شویم

اس کے نزدیک شہید عشق کا مرتبہ شہید مذہب سے بہت بڑھا ہوا ہے کیونکہ شہید مذہب کشتۂ دشمن ہے اور شہید عشق کشتۂ دوست۔

غازی برہ شہادت اندر تگ و پوست — غافل کہ شہید عشق فاضل تر از دوست
در روز قیامت ایں بداں کے ماند — کیں کشتۂ دشمن ست و آں کشتۂ دوست

اس کے مقابل جب عرب کی طبائع اور ان کے جذبات پر ایک گہری نظر ڈالی جاتی ہے تو جوش و خروش کا سامان اندازے سے زیادہ معلوم ہوتا ہے لیکن سوز و گداز کا کوسوں پتہ نہیں، سوز و گداز نتیجہ ہوتا ہے عشق و الفت کے غلبے کا۔ جب اس غلبے کا سامان ہی مکمل نہ ہو تو پھر جذبات میں اس کے آثار کیسے پیدا ہو سکتے ہیں۔ عشقیہ جذبات کی تخلیق تمدنی ترقی اور آب و ہوا کی لطافت کے زیر اثر ہوتی ہے۔ عرب کی

سوسائٹی کو ان باتوں میں سے ایک بات بھی حاصل نہ تھی بلکہ اکثر برائیاں سوسائٹی کا جزو بن گئی تھیں آب و ہوا میں لطافت و پاکیزگی کا نام و نشان نہ تھا۔ تمام عرب میں جہاں عشق و محبت کے چرچے زیادہ نظر آتے ہیں وہ صرف قبیلۂ بنی عذرہ ہے۔ چونکہ اس قبیلے کی جائے رہائش اپنی سرسبزی اور آب و ہوا کی لطافت کے اعتبار سے دوسرے حصص ملک سے بہتر حالت میں تھی اس وجہ سے عرب کی عشقیہ شاعری کے اکثر عاشق و محبوب اسی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب تمام ملک میں صرف ایک قبیلہ عشقیہ جذبات میں ممتاز سمجھا جاتا ہو تو پھر اس ملک کے عام عشقیہ انداز میں سوز و گداز کی چاشنی نہیں پیدا ہو سکتی۔ ایرانی شاعر کو چونکہ یہ سامان حاصل تھے اس لئے وہ اس رنگ کو اس درد کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ سننے والا مضطرب ہو جاتا ہے مگر عربی شاعر میں اضطراب پیدا کرنے کی طاقت نہیں اس کے نزدیک لذت حیات دل کے اضطراب میں پوشیدہ نہیں بلکہ فخر و نبرد آزمائی کے پردے میں نہاں ہے۔ مقتول جنگ کا مرتبہ اس کے نزدیک کشتۂ عشق سے بڑھا ہوا ہے۔

اس تمام تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ فارسی شاعری کو اس معاملے میں جو رفعت حاصل ہے وہ دنیا کی کسی اور شاعری کو حاصل نہیں۔ فارسی شاعر جب سوز و گداز کے جذبات ادا کرتا ہے تو دلوں میں آگ سی لگ جاتی ہے۔

مرا مسوز کہ نازت ز کسر پا افتد — چو خس تمام شود شعلہ ہم ز پا افتد (ابوطالب کلیم)

یعنی مجھ کو نہ جلاؤ ورنہ تمہارا غرور بھی خاک میں مل جائے گا کیونکہ خس جل جانے کے بعد اس کا شعلہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

تو گر بر ہم زنی سودائے دل نازے زیاں داری — مرا سرمایۂ دنیا و دیں نابودی گردد (نظیری)

یعنی "دل کی خرید و فروخت کا جو معاملہ طے ہو چکا ہے اس کو تو اگر شکست کر دے گا تو تیرا صرف ایک ناز ہی کا نقصان ہوگا لیکن میرا تو دنیا و دیں کا تمام سرمایہ جاتا رہے گا۔" فارسی شاعر کا کلام اس چاشنی سے کیسے خالی ہو سکتا ہے جبکہ اس کا وظیفۂ حیات اور مقصد زندگی بجز دعائے سوز اور کچھ نہیں۔

یارب آں سوز فگن در دل دیوانۂ ما — کہ کلیم آید و آتش برد از خانۂ ما (ملا باقر کاشانی)

جوش و مستی | عشقیہ شاعری میں علاوہ دیگر چیزوں کے جوش و مستی کے انداز کی بھی خاص ضرورت ہے۔ یہ دونوں چیزیں عشق و محبت کی خصوصیات اور لوازمات میں داخل ہیں اور عشقیہ شاعری میں ہر اس چیز کا بیان جسے عشق و محبت سے خاص تعلق ہے ازبس ضروری ہے اور صرف بیان ہی پر اکتفا نہیں کیا جاسکتا بلکہ اس کے اندازے اور مرتبے پر بھی نظر رکھنی پڑیگی یعنی جو چیز اپنے اثرات کے لحاظ سے جس مرتبے اور حیثیت کی ہوگی اسی اندازے سے قلم میں طاقت و قوت بھی پیدا کرنا پڑے گی مثلاً یہ نہیں ہوسکتا کہ سوز و گداز یا جوش و مستی جو معاملات عشق میں ایک خاص اور معیاری ورجے کی چیزیں ہیں معمولی اسلوب اور سادہ انداز سے بیان کردی جائیں۔ اگر ان چیزوں کے بیان میں دماغی قوتوں کو خاص طریقے سے بروے کار نہیں لایا جائے گا تو یقیناً عشقیہ رنگ میں بدنمائی پیدا ہو جائے گی اور دلکشی کے تمام سامان مفقود ہو جائیں گے۔ جوش و مستی کی تعریف میں تھوڑا سا اختلاف پایا جاتا ہے بعض کے نزدیک اس کے یہ معنی ہیں کہ "مضمون شعر کو اس انداز سے بیان کیا جائے کہ اس میں بے ساختگی اور اثریت کے پہلو ہر نہج سے نمایاں رہیں یعنی کلام کو دیکھ کر یہ نہ کہا جائے کہ اس مضمون کو زبردستی باندھا ہے بلکہ یہ معلوم ہو کہ شاعر کے منہ سے خود بخود یہ مضمون نکلا ہے" اور بعض کے نزدیک "مضمون کو زوردار اور جوشیلے الفاظ میں ظاہر کردینا کافی ہے۔" لیکن میرے نزدیک جوش و مستی کی صحیح تعریف یہ ہے کہ کسی مضمون کو نہایت جوش و خروش اور والہانہ انداز سے بیان کیا جائے۔ اس تعریف میں سابقہ تعریفات بھی اچھی طرح آجاتی ہیں۔ زیادہ الٹنے پھیرنے کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

حقیقت میں یہ چیز ہر موقع پر کلام کی اثریت اور افادیت میں وسعت پیدا کردیتی ہے اور خاص کر عشقیہ مضامین میں تو صد درجہ کیف کے سامان اس سے پیدا ہو جاتے ہیں یہ بالکل صحیح ہے کہ عشقیہ انداز کی ساری کیفیت اسی جوش و مستی کے پردے میں مضمر ہے۔

عہد قدیم کی شاعری میں سب سے زیادہ جوش و خروش جس کی شاعری میں پایا جاتا تھا وہ عبرانیوں کی سیدھی سادی اور سچی شاعری تھی چنانچہ ایک مغربی محقق کا یہ ایک مشہور قول ہے کہ "عبرانی شاعروں کے کلام میں اس قدر جوش ہے کہ ان کا شعر سن کر یہ معلوم ہوتا ہے گویا صحرا میں ایک تنا ور درخت جل رہا ہے

یا ایک شخص پر وحی نازل ہو رہی ہے۔"

عبرانی کے بعد اس جوش و خروش کی سب سے زیادہ حامل عربی شاعری سمجھی جاتی ہے شعرائے عرب نے اپنی شاعری میں عبرانی اثر پیدا کرنے کی ان تھک کوشش کی لیکن مرضی کے موافق ان کو کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور اسی ناکامیابی کی وجہ سے ان کو آخر میں عبرانی شاعری سے ایک قسم کی نفرت سی ہو گئی تھی۔ عربی شاعری کے جوش آور مضامین سے کسی کو مجالِ انکار نہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس کا سارا جوش وخروش رزمیہ شاعری تک محدود ہے۔ عبرانی جوش وخروش کے جو نمونے اس وقت پائے جاتے ہیں وہ عربی کے رزمیہ جوش کے مقابلے میں بالکل بے اثر اور بے کیف سے نظر آتے ہیں۔ اس صنف سے ہٹ کر عشقیہ رنگ میں اگر دیکھا جائے تو وہ جوش وخروش اور سرمستی نہیں جو فارسی کے عشقیہ رنگ میں ہے اگرچہ فارسی شاعری کی عشقیہ سرمستی خود اس پر طاری ہونے والی سرمستی نہیں ہے بلکہ یہ بھی دوسروں کے جذبات کی ترجمانی ہے لیکن اس کے باوجود تمام دنیا کی عشقیہ سرمستیاں اس پر نثار ہو سکتی ہیں۔ اس رنگ کے اندر بھی گو عربی شاعر نے ایرانی سرمستیاں پیدا کرنے کی انتہائی کوشش کی ہے لیکن اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کے برخلاف فارسی کی عشقیہ شاعری جوش و سرمستی کے واقعات سے لبریز ہے۔ رودکی سے لے کر قاآنی تک کی سینکڑوں برس کی شاعری پر نظر ڈال جائیے۔ اس عرصے میں سینکڑوں شعرا منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے مگر آب و ہوا کی یکرنگی اور اثر انگیزی کا یہ عالم رہا کہ ان کی عشقیہ شاعری میں جوش و سرمستی کی ذرہ برابر بھی کمی نہیں ہوئی۔ ایرانی شاعر اس قسم کی کیفیت کو جب اپنے خاص رنگ میں بیان کرتا ہے تو سامع کی طبیعت میں ایک آگ سی لگ جاتی ہے۔ اس آخری دور میں جب ایران سے شاعری کا نام مٹ چکا تھا مرزا قاآنی نے اس رنگ کو اتنا ابھارا کہ درمیان کی سب کوتاہیاں دور ہو گئیں۔

شعر میں جوش و سرمستی پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ مضمون میں بندش الفاظ اور اسلوب بیان کی معاونت سے والہانہ انداز پیدا کر دیا جائے۔

دلم بردہ است شوخے شاہدے شنگ کہ ہمچوں او

نہ ماہے از ختن خیزد نہ ترکے از حصار آید

سادہ سا خیال ہے لیکن جوش و سرتی کی فراوانی نے اس خیال کو نہایت شوخ بنا دیا ہے۔

نگارا صبح نوروزاست و روز بوسہ امروزاست     کہ در اسلام ایں سنت بہر عیدے شعار آید

مضمون شعر میں کوئی خاص ندرت و جدت نہیں لیکن جس چیز نے اس کو مستی آور بنا دیا ہے وہ صرف جوش و سرتی کا ایک خاص انداز ہے۔

محبوب معشوقانہ اداؤں کو چھوڑنا چاہتا ہے عاشق کو یہ بات کسی طرح پسند نہیں۔ وہ نہایت جوش کے عالم میں کہتا ہے:۔

ہنوز ایمان و دل بسیار غارت کردنی دارد     مسلمانی میاموز آں دو چشم نامسلماں را

عشقیہ انداز میں جوش و سرتی پیدا ہونے کی دو وجہ ہیں سب سے بڑی وجہ آب و ہوا کی فرحت انگیزی اور لطافت ہے اور دوسرا سبب تمدن و معاشرت کی ترقی۔ آب و ہوا کی لطافت اول تو جوش و سرتی کی تخلیق کی خود ضامن ہے اور اگر تمدن و معاشرت بھی بہتر حالت میں ہو تو پھر مستانہ مضامین کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ ایران کا تمدن جس بلندی پر پہنچ چکا تھا اس کے متعلق کئی جگہ روشنی ڈالی جا چکی ہے اور عرب کی گرم و خشک آب و ہوا اور دیہی تمدن کی پستی کے بارے میں بھی مختلف جگہ تفصیلی رائے کا اظہار کیا جا چکا ہے۔ ایران کی عشقیہ شاعری میں جس قدر جوش و سرتی کی فراوانی پائی جاتی ہے وہ نتیجہ ہے صرف ایرانی آب و ہوا کی لطافت اور تمدن و معاشرت کی ترقی کا۔ اگر عرب کی آب و ہوا اور تمدن کی حالت بھی ایران کے مماثل ہوتی تو یقیناً یہاں کی عشقیہ شاعری میں بھی ایرانی سرستیاں مکمل طریقے سے پائی جاتیں۔

تصد و تبدی عن اسیل و تتقی     بناظرۃ من وحش وجرۃ مطفل

یعنی وہ حسینہ ہم سے براہ ناز اعراض کرتی ہیں اور اپنا رخسار بطور رکاوٹ ہمارے سامنے ظاہر کرتی ہے اور اپنی آنکھوں کے ذریعے جو موضع وجرہ کے جانوروں کی طرح ہیں آڑ کر لیتی ہیں اور میں اس کی چشم میگوں کو دیکھ کر مست ہو جاتا ہوں اور تاب نظارہ نہیں رہتی۔

عرب کی عشقیہ شاعری میں یہ شعر ایک خاص مرتبہ رکھتا ہے۔ عاشقانہ سادگی اور دیگر خصوصیات عاشقانہ اپنی جگہ پر بہتر حالت میں ہیں لیکن وہ جوش و سرتی جو آب و ہوا کی لطافت اور تمدن و معاشرت

کی ترقی کا نتیجہ ہوتی ہے اس جگہ کمی کے ساتھ ہے۔

رقابت | معاملات عشق میں رقابت کو ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ عاشق اپنے غلبۂ عشق کی وجہ سے یہ چاہتا ہے کہ محبوب صرف اس کی آرزوؤں کی ہر وقت تکمیل کرتا رہے۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو اپنی تمام آزادیوں کو سلب کر کے دوسرے کے اختیار میں اپنی باگ دیدے۔ پھر بھلا محبوب جس کی سرشت اور جبلت میں خود پسندی کا مادہ بھرا ہوتا ہے وہ اپنی عادت ثانیہ کو چھوڑ کر کس طرح دوسروں کی آرزو کا تکمیل کنندہ بن سکتا ہے، اس کو کیا ضرورت ہے کہ وہ اپنی آزادی پر خواہ مخواہ کی پابندیاں عائد کر کے اپنی زندگی کو مصیبتناک بنالے۔ وہ دوسروں سے ملتا ہے، ان کی انجمنوں اور جلسوں میں شریک ہوتا ہے۔ دوسرے اس کے یہاں آتے جاتے ہیں۔ عاشق کو یہ باتیں بہت بری معلوم ہوتی ہیں۔ محبوب نے جہاں دوسرے سے خندہ روئی سے بات چیت کی بس عاشق کے دل پر بجلیاں سی گرنے لگیں اور چہرے پر افسردگی کے آثار پیدا ہونے لگے۔

اگر یک حرف با اغیار با من صد سخن گوید ندارم تاب آں یک حرف ہم خواہم بمن گوید

یہ اسی کا اثر ہوتا ہے کہ عاشق کے دل میں محبوب کی طرف سے طرح طرح کے گمان پیدا ہونے لگتے ہیں اور ہر شخص کو وہ اپنا رقیب سمجھنے لگتا ہے حتیٰ کہ یہ معاملہ ترقی کر کے باہمی عداوت کا ایک مستقل مضمون بن جاتا ہے۔ عرب میں رقیب کا لفظ محافظ کے معنی میں مستعمل ہوتا تھا۔ محبوب کے محافظ جو عموماً اہل خاندان ہوتے تھے عرب ان کو رقیب کے لفظ سے یاد کرتے تھے لیکن فارسی علم میں ایک معشوق کے کئی عاشق آپس میں رقیب کہلاتے ہیں۔ فارسی کی جدت پسندی نے اس کی صفات بھی پیدا کرلیں۔

گفتم اے مہ! با رقیب روسیہ کمتر نشیں زیر لب خندید گفتا او نمی گوید چنیں

اس شعر میں رقیب کے ساتھ لفظ روسیاہ کا اضافہ کر کے اس کے معنوں میں اور شدت پیدا کر دی ہے۔
عربی شاعری میں چونکہ رقیب کے معنی محدود تھے اور اس کی صفات بھی متعین نہیں ہوئی تھیں، اس لئے اس میں رقابت کے مضامین کی وہ بہتات نہیں جو فارسی شاعری میں ہے۔ عربی شعرا کو بھی رقیبوں (محافظوں) کے ساتھ معرکہ آرائی کے مواقع پیش آئے ہیں لیکن چونکہ ان کے یہاں یہ لفظ

اپنے خاص معنی موضوع لہ میں استعمال ہوتا تھا اس اعتبار سے عربی شاعری میں اس عنوان پر قلم کی جنبش فارسی شاعری کی وسعت کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ فارسی میں ہیں چونکہ یہ لفظ معنی غیر موضوع لہ میں با دنیٰ مناسبت استعمال کیا جاتا ہے اس لئے فارسی شعرا نے اس مضمون میں انتہائی خیال آفرینیوں سے کام لیا۔

رقیب کی شرارتیں بعض وقت معشوق کے ظلم و ستم سے بھی سبقت لے جاتی ہیں۔ عاشق کو جو تکلیف رقیب کی خصومت سے پہنچتی ہے محبوب کی کج ادائیوں اور ظلم انگیزیوں سے نہیں پہنچتی بعض وقت عاشق خیال کرتا ہے کہ اس کمبخت کی شکایت خود معشوق سے کرنی چاہئے لیکن پھر سوچتا ہے کہ معشوق کو میری باتوں پر رقیب کے داؤ پیچ کی وجہ سے اعتبار نہیں آئے گا اس لئے دوسروں سے کہلاتا ہے تاکہ دوسرے کے کہنے سے کچھ زیادہ اثر ہو سکے۔

ایں کہ با من کردہ ہر دم غیر غوغائے دگر  خواہم آں مہ بشنود از من از جائے دگر

بزم نشاط میں عاشق و معشوق اور رقیب جمع ہیں معشوق کی نظریں عاشق کے چہرے پر جمی ہوئی اس کی حرکات و سکنات کا مطالعہ کر رہی ہیں لیکن عاشق بیچارے کی آنکھیں اس بات پر لگی ہوئی ہیں کہ کہیں رقیب تو محبوب کی جانب بری نظر سے نہیں دیکھ رہا ہے۔

تو واقفِ من و من واقفِ نگاہ رقیب  تو پاس خرمن و من پاس خوشہ چیں دارم

معشوق جو مہربانیاں رقیب کے ساتھ کیا کرتا تھا اتفاق سے اس کا حال عاشق کو بھی معلوم ہو گیا۔ عاشق اپنے مقابلے میں مراعات رقیب کی شکایت کرتا ہے لیکن اس عرصے میں محبوب رقیب سے اس بات پر ناخوش ہو جاتا ہے کہ اس نے میری اس پاسداری کی خبر عاشق سے کیوں اور کس وجہ سے کی۔ اب عاشق نہایت ہوشیاری سے معاملے کو طوالت سے بچانے کے لئے خیال محبوب کی تردید کرتا ہے۔

لطف تو دانستہ ام با غیر، از ہجرم مرنج  کو نگفت ایں با من از جائے دگر دانستہ ام

عاشق کو اپنے سر جانے کا کوئی خوف نہیں لیکن یہ خیال اس کو ستاتا ہے کہ کہیں کمبخت رقیب میری سفارش اور شفاعت کے حیلے سے قدم محبوب کا بوسہ نہ لے لے۔

ندارم بیم سر ترسم کہ در ہنگام قتل من  زند غیرے بتقریب شفاعت بوسہ بر پایش

محبوب رقیب کے کہنے میں ہے۔ رقیب کے سامنے اس کی ایک نہیں چلتی۔ مجبور ہو کر رقیب ہی سے التجا کرتا ہے کہ تمام دنیا کی نعمتیں تجھ کو مبارک ہوں لیکن میرا محبوب میرے قبضے میں رہنے دے۔

برادرانہ بیا قسمتے کنیم رقیب! جہان و ہرچہ درو ہست از تو، یار از من

بزم میں معشوق کا غصہ اور غضب کی حالت میں شمشیر بدست آنا عاشق کو اس وجہ سے اچھا لگتا ہے کہ رقیب اور بوالہوس اس حالت کو دیکھ کر راہِ فرار اختیار کریں گے اور مجھ کو وفاداری اور جاں نثاری کے ظاہر کرنے کا موقع مل سکے گا۔

خوش آں ساعت کہ آید ترک من شمشیر کیں با او رقیباں جملہ بگریزند و من مانم ہمیں با او

معشوق رقیب پر مہربان سا معلوم ہوتا ہے۔ عاشق چونکہ یہ منظر اپنی آنکھ سے دیکھ نہیں سکتا اس لئے وہ رقیب کو بھڑکانے یا افتراق پیدا کرنے کے لئے چال چلتا ہے کہ محبوب کا یہ لطف و کرم حقیقت میں کوئی لطف و کرم نہیں بلکہ مجھ کو ستانے اور پریشان کرنے کے لئے یہ سارا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔

نداردا اے رقیب! آں سست پیماں با تو ہم لطفے گہے حال تو بر رغم من آنگارمی پرسد

عاشق کی نظروں میں رقیب کی کوئی منزلت ہی نہیں ہوتی۔ وہ اس کو ہمیشہ پست خیال اور دوں ہمت سمجھا کرتا ہے۔ معاملات محبت کی گہرائیوں کے متعلق کبھی کوئی راز کی بات اس کے منہ سے نکل جاتی ہے تو اس کو خفیف کرنے کے لئے کہہ دیتا ہے کہ "ایں گفتہ من است"

گر گفتہ ز عشق، گہے حرف آشنا آں ہم حکایتے است کہ از من شنیدہ

لیکن بعض وقت ایسا موقع آجاتا ہے کہ رقیب کے مقابل ایک نہیں چلتی اس لئے وہ اپنی ذلت پر ایک عجیب و غریب طریقے سے پردہ ڈالتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ تمام ظلم و ستم میرے لئے باعث تسکین ہیں کیونکہ یہ تمام باتیں میرے محبوب کے اشارے سے ظہور میں آ رہی ہیں اور اس کا ظلم خواہ وہ کسی واسطے سے ہو میرے لئے عین لطف ہے۔

صد جور می کنی و نمی رنجم اے رقیب چوں آگہم کہ ایں ہمہ فرمودہ ئی کنی

عاشق معشوق کے مکان پر جانا چاہتا ہے لیکن یہ خیال اس کو مانع ہوتا ہے کہ میرے نشان پا

سے رقیب کو بھی اس کے مکان کا پتہ معلوم ہو جائے گا، حالانکہ وہ اس بات سے بہت خوش ہے کہ محبوب کے گھر کا پتہ اس کو نہیں معلوم لیکن عاشق کو اس کی دہلیز پر جبہ سائی کے بغیر چین بھی نہیں اس لئے وہ بجائے پاؤں کے سر کے بل چلتا ہے تاکہ زمین پر نشان قدم نہ آسکیں۔

رقیب تا نبرد پے بوادی وصلت　　　بجائے پا ہمہ جا سر نہادہ می آیم

مرزا غالب نے اسی مفہوم کو ذرا اور شوخ بنا کر پیش کیا ہے۔

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں　　　ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

عربی میں یہ لفظ اگر اسی معنی میں مستعمل ہوتا جس میں فارسی شعرا استعمال کرتے ہیں تو اس میں اسی انداز کی مضمون آفرینیاں پائی جاتیں لیکن آزادانہ سرشت نے اس قسم کی مضمون آفرینیوں کو اپنے وقار کے خلاف سمجھا۔

فارسی شاعری نے گو اس رنگ کو بہت تیز اور شوخ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا لیکن اخلاقی اعتبار سے یہ چیز فارسی شاعری کے حسین چہرے پر ایک بدنما داغ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس رنگ کی تیزی نے سوسائٹی کی تعمیر اور نظام میں ایک خاص قسم کی خرابی پیدا کر دی، صلح و یکجہتی اور اتفاق و اتحاد کے آثار جن کا سوسائٹی کے قصر کی تعمیر میں ایک نمایاں حصہ ہے، ایک ایک کر کے فنا ہو گئے اور اس کے بجائے ہر قسم کی بدنظمی اور انتشار کے آثار پیدا ہو گئے، بغض و کینہ اور باہمی عداوت کی جڑیں مضبوط ہو گئیں گو بعض جگہ اس میں بھی صلح عام کی تعلیم پائی جاتی ہے لیکن وہ "الشاذ کالمعدوم" کا درجہ رکھتی ہے، زیادہ عنصر بغض و عداوت کی تعلیم کا اس میں موجود ہے۔

نیازارم زخود ہرگز دلے را　　　کہ می ترسم درو جائے تو باشد

نامہ نویسی اور نامہ بری | عشق کی دنیا میں نامہ نویسی اور نامہ بری کا رواج بھی عہد قدیم کی ایک پسندیدہ یادگار ہے۔ اس کا موقع اس وقت آتا ہے جبکہ معشوق کہیں چلا جاتا ہے یا خفا ہو کر آمد و رفت کے دروازے بند کر دیتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں بیچارے عاشق کی آباد دنیا ذرا سی دیر میں ویران ہو جاتی ہے، ساری آرزوئیں خاک میں مل جاتی ہیں، ایک عجیب پریشانی اور مصیبت کا عالم طاری ہو جاتا ہے، طرح

طرح کے تفکرات اس کو گھیر لیتے ہیں۔ اس بربادی اور مصائب کے عالم میں وہ پھر اسی آبادی کی تمنا کرتا ہے اور اس کی ہر کوشش اسی منظر کی تجدید کے لئے وقف ہوتی ہے لیکن اس کی تمام کوششیں ناشکور ثابت ہوتی ہیں۔ اس کے بعد اس کو ایک ایسے رازدار کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی طرف سے نامہ بری کے فرائض انجام دے سکے۔ اس فرض کی انجام دہی کے لئے وہ بڑے معتبر اور تجربہ کار رازداں کی جستجو کرتا ہے تاکہ اس کی درپردہ رقابت سے اس کو دوچار ہونا نہ پڑے۔ عاشق کو چونکہ قاصد کی حالت پر کبھی مکمل اطمینان نہیں ہوتا اس لئے وہ اس کی اندرونی کیفیات کا ہر وقت ایک گہرا مطالعہ کرتا رہتا ہے۔ عشق و محبت کے معاملے میں یہ ایک خاص اور اہم چیز واقع ہوئی ہے اور شعرائے ایران نے عشق کے معاملات کو جس منزل تک پہنچایا ہے اس میں ان کا کوئی شریک و سہیم نہیں لہٰذا اس راستے میں بھی ان کا کوئی حریف و مقابل نہیں معلوم ہوتا۔

ایران کا مست و بے خود شاعر اس منزل کی ہر وادی میں طرح طرح کے غنچوں کو شگفتہ کرتا چلا جاتا ہے اور اس سبق کے بیان میں گوناگوں معانی کا دفتر کھول دینا اس کے نزدیک بازیٔ طفلاں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ اس معاملے میں ان جدت طرازیوں اور مضمون آفرینیوں سے کام لیتا ہے کہ جہاں دنیا کی نگاہیں نہیں پہنچتیں۔

عام قاعدہ ہے کہ جب کسی عزیز ترین دوست کو کوئی خط لکھتا ہے تو اس کے جذبات میں ایک قسم کا تلاطم پیدا ہو جاتا ہے، مختلف قسم کے خیالات آتے ہیں اور دور ہو جاتے ہیں اور اس بحر خیال کی تلاطم خیزی کے دوران میں وہ ایک ہی بات کو کئی جگہ لکھ جاتا ہے۔ یہی حالت عاشق کے دل کی بھی محبوب کو نامۂ شوق تحریر کرنے کے وقت ہو جاتی ہے، خیالات کا طوفان اس کے سامنے اٹھتا ہے، شوق تحریر میں نہ تو ترتیب مضمون کا خیال باقی رہتا ہے اور نہ اس کی صحت کی پروا رہتی ہے۔ ایک ایک بات کو سو سو بار عالم بے خودی میں لکھ جاتا ہے۔

به جاناں نامه هرگز عاشق بیمار ننویسد — که از بے طاقتی یک حرف را صد بار بنویسد

"قاصد کو جب کوئی پیغام دیتا ہے تو اس سے ایک ایک بات کو سو سو مرتبہ کہتا ہے تاکہ وہ بھول

نہ جائے۔

چو من پیغام خود با قاصد دلداری گویم  ز بیم آں کہ از یادش رود صد باری گویم

عاشقی کی دنیا میں یہ موقع اکثر آتا ہے کہ عاشق اپنا تمام معاملہ اور اس کا نشیب و فراز قاصد کو سمجھا دیتا ہے اور ساتھ ہی انداز گفتگو بھی سرسری طریقے سے بتا دیتا ہے لیکن جب اس کو قاصد کی درپردہ رقابت کا پتہ چلتا ہے تو اس کو اپنی غفلتوں پر بہت افسوس آتا ہے اس وسیع مضمون کو فارسی کی عشقیہ شاعری نے نہایت اختصار مگر جامعیت کے انداز سے پیش کیا ہے۔

قاصد رقیب بود و من غافل از فریب  بے درد مدعائے خود اندر میاں نہاد (اسیرازی)

مرزا غالب نے بھی اسی انداز کا ایک شعر کہا ہے گو مفہوم میں جزوی فرق کہا جا سکتا ہے لیکن تاثیر کے اعتبار سے ایک ہی چیز ہے۔

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا  بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

عاشق ہجر دوست میں اپنی زندگی سے پریشان ہے۔ قاصد کو بھی محبوب کے رضامند کرنے کے لئے بھیج چکا ہے۔ عین انتظار اور بے چینی کی حالت میں قاصد محبوب کے پاس سے واپس آتا ہے۔ اس کو دیکھ کر عاشق کے چہرے پر خوشی اور مسرت کے آثار رقص کرنے لگتے ہیں اور وہ بے تابانہ انداز سے دریافت کرتا ہے کہ اے قاصد! میری جان تجھ پر قربان ہو جلد بتا کہ اس ظالم نے کیا کہا۔

قاصد بخدا آں بت عیار چہ می گفت  قربان زبان تو، بگو یار چہ می گفت

عاشق کی یہ عین تمنا ہوتی ہے کہ محبوب کے ناز و انداز سے لذت اندوز ہونے والا اس کے سوا کوئی اور نہ ہو اس لئے قاصد کی زبان سے جب وہ بیماری اغیار کا مژدہ سنتا ہے تو اس سے لمنت یہ کہتا ہے کہ میری جان تجھ پر فدا ہو اس سے بہتر کوئی مژدہ سنا۔

قاصدم مژدۂ بیماری اغیار آورد  جاں فدایش کہ رساند خبرے بہتر ازیں

عاشق محبوب کے پاس قاصد روانہ کرتا ہے۔ اتنے میں طرح طرح کے شکوک اس کو گھیر لیتے ہیں، اب وہ خدا سے دعا مانگتا ہے کہ کوئی ایسا سبب پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے وہ محبوب کے

پاس نہ پہنچ سکے۔

می نوشتم براو قاصد و می گوید رشک  سببے ساز خدایا کہ بمنزل نرسد

اس منزل میں مختلف قسم کے خیالات اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ قاصد پیغام لے کر روانہ ہو چکا ہے اور اس عرصے میں عاشق بیٹھے بیٹھے یہ سوچا کرتا ہے کہ معلوم نہیں کہ قاصد ابھی اس کے پاس پہنچا یا نہیں اور اگر پہنچ گیا ہے تو میرا حال کہاں تک کہہ چکا ہے۔

چو برد پیام قاصد کنم ایں خیال و گویم  کہ بریں حکایت من بہ کجا رسیدہ باشد

اس معاملے میں وہ موقع عجیب دلکش اور جاذب توجہ ہوتا ہے جبکہ عاشق قاصدگری کے فرائض باد صبا سے لینا چاہتا ہے۔ اس موقع پر اس کا ہر لفظ دلی احساس اور اندرونی اضطراب کی ترجمانی کرتا ہوتا ہے۔ ہر نہج اور ہر انداز سے وہ اس کی حالت و کیفیت دریافت کرتا ہے۔ غیر ذی عقل بلکہ غیر حسی چیزوں کو فرائض کی تکمیل کے لئے مجبور کرنا صرف فارسی شعرا کا کام ہے۔

اے صبا باز بہ من گوئی کہ جاناں چون است  آں گل تازہ و آں غنچہ خنداں چوں است
چشم بد خوش کہ ہشیار نہ باشد مست است  چشم میگونش کہ دیوانہ کند آں چوں است
ہم بہ جانان و سر او کہ کم و بیش مگوئے  گو ہمیں یک سخن است کہ جاناں چوں است

ان اشعار سے صرف دریافت حال اور حسرت کا پتہ چلتا ہے لیکن بعض جگہ اس بیان میں رنگینیوں اور دلفریبیوں کی روح پھونک کر مستی کا سا عالم پیدا کر دیا جاتا ہے۔ رنگین مضامین کی تمہید اس طرح اٹھائی جاتی ہے کہ بہار کا موسم شباب پر ہے، عاشق کے دل میں مستی کے آثار پیدا ہیں، باغ میں گلگشت کے لئے وہ جانا چاہتا ہے، بزم آرائی کا سامان بھی سب موجود ہے لیکن محبوب ساتھ نہیں اس لئے سارا عیش مکدر ہو جاتا ہے۔ باد بہاری کے ذریعے محبوب کے پاس یہ پیغام بھیجتا ہے کہ "باغ میں ایک عجیب انداز سے بہار آئی ہوئی ہے۔ چاروں طرف سبزہ لہلہا رہا ہے، غنچوں کی شگفتگی نے باغ میں آگ سی لگا دی ہے، خوشنما فواروں کا چلنا جنت نظر کا لطف دے رہا ہے، بلبلوں کی نغمہ سنجی فردوس گوش بنی ہوئی ہے" اور اسی کے ساتھ اس کو یہ بھی سمجھا دیتا ہے کہ "اگر وہ باتوں میں ٹالنا چاہے تو کسی طرح

نہ ماننا بلکہ جس طرح ممکن ہو سکے اس کو یہاں لے آنا۔"

آمد بہار و شد چمن و لالہ زار خوش | وقتے است خوش بہار کہ وقت بہار خوش
در باغ با ترانہ بلبل دریں ہوا | مستی خوش است و بادہ خوش است و بہار خوش
اے باد کاہلی مکن و سوئے دوست رو | ما را بکن بہ آمدن آں نگار خوش
چیزے دگر مگوئے ہمیں گو کہ در چمن | سبزہ خوش است و آب خوش و جوئبار خوش
گر خوش کند ترا بہ حدیثے کہ باز گرد | مشنو زینہار خوش

ان اشعار کی لطافت اور انداز بیان پر غور کیجئے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مستی اور شوخی کا دریا بہہ رہا ہے۔

شعرائے عرب کے یہاں نامہ بری کے مضامین کا کم پتہ چلتا ہے کیونکہ اول تو وہ اپنے ذاتی معاملات میں کسی کو رازدار نہیں بناتے تھے اور دوسرے وہ اس معاملے میں اتنے جری ہوتے تھے کہ مصائب برداشت کر کے محبوب کے پاس پہنچ جاتے تھے۔

چونکہ ملک کا اکثر حصہ خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا جس جگہ پانی کے چشمے وغیرہ ہوتے تھے اس جگہ خیمے نصب کر دیے جاتے تھے اور یہ حالت سب کے لئے ایک ہی وقت میں پیش آتی تھی جس موسم میں معشوق کے قبیلے والے پانی وغیرہ کی تلاش میں رخت سفر باندھتے تھے اسی موسم میں عاشق کے قبیلے والوں کو بھی کوچ کا سامان کرنا پڑتا تھا۔ قریب قریب ایک ہی منزل میں پڑاؤ ہوا کرتا تھا اس لئے نہ تو ان کو خطوط لکھنے کی نوبت آتی تھی اور نہ کسی کو نامہ بر بنانے کی ضرورت ہوتی تھی۔ سال میں ایک مرتبہ ان کو یہ موقع ضرور پیش آجاتا تھا اور جب وہ ایک دوسرے سے جدا ہوتے تھے تو دوبارہ ملنے کی ساری تدبیریں پہلے ہی سے سوچ لیتے تھے۔ یہ تھے وہ اسباب جن کی بنا پر عرب کے عاشقوں کو اس کی ضرورت کم پڑتی تھی لیکن ایران میں چونکہ یہ طریقے جاری نہ تھے اس لئے ان کو بغیر اس کے کوئی چارۂ کار نہ تھا اور یہی سبب ہے کہ شعرائے ایران کے یہاں اس عنوان پر بہت کچھ مواد ہے۔

---

# قربانی کی دینی حیثیت!

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم!

رسالہ جامعہ کے اگست نمبر میں "صدائے حق" کے نام سے ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں قربانی کے متعلق نہایت عالمانہ، عارفانہ اور ناصحانہ لب ولہجے میں گفتگو کی گئی ہے اور آخر میں فیصلہ فرمایا گیا ہے کہ بحالات موجودہ قربانی ایک رسم باطل سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔

مذہب سے متعلق گفتگو کے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں یا تو گفتگو منقولات کی حد تک محدود ہو یا معقولی انداز میں نفس مسئلہ پر اثباتی یا سلبی اعتبار سے اظہار خیال کیا جائے اور ان دونوں صورتوں میں یہ ضروری ہے کہ معترض جس چیز پر اعتراض کر رہا ہے اس کے مالہ وماعلیہ سے واقف ہو منقولات سے متعلق تمام چیزیں اس کے پیش نظر ہوں، مذہبی تعلیم، احکام، اور اوامر سے بھی وہ پورے طور سے آشنا ہو اس کے متعلق موافقت یا مخالفت میں جو کچھ کہا گیا ہو وہ بھی اس کے سامنے ہو، پھر اسے بلاشبہ حق ہے کہ وہ کسی مسئلے پر گفتگو کرے اور اپنے نقطۂ نظر سے اسے غلط یا صحیح قرار دے۔

لیکن جب صورت حال برعکس ہو محض غور وفکر یا اقتباس واستنباط سے کوئی رائے قائم کر لی گئی ہو اور منقولی اعتبار سے اس کا کیسہ معلومات بالکل خالی ہو تو میرے خیال میں یہ بہت بڑی جرأت ہوگی اگر پھر بھی پورے ادعا کے ساتھ گفتگو کر کے کوئی آخری فیصلہ کر دیا جائے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ "صدائے حق" کے نام سے جن صاحب نے اپنا مضمون شائع کرایا ہے انھوں نے یہی دوسری صورت اختیار کرائی ہے۔

انھوں نے بعض مقامات پر ترجمہ غلط کیا ہے نفس مسئلہ سے متعلق تمام آیات قرآنی کو اپنے سامنے نہیں رکھا ہے، حدیث وسنت کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے، نہایت ناقص طور سے چند آیتیں انھوں نے لکھ دی ہیں اور ان سے سیاق وسباق سے بالکل الگ ہو کر ایک نتیجہ اخذ کر لیا ہے اور اسی کو وہ

ملحدانہ انداز میں پیش کر رہے ہیں گویا جو کچھ وہ فرما رہے ہیں وہ مدلل بھی ہے۔

بہرحال، یہ ضروری نہیں کہ اس معاملے میں محترم مقالہ نگار کی پیروی کی جائے۔ مناسب یہ ہے کہ اصل مسئلے پر سنجیدگی سے غور کیا جائے کہ جو کچھ وہ فرما رہے ہیں اس میں کہاں تک شائبۂ صداقت ہے اور کہاں تک ادعا محض؟

ارشاد ہوا ہے:۔

"قربانی کی ابتدا ہر ملک اور ہر قوم کی ابتدائی تہذیب میں اس باطل اعتقاد کے ماتحت ہوئی ہے کہ خدا اپنی شکل، ضروریات، عادات و جذبات میں انسان کے مشابہ ہے اور جو جانور، شراب، پھول پھل اور زیورات وغیرہ اس پر چڑھائے جاتے ہیں وہ ان کا جوہر استعمال کرتا ہے۔"

محترم مقالہ نگار صاحب جس چیز کو ایقانی لب و لہجے میں "اعتقاد باطل" قرار دے رہے ہیں قرآن مجید کا فیصلہ اس کے متعلق دوسرا ہے۔

ولکل امۃ جعلنا منسکا لیذکروا اسم اللہ علی ما رزقہم من بہیمۃ الانعام فالٰہکم الٰہ واحد فلہ اسلموا وبشر المخبتین الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبہم والصٰبرین علی ما اصابہم والمقیمی الصلوٰۃ ومما رزقنٰہم ینفقون ٥

اور ہم نے ہر امت کے لیے قربانی کرنا اس غرض سے مقرر کیا کہ وہ ان مخصوص چوپاؤں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو عطا فرمائے تھے۔ سو تمہارا معبود ایک ہی خدا ہے تو تم ہمہ تن اسی کے ہو کر رہو اور آپ گردن جھکانے والوں کو خوشخبری سنا دیجئے، جو ایسے ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جو ان مصیبتوں پر کہ ان پر پڑتی ہیں صبر کرتے ہیں اور جو نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

(ترجمہ از حکیم الامۃ حضرت مولینا اشرف علی صاحب تھانوی)

آیات بالا نے اس "اعتقاد باطل" کی تردید کر دی ہے جو اقتباس بالا میں پیش کیا گیا ہے۔

اسلامی قربانی اس قربانی سے مختلف ہے جو مختلف چیزوں کے مختلف دیوتاؤں کی خوشنودی مزاج کی خاطر کی جاتی تھی۔ قربانی کا مقصد یہ قرار دیا گیا کہ لوگ ان جانوروں پر " اللہ کا نام لیں " " جو معبود ہے اور " جو ایک ہی ہے " اور بتوں اور دیوتاؤں کو چھوڑ دیں کہ صرف اسی کے آگے گردن جھکانے والوں کو خوشخبری ہے "۔

یہاں اس خیال کی بھی تردید ہو جانی چاہیئے کہ " خدا ان چیزوں کا جوہر استعمال کرتا ہے " اس لئے کہ قرآن مجید میں اس کی صاف و واضح الفاظ میں تردید موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ کو گوشت و خون نہیں پہنچتا بلکہ تقویٰ پہنچتا ہے۔ مطلب یہ کہ جس جذبے، جس روح اور جس نیت کے ماتحت قربانی کی جاتی ہے اللہ تعالیٰ اسے دیکھتا ہے اور اسی کے ماتحت عذاب و ثواب کا حکم صادر فرماتا ہے۔

آگے چل کر فرمایا ہے :-

" خدا نے جب عرب کی نیم وحشی قوم میں آج سے چودہ سو برس پہلے نبی آخرالزماں کے ذریعے سے اپنی ذات وصفات کا صحیح تصور قائم کرنا چاہا تو اس مروجہ رسم کو شراب یا ربا کی طرح سے حرام یا ناجائز نہیں کیا کیونکہ وہ شراب یا ربا کی طرح سے مخرب اخلاق یا مضر نہیں تھی بلکہ وقتی اور مقامی تمدنی ضروریات کے لحاظ سے ایک مفید اور کارآمد رسم تھی۔

مضمون کا سب سے دلچسپ حصہ یہی ہے۔ اس سے پیشتر مضمون نگار صاحب اس رسم کو " اعتقاد باطل " قرار دے چکے ہیں اور اب ارشاد ہوتا ہے کہ " نبی آخرالزماں کے ذریعے سے (خدا نے) اپنی ذات وصفات کا صحیح تصور قائم کرنا چاہا " تو اسے جائز رکھا اس لئے کہ یہ رسم " مخرب اخلاق یا مضر نہیں تھی " " بلکہ ایک مفید اور کارآمد رسم تھی "۔

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا ؟

اسی سلسلے میں ارشاد ہوا ہے :-

" لن ینال اللہ لحومها ولا دماؤها ولکن ینالہ التقوی منکم یعنی نہ ان کا گوشت اور خون خدا قبول کرتا ہے بلکہ وہ تمہارا تقویٰ قبول کرتا ہے (اس آیت کا) یہی مطلب ہے کہ جانوروں

کی خوں ریزی خدا کی نظروں میں کوئی احسن فعل نہیں کیونکہ وہ گوشت اور خون کو قبول نہیں کرتا ہے"

یہ معلوم کس مقصد کے ماتحت مضمون نگار صاحب نے اس مقام پر آیت کا ترجمہ غلط کیا ہے۔ اول تو یہ کہ انھوں نے اللہ کو فاعل قرار دیا ہے حالانکہ اس جگہ "لحوم" فاعلی حالت میں ہے، دوسرے یہ کہ "ینال" کا ترجمہ فرمایا ہے "قبول" کرتا ہے حالانکہ صحیح ترجمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تقویٰ پہنچتا ہے۔

پہلے زمانے میں یہ دستور تھا کہ مشرکین جب قربانی کرتے تھے تو خانہ کعبہ پر خون کے چھینٹے دیتے تھے اور گوشت چڑھاتے تھے اُسی "اعتقاد باطل" کے ماتحت جس کا ذکر مضمون نگار صاحب فرما چکے ہیں لیکن اسلام نے منجملہ اور عقائد باطلہ کی اصلاح کے اس "اعتقاد باطل" کو بھی دور کر دیا کہ اس خون چھڑکنے اور گوشت چڑھانے سے کیا فائدہ۔ یہ چیزیں تو خدا تک پہنچنے سے رہیں (اگرچہ ان کی مقبولیت میں کوئی شبہ نہیں) خدا تک پہنچنے والی جو چیز ہے وہ تمھارا تقویٰ ہے یعنی خلوص نیت ہے کہ تم یہ قربانی "رئاء الناس" کر رہے ہو یا "حسبۃً للہ"۔ پہلی صورت میں وہ مردود ہے اور دوسری صورت میں مقبول۔ تفصیل کی اگر ضرورت ہو تو ابن جریر، کشاف اور دوسری معتبر کتب تفسیر میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

رہا "وقتی، مقامی اور تمدنی ضروریات کا لحاظ" تو یہ ایک عجیب مبہم سی بات ہے۔ قرآن مجید میں جس حکم کو بالصراحت بیان کیا گیا ہو، اس کی بجاآوری کی تاکید کی گئی ہو، اس کے انجام دینے پر ثواب و مغفرت کی بشارت ہو، جس کے چھوڑ دینے پر عذاب و عتاب کی دھمکی ہو، جس کو بار بار کرات و مرات ایک فریضہ اور رضائے الٰہی کا ذریعہ قرار دیا گیا ہو، جس کے متعلق کوئی حد بندی نہ ہو، حکم میں عمومیت ہو، عہد رسالت سے لے کر ۱۹۳۳ء تک برابر وہ فریضہ ادا کیا جاتا رہا ہو اس کے متعلق دفعۃً یہ انکشاف دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ تعجب خیز بھی ہے!

آگے چل کر فرمایا گیا ہے:۔

"کفارے میں غلاموں کو آزاد کرنے کی ہدایتیں موجود ہونے سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ غلامی کی رسم کو قائم رکھنا خدا کی منشا کے مطابق ہے اور اگر اس کو قائم نہ رکھا گیا تو بعض

گناہوں کے کفارے میں جو غلاموں کو آزاد کرنے کا حکم ہے اس کی حکم عدولی ہو جانے سے مسلمان گناہ کے مرتکب ہو جائیں گے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ جانوروں کی قربانی کے متعلق محض کلام مجید میں بعض ہدایتیں موجود ہونے سے اس رسم کو بند کرکے دوسرے مفید ذرائع سے اس کی روح کو قائم رکھنے سے مسلمان کیوں کر کسی گناہ کے مرتکب ہو سکتے ہیں؟

غلامی اور قربانی کی باہم مطابقت یقیناً مضمون نگار صاحب کا ایک دلچسپ کارنامہ ہے۔

غلامی کو خدا نے کہیں بھی پسندیدہ فعل نہیں فرمایا نہ اسے "من شعائر اللہ" قرار دیا ہے۔ اسی طرح جہاں کہیں بطور کفارے کے غلام کو آزاد کرنے کی ہدایت ہے وہیں بطور کفارے کے روزہ یا یا اسی قسم کی کسی اور چیز کے متعلق بھی موجود ہے کہ اگر غلام نہ ہو تو بایں طور کفارہ ادا کیا جائے۔

قربانی کے متعلق یہ کہیں نہیں ہے کہ کسی خاص موقع پر تم قربانی کے جانوروں کو آزاد کر دیا کرو بلکہ حکم ہے تو یہ کہ یہ قربانی کی رسم "سنت ابراہیمؑ" اور "من شعائر اللہ" ہے۔ رہا قربانی کی فرضیت اور وجوب کا سوال تو یہ انھیں پر ہے جو صاحب استطاعت ہوں اگر استطاعت نہ ہو تو دس روز کے روزے ضروری قرار دئے گئے ہیں۔

قرآن مجید میں قربانی کے متعلق بہت زیادہ صاف اور واضح الفاظ میں احکام موجود ہیں جن سے اگر عمداً چشم پوشی نہ کی جائے تو یقیناً ہر شخص راہ یاب ہو سکتا ہے مثلاً

والبدن جعلناھا لکم من شعائر اللہ لکم فیھا خیر فاذکروا اسم اللہ علیھا صواف فاذا وجبت جنوبھا فکلوا منھا واطعموا القانع والمعتر کذلک سخرناھا لکم لعلکم تشکرون ○ لن ینال اللہ لحومھا ولا دماؤھا ولکن ینالہ التقوی منکم کذلک سخرھا لکم لتکبروا اللہ علی ما ھدٰکم وبشر المحسنین ○

اور قربانی کے اونٹ اور گائے ہم نے اللہ کی یادگار بنایا ہے ان جانوروں میں تمھارے فائدے ہیں سو تم ان پر کھڑے کرکے اللہ کا نام لیا کرو پس جب وہ کروٹ کے بل گر پڑیں تو تم خود بھی کھاؤ اور بے سوال اور سوالی کو بھی کھانے کو دو۔ ہم نے ان جانوروں کو اس طرح تمھارے زیر حکم کر دیا تاکہ تم شکر کرو۔ اللہ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون پہنچتا ہے ولیکن ان کے پاس تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں

کو زیر حکم کر دیا تاکہ تم اس بات پر اللہ کی بڑائی کرو کہ اس نے تم کو
توفیق دی اور اخلاص والوں کو خوشخبری سنا دیجئے۔

(ترجمہ از حکیم الامتہ حضرت مولینا اشرف علی صاحب مدظلہ)

اوپر کی سطروں میں جو آیات پاک پیش کی گئیں ان سے صاف الفاظ میں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قربانی "من شعائر اللہ" ہے اور اس میں "تمھارے لئے بہتری ہے" اور آخر میں ارشاد ہوا ہے کہ "اخلاص والوں کو خوشخبری سنا دیجئے" یعنی ان کے حسن عمل اور حسن نیت کے بدلے میں انھیں ثواب ملے گا اور رضائے الٰہی جیسی دولت بے بہا حاصل ہوگی۔ ان آیات مبارکہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قربانی "وقتی مقامی اور تمدنی ضروریات" کے ماتحت نہیں باقی رکھی گئی بلکہ ان مصالح کے ماتحت باقی رکھی گئی جو بدستور قائم ہیں یعنی صرف جذبۂ خلوص کا اظہار، تمام دوسرے مصنوعی معبودوں سے رشتہ توڑ کر ایک ہی خدا سے لو لگا کر، اس کا نام لینا، اس کا تذکرہ کرنا اور اس کے حکم کی تعمیل میں قربانی کرنا!

علاوہ ازیں غلامی ایک ایسی رسم ہے جو خود انسانوں کی قائم کی ہوئی ہے اس لئے اس کے متعلق اگر کچھ باتیں ایسی ہوں جن سے یہ احساس ہوتا ہو کہ اسے رفتہ رفتہ کم اور پھر ختم ہو جانا چاہئے تو زیادہ مقام تعجب نہیں لیکن قربانی کا معاملہ بالکل جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن مجید ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ قربانی تمھارا ایک فریضہ ہے، اسلام (دین ابراہیمی) جب سے ہے یہ رسم چلی آرہی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی یادگار ہے، بندوں کا یہ فعل آقا کی خوشنودی کا سبب ہے۔ اس کے کرنے پر ترغیب و تحریص ہے اور نہ کرنے پر عذاب و عتاب کی وعید پھر ہم اسے کیوں کر چھوڑ سکتے ہیں۔

باقی رہی مصلحت سو اس سے الحمد للہ اسلام کا دامن ہمیشہ پاک رہا ہے، کسی مصلحت کی بنا پر کسی ضروری امر کا نفاذ نہ کرنا کسی مذہب کا بھی دستور نہیں رہا ہے اور اگر رہا ہے تو وہ مذہب یقیناً خدائی مذہب نہیں ہے بلکہ کمزور دل مصلحت شناس مصلحوں کی ایجاد ہے جو کبھی بھی اس کی مستحق نہیں کہ عالمگیر قبولیت حاصل کر سکے۔

اسلام جب دنیا میں آیا تو ساری دنیا کفر و طغیان سے لبریز تھی، ایک خدا کے بجائے سیکڑوں

خداؤں کی پرستش ہو رہی تھی، دین حنیف کے آثار و نقوش مٹ گئے تھے اور کفر و شرک کی تاریکیاں حق و صداقت پر چھائی ہوئی تھیں لیکن اسلام کے نیرتاباں نے طلوع ہوتے ہی کفر و شرک کے بادلوں کو چھانٹ دیا۔

دعوت اسلام کے آغاز میں داعی اسلام کو کیا کچھ تکلیفیں نہ دی گئیں، سیم و زر کے انباروں نے کس کس طرح لبھایا اور حسن و جمال کی عشوہ طرازیاں کس کس طرح بے نقاب ہوئیں، خوف ہلاکت اور اندیشہ رسوائی نے کیسے کیسے بھیانک مرقعے پیش کئے، اپنوں اور دوستوں کی رفاقت کے رشتے آن کی آن میں ٹوٹ گئے اور ساری خدائی دشمنی اور قتل پر آمادہ ہو ہو گئی لیکن داعی اسلام کی جبینِ استقلال پر شکن تک نہ آئی اگر ارشاد ہوا تو یہ کہ یہ کفار اگر میرے ایک ہاتھ میں چاند اور دوسرے میں سورج دیدیں جب بھی میں اس دعوت حق سے باز نہیں آسکتا لیکن چودہ سو برس کی طویل مدت گزر جانے کے بعد ایک نقاب پوش ہستی اٹھتی ہے اور ادعا کے ساتھ کہتی ہے کہ یہ سب کچھ "مصلحت" کے ماتحت تھا! اللہ اللہ! اسلام پر اور داعی اسلام پر یہ کتنا ناروا سوءظن ہے!

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات پر اگر صرف قرآن و حدیث کی روشنی میں غور کیا جائے تو یہ ایک مسلمہ اور طے شدہ مسئلہ ہے کہ اسلام میں قربانی کی مذہبی حیثیت ہے اور وہ حج کا ایک اہم رکن ہے جس کو اگر مجبوری اور افلاس کی وجہ سے کوئی شخص نہ ادا کر سکے تو از روئے قرآن اس پر دس روز کے روزے واجب ہوتے ہیں مثلاً ارشاد ہوتا ہے:۔

| | |
|---|---|
| واتموا الحج والعمرۃ للہ فان احصرتم فما استیسر من الھدی ولا تحلقوا رؤسکم حتی یبلغ الھدی محلہ فمن کان منکم مریضا او بہ اذی من راسہ ففدیۃ من صیام او صدقۃ او نسک، فاذا امنتم فمن تمتع بالعمرۃ الی الحج فما استیسر من الھدی فمن لم یجد فصیام ثلثۃ | اور حج و عمرہ کو اللہ تعالیٰ کے واسطے پورا پورا ادا کیا کرو، پھر اگر روک دئے جاؤ تو قربانی کا جانور جو کچھ میسر ہو اور اپنے سروں کو اس وقت تک مت منڈاؤ جب تک کہ قربانی اپنے موقع پر نہ پہنچ جائے۔ البتہ اگر کوئی تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کچھ تکلیف ہو تو فدیہ دیدے روزے سے یا خیرات دینے سے یا ذبح کر دینے سے۔ پھر جب تم امن کی حالت میں ہو تو جو شخص |

ایام فی الحج وسبعۃ اذا رجعتم تلک عشرۃ کاملۃ ذلک
لمن لم یکن اہلہ حاضری المسجد الحرام واتقوا
اللہ واعلموا ان اللہ شدید العقاب ○

عمرہ سے اس کو حج کے ساتھ ملا کر متمتع ہوا ہو تو جو کچھ قربانی
میسر ہو۔ پھر جس شخص کو قربانی کا جانور میسر نہ ہو تو تین دن کے
روزے ہیں حج میں اور سات ہیں جبکہ حج سے تمہارے لوٹنے
کا وقت آجائے، یہ پورے دس ہوئے۔ یہ اس شخص کے
لئے ہے جس کے اہل مسجد حرام کے قرب میں نہ رہتے ہوں
اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ بلاشبہ اللہ تعالےٰ
سزائے سخت دیتے ہیں۔

(ترجمہ از حکیم الامتہ مولٰنا اشرف علی صاحب تھانوی)

آیات بالا سے قربانی کی دینی حیثیت اور مذہبی اہمیت کا اور زیادہ صحیح اندازہ ہو جانا چاہیے۔ ان آیات سے یہاں تک معلوم ہو جاتا ہے کہ اگر کوئی شخص قربانی نہ کر سکے تو اسے دس روز کے روزے رکھنا چاہیے، اگر کوئی شخص روک دیا جائے تو بھی قربانی کرے۔ حلق کی رسم اس وقت تک نہ ادا کرے جب تک قربانی کے جانور اپنے مقام پر نہ پہنچ لیں اور آخر میں ارشاد فرمایا ہے "اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ کی سزا بہت سخت ہوتی ہے"۔ ان صاف و صریح احکام و اوامر کی موجودگی میں بھی اگر کوئی صاحب یہی کہتے رہیں کہ یہ سب کچھ "وقتی ضروریات" کے ماتحت تھا، تو سوائے خاموشی کے اور کیا جواب ممکن ہے؟

قرآن مجید کا جتنا زیادہ مطالعہ کیا جائے گا قربانی کی اہمیت و حیثیت روشن ہوتی جائے گی۔ ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوا ہے۔

جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیاماً للناس
والشہر الحرام والھدی والقلائد ذلک لتعلموا
ان اللہ یعلم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض و
ان اللہ بکل شیء علیم ○

خدا نے کعبہ کو جو کہ ادب کا مکان ہے لوگوں کے قائم رہنے
کا سبب قرار دیا اور عزت والے مہینے کو بھی اور حرم میں
قربانی ہونے والے جانور کو بھی اور ان جانوروں کو بھی جن کے
گلے میں پٹے ہوں یہ اس لئے کہ تم اس بات کا یقین کر لو

کہ بے شک اللہ تعالیٰ تمام آسمانوں اور زمین کے اندر کی چیزوں کا علم رکھتے ہیں اور بے شک اللہ تعالیٰ سب چیزوں کو خوب جانتے ہیں۔

(ترجمہ از حکیم الامتہ مولینا اشرف علی صاحب تھانوی)

جس چیز کو اللہ تعالیٰ معزز فرما رہا ہو اسے نہ معلوم کس دلیل سے "خدا کا تصور قائم کرنے والا" "اعتقاد باطل" کہا جا سکتا ہے۔

ایک اور موقع پر وارد ہوا ہے:۔

ذلک ومن یعظم شعائر اللہ فانہا من تقوی القلوب ۝ لکم فیہا منافع الی اجل مسمی ثم محلہا الی البیت العتیق ۝

یہ بات بھی ہو چکی اور جو شخص دین خداوندی کے ان یادگاروں کا پورا پورا لحاظ رکھے گا تو ان کا یہ لحاظ رکھنا دل کے ساتھ ڈرنے سے ہوتا ہے، تم کو ان سے ایک معین وقت تک فوائد حاصل کرنا جائز ہے پھر ان کے ذبح حلال ہونے کا موقع بیت عتیق کے قریب ہے۔ (ترجمہ از حکیم الامتہ)

اس جگہ یہ فرق بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ اسلام کی قربانی اور دوسری قربانیوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ مشرکین کی قربانیوں کا مقصد ہوتا ہے مختلف قوتوں کے دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنا۔ علاوہ ازیں ان کی قربانی زیادہ تر انفرادی حیثیت رکھتی ہے ادھر یہ بھی ہے کہ ان کی قربانی کا کوئی مصرف نہیں ہوتا جو اجتماعی طور سے برتا جا سکے۔ برعکس اس کے اسلام کی قربانی ایک جداگانہ اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی حیثیت اجتماعی ہے اس کا مصرف بھی مقرر و متعین ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ رضائے الٰہی کی تمنا کے ساتھ ہی ساتھ یہ جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے کہ اجتماعی طور سے بہت سے مفلس اور قلاش لوگوں کا بھلا ہو جاتا ہے!

اسلام کی قربانی کے متعلق یہ خیال قائم کرنا کہ اس سے کسی زمانے میں بھی "خدا کے تصور میں مدد ملتی تھی" یقیناً ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ اسلام کی سب سے اہم اور سب سے پہلی

دعوت توحید ہے جو بغیر کسی قسم کی آلائش اور ابہام کے اسلام کا اصل اصول رہا ہے۔ جہاں کہیں بھی قربانی پر زور دیا گیا ہے، وہاں کہیں یہ نہیں بتایا ہے کہ اس سے خدا کے تصور میں مدد ملتی ہے بلکہ ہمیشہ توحید پر ساری توت صرف کی گئی ہے، شرک اور بت پرستی کی قسم کے جذبات کو بیخ و بن سے اکھاڑنا ہی اسلام کا اصل کام ہے۔ قرآن و حدیث میں جا بجا نہایت کثرت سے اس دعوے کے شواہد مل سکتے ہیں۔

ایک اور موقع پر قرآن مجید میں وارد ہوا ہے۔

واذ بوانا لابراہیم مکان البیت ان لا تشرک بی شیئاً وطہر بیتی للطائفین والقائمین والرکع السجود ۝ واذن فی الناس بالحج یاتوک رجالاً وعلی کل ضامر یاتین من کل فج عمیق ۝ لیشھدو منافع لھم و یذکروا اسم اللہ فی ایام معلومات علی ما رزقھم من بھیمۃ الانعام فکلوا منھا واطعموا البائس الفقیر ثم لیقضوا تفثھم و لیوفوا نذورہم ولیطوفوا بالبیت العتیق ۝

اور جبکہ ہم نے ابراہیم کو خانہ کعبہ کی جگہ بتلادی کہ میرے ساتھ کسی کو شریک مت کرنا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے واسطے پاک رکھنا! اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو لوگ تمہارے پاس چلے آئیں گے پیادہ بھی اور دبلی اونٹنیوں پر بھی جو کہ دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی تاکہ اپنے فوائد کے لئے آموجود ہوں اور تاکہ ایام مقررہ میں ان مخصوص چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو خدائے تعالیٰ نے ان کو عطا کئے ہیں۔ سو ان جانوروں میں سے تم بھی کھایا کرو اور مصیبت زدہ محتاجوں کو بھی کھلایا کرو۔ پھر لوگوں کو چاہیئے کہ اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنے واجبات کو پورا کریں اور اس مامون گھر کا طواف کریں۔ (ترجمہ از حکیم الامت)

صفحات بالا میں قرآن مجید کی جو آیات پیش کی گئیں ان سے میرے خیال میں قربانی کی مذہبی حیثیت اچھی طرح آشکارا ہو گئی۔ حدیث سے کچھ میں نے عمداً پیش کرنے کی جرأت نہیں کی اس لئے کہ یہ معلوم نہ تھا کہ مضمون نگار صاحب حدیث کی دینی حیثیت کے قائل ہیں یا نہیں۔

منقولی حیثیت کا جہاں تک تعلق تھا اس مسئلے پر سیر حاصل بحث و گفتگو ہو چکی ہے چنانچہ

میں ایک اور آیت پیش کر کے اس اعتبار سے گفتگو ختم کرتا ہوں اور وہ یہ ہے:۔
انا اعطینٰک الکوثر، فصل لربک وانحر۔ اللہ تعالیٰ سرکار رسالت سے ارشاد فرماتا ہے کہ ہم نے تمھیں "کوثر" عطا کیا ہے (لہٰذا بطور اظہار عبودیت و سپاس) تم نماز پڑھو اور قربانی کرو۔ اگر قربانی کوئی مذہبی چیز نہیں تھی اور رضائے الٰہی حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں تھی تو دنیا کی سب سے زیادہ پاک اور پاکباز، معصوم اور مطہر ہستی کو قربانی کی ترغیب کیوں دی گئی۔

شاید نامناسب نہ ہو اگر اس مسئلے پر "عقل و دانش" کی روشنی میں بھی کچھ غور کر لیا جائے۔

فلسفۂ رسوم پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ رسوم کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ رسم میں کوئی مذہبی شان نہ ہو محض نام و نمود، شور و ہنگامہ اور اصراف و نمایش مقصود ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس سے کچھ فوائد مترتب ہوتے ہوں، زندگی پر کچھ اثرات پڑتے ہوں، عبرت و بصیرت کا درس حاصل ہوتا ہو۔ مذہبی رسوم کا جہاں تک تعلق ہے وہ اسی دوسری قسم میں داخل ہیں۔

مثلاً قربانی کے فلسفے پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ صرف ایک رسم کی بجا آوری ہی نہیں ہے بلکہ اس رسم کہن سے ماضی اور حال میں ارتباط پیدا ہوتا ہے۔ تاریخ میں جو کچھ پڑھا، روایات سے جو کچھ معلوم کیا، مذہبی ارشادات نے جن چیزوں کی طرف راہ نمائی کی، اس رسم کے انجام دینے سے وہ تمام چیزیں تازہ ہوگئیں، معلوم ہوگیا کہ ذبح عظیم کا معاملہ پیش آیا تھا، خدا کی راہ میں ایک محبوب بندے نے اپنے لخت جگر کو بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ پس ہر اس شخص پر جو دین حنیف اور ملت ابراہیمی کا ایک فرد ہے واجب ہے کہ اسی روح، اسی جذبے اور اسی احساس کے ماتحت اگر جان کی قربانی نہیں کر سکتا تو کم از کم مال کی "قربانی" سے تو دریغ نہ کرے کہ اس سے زیادہ پست درجہ قربانی اور کیا ہو سکتی ہے؟

قربانی کے متعلق ایک صحابی نے آنحضرتؐ سے استفسار کیا کہ یہ کیا ہے۔ ارشاد ہوا "سنتہ ابیکم ابراہیم" یعنی تمھارے جد امجد حضرت ابراہیمؑ کی سنت۔

بلاشبہ یہ تقاضائے عقل و دانش ہے کہ اس مبارک رسم کو جاری رکھا جائے اور اسی

طرح جاری رکھا جائے جس طرح ہوتی چلی آئی ہے۔

ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کا وہ غیر فانی کارنامہ جس کی یادگار میں قربانی کی رسم پڑی ہے کس کو نہیں معلوم؟

مشیت نے اپنے دو محبوب بندوں کو امتحان و آزمائش کے لئے منتخب کیا! ایک کہن سال مرد بزرگ تھا اور دوسرا جواں عمر و جواں سال طفل ہوشمند! باپ کو حکم ملا کہ بیٹے کے گلے پر چھری پھیر دے! قدوسیوں میں تہلکہ پڑ گیا کہ یہ کیا ہونے والا ہے مگر مشیت کردگار مسکرائی کہ

انی اعلم مالا تعلمون ٥

آزمائش کی گھڑی آن پہنچی۔ چشم فلک نے دیکھا کہ بوڑھا باپ میدان میں اتر آیا' اس کی آستینیں چڑھی ہوئی تھیں' ہاتھ میں چمکتی ہوئی چھری تھی' دل میں جذبات محبت کا طوفان موجزن تھا' پر آنکھیں عزم آہنی کی آئینہ دار تھیں۔ وہ بڑھا اس حال میں کہ نہ اس کے پیروں میں لغزش تھی اور نہ ہاتھوں میں رعشہ —— آج ایک سر کٹنے کے لئے مضطرب تھا اور ایک خنجر حلقوم سے پار اترنے کے لئے بیتاب —— بالآخر ابراہیمؑ نے اسمٰعیلؑ کی گردن پر چھری رکھدی۔ ربوبیت کاملہ کو اپنے بندوں کی یہ ادا پسند آئی۔ چشم زدن میں معلوم ہوا کہ "قربانی" مقبول ہوئی۔ خود مشیت نے نہ چاہا کہ اسمٰعیلؑ کی جان ضائع ہو' دیکھا تو چھری کے نیچے ایک جانور پھڑک رہا تھا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا:۔

وفدیناہ بذبح عظیم وترکنا علیہ فی الآخرین
سلام علی ابراہیم۔ کذلک نجزی المحسنین ٥
انہ من عبادنا المؤمنین ٥

اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ ان کے عوض میں دیا اور ہم نے پیچھے آنے والوں میں یہ بات ان کے لئے رہنے دی' ابراہیم پر سلام ہو' ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا کرتے ہیں' بیشک وہ ہمارے ایماندار بندوں میں سے تھے۔ (ترجمہ از حکیم الامۃ)

یہ تھا وہ واقعہ جس کی یادگار میں قربانی اب تک اپنی اصل شکل و صورت میں موجود ہے اور جب تک یہ قربانی قائم ہے وہ روح بھی قائم ہے جس کی یادگار میں سب کچھ کیا جاتا ہے۔

اسلام کی اس خصوصیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے ہاں اول تو محض رسوم بہت کم ہیں اور اگر کچھ ہیں بھی تو وہ اس قدر زیادہ فطرت شناسی پر مبنی ہیں کہ ان کے اعتراف کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہیں۔

اسی قربانی کے مسئلے کو لے لیجئے۔ قطع نظر اس کے کہ یہ رسم ماضی اور حال میں ارتباط پیدا کرتی ہے، اس کی یہ خصوصیت کیا کم قابل توجہ ہے کہ اس رسم کی بجا آوری کے ساتھ وہ تمام جذبات تازہ ہو جاتے ہیں جو سرفروشی و جاں نثاری کے لئے ضروری ہیں۔ قربانی کے معنی ہی یہ ہیں کہ آج اگرچہ دنبہ کی، بکری کی، گائے کی یا اونٹ کی قربانی کی جاتی ہے لیکن حقیقۃً اس جذبے کے ماتحت کہ قربانی کرنے والا خود اس کے لئے تیار ہے کہ اگر رضائے الٰہی کا سوال درپیش ہو "من انصاری الی اللہ" کی صدا بلند ہو اور دین حق کو انسانی خون کی ضرورت ہو تو یہی چھری جو آج اس جانور پر چل رہی ہے خود اپنے حلقوم پر بھی چلے گی اور چلنا چاہئے۔ یہی جذبہ تھا جس نے کئی سو برس بعد سبط رسول اور جگر گوشۂ بتول، امام مظلومؑ کو رضائے حق کے لئے جان کی بازی لگانے پر مجبور کر دیا!

اسی طرح اس رسم کی یہ خصوصیت بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ اس طرح ایک خاص موقع پر چند روپے صرف کر دینے کے بعد خدا کے راستے میں مال و زر قربان کرنے کا جذبہ بھی نہ صرف یہ کہ پیدا ہوتا رہتا ہے بلکہ تازہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ ان مصالح کی بنا پر قربانی کی رسم کو غیر ضروری قرار دینا یا اس کی موجودہ صورت کو دوسری اصطلاحی صورتوں میں مدغم کر دینا ایک بہت بڑا ظلم ہے جس کی تلافی آسان نہیں۔

مضمون کے آخر میں صاحب مضمون نے ارشاد فرمایا ہے:۔

"اگر اس زمانے میں ہندوستان کے مسلمان قربانی کی رسم جاری رکھنا چاہتے ہیں تو ان کو عید الضحیٰ اور حج کے موقعے پر موجودہ اسلامی انجمنوں کو روپیہ بھیجنا چاہئے۔"

تجویز کے معقول ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن دینی معاملات کو اس قسم کی تجاویز پر "قربان" کر دینا درحقیقت بہت بڑی غلطی ہے۔ کل ایک صاحب یہ تجویز پیش کر سکتے ہیں کہ سیکڑوں ہزاروں

روپیہ صرف کرکے لوگ خواہ مخواہ حجاز جاتے ہیں جس سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچتا، بہتر ہو کہ لوگ اپنے کرائے وغیرہ کا تخمینہ کرکے کسی اسلامی انجمن کو وہ رقم دیدیا کریں۔ محترم مقالہ نگار صاحب خود فرمائیں کہ اگر اس قسم کی تجاویز پیش ہونے لگیں تو مذہبی اوامر واحکام اور رسوم و ہدایات رفتہ رفتہ کس قدر جلد ختم ہو جائیں؟

اسی لئے مذہب میں کسی قسم کی "بدعت" کو "ضلالت" سے تعبیر کیا گیا ہے اور "ضلالت" کے متعلق ارشاد ہوا ہے اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔

مسلمانوں میں قربانی جیسی صحیح مذہبی رسم کے علاوہ اور بہت سی غیر شرعی اور مسرفانہ رسوم ہمسایہ اقوام سے اختلاط کی وجہ سے جاری ہوگئی ہیں۔ انھیں دور کرنے میں اگر جدوجہد کی جائے تو وہ عنداللہ اور عندالناس ہر طرح مشکور ہو۔

آخر میں یہ گزارش شاید بارِ خاطر نہ ہو کہ نہ صرف "صدائے حق" صاحب کو بلکہ تمام حضرات کو اس قسم کے مسائل پر اظہار خیال سے پیشتر اس پر غور کرلینا چاہئے کہ آیا ان کے سامنے سارا مواد اور تمام ماخذ ہیں یا نہیں؟ بغیر اس قسم کی تیاری کے قلم اٹھانا اپنی جرأت کا ناروا اور افسوسناک مظاہرہ ہے۔

اس مضمون کے بعض اور پہلو بھی اس قابل تھے کہ ان پر گفتگو کی جاتی لیکن شاید وہ علمی گفتگو نہ رہتی بلکہ ادبی ہو جاتی اس لئے انھیں نظر انداز کر دیا گیا۔

---

# جہنم میں

جوزف نے اپنی جوانی کا بڑا حصہ ایک چھوٹے سے قصبے میں گزار دیا تھا۔ اس کے پاس ہر ایک ایسی چیز تھی جس سے وہ خوش رہ سکے۔ تمام لوگوں میں اس کی عزت تھی۔ اپنے اور پرائے اس کی نیکی اور حسنِ اخلاق کی وجہ سے اسے دل سے چاہتے تھے۔ ہر ایک کہتا تھا کہ جوزف بڑا خوش قسمت انسان ہے۔

لیکن خود جوزف کا خیال تھا کہ اس میں کسی چیز کی کمی ہے۔ اور اس کی مسرت اصلی نہیں۔ ایک بوجھ وہ اپنے اوپر محسوس کرتا تھا، ایک خلش سی اس کے دل میں تھی لیکن یہ تھا کیوں؟ اس کی اسے خبر نہیں تھی۔ وہ اپنی موجودہ زندگی سے متنفر تھا اور کسی نئی زندگی کا آرزومند۔ لیکن یہ نئی زندگی کیسی ہو اسے معلوم نہیں تھا۔

ایک دن شام کے وقت بغیر کسی مقصد کے وہ قصبے سے باہر نکل گیا۔ چلتے چلتے بندرگاہ تک جا پہنچا جو قصبے کے نزدیک ہی تھا اور وہاں کھڑا ہو گیا۔

پانی ساحل سے ٹکرا رہا تھا اور سرد ہوا چل رہی تھی۔ ہر طرف کئی جہاز خاموش کھڑے تھے لیکن ان میں ایک بڑا جہاز روشنی سے جگمگا رہا تھا۔

یکایک جوزف نے اپنے دل میں کہا "کیا یہ ممکن نہیں کہ میں جہاز پر کسی دوسرے ملک میں پہنچ جاؤں؟"

وہ کھڑا نیلے پانی اور جہازوں کو دیکھتا رہا "کیا یہ ممکن نہیں کہ میں جہاز پر کسی دوسرے ملک میں پہنچ جاؤں؟" اس نے یہ الفاظ دہرائے۔ قریب ہی دو آدمی کھڑے تھے۔ انھوں نے شاید اس کے دل کی کیفیت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ وہ اس کے پاس آئے۔ ان میں سے ایک کا رنگ سفید تھا اور دوسرے کا سیاہ۔

اس سفید آدمی نے کہا "جناب! یہ دنیا مجموعہ ہے سمتوں اور فاصلوں کا۔ بیوی، بچے

رشتہ دار، مکان آدمی کے لئے مصیبت ہیں، زندگی وطن میں رہ کر خراب ہو جاتی ہے لیکن دوسرے ممالک میں نہ بچوں کی فکر ہوتی ہے نہ بیوی کی، ان ملکوں میں آدمی کے لئے ہر ایک راستہ کھلا ہے، جس طرف وہ چاہے جا سکتا ہے۔ اسے روکنے والا کوئی نہیں۔ اس لئے اگر آپ میری بات مانیں تو اس قید خانے سے رہائی حاصل کیجئے۔ آپ کو یہاں سے نکل کر پتہ چلے گا کہ مختلف سمتوں اور فاصلوں کے پیدا کرنے کا کیا مقصد ہے"۔

اس حبشی نے کہا " اور حضرت ہر سمت کے اس سے پرخوبصورت ملک اور لوگ ہیں بعض ممالک میں تو آپ کو ایسی اچھی چیزیں ملیں گی کہ آپ سب کچھ بھول جائیں گے اور جزائر میں تو اس سے بھی اچھی چیزیں ہیں۔ غرض ان کی کوئی انتہا ہی نہیں"۔

جوزف خاموش کھڑا سنتا رہا۔ اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔

حبشی نے پھر کہنا شروع کیا " اس کے علاوہ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ دوسرے ملکوں میں جا کر آدمی دولتمند ہو جاتا ہے۔ زندگی کی ہر چیز سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ دنیا میں ایسے خطے بھی ہیں جہاں انسانوں اور جانوروں کا نام تک نہیں۔ وہاں ہر طرف آزادی ہی آزادی ہے۔ لیکن اصلی اور حقیقی آزادی ایک جگہ رہنے سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ تمام دنیا میں چکر لگانے سے"۔

اس پوری گفتگو کے دوران میں ان دونوں آدمیوں کی آنکھیں جہاز پر لگی تھیں جس کے چلنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اتنے میں گھنٹی کی آواز آئی اور دونوں یہ کہتے ہوئے ایک چھوٹی سی کشتی میں بیٹھ گئے " اچھا پھر ملیں گے"۔

جوزف نے پوچھا " تم کہاں جا رہے ہو؟"

"جہنم میں"

" فرض کرو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں" یہ کہہ کر وہ بھی کشتی میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں یہ سب جہاز پر پہنچ گئے اور وہ روانہ ہو گیا۔

اس وقت سے جوزف نے ملاحوں کا پیشہ اختیار کر لیا۔

جہاز کئی ملکوں سے ہوتا ہوا پھر اسی بندرگاہ میں واپس آگیا لیکن جوزف کو اب ایک جگہ چین نہیں تھا۔ اس نے دوسرا جہاز لیا اور پھر روانہ ہو گیا۔ مہینے اور سال گزرتے گئے لیکن وہ اپنے وطن واپس نہیں آیا۔ کئی جہاز جن پر وہ تھا تباہ ہو گئے لیکن وہ ہمیشہ بچ بچ گیا۔ اس کے کئی ساتھی مر گئے لیکن وہ سخت جان تھا کئی مرتبہ بیماریوں کا شکار ہوا لیکن ہر بار صحیح وسلامت رہا۔ اسے ایسے زخم آئے کہ اس کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی لیکن یہ زخم بھی مندمل ہو گئے۔ ان تمام باتوں کے باوجود جوزف نے کسی ایک جگہ اقامت اختیار نہیں کی بلکہ دنیا بھر میں مارا مارا پھرتا رہا لیکن جس چیز کی اسے تمنا تھی وہ نہ ملی۔ آخر کار وہ بوڑھا ہو گیا اور تمام قویٰ نے جواب دیدیا۔ ایک دن وہ ایسا بیمار پڑا کہ مرنے کے لئے سڑک پر لیٹ گیا لیکن اس کی قسمت میں یہ نہیں تھا کہ وہ کتوں کی موت مرے۔ ایک آدمی ادھر سے گزر رہا تھا۔ اس نے اس کو ہسپتال میں پہنچا دیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو ایک شخص اس کے پاس آیا اور کہنے لگا "جناب آپ سخت بیمار ہیں اور خدا جانے دم بھر میں کیا ہو جائے۔ جو لوگ بالکل تندرست ہیں ان کی زندگی کا بھی کچھ اعتبار نہیں اس لئے آپ کو چاہئے کہ آپ اپنے تمام گناہوں سے توبہ کر لیں۔"

جوزف نے لاپرواہی سے جواب دیا "بہت بہتر"۔

یہ سن کر وہ شخص بھاگ کر کمرے سے باہر گیا اور تھوڑی دیر کے بعد ایک پادری کو بلا لایا۔

پادری جوزف کے پاس آیا اور نرمی سے کہا "پیارے بیٹے میں نے سنا ہے کہ تمھارا آخری وقت قریب ہے اور تم اپنے گناہوں کا اعتراف خدا کے سامنے کرنے کو طیار ہو" یہ کہہ کر اس نے فلسفۂ اعتراف پر ایک زبردست تقریر کی یہاں تک کہ جوزف نے ارادہ کر لیا کہ وہ اپنا دل اس کے سامنے کھول کر رکھ دے گا۔"

پادری نے کہا "اپنے تمام اعمال کو ایک ایک کر کے بیان کرنا۔ کیا تم اس بیماری کی وجہ سے اہم باتوں کو بھول تو نہ جاؤ گے"۔

"جی نہیں" جوزف نے جواب دیا "میں اس وقت اپنی زندگی کو زیادہ صاف اور مکمل

دیکھ رہا ہوں لیکن میں کس ترتیب سے اعتراف شروع کروں، اوقات، مقامات یا اعمال کے لحاظ سے"۔

"جس طرح تمھیں آسانی ہو" پادری نے کہا "لیکن میں اعمال کو اور باتوں پر ترجیح دیتا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم ایک عقلمند انسان ہو۔ اس آدمی کی خوش قسمتی کا کیا ٹھکانا جو اپنے گناہوں کا اعتراف کر کے خوش خوش دوسری دنیا میں جائے"۔

"میری زندگی" جوزف نے کہنا شروع کیا "محنت اور مشقت میں بسر ہوئی ہے۔ اس لئے میں آرام اور ابدی نیند چاہتا ہوں۔ میں قبر سے نہیں ڈرتا کیونکہ یہی میرے لئے چین کی جگہ ہو گی۔ لیکن افسوس اب میں کبھی ان دلفریب جزائر میں قیام نہیں کر سکتا اور نہ وہ دلکش بولی سن سکتا ہوں جس سے انسان پر ایک بیخودی طاری ہو جاتی ہے۔ اب وقت ہے آرام کرنے کا لیکن جتنی چیزیں میں نے دیکھی ہیں ان میں سے کسی کو نہیں بھول سکتا۔"

جوزف جوش میں آ کر بیٹھ گیا اور پھر کہنا شروع کیا "میری زندگی ایسے نادر تجربات اور عجیب واقعات سے بھری پڑی ہے کہ میں نہیں سمجھ سکتا کہاں سے شروع کروں۔ میری زندگی کا ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا جو اپنے اندر کوئی نہ کوئی اہمیت نہ رکھتا ہو۔ میں کس طرح اس حسن اور خوبصورتی کو بیان کر سکتا ہوں جسے میری آنکھوں نے دیکھا اور میرے دل نے محسوس کیا ہے۔ جب آدمی مرنے کے قریب ہوتا ہے تو اس وقت اس کی ساری زندگی اس کے سامنے آجاتی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ میری زندگی میں ایک بھی ایسی چیز نہیں جو اہم اور قابل فکر نہ ہو۔ یہ بھی ایک بڑا اہم واقعہ ہے کہ میں نے اپنا وطن اور گھر بار بالکل چھوڑ دیا تھا۔ اس طرح اس کی اہمیت میں بھی شک نہیں کہ میں کبھی گھر واپس نہیں لوٹا اور دنیا میں گھومتا رہا۔ میں کس طرح بیان کروں کہ میں نے کیا کیا۔ میں دنیا کے ہر جزیرے، ہر براعظم اور ہر حصے کو جانتا ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ان میں کس قسم کے لوگ بستے ہیں۔ اگر اس وقت میں اپنی آنکھیں بند کر لوں تو ہر ایک چیز میرے سامنے آجائے جو میں نے دیکھی ہے اور جس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں ہر ایک ملک کی عورتوں کے خصائل، عادات اور لباس سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میں ہر قسم کے مرض میں مبتلا ہوا ہوں اور میں بتا سکتا ہوں کہ فلاں ملک میں

کس قسم کی بیماری ہوتی ہے اور اس کا علاج کیا ہے۔ میں کئی مرتبہ قید ہوا ہوں اور جان پر کھیل کر رہائی حاصل کی ہے۔"

"ملاح میں یہ نہیں پوچھتا کہ تم کیا تھے اور تم نے کیا دیکھا ہے بلکہ میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ تم نے کیسے اعمال کئے، اچھے یا برے۔"

"میرے اعمال" جوزف نے کہا "مختلف ملکوں کے لحاظ سے مختلف تھے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ میں نے ہر ایک وہ کام کیا ہے جس کا مجھے موقع ملا۔ کبھی میں اتنا رئیس تھا کہ میری دولت کے سامنے قارون کے خزانے کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ کبھی میں اتنا غریب ہوا کہ میرے پاس ایسی چیز بھی نہیں تھی کہ سانپ کو مار سکوں یا بندر کو دھمکا سکوں۔ ایک دن ایسا تھا کہ میں غلاموں کو خوب پیٹتا تھا اور لوگ میرے سامنے جھکتے تھے لیکن کئی سال تک میں نے دوسروں کی بھی خدمت کی ہے اور گدھوں کی طرح اپنی پیٹھ پر سامان لادا ہے۔"

"یہ سب کچھ بہت دلچسپ ہے لیکن تمہیں چاہئے کہ خدا کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرو۔ کیا تم نے کبھی قتل یا چوری نہیں کی ہے۔ کیا کبھی ڈاکہ نہیں ڈالا ہے۔ کسی بد اخلاقی میں مبتلا نہیں ہوئے ہو۔ کسی پر زبردستی نہیں کی ہے۔ کیا تم نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ کسی پر بے رحمی نہیں کی۔ کیا تمھارا ایمان کبھی متزلزل نہیں ہوا؟"

"بے شک میں نے اس قسم کے کام کئے ہیں۔ اگر یہ سب چیزیں بہت اہم ہیں اور آپ پوچھنے پر مصر ہیں تو میں بتاتا ہوں کہ میں نے اپنی حفاظت کے لئے دوسروں کو مارا ہے اور بغیر کسی وجہ کے بھی۔ اگر آپ بد اخلاقی کے متعلق دریافت کرتے ہیں تو میں آپ کو وہ تمام واقعات بتا سکتا ہوں جو مجھے مختلف عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ پیش آئے جن کو سن کر آپ سخت متعجب ہوں گے لیکن اس وقت میرے نزدیک یہ باتیں اہم نہیں۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ کس طرح میں نے اتنے دور دراز اور دشوار گزار راستوں کو طے کیا اور کس طرح عمیق سمندروں کو عبور کیا جو اژدہوں کی طرح منہ کھولے ہوئے آدمی کو نگلنے کے لئے تیار ہیں۔"

پادری نے ایک آہ بھر کر کہا "بہتر یہ ہے کہ تم اپنے گناہوں کا اعتراف کرلو اور فضول وقت نہ ضائع کرو۔"

جوزف نے جواب دیا "لیکن جو کچھ میں نے کیا ہے ٹھیک سمجھ کر کیا ہے اور مجھے اپنے کسی عمل یا گناہ سے شرمسار ہونے کی ضرورت نہیں۔ میری زندگی ایک خاص مقصد کے لئے تھی۔ اس میں جو برائی یا بھلائی ہے اسے میں نہیں جانتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت ضروری تھا کہ میں دنیا کے ہر حصے میں گھوموں، نئے نئے ملک اور سمندر دیکھوں۔ کیا آپ کے نزدیک یہ ضروری نہیں تھا کہ میں سیکڑوں اچھے اچھے مقامات کی سیر کروں اور نئے نئے جزیروں اور سمندروں کا انکشاف کروں۔"

پادری نے غصے میں اور بلند آواز سے کہا "خدا کے عذاب سے ڈرو۔"

مگر جوزف خاموش نہیں ہوا "میں خدا کے ہر فیصلے کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں۔ میں اپنی زندگی کو اس لحاظ سے نہیں دیکھتا کہ میں نے کتنی برائیاں کی ہیں اور کتنی نیکیاں بلکہ اس لحاظ سے جانچتا ہوں کہ میں نے کتنے ہزار میل کے فاصلے طے کئے ہیں اور کتنے ملکوں کو دیکھا ہے لیکن افسوس کہ اب شکستہ ناؤ کی طرح یہاں پڑا ہوں اور کہیں نہیں جا سکتا۔"

پادری چلا اٹھا "لعنت ہے تم پر۔ میں نے آخری وقت میں کسی شخص کو اس قدر ضد کرتے کبھی نہیں دیکھا۔" یہ کہہ کر چلا گیا۔

جوزف نے بھی زور سے کہا "جاتے ہو تو چلے جاؤ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔"

جوزف بہت کمزور ہو گیا تھا اس لئے وہ سو گیا۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک شہر میں چلا جا رہا ہے (کس شہر میں اور کہاں یہ نہیں معلوم) یہاں تک کہ وہ ایک بندرگاہ کے کنارے جا پہنچا۔ نیلا پانی آہستہ آہستہ ساحل سے ٹکرا رہا تھا۔ وہاں کئی جہاز کھڑے تھے لیکن ایک بڑا جہاز تھا جس پر خوب روشنی ہو رہی تھی۔ دو آدمی اس کے قریب کھڑے تھے۔ باوجود کوشش کے جوزف ان کو نہیں پہچان سکا اور نہ ان کی گفتگو کا ایک حرف بھی سمجھا حالانکہ وہ اس کی مادری زبان میں گفتگو

گزر رہے تھے۔ اتنے میں جہاز سے گھنٹی کی آواز آئی اور وہ دونوں ایک کشتی پر جا بیٹھے۔ جوزف نے ان سے پوچھا "تم کہاں جا رہے ہو" ان میں سے ایک آدمی نے جواب دیا "جہنم میں"۔ یہ الفاظ وہ سمجھ گیا۔ "فرض کرو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں" یہ کہہ کر جوزف بھی ان کے ساتھ کشتی پر بیٹھ گیا۔ کشتی جہاز کے قریب آگئی۔ پانی اور تاریکی میں امتیاز باقی نہ رہا۔ یہاں تک کہ خود جوزف بھی عالم واقعی سے نکل کر خیالی دنیا میں گم ہو گیا۔

تھوڑی دیر میں ڈاکٹر نے آکر دیکھا تو اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

---

# غزل

سرمستِ شرابِ شوق ہے دل — یا خود ہمہ تن ہے جامِ مے دل

بجھتی ہی نہیں پیاس اس کی — اتنا بھی نہ ہو خراب اے دل

حسنِ رخِ یار سے عیاں ہے — سب تیرا جمالِ شوق لے دل

جس کو نہ تری طلب ہو پیارے — ایسا بھی جہاں میں کوئی ہے دل

کیا ایسی پڑی ہے اس پہ افتاد — بیزار جو زندگی سے ہے دل

کس کے غمِ ہجر میں شب و روز — سرگشتہ و بیقرار ہے دل

کس ساقیِ ماہ وش سے چھٹ کر — ہے حسرت میں مثلِ موجِ مے دل

کس مطربِ خوش نوا کے غم میں — فریاد کناں ہے مثلِ نے دل

اک حال پہ مثلِ طبعِ جاناں — تجھ کو بھی نہیں قرار اے دل

اب وصل میں ہجر کی ہوس ہے — ہے تو بھی غرض عجیب شے دل

ہے تیرے سوا علیل کا کون

اے یار وفا شعار اے دل!

---

# غزل

(از مصور جذبات حضرت ثاقب لکھنوی)

رہیں خود فراموشی گلوں کو یاد کیا کرتے
اب اس سے بڑھ کے پاس خانۂ صیاد کیا کرتے

تصور عیش کا کرتے ہیں تو غم اور بڑھتا ہے
جو یاد آنے سے بھولا ہو اسے ہم یاد کیا کرتے

دل شوریدہ ہو یا دامن گور غریباں ہو
یہ ویرانے ہیں برسوں کے انھیں آباد کیا کرتے

لہو دل ہو گیا اپنے ہی نالوں سے شب غم میں
کوئی بتلائے اب فریاد کی فریاد کیا کرتے

اسیری راستا دیتی نہیں دل کو تصور کا
قفس والے خیال خاطر آزاد کیا کرتے

زمانہ ہو نہ جاتا دست کش آخر تو کیا کرتا
جو زیر خاک ہیں ظالم انھیں برباد کیا کرتے

ترس کو بھی جگہ دیتی نہیں غم دوستی میری
جو ناشادی پہ مرتا ہو اسے وہ شاد کیا کرتے

خوش و ناخوش بسر کی عمر طوفان حوادث میں
مخالف تھی ہوائے عالم ایجاد کیا کرتے

رسائی کب تھی ان کی بزم میں اچھا جو ہوتی بھی
تو ہم کیا ان سے کہتے اور وہ ارشاد کیا کرتے

نیاز و ناز تھے دونوں طرف حد ترقی پر
ہم ان کو بھولتے کیوں کر وہ ہم کو یاد کیا کرتے

ستم احباب کے آئینۂ اخلاص تھے ثاقب
مقام شکر تھا ہم شکوۂ بیداد کیا کرتے

---

# تنقید و تبصرہ

**مجموعۂ نغز** | تقطیع ۲۰×۳۰/۸ صفحات ۹۰۶ - علاوہ سرورق - مرتبہ حافظ محمود خاں صاحب شیرانی لیکچرر پنجاب یونیورسٹی لاہور - لکھائی چھپائی دیدہ زیب - قیمت درج نہیں -

یہ کتاب جناب مرتب نے لاہور سے غازی آباد تشریف لاکر خاکسار کو ہدیۃً عنایت فرمائی تھی انھوں نے مجھ سے تنقید کی خواہش ظاہر نہیں کی تھی لیکن بغوائے گر نہ ستانی بہ ستم می رسد - میں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کی فرمائش سے اپنی ناچیز رائے حافظ صاحب اور قارئین جامعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں -

(محمد یحییٰ تنہا)

یہ تذکرہ حکیم ابو القاسم میر قدرت اللہ متخلص بہ قاسم کی یادگار تالیف ہے - اس کی اشاعت سے بعض امور جو اب تک پردۂ خفا میں تھے ظاہر ہو گئے - اور جہاں یہ ثابت ہو گیا کہ مولوی محمد حسین آزاد کا تذکرہ آب حیات زیادہ تر حکیم صاحب کے تذکرۂ "مجموعہ نغز" کا مرہون منت ہے ، وہاں ان نکتہ چینوں کی بھی قلعی کھل گئی جو آزاد کی غلطیوں کے اظہار کو اپنا خاص فن بنائے ہوئے تھے - مثلاً ولی کے متعلق آزاد کے اس بیان کو بے اصل بتایا گیا تھا -

"ولی کہ بنی نوع شعرا کا آدم ہے - اس کے حق میں (میر) فرماتے ہیں :- ولی شاعریست از شیطان مشہور تر - میر خاں کمترین اسی زمانے میں ایک قدیمی شاعر دلی کے تھے - انھیں اس فقرے پر بڑا غصہ آیا - ایک نظم میں اول بہت کچھ کہا - آخر میں آکر کہتے ہیں - ع ولی پر جو سخن لاوے اُسے شیطان کہتے ہیں" صلا۲۱۲

آزاد کا یہ بیان حکیم صاحب کے ان بیانات پر مبنی ہے " در تذکرہ ہمہ کس را بہ بدی یاد کردہ درحق شاعر شان جلی التخلص بہ ولی نوشتہ کہ وے شاعریست از شیطان مشہور تر و سزائے این کردار ناہنجار از کمترین شاعر بود جی یافتہ کہ وے ہجوہائے متعدد ہ ادکردہ کہ بعضے ازاں بغایت

رکیک پردہ در افتادہ" ص ۲۳/۲ - "بنا بر نوشتن میر در تذکرۂ خود شاعر شان جلی المتخلص بہ ولی را کہ وے شاعر یست از شیطان مشہور تر ہجو ہائے رکیکہ بواجبی نمود" ص ۱۴۳/۲ "حقش بر جملہ سخن پردازان ہندی ثابت است و سخن بر سخنش ابلیس منشی و شیطنت میر خاں کمترین کہ خدا شش بیامرزد بسیار بموقع و بجا گفتہ کہ ع ولی پہ جو سخن لاوے اسے شیطان کہتے ہیں" ص ۲۶۹/۲ -

شاید اب بھی یہ حجت کی جائے کہ نکات الشعرا میں ولی کے متعلق یہ فقرہ درج نہیں ہے لہذا حکیم صاحب کا خود ساختہ ہے - مگر ہم ایسے اصحاب سے یہ سوال کرنا چاہتے ہیں کہ آج کل تو مطابع کی وجہ سے کسی کتاب کا پہلا اڈیشن محفوظ رہ سکتا ہے - اور دوسرے اڈیشن میں جو ایک مدت کے بعد ترمیم و اصلاح کی جائے اس کا مقابلہ پہلے اڈیشن سے بآسانی کیا جا سکتا ہے لیکن قلمی نسخوں میں اول تو اس امر کا پتہ لگانا کہ یہ نسخہ سب سے پہلے لکھا گیا تھا اور دوسرے یہ کہ پھر اس میں کوئی ترمیم و تنسیخ (جو بیک جنبش قلم چشم زدن میں ہو سکتی ہے) ہو کر اس کی نقل نہیں ہوئی - آسان ہے یا دشوار؟ اگر ان کے نزدیک بھی یہ پتہ لگانا دشوار ہے تو پھر یہ مان لینا نہایت آسان ہے کہ جب میر تقی میر کی کتاب نکات الشعرا اس زمانے کے لوگوں نے دیکھی اور ولی کی نسبت شیطان والا فقرہ پڑھ کر برہمی پیدا ہوئی تو میر تقی نے اپنی کتاب میں ترمیم کر دی اور شیطان والا فقرا اڑا دیا۔ حکیم صاحب وہ بزرگ ہیں جو اپنے مخالفین کا بھی ذکر خیر و خوبی کے ساتھ کرتے ہیں۔ مثلاً سید انشاء اللہ خاں کے حالات لیکن صحیح رائے کے اظہار میں دریغ نہیں فرماتے۔ مثلاً مرزا عظیم بیگ اپنے دوست کی نسبت رائے - لہذا ان پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ کہ انھوں نے میر کے ہم عصر ہونے کے باوجود نکات الشعرا کو نہیں دیکھا یا میر خاں کمترین ایک فرضی شاعر پیش کر دیا ہے۔ اور خود شیطان والا فقرا گھڑ کر یہ مصرع بھی " ولی پر جو سخن لاوے اُسے شیطان کہتے ہیں" لکھ دیا ہے

درحقیقت میر صاحب کی نسبت یہ حسن ظن تعجب خیز ہے کہ وہ شیطان والا فقرہ لکھنے پر قادر نہ تھے۔ انعام اللہ خاں یقین کی نسبت جو اس زمانے کا مشہور شاعر ہے اور جس کا کلام ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے تحریر فرماتے ہیں :۔

"بر و پوچ چندے کہ بافتہ است کہ ما و شما نیز می توانیم بافت این قدر بر خود چیدہ است کہ رعونت فرعون پیشِ او پشتِ دست بر زمیں می گزارد...... بعد از ملاقات این قدر معلوم شد کہ ذائقہ شعر فہمی مطلق ندارد۔"

میر صاحب نے دوسروں کو پوچ گو ثابت کرنے کی کوشش میں اپنی فارسی کی بھی مطلق پروا نہیں کی۔ کیا میر صاحب ولی کی نسبت شیطان والا فقرہ نہیں لکھ سکتے تھے۔؟ کم از کم فقرے کی ساخت تو صاف کہہ رہی ہے کہ یہ میر کی فارسی کا ٹکڑا ہے۔

جناب مرتب نے اس کتاب کی اشاعت سے ادب اردو پر بڑا احسان کیا ہے اس سے نہ صرف ان تمام غلطیوں کا ازالہ ہو جائے گا جو صاحب آب حیات سے منسوب کی جاتی تھیں بلکہ ان شعرائے نامور کے بھی حالات و کلام سے آگاہی ہو جائے ۔ جن کو آزاد نے اپنی کتاب میں جگہ نہیں دی تھی۔ اور جن کا کلام بھی اب دستیاب نہیں ہوتا تھا۔ کیوں کہ اس تذکرے کی ایک یہ بھی خصوصیت ہے کہ مشہور اور باکمال شعرا کے اشعار کافی تعداد میں نقل کئے گئے ہیں۔

شعرا کے کلام کے متعلق اگرچہ حکیم صاحب کی آرا اس قدر جچی تلی نہیں ہیں جس قدر کہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی ہیں۔ لیکن طرز تحریر نہایت عمدہ اور شگفتہ ہے۔ میر مصحفی اور حسن کے تذکرے زبان کے لحاظ سے مقابلتاً ژولیدہ اور پراگندہ ہیں۔ جناب مرتب نے مصنف کے حالات کے تحت میں ثابت کیا ہے کہ جو تذکرے حکیم صاحب کے تذکرے سے پیشتر لکھے گئے تھے مثلاً ۱۱۶۵ھ میں نکات الشعرا اور تذکرہ علی حسینی گردیزی ۱۱۶۵ھ میں مخزن نکات ۱۱۶۸ھ میں چمنستان شعرا ۱۱۸۰ھ و ۱۱۹۲ھ کے مابین میر حسن کا تذکرہ ۱۱۹۳ھ میں تذکرۂ شورش ۱۱۹۶ھ میں گلزار ابراہیم ۱۲۰۰ھ میں تذکرۂ مصحفی۔ گلشن ہند ۱۲۱۵ھ میں تذکرۂ عشقی، ۱۲۱۶ھ مجموعہ نغز ان تالیفات کے مقابلے میں یقیناً ایک جسود اور ضخیم تالیف ہے۔ لیکن دو اور تذکرے ہیں جو ضخامت او حجم کے اعتبار سے اس پر فضیلت رکھتے ہیں۔ یعنی عیار الشعرا از خوب چند ذکا جو ۱۲۰۰ھ یا ۱۲۱۳ھ میں شروع ہوا۔ اور مولف برابر تیس سال تک اس میں اضافے کرتا

رہا۔ اور جس میں پندرہ سو شعرا کا حال لکھا گیا ہے۔ دوسرا تذکرہ عمدۂ منتخبہ از اعظم الدولہ سرور ۱۲۱۶ھ
جس میں بارہ سو شعرا کے حالات درج ہیں۔ مگر جناب مرتب کی رائے میں مجموعہ نغز اگرچہ چھ سو تراسی
ریختہ نگاروں کے حالات پر مشتمل ہے اور حکیم صاحب نے ان ہر دو تالیفات سے ممکن ہے استفادہ
حاصل کیا ہو تاہم خود حکیم صاحب کی تحقیقات اور تلاش کو اس تذکرے کی تالیف میں بہت بڑا دخل ہے۔
اشپرنگر ریختہ گویوں کی جدید فہرست تیار کرتے وقت مجموعہ نغز کو تین سو بیس شعرائے اردو کے سلسلے
میں استعمال کرتا ہے ادھر گارساں دتاسی اپنی تاریخ شعرائے اردو میں کثرت کے ساتھ اس سے
کام لیتا ہے۔ پھر آزاد کی مشہور عالم تصنیف آب حیات کی ورق گردانی کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے
کہ آب حیات کا ایک بڑا حصہ اس تذکرے سے ماخوذ ہے۔

ان معلومات کے بعد مجموعہ نغز کی حقیقی وقعت اور قیمت کا اندازہ خود بخود ہو جاتا ہے۔ ہم
کو نہایت مسرت ہے کہ ایسی نایاب کتاب "کلیۂ پنجاب" کی طرف سے شائع ہوئی۔ جناب مرتب کی
دیدہ ریزی اور محنت و تلاش بھی کچھ کم قابل قدر نہیں ہے۔ آپ نے نسخہ ہذا کو نہایت خستہ اور تباہ
حالت میں پایا۔ مولف کی تحریر میں نقاط کا بہت کم التزام تھا۔ اس لئے اس کو نقل کرنا آسان
نہ تھا۔ متن کی تصحیح میں بھی ہر ممکن ذریعے سے کام لیا گیا ہے کثرت سے کرم خوردہ ہونے کے علاوہ
جس کا اثر عبارت متن پر بھی عائد تھا، متعدد اوراق کا کچھ کچھ حصہ ڈیڑھ، ڈیڑھ، دو، دو انچ
کے دور میں ضائع ہو چکا تھا، چنانچہ انڈیا آفس کے کتاب خانہ سے ایک نسخہ ۱۲۲۳ھ آپ کو مل
گیا۔ جو کثرت سے غلط اور سقیم تھا۔ تاہم اس میں بعض اضافے آپ کے نسخے سے زیادہ تھے جن کو
آپ نے متن میں شامل کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ جہاں جہاں اصل نسخے کی عبارت ضائع ہو گئی
تھی وہ حصہ آپ نے انڈیا آفس کے نسخے سے نقل کر لیا اور ایسی عبارت یا الفاظ کو قلابین میں
بدیں صورت [ ] محدود کر دیا۔ اور اپنے اضافوں کو قوسین ( ) سے ظاہر کر دیا۔ بے شک
آپ نے کچھ اشعار جو عہد حاضر کے مذاق کے منافی تھے خارج کر دئے ہیں۔ اس کے سوا آپ نے
اصل نسخے کو جوں کا توں رہنے دیا ہے۔ البتہ ضخامت کے خیال سے دو جلدوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

آپ نے اپنے دیباچہ میں ثابت کیا ہے کہ اصل نسخہ خود حکیم صاحب کے دست مبارک کا نوشتہ ہے اور جو امور آپ نے بطور شہادت پیش کئے ہیں۔ اس کے لحاظ سے ہم کو بھی اس امر کے تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہے۔ اسی یقین پر عمل کرتے ہوئے جناب مرتب نے گذشتہ صدی کے ایک عالم اہل قلم کی خصائص انشاؤ املا کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ آپ اس کے مدعی نہیں کہ نسخہ مطبوعہ ملحاظ رسم الخط اپنے اصل کا صحیح قائم مقام ہے مگر آپ اس قدر ضرور کہتے ہیں اور بجا کہتے ہیں کہ اول الذکر زیادہ تر آخر الذکر کی خصوصیات پر قائم ہے چنانچہ آپ نے اپنے دیباچہ میں وہ تمام فرق املا کے دکھائے ہیں جو اس زمانے اور اس زمانے کی تحریر میں پائے جاتے ہیں۔

آپ نے شروع میں فہرست مطالب مع سودحلد درج کی ہے جو بارہ صفحات پر حاوی ہے۔ اس کے بعد دیباچہ لکھا ہے۔ جو چودہ صفحات کا ہے۔ بعد ازاں مصنف کے حالات اور دیگر امور متعلقہ پر روشنی ڈالی ہے۔ اور حکیم صاحب کے تذکرے کی برتری دیگر تذکروں پر ثابت کی ہے۔ آخر میں آپ حیات اور مجموعۂ نغز کے عنوان سے ظاہر کیا ہے کہ کہاں کہاں آزاد نے اس کتاب سے استفادہ کیا ہے۔ ان حالات اور دیگر امور نے بیس صفحات پر کئے ہیں۔

جناب مرتب نے اس کتاب کا نہایت نفیس اڈیشن شائع کر کے ہم لوگوں کو اس سے روشناس کر دیا ہے۔ یہ کتاب مجلد ہے اور جلد بھی نہایت خوبصورت ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ سب عمدہ ہے۔ کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ اگر جناب مرتب حکیم صاحب مرحوم کی تصویر بھی (اصلی نہیں خیالی یا فرضی ہی سہی) چھاپ دیتے تو آکسفورڈ یونیورسٹی کے مطبوعات سے کلیۃً پنجاب کے اس نسخے مطبوعہ کا وزن ہرگز کم نہ رہتا۔ بہرحال ہم جناب مرتب کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ اور ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ کہ انھوں نے حکیم صاحب کے مجموعہ نغز کو جو ایک صدی سے گوشۂ گمنامی میں مقید پڑا تھا تازہ ہوا کھانے کا موقع دیا۔ اور اس کو ایسا نفیس چھاپا کہ خود مولف سے بھی یقیناً اس قدر اہتمام نہ ہو سکتا۔ نیز آپ نے مؤلف کے نام کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ ع "ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"

آخر میں ہم جناب مرتب کی توجہ چند ایسی غلطیوں کی طرف مبذول کرنے کی جرأت کرتے ہیں جو بظاہر

خفیف معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن جن کا اثر ادب و انشا کو خراب اور بد مذاق بنا رہا ہے۔ اور ہمارے نوجوان
تعلیم یافتہ اصحاب کو خود رائی، خود پسندی اور بے پروائی کا سبق دے رہا ہے۔
آپ نے اپنے دیباچے کو شروع کرتے ہوئے تیسری سطر میں تحریر فرمایا ہے: "گذشتہ چند سالوں
میں اردو شعراء و مصنفین کے حالات کے متعلق تحقیق و تلاش کی جو مبارک تحریک ہمارے ملک میں جاری ہوئی
ہے ........"
میرے نزدیک سال کی جمع "سالوں" نہایت مذموم ہے۔ یہ جمع کسی مستند شاعر یا مصنف کے یہاں
نہیں دیکھی گئی۔ اگلے لوگ سالہا سال کہتے تھے یا برسوں کہتے تھے۔ مثلاً امیر مینائی فرماتے ہیں:

"رہے گا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں"

چوں کہ اس موقع پر اگر آپ "برسوں" استعمال کرتے تو کوئی خرابی واقع نہ ہوتی اور اگر آپ لفظ "سال"
ہی استعمال کرنے پر مصر ہیں تو اس کو واحد اور جمع دونوں موقعوں پر لکھ سکتے ہیں۔
مصنف کے حالات کے تحت میں صفحہ (ما) کی آخری سطروں میں آپ نے تحریر فرمایا ہے:۔
"لیکن ان کی ستیزہ کاری کے قصوں کی تحریر کے وقت بھی ہمارے مصنف کا رویہ تعجب کی حد تک
اغماض اور چشم پوشی کو کار فرما ہے۔" ہمارے نزدیک کار فرما کا استعمال اس طرح نہ ہونا چاہئے بلکہ یہ جملہ
یوں ادا ہونا چاہیئے:۔
"......... ہمارے مصنف کے رویہ میں تعجب کی حد تک اغماض اور چشم پوشی کار فرما ہے۔"
اس عنوان کے تحت میں صفحہ (ج) کی آخری سطروں میں آپ لکھتے ہیں:۔
"ہم ان الزامات کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتے۔" یہ انگریزی محاورے کا لفظی ترجمہ ہے۔ جو اردو
میں اجنبی اور وحشی معلوم ہوتا ہے۔ کیا ان کا مطلب ان الفاظ سے ادا نہیں کیا جا سکتا تھا کہ "ہم ان
الزامات کو بالتفصیل بیان کرنا نہیں چاہتے۔" لیکن مشکل یہ ہے کہ بعض مشہور اہل قلم بھی اس قسم کی
غلطیوں کو غلطی نہیں سمجھتے اور" اردو میں اضافہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔
جناب مرتب صاحب ہمیں معاف فرمائیں اگر ہم نے زبان کی بہتری کو مد نظر رکھتے ہوئے ان چند

فروگذاشتوں کا ذکر اس توقع پر کر دیا ہے کہ آئندہ وہ اپنی تحریر میں زیادہ احتیاط سے کام لیں گے۔
اور جیسا کہ اب تک ان کا شعار رہا ہے۔ برابر دادِ تحقیق دیتے رہیں گے۔

---

گھر گرہستی | از سید بشیر حسین صاحب مولوی فاضل تقطیع ۱۸×۲۲/۸، حجم ۲۳۰ صفحہ لکھائی چھپائی اچھی کاغذ اوسط درجے کا قیمت عہ/ سید محمود حسن صاحب ادبی بک ڈپو، امروہہ (یو پی) سے مل سکتی ہے۔

خانہ داری یا تدبیر منزل یونانیوں کے نزدیک علم الاخلاق اور سیاست مدن کی طرح حکمت عملی کا ایک شعبہ سمجھی جاتی تھی۔ اس کی بنیاد پر اس علم کی تعمیر ہوئی۔ جواب معاشیات یا اقتصادیات کہلاتا ہے مہذب قوموں کو خانہ داری کی اہمیت کا ہمیشہ احساس رہا ہے اس لئے کہ گھر اور اس کا کاروبار انسانی تمدن اور معاشرت کا نقطۂ قائمہ یا قطب ہے۔ اسی کے گرد سارا نظام تمدن گردش کرتا ہے۔ ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کی موجودہ پستی کا اصلی سبب یہی ہے کہ ان کی خانہ داری کا قوام ہر طرح سے بگڑ گیا ہے اور اس پستی کے دور ہونے کی کچھ امید ہے تو اسی سے ہے کہ اب گھریلو زندگی کو درست کرنے کی طرف تھوڑی بہت توجہ ہو رہی ہے۔ اس موضوع پر پچھلے تیس چالیس سال میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ جن میں مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کی کتاب مراۃ العروس کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس لئے کہ اس میں قدیم طرز کی ہندوستانی معاشرت کی بے مثل تصویر ہے۔ مگر بہت سی کتابیں خصوصاً وہ جو جدید طرز معاشرت کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں بالکل ناکامیاب ثابت ہوئیں۔ اس کی وجوہ علاوہ ادبی نقائص کے دو ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کتابوں کے لکھنے والے ہندوستانی معاشرت کی روح سے بیگانہ ہیں۔ اس لئے ان کی باتیں پڑھنے والوں کے دل میں نہیں اترتیں۔ دوسرے ان میں جو اصلاحی تدابیر بتائی جاتی ہیں وہ اس قدر مصارف چاہتی ہیں کہ سوائے چند امیر گھرانوں کے کسی کے لئے ان کا اختیار کرنا ممکن نہیں "گھر گرہستی" جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے ان سب عیوب سے پاک ہے اس کی زبان پاکیزہ شستہ، سادہ اور سلیس ہے۔ طرز بیان سبک، دل آویز اور دلنشیں ہے۔ مضامین، گھر بار کے انتظام، کفایت شعاری، سلیقہ مندی، لباس اور زیور، رسومات، حفظانِ صحت، عزیزوں کے آپس کے تعلقات،

غرض گھریلو زندگی کے کل شعبوں پر حاوی ہیں۔ قصے کا پیرایہ اگرچہ محض برائے نام اختیار کیا گیا ہی لیکن اس کی وجہ سے دلچسپی میں اضافہ ہوگیا ہی۔ کہیں کہیں ظرافت کی چاشنی بھی موجود ہی۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہی کہ کتاب امیروں کے لئے نہیں بلکہ معمولی حیثیت کے لوگوں کے لئے لکھی گئی ہی جنھیں اس قسم کے ہدایت اور مشورے کی سب سے زیادہ ضرورت ہی۔ غرض کتاب اس قابل ہے کہ ہر پڑھی لکھی عورت ایک بار نہیں بار بار پڑھے اور بن پڑھی دوسروں سے پڑھوا کر سنے۔

ان خوبیوں کے ساتھ دو چیزیں ایسی ہیں کہ مصنف کو آئندہ اڈیشن میں جس کا موقع انشاء اللہ بہت جلد آئے گا دور کر دینا چاہئے۔ ایک یہ کہ کہیں کہیں مقامی الفاظ اور محاورے استعمال کئے گئے ہیں جنھیں ہندوستان کے دوسرے حصوں کے لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ یا تو ان کی جگہ ٹکسالی الفاظ استعمال کئے جائیں یا پھر ان کی تشریح کردی جائے۔ دوسرے تصویریں بدل دی جائیں۔ ان سے عبرت تو ضرور ہوتی ہے لیکن اس قسم کی نہیں جیسی مصنف چاہتے ہیں۔

---
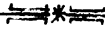
**ندیم - بہار نمبر** | اڈیٹر جناب انجم گیاوی تقطیع متوسط، حجم ۳۲۰ صفحات، کاغذ اور کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت عہ۔ قیمت سالانہ للعہ مقام اشاعت گیا (بہار)

بہار کی زمین اخبارات و رسائل کے لئے بہت شور ہے۔ انتہا یہ کہ پورے صوبے میں اس وقت کوئی معقول و سنجیدہ اردو یا انگریزی روزنامہ تک موجود نہیں۔ اس سے پہلے کئی اچھے اچھے رسالے۔ پٹنہ اور دوسرے مقامات سے نکلے لیکن چند دن جاری رہ کر ناقدری کا شکار ہوگئے جناب انجم سزاوار تحسین و ستائش ہیں کہ اپنی کوشش و ہمت سے اس قدر کامیابی کے ساتھ رسالے کو چلا رہے ہیں۔ اس مرتبہ انھوں نے ایک خاص نمبر، بہار نمبر کے نام سے نکالا ہی اس نمبر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بہاری اہل قلم حضرات کے مضامین ہیں۔ مضمون نگاروں میں، مولینا سید سلیمان ندوی، مولینا سید نجیب اشرف ندوی، حضرت شاد مرحوم، مولینا مناظر احسن گیلانی، جناب مان پوری، جناب عبدالمالک صاحب آروی، شاہ ولی الرحمن صاحب ایم اے، پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی

پروفیسر محفوظ الحق ایم اے ۔ سید ریاست علی ندوی ، جناب احمد اللہ صاحب ندوی وغیرہم خاص طور سے قابل ذکر ہیں ۔ اسی طرح شعرا میں جناب محسن ، جناب نجم گیلانی ، حضرت شفق عماد پوری ، حضرت شاد مرحوم مولینا تمنا ، علامہ آزاد ، جناب یاس ، جناب بنا ، جناب اصغر ، جناب تمین ، جناب رسا ہمدانی کے نام نظر آتے ہیں ۔ مضامین کی ترتیب اور تصاویر کے انتخاب میں بھی ایک خاص سلیقہ نمایاں ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ جناب اڈیٹر نے بہار کے تقریباً تمام اچھے لکھنے والوں کے مضامین جمع کرکے ایک کارنامہ انجام دیا ہے ۔ جس کے لئے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں ۔ اس سلسلے میں یہ ظاہر کر دینا بھی غیر مناسب نہ ہوگا کہ ہمیں جناب مولینا مناظر احسن صاحب گیلانی کا طرز تحریر پسند نہیں آیا ۔ اپنی یا اپنے صوبے کی علمی کاوشوں کی تعریف کرتے وقت کیا ضرور ہے کہ دوسروں کی مذمت کی جائے ۔ یا ان کی کوششوں کو گھٹا کر بیان کیا جائے ۔ خالص علمی و ادبی تحریریں تو اس ہیئت سے خالی ہوں تو اچھا ہے ۔

---

الایمان ماہوار ۔ اڈیٹر مولینا مظہر الدین صاحب ، تقطیع بڑی ۔ ضخامت ۵۶ صفحات کتابت وطباعت اور کاغذ معمولی ۔ قیمت سالانہ ایک روپیہ فی پرچہ ۲ر مقام اشاعت دہلی

یہ رسالہ اشاعت و تبلیغ کی غرض سے جناب مولینا مظہر الدین صاحب کی نگرانی و ادارت میں نکلتا ہے ۔ مضامین زیادہ تر مذہبی اور تاریخی ہوتے ہیں ۔ عام لوگوں کے لئے مفید اور دلچسپ ہیں ، ایک روپیہ میں بہت سستا ہے ۔

# دنیا کی رفتار

## (ہندوستان)

گاندھی جی کی گرفتاری کو مشکل سے دو ہفتے ہوئے تھے جب اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ وہ پھر برت رکھنے والے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے برت رکھا اور جب ان کی حالت خطرناک ہوتی تو حکومت نے ان کو رہا کر دیا۔ یہ برت اس وجہ سے رکھا گیا تھا کہ پچھلی قید کی طرح گاندھی جی اس دفعہ بھی اچھوت ادھار کے کام کے لئے مکمل آزادی کا مطالبہ کرتے تھے اور حکومت صرف محدود آزادی دینی چاہتی تھی، گاندھی جی نے حکومت کو یہ لکھا کہ اگر انھیں اس کام کے لئے پوری آزادی حاصل نہ ہوتی تو زندگی ان کے لئے عذاب ہو جائے گی اور وہ ایسا برت رکھیں گے جو ان کی جان لے کر رہے۔ حکومت نے اس موقعے پر جو بیان شائع کیا اس کا مفہوم یہ تھا کہ گاندھی جی جب اول دفعہ رہا کئے گئے تو انھوں نے اپنا بیشتر وقت سیاسی معاملات میں صرف کیا اور ہریجنوں کی خدمت کے لئے بہت کم وقت دیا۔ پھر اب قید خانے میں جو وہ مکمل آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں وہ معقول نہیں ہے، دوسری دلیل یہ تھی کہ پچھلی دفعہ گاندھی جی سرکاری قیدی تھے اور اس دفعہ معمولی مجرم! اس لئے جو رعایتیں انھیں پچھلی دفعہ حاصل تھیں وہ اس دفعہ نہیں مل سکتیں۔ آخر میں حکومت نے یہ اعلان کیا تھا کہ اگر گاندھی جی کو واقعی ہریجنوں کی خدمت اس قدر عزیز ہے تو حکومت انھیں اس شرط پر رہا کرنے کے لئے تیار ہے کہ وہ اپنا وقت صرف اسی کام میں صرف کریں۔ اور سیاست سے الگ رہیں۔

رہائی کے بعد گاندھی جی نے اس سرکاری اعلان کا جو جواب شائع کیا اس کا مفہوم یہ تھا کہ حکومت کا یہ الزام کہ انھوں نے رہائی کے بعد بہت کم وقت ہریجنوں کے کام میں صرف کیا سراسر غلط ہے، ثبوت میں انھوں نے چند مثالیں اور کام کی تفصیلات بھی پیش کیں۔ سرکاری اور معمولی قیدی کی جو تفریق حکومت نے کی تھی اسے بھی گاندھی جی نے تسلیم نہیں کیا۔ اور کہا کہ یہ تفریق بالکل غیر متعلق بات ہے

مسئلہ دراصل یہ ہی کہ "قید خانے میں ہریجنوں کی خدمت کی آزادی اور میری زندگی یا پابندی اور میری موت۔ یہ مسئلہ اس وقت تک باقی رہے گا جب تک میں زندہ ہوں اور نہ صرف میرے سامنے رہے گا بلکہ حکومت اور پبلک کے سامنے بھی اگر میرا مطالبہ غلط ہی کہ مجھے قید خانے کے اندر بھی اس کام کے لئے اتنی ہی آزادی حاصل ہونی چاہئے جتنی باہر ہے تو میرے برت کو ایک گستاخی سمجھ کر حکومت اور پبلک دونوں کو چاہئے کہ میری پروا نہ کریں۔"

ہریجنوں کے معاملے میں گاندھی جی کا یہ تیسرا برت تھا، پہلا برت انھوں نے پچھلے سال ستمبر میں رکھا تھا جب حکومت کا فیصلہ فرقہ وار نمایندگی سے متعلق شائع ہوا تھا، اس برت کا اثر اتنا زیادہ ہوا کہ دس روز کے اندر ہی ہندوستان کے ہر حصہ سے لوگ بمبئی میں جمع ہوئے اور ایک فیصلہ ہریجنوں کے حق میں ایسا ہوگیا جسے حکومت بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہوئی۔ حکومت کی منظوری کی خبر ملتے ہی برت ختم ہوگیا۔ دوسرا برت غیر مشروط تھا اور حکومت کی کسی کارروائی سے متاثر ہوکر نہیں رکھا گیا تھا، بلکہ قوم کی سستی اور سہل انگاری کا نتیجہ تھا، اس برت کے رکھتے ہی حکومت نے گاندھی جی کو رہا کردیا۔ لیکن چونکہ یہ اکیس دن کا برت تھا اس لئے پوری مدت تک جاری رہا۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہریجنوں کی خدمت کی تحریک میں پھر ایک رو دوڑ گئی اگر اخبارات سے اس کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے تو یہ کہا جاسکتا ہی کہ پہلے برت سے دوسرے کا اثر کم ہوا اور تیسرے کا تو بہت ہی خفیف اثر ملک میں نظر آتا ہے۔

اس بار رہائی کے بعد گاندھی نے پھر پرناکٹی میں قیام کیا اور وہیں پنڈت جواہر لال نہرو سے ملاقات کی۔ اس ملاقات پر قوم کی آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ قوم پرست جماعت میں گاندھی جی کے بعد جواہر لال نہرو ہی سب سے زیادہ مقبول ہیں لیکن سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ نافرمانی کی جو تحریک گاندھی جی کی انگلستان سے واپسی کے بعد شروع ہوئی تھی اس کی ذمہ داری بڑی حد تک جواہر لال نہرو پر ہے۔ گاندھی جی کے اعلان سے پہلے صوبہ متحدہ میں یہ تحریک عملاً شروع ہوچکی تھی اور خود پنڈت جواہر لال نہرو گرفتار بھی ہوچکے تھے۔ یہ حقیقت

بھی اب راز نہیں ہے کہ لارڈ ارون اور مہاتما گاندھی کی مفاہمت پنڈت جواہر لال نہرو کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی اور انھوں نے کوئی ارادی کوشش اس معاہدے کو فسخ کرنے کی نہ بھی کی ہو تو کم از کم یہ خواہش ان کی ضرور تھی کہ یہ تکلیف دہ صلح جلد سے جلد ختم ہو جائے ۔ ان وجوہ سے گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو کی ملاقات اور زیادہ اہم ہو گئی ۔

یہ ملاقات کئی دن تک جاری رہی اور تفصیلات کا تو علم نہیں ۔ لیکن اس کا جو نتیجہ نکلا وہ یہ ہے کہ گاندھی جی نے یہ اعلان کیا کہ وہ ایک سال تک نافرمانی کی تحریک میں کوئی جارحانہ اقدام نہیں کریں گے ، اور اپنا بیشتر وقت ہریجنوں کے لئے وقف کر دیں گے ۔ اس سلسلے میں گاندھی جی نے جو اعلان شائع کیا ہے انھوں نے اس میں یہ اعتراف کیا ہے کہ اس وقت انھیں کسی طرف کوئی درستی نظر نہیں آتی اور نہ مستقبل کی راہ صاف دکھائی دیتی ہے اس کے علاوہ صحت بھی اچھی نہیں ہے ۔ بہت غور و فکر اور دعا کے بعد وہ اس فیصلے پر پہنچے ہیں کہ ایک سال تک وہ اپنے آپ کو قیدی تصور کریں گے اور صرف وہی کام کریں گے جس کا مطالبہ انھوں نے قید خانے میں کیا تھا ۔ یہ فیصلہ انفرادی ہے اور تحریک نافرمانی کا التوا اس سے لازم نہیں آتا ، ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت مجبور ہو کر انھوں نے یہ فیصلہ کیا ہے اور خود اس عائد کردہ پابندی سے انھیں بہت تکلیف ہے ۔

اس سلسلے میں پنڈت جواہر لال نہرو کا ایک خط اور گاندھی جی کا جواب بھی شائع ہوا ہے اس میں ان تمام اہم مسائل کا بیان ہے جو اس ملاقات میں زیر بحث تھے ، اور دونوں نے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے ۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے خط میں جن امور پر زور دیا ہے وہ یہ ہیں ۔

(۱) کراچی کانگرس کی تجویز متعلق بنیادی حقوق ۔ اگرچہ پنڈت جی اس سے کلیتاً مطمئن نہیں ہیں لیکن ان کے خیال میں یہ ایک مبارک ابتدا تھی ۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستان کی آزادی اس وقت تک بالکل بے معنی ہے جب تک اس کا نتیجہ غریب کسان اور مزدور کی فلاح نہ ہو ۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان لوگوں سے جو صاحب اقتدار ہیں ۔ اقتدار لے کر کم مایہ عوام کو دے

دیا جائے۔ سب سے بڑی صاحب اقتدار طاقت تو حکومت ہے اور اس کے بعد نوابوں اور راجاؤں کا درجہ ہے۔ پھر زمیندار اور تعلقہ دار ہیں۔ اس لئے صرف حکومت کے خلاف تحریک کافی نہیں ہے بلکہ دوسرے صاحب اقتدار طبقوں کے خلاف بھی آواز اٹھانی چاہئے۔ گاندھی جی نے اس کے جواب میں یہ لکھا ہے کہ ان کی رائے میں یہ کارروائی ابھی قبل از وقت ہوگی وہ اس سے تو متفق ہیں کہ والیان ملک کو ذمہ دار حکومت قائم کرنی چاہئے لیکن ان کو علیحدہ کرنا مناسب نہیں۔ اس لئے کہ ان سے گاندھی جی کو بہت سی توقعات ہیں۔ اسی طرح زمینداروں اور تعلقہ داروں سے بھی ایسا برتاؤ کرنا چاہئے کہ ان پر جبر نہ ہو بلکہ بہ رضا و رغبت وہ اپنے بیجا حقوق سے دست بردار ہو جائیں۔ مہاتما جی کو اس کا تو احساس ہے کہ اس کے لئے عرصہ بہت درکار ہے مگر ان کے خیال میں یہی سب سے زیادہ سیدھا راستہ ہے۔

۲۔ کانگرس کا مقصد ہندوستان کی مکمل آزادی ہے اور اس کا اعلان صاف صاف کر دینا چاہئے۔

گاندھی جی کو اس سے اتفاق ہے لیکن اس مقصد کو بار بار دہرانے کی انھیں کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ان کا خیال ہے کہ اس معاملے میں ان میں اور پنڈت جواہر لال نہرو میں جو اختلاف ہے اس کی بنا اختلاف مزاج پر ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو ہر چیز کو بار بار صاف صاف بیان کر دینا چاہتے ہیں اور گاندھی جی ایک دفعہ فیصلہ کرنے کے بعد اس کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ بار بار فیصلے کا اعادہ کیا جائے بلکہ ہر ذریعے سے فائدہ اٹھا کر مقصد کی کامیابی کی کوشش کرتے ہیں۔

۳۔ ہندوستان کو چاہئے کہ دنیا کی ترقی پسند جماعتوں کا ساتھ دے اور الگ تھلگ نہ رہے۔ مہاتما جی کو اس سے اتفاق ہے۔

۴۔ مسٹر آنے کے بیان سے جو غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے کہ کانگرس کا ادارہ ختم ہو گیا وہ خلاف واقعہ ہے۔ گاندھی جی کا بھی یہی خیال ہے۔

۵۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے خیال میں اجتماعی اور انفرادی نافرمانی میں کوئی بنیادی فرق نہیں

ہی اور یہ تفریق بلا وجہ کی گئی۔ گاندھی جی اس سے متفق نہیں ہیں۔ ان کی رائے میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ اجتماعی نافرمانی میں ایک کارکن کا اثر دوسرے پر لازماً پڑتا ہے اور انفرادی نافرمانی میں یہ ضروری نہیں۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ اجتماعی نافرمانی کی حالت میں کانگرس کے اداروں کا کام کرتے رہنا ضروری ہے اور انفرادی نافرمانی میں اس کی ضرورت نہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت کے احکام امتناعی کی موجودگی میں اجتماعی نافرمانی بغیر خفیہ کارروائیوں کے ناممکن ہے (خفیہ کارروائیوں کے عدم جواز پر دونوں حضرات متفق ہیں) اور انفرادی نافرمانی باوجود صدہا احکام امتناعی کے جاری رہ سکتی ہے اور اسے جاری رہنا چاہیئے۔

گاندھی جی نے اپنے جواب میں یہ بھی لکھا ہے کہ کانگرس کے تعمیری پروگرام کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیئے۔ قید ہونے والے کم ملیں گے اس لئے ان چیزوں پر زور دینا چاہیئے جن پر سب لوگ عمل کر سکتے ہیں مثلاً کھدر اور ہندو مسلم اتحاد۔

ان بیانات کا اثر تحریک نافرمانی پر جو اس دفعہ شروع ہی سے نیم جان ہے جو کچھ پڑے گا ظاہر ہے گاندھی جی کی کنارہ کشی کے بعد خواہ وہ عارضی ہی کیوں نہ ہو اس تحریک کا چلنا معلوم۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ بےچارے کارکن جو اس تحریک کے سلسلے میں قید میں مبتلا ہیں اور جن کی رہائی کے لئے کسی غیر معمولی وجہ کے ظہور کا بھی امکان نہیں ہے کب تک اس مصیبت میں گرفتار رہتے ہیں ہر دفعہ گاندھی جی کی رہائی کے بعد کچھ لوگ ان میں اور حکومت ہند میں صلح کرانے کا بیڑا اٹھاتے ہیں اس دفعہ بھی اس کے آثار ہیں لیکن کوئی وجہ بظاہر اس کی نہیں معلوم ہوتی کہ حکومت ایسے موقعے پر جب اس کی دشواریاں ختم ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں دست تعاون بڑھائے گی۔ اور محض اس لئے صلح کرے گی کہ اصول اخلاق کی رو سے صلح جنگ سے بہتر ہے۔

# ممالکِ غیر

**جرمنی** جو حضرات یورپ کے سیاسی اور معاشی حالات کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جرمنی میں ہٹلر اور اس کی پارٹی کا برسر اقتدار ہو جانا اس سال کا سب سے اہم واقعہ ہے اور ساری دنیا کی آنکھیں اس وقت ان تجربات کی طرف لگی ہوئی ہیں جو یہ جماعت کر رہی ہے۔ اسی وجہ سے ان صفحات میں بھی پابندی سے ہر مہینے جرمنی کے واقعات کی رفتار پر نظر ڈالی جاتی ہے۔ غالباً رسالہ "جامعہ" کے پڑھنے والوں کے دل میں بھی نئی جرمن حکومت کے متعلق وہی سوالات پیدا ہوں گے جو یورپ اور امریکا میں ہر شخص کی زبان پر ہیں کہ ہٹلر کی قومی اشتراکی جماعت (نیشنل سوشلسٹ پارٹی جسے اختصار کی غرض سے جرمن "نانسی" انگریز "نازی" کہتے ہیں) کے حقیقی اصول کیا ہیں۔ اس میں قومیت کا عنصر کتنا ہے اور اشتراکیت کا کتنا۔ اس کی تائید ملک میں کون کون سے طبقے کر رہے ہیں۔ اس کے اتنی جلدی قوت پکڑ جانے کے کیا اسباب ہیں۔ وہ اس قوت سے کیا کام لے رہی ہے، اور اس کے اپنے مقاصد میں کامیاب ہونے کا کس حد تک امکان ہے۔ ذیل میں ان سوالات کا جواب اختصار کے ساتھ ایسے ماخذ سے دیا جاتا ہے جو بظاہر بے تعصبانہ تحقیقات کے معیار پر پورا اترتا ہے۔

قومی اشتراکی جماعت جرمنی میں مدت سے قائم ہے۔ اس کا نصب العین یہ ہے کہ ملک کی سیاسی اور معاشی زندگی کی بنا اشتراکی اصولوں پر قائم کی جائے۔ لیکن صرف جرمن قوم کی ضرورتوں اور مصلحتوں کو مد نظر رکھ کر۔ اب سے چند سال پہلے تک اس جماعت میں بہت تھوڑے لوگ تھے، اشتراکی خیال کے لوگ اسے قومیت پرست اور تنگ نظر سمجھتے تھے اور نیشنلسٹ اس کے اشتراکی رجحان کی وجہ سے مخالف تھے۔ عام خیال یہ تھا کہ اس پارٹی کا نصب العین اضداد کا مجموعہ ہے۔

پچھلے دس سال کے عرصے میں اس کی قوت آہستہ آہستہ بڑھتی رہی۔ جس کی دو وجوہ تھیں ایک تو یہ کہ اطالیہ میں فاشستی جماعت کو جس کے اصول ایک حد تک اس پارٹی کے اصولوں سے ملتے جلتے تھے نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ اور جرمن قوم پر خصوصاً نوجوانوں کے تخیل پر اس کا

بہت زبردست اثر پڑا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ جمہوری اشتراکی جماعت جو ۱۹۱۸ء کے انقلاب کے بعد سے برسرِ حکومت تھی جرمن قوم کو اس سیاسی ذلت اور معاشی پستی سے جس میں اُسے صلح نامۂ ورسائی نے مبتلا کر دیا تھا نکالنے میں بالکل ناکام رہی اور اندرونی معاملات میں بھی صنعتی سرمایہ داروں کی قوت اور حکمت عملی نے اسے زچ کر دیا۔ اس کے بعد نیشنلسٹ جماعت کے ہاتھ میں قوت آئی جس کی سرپرستی صنعتی سرمایہ دار اور کچھ زمیندار کر رہے تھے، اس جماعت کا بھروسا جنرل فان شلائشر پر تھا، کہ وہ فوجی قوت اور سختی سے کام لے کر ملک میں اس وقت تک امن قائم رکھے گا کہ معاشی حالت بہتر ہو جائے جنرل فان شلائشر مزدوروں اور کسانوں کا بھی بہی خواہ تھا۔ اور یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ اگر اسے کامل اختیارات دے دئے جائیں تو وہ ایک حد تک عام قومی مفاد کو مدنظر رکھ کر حکومت کرتا رہے گا۔ مگر فان پاپن سابق وزیر اعظم کی سازشوں نے فان شلائشر کی حکومت کو قائم نہ رہنے دیا۔ فان پاپن نے بڑے زمینداروں کو جن کا قائد ہوگن برگ ہے اور علاقہ رھائن کے صنعتی سرمایہ داروں کو یہ یقین دلایا کہ ہٹلر کی سرکردگی میں قومی اشتراکی جماعت کی قوت بڑھتی جاتی ہے اور اسے ساتھ لئے بغیر کسی حکومت کا قائم رہنا مشکل ہے۔ سرمایہ داروں کو دو اعتراض تھے پہلا یہ کہ یہ اشتراکی پارٹی ہے جو اصولاً سرمایہ داروں کی مخالف ہے دوسرا یہ کہ ہٹلر اپنی پارٹی کی تعداد کے تناسب سے کہیں زیادہ حصہ حکومت میں مانگتا ہے۔ پاپن نے اطمینان دلایا کہ ہٹلر کی اشتراکیت محض عوام کو خوش کرنے کے لئے ہے۔ اور یہ بھی کہا کہ میں مجلسِ وزرا میں صرف دو تین جگہیں لینے پر اس جماعت کو راضی کر دوں گا۔ غرض باوجود بہت سے سرمایہ داروں کی مخالفت کے بڑے زمیندار اور علاقہ رھائن کے سرمایہ دار اس تجویز پر راضی ہو گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہٹلر اپنی پارٹی کے لئے سلطنت کی مجلس وزرا میں صرف دو جگہیں اور پروشیا میں صرف ایک وزارت لے کر اتحادِ عمل پر راضی ہو گیا۔ بظاہر یہ فان پاپن اور سرمایہ داروں کی بہت بڑی فتح تھی۔

لیکن ذرا یہ دیکھئے گا کہ قومی اشتراکی جماعت نے جن معدودے چند وزارتوں پر

قناعت کی وہ کون کون تھیں اور ان کی کیا اہمیت تھی، پہلی وزارت حربی تھی جس پر
فان شلائشر کی جگہ فان بلوم برگ کا دوسری وزارت داخلہ تھی جس پر ہر فلک کا، تیسری خاص
پروشیا کی وزارت داخلہ تھی جس پر ہر گورنگ کا تقرر ہوا اس کے معنی یہ تھے کہ سارے ملک
کی فوج اور پولیس قومی اشتراکی وزرا کے ہاتھ میں آگئی! اس کے علاوہ خود قومی اشتراکی جماعت
کے والنٹیر جو ایک باقاعدہ فوج کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور جن کی جد و جہد کو سرکاری فوج اور پولیس
بڑی مشکل سے روکتی تھی اب اپنی پارٹی کے وزرا کے معاون بن گئے۔

ان قوتوں سے کام لے کر ہٹلر نے ۵ مارچ کے انتخابات میں اکثریت حاصل کرنے کی
کوشش کی۔ اس کی تقدیر سے اور کمیونسٹ پارٹی کی حماقت سے اسی زمانے میں رائشٹاگ
(جرمن پارلیمنٹ) میں آگ لگائے جانے کا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے ہٹلر کی جماعت کے وزرا
کو اس کا موقع مل گیا کہ کمیونسٹ پارٹی کو رائشٹاگ سے خارج کر دیں اور یوں بھی کل نیشنلسٹ
پارٹیوں میں یہ لوگ ہر دل عزیز ہو گئے۔ ہٹلر کو پارلیمنٹ میں پوری اکثریت حاصل ہو گئی اس نے
وزیر اعظم کی حیثیت سے جو مجلس وزرا بنائی اس میں دوسری پارٹیوں کے ارکان بھی تھے، لیکن فوج
پولیس، عدالت وغیرہ بدستور قومی اشتراکی وزرا کے ہاتھ میں تھی، کیتھولک جماعت وغیرہ کو
دھمکا کر اسے بھی ہٹلر نے اپنے ساتھ شریک کر لیا۔ اور رائشٹاگ کے اتفاق رائے سے چار برس
کے لئے ڈکٹیٹر بنا دیا گیا۔

جو طرز عمل قومی اشتراکی جماعت نے اختیار کیا وہ اسے دیکھ کر فان پاپن اور سرمایہ داروں
کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ کام جو کسانوں اور مزدوروں کی امداد کے لئے جمہوری اشتراکی جماعت دس
سال کی حکومت میں نہیں کر پائی تھی وہ ہٹلر کی پارٹی نے چند ہفتوں میں کر لیا۔ کسانوں کی مدد اس
طرح ہوئی کہ غیر ملکوں کی زراعتی پیداوار کا داخلہ جرمنی میں بند کر دیا گیا جس سے دیسی پیداوار کی
قیمت بڑھ گئی، کسانوں کے کل قرضوں کی وصولی ملتوی کر دی گئی اور سود کی شرح گھٹا دی گئی۔
یہ اور دوسری اصلاحات بغیر قانون سازی کے بہت سیدھے سادھے طریقے سے انجام

پا گئیں ۔ قومی اشتراکی پارٹی نے فاشسٹوں کی تقلید میں اپنے یہاں اجتماع قوت کا اصول جاری کیا اور اس کا نام "اتحادِ عمل" رکھا۔ مقصد یہ تھا کہ نہ صرف حکومت میں بلکہ صنعت و تجارت، زراعت مالیات اور معیشت غرض ملکی زندگی کے ہر شعبے میں قومی اشتراکی جماعت کے افراد کارفرما ہوں تاکہ نئی تنظیم میں اشخاص اور جماعتوں کے اختلاف مقاصد سے خلل نہ پڑے چنانچہ ہٹلر نے پریسیڈنٹ ہنڈنبرگ کی منظوری سے جرمن سلطنت کی کل ریاستوں میں اپنی پارٹی کے گورنر مقرر کئے اور انھوں نے اپنی اپنی مجلس وزرا خود نامزد کی۔ جو مقامی پارلیمنٹ سے آزاد رکھی گئی۔ ان مجالس میں جو صنعت و تجارت وغیرہ کی نمائندگی کر سکتی ہیں، بنکوں میں، بڑے بڑے کارخانوں غرض ہر ادارے میں قومی اشتراکی پارٹی کے لوگ نگراں مقرر کئے گئے یہاں تک کہ مزدوروں کی انجمنیں بھی جمہوری اشتراکی قبضے سے نکل کر اس پارٹی کے ہاتھ میں آگئیں۔ اس قوت کو سمیٹنے میں ہٹلر کو اس عام نفرت سے بہت مدد ملی جو جرمن قوم کو یہودیوں سے ہے۔ ملک کو یہودیوں کے اثر سے پاک کرنے کا بہانہ کر کے اس نے ہر ادارے سے یہودی کارکن نکال دئے اور اس کی جگہ اپنی پارٹی کے لوگ بھر دئے۔

مزدوروں کی بے روزگاری دور کرنے کے لئے بھی متعدد تدابیر اختیار کی گئیں، اول تمام جرمن نوجوانوں کے لئے ایک سال تک مزدوری کرنا لازمی قرار دیا گیا۔ اور اس کا خرچ حکومت کے ذمے رکھا گیا۔ دوسرے ایک ارب مارک کے نوٹ اس غرض سے جاری کئے گئے کہ سرکاری عمارتیں اور رفاہِ عام کے ادارے تعمیر کرائے جائیں تاکہ مزدوروں کے لئے کام نکلے۔ نگران مزدوروں کیلئے علاوہ اس رقم کے جو بے روزگاری میں امداد کے طور پر ملتی تھی صرف ایک وقت کا کھانا اور کچھ اور رقم مقرر کی گئی جو صرف روزمرہ کی ضروریات پر خرچ کی جا سکتی ہے اس طرح تھوڑے روپئے میں بہت سے لوگوں کو کام کرنے کا موقع مل گیا۔ تیسرے یہ اعلان کیا گیا کہ جو کارخانے، ادارے یا افراد اپنے یہاں مزید مزدوروں سے کام لیں گے اور جو خانداں ماما ئیں نوکر رکھیں گے ان کے ساتھ انکم ٹیکس میں رعایت کی جائے گی۔ چوتھے یہ قاعدہ مقرر ہوا کہ جب کسی کی شادی ہو اور اس

میں خانہ داری کا سامان خریدنے کی استطاعت نہ ہو تو ریاست کی طرف سے اسے ایک ہزار مارک قرض دئے جائیں گے اور ماہوار آمدنی میں سے ایک فیصدی کی قسطوں میں ادائگی ہوگی مگر شرط یہ ہے کہ اگر اس شخص کی آمدنی ایک خاص حد سے کم نہ ہو تو اس کی بیوی مزدوری یا ملازمت نہ کرے ان انتظامات میں مزدوروں کے لئے کام پیدا کرنے کے علاوہ یہ بات بھی مدنظر ہی کہ کہ جہاں تک ہوسکے عورتوں کو گھر کے باہر کام کرنے سے باز رکھا جائے۔

غرض قومی اشتراکی جماعت نے اس مختصر سے عرصے میں اپنے نصب العین یعنی قومیت کے محدود دائرے میں بعض اشتراکی اصول رائج کرنے کی پوری کوشش کی ہے اور اب ایک حد تک کامیابی بھی حاصل کی ہے اور اس کے متعلق یہ کہنا غلط ہے کہ یہ بڑے زمینداروں یا سرمایہ داروں کی مٹھی میں ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ اس کا زیادہ دن برسرِ حکومت رہنا اور جو کام شروع کیا ہے اسے انجام تک پہنچانا ممکن ہے یا نہیں بہت کچھ غور و فکر چاہتا ہے۔ یہودیوں پر جو سختیاں کی گئی ہیں ان کی وجہ سے یہ پارٹی دوسرے ملکوں میں بہت بدنام ہوگئی ہے اور تمام دنیا کے یہودیوں نے اس کے خلاف زبردست پروپاگنڈا شروع کیا ہے۔ اگر بیرونی ممالک خصوصاً انگلستان اور امریکا میں رائے عامہ اس جماعت کے خلاف ہوگئی تو امورِ خارجہ میں اس کی پالسی بالکل ناکام رہے گی اور اس کی حکومت کا قائم رہنا دشوار ہو جائے گا۔ دوسری طرف داخلی امور میں اس کی کامیابی اس وقت تک صرف عوام اور متوسط طبقے کی تائید کی بدولت ہی۔ اور یہ لوگ اس کا ساتھ اس توقع پر دے رہے ہیں کہ یہ بیرونی قرضوں اور مطالبوں کے بار کو ہلکا کرکے جرمنی کی معاشی حالت کو سنبھالے گی، اگر اس میں کامیابی نہ ہوئی اور یہ ظاہر ہونے کی کوئی امید نہیں تو محض نسل پرستی اور غیر قوموں سے نفرت کے جذبات اُبھارنے سے آخر کب تک کام چل سکتا ہے، یہ سچ ہے کہ اس پارٹی کی بدولت اس وقت کسانوں اور مزدوروں کو روکھی سوکھی روٹی مل جاتی ہی۔ لیکن ایک تو اس کا اعتبار نہیں کہ یہ زیادہ دن تک چلے جائے گی دوسرے جرمن کچھ ہندوستانی نہیں جو روکھی سوکھی روٹی پاکر سرکار کے دولت و اقبال کو دعا دیں اس لئے کہ ان کے بہت سے بھائیوں کو وہ بھی نصیب

نہیں۔ اگر ہٹلر کی پارٹی ان لوگوں کا پیٹ بھرنے میں کامیاب نہ ہوئی تو اس کا بھی وہی انجام ہوگا جو دوسری پارٹیوں کا ہوا۔ اس آخری امید سے مایوس ہونے کے بعد جرمنی میں اور اس کی وجہ سے سارے یورپ میں وہ قیامت برپا ہونے کا اندیشہ ہے جس کے آگے جنگ عظیم ایک کھیل معلوم ہوگی۔

# ممالکِ اسلام

**عراق** پچھلے مہینے کے رسالے میں جب اسوری قبائل اور حکومت عراق کی باہمی کشمکش پر تبصرہ کیا گیا تھا تو یہ وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ اس پرچے میں شاہ عراق امیر فیصل کے انتقال کا ذکر کرنا پڑے گا۔ مرحوم بالکل تندرست تھے اور سوئٹسان کے پرفضا مناظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ایک شب کو یک بیک قلب کی حرکت بند ہوگئی اور پاس والوں کو بھی خبر نہ ہوئی[۱]۔ امیر فیصل کو جس طرح عراق کی بادشاہی ملی وہ ایک بہت ہی دلچسپ داستاں ہے۔ اگر جنگِ عظیم شروع نہ ہوتی تو وہ اب تک غالباً ترکی فوج میں ایک معمولی افسر ہوتے یا اگر ترکی سلطان کی توجہ ان کی طرف منعطف ہوجاتی تو ممکن تھا کسی بڑے رتبے پر فائز ہوتے۔ لیکن بہرحال یہ موقع تو انھیں نصیب نہ ہوتا کہ باپ اور ٹمنے بھائی کی موجودگی میں ایک وسیع رقبے پر حکمرانی کرتے اور وہ رقبہ بھی ایسا جس پر خاندان شریفی کا اثر بالکل نہ تھا اور نہ اس کی بظاہر کوئی امید تھی کہ وہاں ان کی حکومت قائم ہوگی۔

جنگ عظیم کے کرشمے سے یہ بھی ایک انوکھا کارنامہ جو بر آیا۔ قیصر جرمنی نے سلطان عبدالحمید سے تعلقات قائم کرنے شروع کئے اور حکومت برطانیہ نے شریف حسین سے ۱۹۰۸ء میں جبکہ

---

۱۔ غلط فہمی کی بنا پر پچھلے مہینے کے رسالے میں یہ لکھا گیا تھا کہ امیر فیصل عراق واپس آگئے، اور اسوری قبائل کے فتنے کو فرو کرنے میں مشغول ہیں حالانکہ وہ انگلستان سے روانہ ہوکر سوئٹسان میں ٹھہر گئے تھے۔

جنگِ عظیم کے آثار بجز چند سر پر آوردہ سیاستیں اور بعض اولو العزم شہنشاہوں کے اور کسی کو نظر بھی نہ آتے تھے اور جب کہ حکومت ترکی اپنے ہمسایوں سے تنگ تھی اور افریقہ کے مقبوضات کھوتی جارہی تھی۔ سر ہنری مک موہن نے جو مصر میں حکومت برطانیہ کی حکمتِ عملی کے کارپرداز تھے شریف حسین کو ایک خط لکھا تھا جس میں انھوں نے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ اگر عرب اپنی آزادی کا اعلان کر دیں تو حکومتِ برطانیہ ان کی مدد کرے گی۔ جنگِ عظیم کے پرآشوب زمانے میں انگریز جاسوس اور گماشتوں نے عرب کے ہر گوشے میں پھر پھر کر جس طرف بدویوں کو ترکی حکومت کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا وہ اب کوئی راز نہیں ہے ۔ مکہ پر شریف حسین کا قبضہ ہو گیا تھا لیکن مدینہ کے باہر ابھی فیصل مع اپنی فوج کے پڑے ہوئے تھے اور ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں کہ انگریز 'عمرو عیار' لارنس نمودار ہوا ، اس کا بیان ہے کہ فیصل کو دیکھ کر اس نے معلوم کر لیا کہ یہی شخص عرب کو متحد اور ان کے جذبات کو برانگیختہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ لارنس نے فیصل کو عرب کے گوشے گوشے میں پھرایا اور ان کی قابلیت اور صلاحیت کے ایسے گیت گائے کہ عربوں کی ایک بہت بڑی جماعت ان کے ساتھ ہو گئی۔ اس زمانے میں جب امید و بیم کی حالت تھی فیصل اپنے ساتھیوں سے جو عہد لیتے تھے وہ یہ تھا۔ "ہم ٹھیریں گے جب تم ٹھیرو گے ، ہم چلیں گے جب تم چلو گے ، کسی ترک کی فرماں برداری نہ کریں گے ، کسی عربی نژاد کے ساتھ برا برتاؤ نہ کریں گے ، اور آزادی پر جان ، مال ، اہل و عیال کو قربان کریں گے" جنگِ عظیم ختم ہوئی اور حلیفوں نے "تقسیم قبور" شروع کی تو فیصل کی ذہانت کام آئی اور نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی سیادت میں عراق کا بادشاہ فیصل کو بنا یا گیا ، اور انجمن اقوام نے اس فیصلے پر اپنی مہر ثبت کی۔

انگریزوں کی 'ولایت' میں 'بلوغ' کے بعد کی مختصر مدت میں بھی امیر فیصل کی حکومت بہت کامیاب رہی عراق میں نسبتاً امن رہا ، تعلیم اور حفظانِ صحت کا خیال کیا گیا۔ غرض عوام کی حالت نہ صرف طوائف الملوکی کے زمانے سے بلکہ ترکی حکومت کے دور سے بھی بدرجہا بہتر رہی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ آزاد ہونے کے بعد امیر فیصل کا رویہ انگریزوں کے ساتھ ایک طرف اور

عوام کے ساتھ دوسری طرف کیسا رہتا۔ لیکن دست اجل نے اس کا موقع نہ دیا اور امیر فیصل کی روح عین اس زمانے میں قبض کی جب برطانیہ کا دستِ شفقت' ان کے سر سے ہٹا تھا اور ان کو ناصح مشفق' سے چھٹکارا ملا تھا۔ یہ زمانہ ان کی آزادی کا تھا، قفس سے نکل کر گلشن کی سیر کا تھا، مگر صیاد برطانیہ سے چھوٹتے ہی صیاد اجل نے آگھیرا، اور امیر فیصل کی روح کو قفس عنصری سے پرواز کرنا پڑا۔

مورخ کا قلم جب بھی عرب کے دور حاضر کی تاریخ لکھے گا تو امیر فیصل کے نامۂ اعمال میں ایک طرف تو عرب کی آزادی کی خواہش اور جواں مردی سے اس آزادی کو حاصل کرنے کی کوشش کا چمکتا ہوا نشان لگائے گا اور دوسری طرف استعمار برطانوی کی مدد کا سیاہ دھبّا۔ اپنی حکومت سے اس دھبّے کی سیاہی کو امیر فیصل نے بہت کچھ کم کر دیا ہے اور اگر یہ ناگہانی موت نہ آجاتی تو غالباً اس نشان کی سیاہی روشنی سے بدل جاتی لیکن کارکنانِ قضاوقدر کو یہ منظور نہ تھا، ممکن ہے کہ ان کے فرزندارجمند امیر غازی اپنے کارہائے نمایاں سے خاندانِ شریفی کی پیشانی سے اس بدنما داغ کو مٹا سکیں۔ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ وہ ابھی کم سن ہیں اور ناتجربہ کار بھی۔

# شذرات

۱۳ اگست کو ۸½ بجے شب کے وقت اردو اکادمی کی طرف سے ، این ، ساہنی صاحب اڈیٹر "نیشنل کال" کی صدارت میں ایک مباحثے کا جلسہ منعقد کیا گیا ۔ جناب آصف علی صاحب بیرسٹر نے یہ تجویز پیش کی کہ "موجودہ حالت میں قوم پرور جماعت کا مجالسِ آئین ساز کو نظر انداز کرنا ملک اور قوم کے مفاد کے منافی ہے" موصوف نے ابتدا ہی میں اس بات کو صاف کر دیا کہ تجویز کے معنی یہ نہیں کہ قوم پرور جماعت آئندہ انتخابات میں کونسلوں میں جانے کا فیصلہ کرے بلکہ صرف اس خیال کو جو ترکِ موالات کے آغاز کے زمانے سے پھیل گیا ہے دور کرنا مقصود ہے کہ کونسل میں جانا ہر محبِ وطن اور آزادی کے پرستار قوم پرور فرد کے لئے اصولاً ناجائز ہے ، آپ نے ہندوستان میں آئین ساز مجلسوں کی نشو و نما کی مختصر تاریخ بیان کی اور یہ دکھایا کہ ایک خاص منزل پر پہنچ کر کانگریس نے بعض مصالح کی بنا پر کونسلوں کا مقاطعہ کیا ، اس کے بعد پھر شرکت کی اور کچھ دن بعد پھر الگ ہو گئی ۔ اس کی طرزِ عمل کی تبدیلیوں پر غور کیا جائے تو یہ بات نظر آتی ہے کہ دونوں مرتبہ مقاطعہ اس غرض سے کیا گیا کہ کانگریس والے مل کر سول نافرمانی کی تحریک کو چلائیں ، اور بیچ میں اس کے ترک کرنے میں یہ مصلحت تھی کہ ملک سول نافرمانی سے تھک گیا تھا ۔ اسے ملتوی کرنا ضروری تھا ۔ کانگریس کی جماعت میں سے بعض لوگ معاشرتی اور اقتصادی اصلاح کے کاموں میں لگ گئے مگر جو لوگ خالص سیاسی مذاق رکھتے تھے انھوں نے بجائے اس کے کہ اپنی قوت کو منتشر اور معطل کر دیں اس کا رخ کونسلوں کی طرف پھیر دیا اور جب تک کہ دوبارہ سول نافرمانی کا موقع نہیں آیا وہ کم و بیش مفید طریقے سے وقت گذارتے رہے ۔ سول نافرمانی کی دوسری اور تیسری تحریک ختم ہونے کے بعد اب پھر وہی صورت حال درپیش ہے ، اس مرتبہ نئی بات یہ ہے کہ کونسلوں کی اہمیت پہلے سے بہت زیادہ بڑھنے والی ہے ، حلقۂ انتخاب دس گنا ہونے والا ہے ۔ اتنے بڑے حلقے پر انتخابات کے زمانے میں اثر ڈالنے کا موقع ایک نہایت زبردست موقع ہے ۔ اسے تمام تر خوشامد پسند اور رجعت پسند جماعتوں کے لئے چھوڑ دینا دانشمندی سے

بعید ہے، پھر کونسلوں کے اختیارات بھی بڑھ رہے ہیں۔ ان کی قوت کو حقیر سمجھ کر نظر انداز کرنا ناممکن ہے، قوم پرور جماعت یعنی کانگرس کو پوری طرح اس مسئلے پر توجہ اور غور کرنا چاہئے کہ اس کا طرز عمل آئندہ انتخاب کے موقع پر کیا ہو۔ خواہ کانگرس والے خود کونسلوں میں جائیں یا کسی دوسری پارٹی کی تائید کریں یا اس بات کی کوشش کریں کہ کوئی منتخب نہ ہو، بہر حال اس وسیع حلقۂ انتخاب سے کسی نہ کسی طرح کام ضرور لینا چاہئے۔

جناب نور الدین صاحب بیرسٹر نے اس تجویز کی سختی سے مخالفت کی، آپ نے کانگرس کی تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے دکھایا کہ یہ ابتدا میں خوشامد کے ذریعے حقوق مانگنے والوں کی ایک مختصر جماعت تھی اور اس کی یہ حالت کم و بیش اس وقت تک رہی جب اس نے ترک موالات کا اصول اختیار کرکے غیرت اور خودداری کا ثبوت دیا۔ اسی وقت سے اس کی قوت اور اثر بڑھنا شروع ہوا۔ ابھی اس میں اتنی سکت نہیں کہ تلوار کے ذریعے آزادی حاصل کرے اس لئے اس نے سول نافرمانی کی راہ اختیار کی ہے، جو مقابلتہً محفوظ ہے، اگر وہ اس راہ پر بھی نہیں چل سکتی تو بجائے اس کے کہ پھر کونسلوں کے بکھیر میں پڑے جس میں برسوں تضیع اوقات کرکے ذلت اور نقصان برداشت کر چکی ہے اُسے چاہئے کہ قوم کی معاشرتی اقتصادی تعلیمی اصلاح کا تعمیری کام کرے۔ اسی چیز سے آزادی کی بنیادیں مضبوط ہوں گی۔ اور بیداری روشن خیالی، مرفہ الحالی پیدا ہوگی، جو آزادی کی روح ہیں ورنہ جمہوری ادارے جن میں کونسل بھی شامل ہے محض بے جان ڈھانچے ہیں۔

ان حضرات کے علاوہ ڈاکٹر عبد العلیم صاحب، سید محمد صاحب ٹونکی نے تجویز کی تائید میں اور شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی، فرید الحق صاحب انصاری بار ایٹ لا۔ اور خواجہ احمد عباس صاحب نے مخالفت میں تقریریں کیں۔ آخر میں آصف علی صاحب نے ایک نہایت پرجوش تقریر میں مخالفین کا جواب دیا۔ اور پھر جناب صدر نے اپنے آخری خطبے میں کل بحث پر تبصرہ فرمایا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ مویدین اور مخالفین

دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ کونسلوں کے ذریعے سے حقیقی آزادی نہیں مل سکتی، اور کونسلوں کی حالت جواب ہے اس کے لحاظ سے ان میں شرکت کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔ اختلاف صرف اس امر میں ہے کہ نئے دستور اساسی کے ماتحت جو کونسلیں وجود میں آئیں گی ان میں عارضی طور طور پر شرکت کرنا مفید ہے یا نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابھی اس بات کا فیصلہ کرنا قبل از وقت ہے۔ انگلستان کی سیاسی حالت میں ہر طرح کی فوری تبدیلیوں کے امکانات ہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ نئے دستور اساسی کی کیا شکل ہو جائے گی اور نئی کونسلیں کیسی ہوں گی، آدھی رات کے قریب جناب صدر کے شکرئے پر جلسہ ختم ہوا۔

---

مباحثہ ہر لحاظ سے نہایت کامیاب رہا۔ حاضرین کی تعداد چار سو سے کم نہیں تھی۔ تقریریں اس قدر دلچسپ تھیں کہ چار گھنٹے تک سب لوگ نہایت شوق سے سنتے رہے اور بار بار اپنے جوش کا اظہار نعرہائے تحسین سے کرتے رہے۔

رجسٹرڈ نمبر ۱۰۵۲

# جامعہ

جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ


جلد ۲۱ | بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۳ء | نمبر ٦


مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

M.H. Faruqi 1927
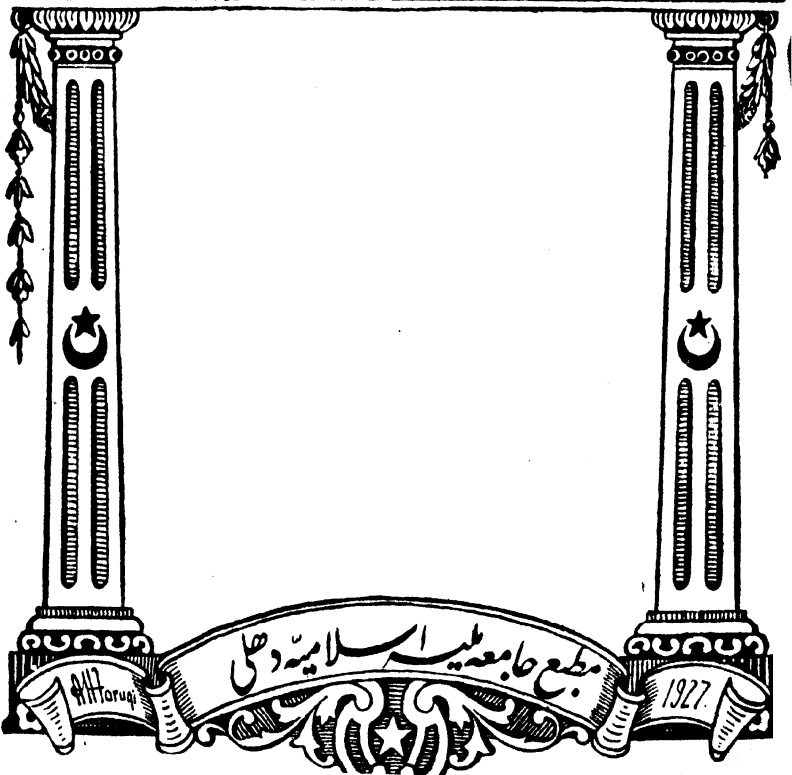
# فہرست

## مطبوعاتِ جامعہ دہلی اور سول اینڈ ملٹری اسٹیٹ کی کتابیں

## مذہب، تاریخ، سوانح عمریاں، ادب، ڈرامے، بچوں کی کتابیں

### مذہب

**نفسیاتِ مذہب** — مقالہ اُردو اکادمی، مذہبی جذبہ نفسِ انسانی میں کن کن شکلوں میں نمودار ہوتا ہے۔ اس کا دوسرے جذبات سے کیا تعلق ہے اور اس کا اثر مجموعی نفسی زندگی پر کس صورت میں پڑتا ہے۔ قیمت ۸ر

**سیرۃ نبوی اور مستشرقین** — مستشرقین یورپ اسلام پر اکثر شریر اور مغالطہ زا انداز میں زہر اگلا کرتے ہیں، اس کتاب میں مدلل جواب دیا گیا ہے۔ قیمت عہ

**تاریخ القرآن** — قرآن حکیم کی جمع ترتیب اور نزول و حفاظت کی دل کش تاریخ۔ قیمت عہ ر

**محجوب الارث** — مولینا [illegible] اسلم صاحب کا یہ رسالہ ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ اولاد کبھی وراثت سے محروم نہیں ہوتی۔ قیمت ۱ہر

**الوراثۃ فی الاسلام** — فن وراثت پر عربی میں یہ ایک اچھا رسالہ ہے۔ ۸ر

**بیان** — الفرقان فی معارف القرآن کا حصہ۔ سورۂ آل عمران کی مکمل تفسیر۔ قیمت عہ ر

**صراط مستقیم** — انفال و توبہ کی تفسیر فلسفہ جنگ و جہاد اور فتح و کامرانی کے قوانین۔ قیمت عاہ ر

**عبرت** — احسن القصص یعنی سورۂ یوسف کی تفسیر نصیحت آمیز اور عبرت انگیز نتائج کا مرقع۔ قیمت عہ ر

**برھان** — سورۂ نور کی آسان تفسیر امت اسلامیہ کے لئے لائحہ عمل۔ قیمت عہ ر

**سبیل الرشاد** — یعنی تفسیر سورۂ حجرات، عملی مسائل کی فلسفیانہ تشریح عقل کی روشنی میں۔ قیمت ۱۰ر

**ذکریٰ** — تفسیر پارۂ عم کو ضرور پڑھنا چاہئے کیونکہ اس میں ان تمام چھوٹی چھوٹی سورتوں کی تفسیر ہے جنھیں ہم نماز میں پڑھتے ہیں۔ ھدیۃ عاہ ر

**مکتبہ جامعہ دہلی**

**ذکری** ولادت نبوی پر مولانا ابو الکلام کا زبردست مضمون ہے۔ قیمت ۳ر

**بشریٰ** اسلام میں خدا کا تخیل کیا ہے؟ از علامہ سید سلیمان ندوی۔ قیمت ۱ر

**الورد والریحان** چند قابل حفظ احادیث کا انتخاب ہے قیمت ۲ر

**ہمارا دین** ارکان اسلام کی خوبیاں عام فہم اور سلیس زبان میں۔ قیمت ۔ر

**کتاب الشفعہ ترجمہ** از جمیل سید محمود مرحوم شفعہ کو اس کتاب میں مجمع البحرین فتاوی قاضی خاں اور عینی سے جمع کر دیا ہے۔ قیمت عہ

**الفوز الکبیر اردو** حضرت مولانا شاہ ولی اللہ مرحوم کی اصول تفسیر پر یہ ایک مختصر اور جامع کتاب ہے قیمت ۱۲ر

**المدینہ والاسلام** اس میں اسلامی تعلیمات پر اصول تمدن کے نقطہ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت عہ

## تاریخ

**تاریخ مغربی یورپ** ہسٹری آف ویسٹرن یورپ کا ترجمہ۔ اس کی معاشرت علم وفن اور سیاسی اداروں کی تدریجی ترقی کا تفصیلی ذکر قیمت عہ

**تاریخ ہند قدیم** کے۔ ایم۔ پانکر کی کتاب جسے موصوف نے جامعہ کے شعبہ تصنیف و تالیف کی درخواست پر لکھا تھا۔ قیمت ۸ر

**تاریخ الدولتین** خلافت بنی امیہ اور بنی عباس کے عہد حکومت کی مختصر اور جامع تاریخ، از نیاز فتحپوری قیمت عہ

**تاریخ نجد** نجدیوں کے مذہبی عقائد۔ سیاسی حالات اور طرز معاشرت پر مکمل کتاب ہے قیمت عہ

**تاریخ الامت** ابتدا سے لیکر خلافت عثمانیہ تک اسلام کی مستند تاریخ سات جلدوں میں قیمت [illegible]

۱۔ [illegible] ۔ ۲۔ خلافت راشدہ عہ

۳۔ خلافت [illegible] ۔ ۴۔ عباسیہ (قسم دوم) عہ

۵۔ عباسیہ [illegible] ۔ ۶۔ عباسیہ مصر عہ

حصہ ہفتم خلافت عثمانیہ عہ

## سوانح عمریاں

**جمال الدین افغانی** مقالہ اردو اکادمی قاضی عبد الغفار صاحب کی برسوں کی ریسرچ کا نتیجہ قیمت ۸ر

**سیرۃ محمد علی** مولانا محمد علی کی سوانح حیات صفحات چھ سو متعدد تصاویر قیمت سے ر

**تلاش حق** گاندھی جی کی آپ بیتی صفحات قسم اول عہ۔ قسم دوم عہ

**ضیاء الدین برنی** عہد تغلق کے نامور مورخ کے حالات اور اس کی تاریخ پر تبصرہ قیمت ۲ر

**مکتبہ جامعہ دہلی**

## جمال الدین

اخوت اسلامی کے پرجوش داعی سید جمال الدین افغانی کے حالات طلباء کے لئے آسان زبان میں قیمت ۸ر

## اورنگ زیب

اورنگ زیب پر اعتراضات کے جواب از شبلی نعمانی مرحوم قیمت ہر

## سیرۃ عمرو بن العاص

نامور فاتح مصر کے حالات قیمت ایک روپیہ عہ ر

## حیات حافظ

حضرت خواجہ حافظ کی زندگی کے حالات اور ان کی شاعری پر تبصرہ قیمت عاؔر

## حیات جامی

فارسی کے شاعر مولینا نورالدین جامی کے حالات اور ان کے تصوف پر بحث قیمت ۸ر

## ٹالسٹائی

مشرق کے مصلح، انسانیت کے شیدائی ٹالسٹائی کے حالات قیمت ہر

## خادمات خلق

یورپ اور امریکہ کی چند پاک سیرۃ خواتین کے حالات۔ قیمت ۱۰ر

## جہاں آرا

شاہجہاں کی فاضل بیٹی جہاں آرا بیگم کے حالات اور کارنامے۔ قیمت ۸ر

# ادب

## سیر المصنفین

ادب اردو کی دلپسند تاریخ جلد اول عاؔ۔ جلد دوم ہے

## کیمیاگر

چند اخلاقی، ادبی مختصر افسانوں کا مجموعہ قیمت عہ ر

## نیرنگ

ایک خاتون کے بارہ ادبی مضامین اور ایک ڈرامے کا مجموعہ۔ قیمت عہؔر

## مضامین رسالہ جوہر

جامعہ ملیہ کے قلمی رسالہ جوہر کے مضامین کا مجموعہ۔ قیمت عہ ر

## دیوان غالب (جرمنی)

جس میں مرزا کا خود نوشتہ مقدمہ، غزلیات، قصائد اور رباعیات ہیں۔ پاکٹ سائز، خوبصورت جلد مع غالب کی سہ رنگی تصویر۔ جرمن ہنرمندی کا اعلیٰ نمونہ۔ قیمت قسم اول عاؔ۸ر — قسم دوم عاؔر

## دیوان شیدا (جرمنی)

مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ۔ عاؔ

## کلام جوہر

مولینا محمد علی کے جدید و قدیم کلام کا مجموعہ مع مقدمہ مولینا عبدالماجد دریابادی۔ ۸ر

## جوہر ملیہ

دس تاریخی نظموں کا مجموعہ درس میں داخل ہے۔ قیمت ۳ر

| | | | |
|---|---|---|---|
| انتخاب میر | ۱۲ر | نالۂ مشیر | عہ ر |
| انتخاب سودا | ۱۲ر | کلام مشیر | عہ |
| انتخاب حسرت | ۱۲ر | نامۂ مشیر | ۸ر |
| مسدس حالی | ۸ر | لیلۃ القدر | ۱ر |

دیوان غالب، مطبع جامعہ ۸ر

# چند اچھے ڈرامے

| | | | |
|---|---|---|---|
| پردۂ غفلت | عہ ر | گناہ کی دیوار | ۸ر |
| کیسی | ۶ر | ضیدِ زبوں | ۱۰ر |
| نقش آخر | ۱۰ر | ہمزاد | ۶ر |

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری　　ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے ۔ پی ایچ ۔ ڈی

جلد ۲۱　　بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۳۳ء　　نمبر ۶

## فہرست مضامین



(باہتمام محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر مطبع جامعہ ملیہ دہلی میں چھپا)

ان کا وجود کہاں ہے۔ ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غیر موجود کو دیکھ نہیں سکتے۔ اس دنیا میں جہاں ہم آپ ہیں وہاں موجود نہیں۔ اب لامحالہ کسی دوسرے عالم میں اس کا وجود ہے جس کو عالم خواب کہئے یا کسی اور عالم سے تعبیر کیجیے۔ اسی طرح عالم ارواح اور عالم اجساد کے مابین ایک عالم ہے جس سے دونوں عالموں کا تعلق ہے۔ اس تعلق و وابستگی کا مفصل بیان سیرت نبی اور مولانا شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ کے باب عالم مثال میں دیکھ سکتے ہیں۔ شاہ صاحب نے نہایت شرح و بسط سے متعدد احادیث سے عالم ارواح اور عالم اجساد کے ماوراء ایک عالم ثابت کیا ہے جس کا نام عالم مثال رکھا ہے۔ اگر عالم مثال کے بجائے کوئی اور عالم اس کا نام رکھنا چاہیں تو کوئی مضائقہ نہیں مصطلحات میں نزاع نہیں ہو سکتی۔ البتہ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ لوگ نہ معلوم کتنے عالم کے قائل ہیں۔ عالم شباب، عالم خیال، عالم خواب کا انکار کون کرسکتا ہے۔ ان عالموں کے قائل ہونے کے بعد اگر ایک عالم مثال کا احادیث و واقعات سے اضافہ ہوتا ہے تو نہ معلوم کیوں لوگوں کی جبین متانت پر بل پڑجاتے ہیں۔

اس کے بعد مولانا موصوف کا قلم گہر بار یوں رقمطراز ہے "حقیقت یہ ہے کہ معجزہ اپنے امکان یا نفس وقوع میں فلسفۂ قدیم و جدید کے ان تمام دلائل کا جو اس کتاب کے دو سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں قطعاً محتاج نہیں، وہ جب واقع ہوتا ہے تو کٹر سے کٹر بھی اس کے ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے...... الخ"

نہ معلوم مولانا نے ان تمام دلائل کو جو دو سو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں بیک جنبش قلم کیوں لغو و مہمل قرار دیا۔ یہ صحیح ہے کہ جب معجزہ واقع ہوتا ہے تو کٹر سے کٹر بھی اس کے ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن ظہور معجزہ کے صدیوں بعد ان لوگوں کو معجزہ کا کس طرح یقین دلایا جاسکتا ہے جو سرے سے امکان معجزہ ہی کے قائل نہ ہوں۔ کیا ایسی صورت میں معجزہ کے امکان سے فلسفۂ جدیدہ و قدیمہ کی روشنی میں اگر ایک مصنف بحث کرتا ہے تو اس کی ساری کوشش، اس کے سارے دلائل و براہین صرف اس لئے قابل قبول نہیں ہیں کہ مولانا اسلم صاحب نے کہیں ہیوم کا ایک قول پڑھ لیا ہے۔ مولانا معجزات نبوی کے انکار کے ثبوت میں ہیوم کا یہ قول نقل فرماتے ہیں" مذہب کے نام سے

لوگ ہمیشہ مضحک و خرافات افسانوں کے دام میں آ جاتے ہیں"۔ مولانا تو بڑے روشن خیال ہیں صرف کلام پاک کی روشنی میں وحی الٰہی کی تعلیم سے مذہب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ دنیا کا سب سے زیادہ قیمتی اور قابل فخر ذخیرۂ احادیث آپ کے نزدیک دفتر پارینہ اساطیر اولین سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ بایں "روشن خیالی" و "حریت ضمیر" مولانا نے ہیوم کے مذکورہ بالا قول کو انکار معجزات کی دلیل کی حیثیت سے پیش کرنے کی کس طرح جرأت کی؟ مولانا کو مصنف سیرت نبی کی قدامت پرستی اور تقلید سے شدید اختلاف ہے۔ لیکن ہیوم کا مہمل قول معرض استدلال میں پیش کر کے فاضل مضمون نگار نے بھی کسی آزادیٔ ضمیر کا ثبوت نہیں دیا، اسی تقلید اور اشخاص پرستی میں مولانا بھی مبتلا ہیں جس سے مولانا کو شدید اختلاف ہے۔ ہیوم کے مذکورہ بالا قول کے ساتھ اس جملہ کو بھی شامل کر لیا جائے تو قول مکمل ہو جائے گا یعنی " اور جس انکار معجزہ کی بنا کسی عقلی دلیل کے بجائے کسی کا بے دلیل قول ہو تو وہ بجائے استدلال و حجت کے محض تمسخر انگیزی نہیں بلکہ حماقتوں کا مجموعہ ہے"

مولانا کا خیال ہے کہ چونکہ ہیوم نے کہا ہے "مذہب کے نام سے لوگ ہمیشہ مضحک و خرافات افسانوں کے دام میں آ جاتے ہیں اس لئے کسی معجزۂ نبوت کو تسلیم نہیں کرنا چاہئے"۔ "خرافات افسانوں" کی بھی ایک کہی۔ کیا حقیقت سے لبریز افسانے بھی ہوا کرتے ہیں یا افسانہ خرافات و غیر واقعی چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے؟ خیر یہ تو ایک سخن گسترانہ بات تھی۔ مولانا موصوف جو بڑے روشن خیال، بلا کسی معقول وجہ کے کسی بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ کیا صرف ہیوم کے کہنے سے مذہب کی طرف جس قدر حقائق و واقعات منسوب ہیں وہ تمام کے تمام مولانا کے نزدیک بھی خرافات و افسانے ہو جائیں گے یا کسی دلیل کی ضرورت ہو گی؟

"استفادات عالیہ" کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے مولانا روایت حدیث پر خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ مولانا کی بیندرہ بیس سطروں کا خلاصہ صرف اس قدر ہے کہ چونکہ احادیث ہم تک بذریعہ روایت در روایت پہنچی ہیں اور چونکہ وہ متواتر نہیں ہیں اس لئے ہمارے لئے وہ نہ قابل استدلال ہیں اور نہ قابل شہادت اس پر مولانا نے اس طرح دلیل قائم کی ہے "کیونکہ اگر آپ خود اپنا چشم دید واقعہ بیان کریں تو میرے پاس اس کے صدق و کذب جانچنے کا ایک معیار ہے۔ وہ یہ کہ میں آپ کو جانتا ہوں اور آپ کا اعتبار

میرے ذہن میں قائم ہے لیکن جب آپ نے اپنا چشم دید واقعہ مجھ سے نہیں بیان کیا بلکہ یہ فرمایا کہ میں نے زید سے سنا تو وہ معیار آپ نے مجھ سے چھین لیا۔ (جی نہیں معیار اب تک باقی ہے اگر آپ کو راوی یعنی زید کے متعلق کسی ایسے شخص سے معلوم ہو جس کی جانچ آپ کی جانچ سے زیادہ بلند اور قابل اعتماد ہے کہ زید سچا یا جھوٹا ہے تو معیار اب تک قائم ہے۔ ناظم) کیونکہ میں زید کو نہیں جانتا، (آپ کا زید کو نہ جاننا روایت کی صداقت میں مخل نہیں ہے جبکہ زید کے حالات نوید کی صداقت آپ دوسروں سے اسی طرح معلوم کر سکتے ہیں جس طرح آپ اپنے ذاتی علم سے کیونکہ ائمہ جرح وتعدیل نے رواۃ کو صداقت کی کسوٹی پر اسی طرح کسا ہے جس طرح ہم یا آپ کسی کو آج جانچ سکتے ہیں بلکہ ہم سے بھی زیادہ کاوش وجستجو سے انھوں نے جانچا ہے۔ ناظم) اب اس قول کے صدق وکذب کا فیصلہ آپ کے اوپر رہا کہ آپ زید سے واقف ہیں۔ مگر جب آپ نے یہ کہا کہ زید نے اس کو عمر سے سنا تو آپ کے پاس بھی کوئی معیار نہ رہا لہٰذا جب روایت کا سلسلہ دو سے تین تک پہنچ گیا تو نہ متکلم کے لئے وہ حجت ہے نہ سامع کے لئے کیونکہ دونوں میں سے کسی کے پاس اس کے جانچنے کا معیار نہیں ہے۔"

مولانا کی اس مسلسل دلیل کی حقیقت صرف یہ ہے کہ مولانا کو رواۃ کے صادق وکاذب ہونے کا علم نہیں ہے اس لئے کسی حدیث کے صحیح ہونے کا یقین نہیں کر سکتے۔ مولانا کا یہ خیال حقیقت سے بہت دور ہے۔ مولانا نے مغالطہ دینے کی سعی ناکام کی ہے۔ اسماء الرجال کی کتابوں میں جن کا شاید مولانا نے بھی مطالعہ کیا ہوگا ہر راوی کے حالات نہایت شرح وبسط کے ساتھ مذکور ہیں۔ ان کتابوں میں رواۃ کی عدالت وصداقت ہی نہیں بیان کی گئی ہے بلکہ ہر ایک راوی کے حافظہ، سامعہ اور اس کے مذہبی میلان کے متعلق مفصل بحث ہے۔ راوی کے اساتذہ وشاگردوں کا کافی وافی ذکر ہے۔ کیا یہ تفصیلی جرح وتعدیل جس کو ائمہ سلف نے حدیث رسول اللہؐ کی خاطر جمع کیا ہے آج ہم اس کے مقابلہ میں کسی شخص کے متعلق اس شرح وبسط کے ساتھ کچھ کہہ سکتے ہیں۔ بلا شبہ ائمہ جرح وتعدیل کی جانچ اسی طرح قابل اعتبار ہے جس طرح آج ہماری جانچ کسی کے متعلق معتبر ہوتی ہے۔ دنیا کے اس قابل فخر ذخیرے کے ہوتے ہوئے بھی کوئی شخص صحیح حدیث کی صحت اس لئے نہیں تسلیم کرتا کہ

رواۃ کے حالات معلوم نہیں ہیں تو ناظرین سمجھ سکتے ہیں کہ منکرین حدیث، حقائق و واقعات کا بلا دلیل و حجت انکار کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا انکار حدیث کی دلیل کے بعد مولانا کو فوراً خیال ہوا کہ کتب اسماء الرجال کے ہوتے ہوئے جن میں رواۃ کے مفصل حالات درج ہیں۔ رواۃ کے صادق و کاذب ہونے کے متعلق لاعلمی کا اظہار کس طرح کیا جا سکتا ہے چنانچہ مولانا نے فوراً منطق کی کسی شکل سے "دور" کے مہیب لفظ کو ثابت کر کے اسماء الرجال کے سارے ذخیرے کو بیک جنبش قلم ردی کر دیا، چنانچہ مولانا رقمطراز ہیں "جواب میں آپ کہیں گے کہ ان روایات کے سلسلۂ اسناد میں جو رواۃ ہیں وہ سب کے سب جانچے ہوئے ثقہ اور معتبر ہیں لیکن وہ میرے اور آپ کے جانچے ہوئے نہیں ہیں کہ ہمارے لئے ان کا بیان حجت ہو بلکہ ان کی ثقاہت کی خبر بھی ہم تک بذریعہ روایت ہی کے پہنچی ہے لہذا ان کا اعتبار روایت پر موقوف ہے اور روایت کا اعتبار ان کے اوپر موقوف ہے اور یہ دور ہے"۔ مولانا کو منطق کا باب المغالطہ خوب یاد ہے۔ رواۃ کی ثقاہت بلاشبہ روایت پر موقوف ہے اور روایت کا اعتبار رواۃ کی ثقاہت پر موقوف ہے لیکن جس روایت کا اعتبار رواۃ کی ثقاہت پر موقوف ہے وہ روایت ثقاہت رواۃ کی روایت کی غیر ہے مثلاً ایک حدیث چند رواۃ کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی، اب اس روایت کا اعتبار موقوف ہے اس کے رواۃ کی ثقاہت پر اور روایت ثقاہت رواۃ موقوف ہے دوسری اس روایت پر جس کے ذریعہ سے ہمیں رواۃ کی ثقاہت کا علم ہوا مثلاً یحییٰ ابن معین نے جو ایک بلند پایہ امام جرح و تعدیل ہیں، ایک راوی کو ثقہ یا غیر ثقہ کہا اب ہمیں معلوم ہو گیا کہ فلاں راوی ثقہ یا غیر ثقہ ہے اب دو قسم کے سوالات پیدا ہوتے ہیں ایک یہ کہ خود یحییٰ ابن معین کیسے تھے دوسرے یحییٰ ابن معین نے فلاں راوی کی ثقاہت یا عدم ثقاہت کے متعلق کہا ہے یا نہیں۔ پہلے سوال کا جواب کھلا ہوا ہے وہ یہ کہ یحییٰ ابن معین کی فضیلت ان کے تبحر علمی خصوصاً جرح و تعدیل میں ان کی وسعت نظر اور ان کے حزم و احتیاط کو تمام محدثین نے تسلیم کیا ہے اس لئے ان کی جرح و تعدیل بلاشبہ معتبر ہے۔ دوسرے سوال کے متعلق یہ کہنا کافی ہے کہ یحییٰ ابن معین کی توثیق یا عدم توثیق کی روایت ہمیں دوسری روایتوں سے معلوم ہوتی ہے لہذا ایک روایت کا دوسری روایت

پر موقوف ہونا" دور" نہیں ثابت کرتا، دور کے ثبوت کے لئے اتحاد موقوف و موقوف علیہ ضروری ہے یہاں وہ اتحاد معدوم ہے۔ اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں" علاوہ ازیں اس بات کا قطعی فتویٰ کہ فلاں ثقہ ہے یا صدوق ہے یا عدول ہے اصولاً اور دیانتاً صحیح نہیں ہے کیونکہ باطن کا علم اللہ کو ہے" عقل ششدر ہے کہ محترم ناقد کے اس طرز استدلال کے متعلق کیا عرض کروں۔ مولانا کے اصول اور دین میں کسی کو ثقہ یا عدول کہنا اس لئے صحیح نہیں ہے کہ انسان کو کسی کے باطن کا حال معلوم نہیں ہے اور روزانہ زندگی میں کسی کے ظاہری اعمال، لوگوں کے ساتھ اس کا معاملہ ان امور سے کوئی فیصلہ کسی کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کے متعلق نہیں کیا جا سکتا۔ اگر انسان اس حد تک مجبور محض ہے تو انسان کی عقل بیکار ہے۔ اللہ نے انسان کو عقل اسی لئے دی ہے کہ وہ اس کے ذریعہ سے خیر و شر میں، بھلے برے میں، جھوٹے اور سچے میں، عادل و ظالم میں، نیک و بد میں تمیز کرے۔ جھوٹے کو جھوٹا کہے اور سچے کو سچا، صدوق کو صدوق سمجھے اور کاذب کو کاذب، ورنہ مولانا ہی کے اصول اور دین کی رو سے مولانا کا مذکورہ بالا خیال بلاکسی مزید دلیل کے ناقابل سماعت ہے کیونکہ معلوم نہیں مولانا کا ضمیر اس کے متعلق کیا رائے رکھتا ہے۔ جو کچھ لکھا ہے وہ تو جنبش قلم اور عمل ظاہری کا نتیجہ ہے۔ اس عمل ظاہری کے ذریعہ سے مولانا کے باطن کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا نہ اصولاً نہ دیانتہً صحیح ہوگا۔

مولانا کا طرز استدلال بھی عجیب و غریب ہوتا ہے۔ بات پر بات یاد آتی ہے۔ غالباً ۱۹۳۱ء کے رسالہ جامعہ کے کسی نمبر میں انکار حدیث کی سرخی کے ماتحت حدیث کے غیر معتبر اور ناقابل عمل ہونے پر مولانا کلام پاک کی اس آیت کریمہ" فبای حدیث بعدہ یومنون" (ترجمہ مولانا اس کے بعد کس "حدیث" پر وہ ایمان لائیں گے) سے کس بلا کی ناقابل تردید دلیل لائے تھے۔ یہ نہ بھولنے والا استدلال اہل علم حضرات کو اب تک یاد ہے۔

خبر احاد کو یک قلم ناقابل عمل قرار دینا کسی اصول کے ماتحت صحیح ہے؟ کسی خاص خبر کے متعلق اگر کسی کو شبہ ہو تو وہ اس کے متعلق کہہ سکتا ہے یہ حدیث فلاں وجہ سے ناقابل قبول ہے لیکن یہ کہ تمام خبر احاد ناقابل عمل، سارا ذخیرۂ حدیث لغو و مہمل ہے کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے چنانچہ مصنف

سیرت نبی نے اس کے متعلق عملی دنیا کے نمونے پیش کر کے خبر احاد کے قابل اعتبار ہونے کو ثابت کیا ہے۔ سید صاحب لکھتے ہیں :-

"متواتر، مشہور اور مستفیض خبروں کو چھوڑ کر خبر احاد تک تم روزانہ یقین کرتے ہو۔ خطوط، تار، اخبارات آج کل کی زندگی کا جزو ہیں اور ان میں سے ہر ایک پر تم کو کامل وثوق ہے۔ رائٹر ایجنسی کے تاروں اور سنجیدہ اخباروں کے کالموں میں عجیب سے عجیب حیرت افزا واقعات و ایجادات وطبی علاجات عموماً بیان ہوتے رہتے ہیں اور لوگ ان کو تسلیم کرتے ہیں ........ کبھی یہ عقلی مباحث اور شکوک نہیں پیش کرتا کہ ممکن ہے کسی نے غلط کہہ دیا ہو، ممکن ہے غلط لکھا گیا ہو، ممکن ہے نامہ نگار جھوٹ بولتا ہو، ممکن ہے کاتب نے خود گھڑ کر لکھ دیا ہو ......" اس پر مولانا فرماتے ہیں "ہر چند سید صاحب کے اس بیان میں مبالغہ ہے کیونکہ اخبارات اور روزانہ معاملات کے بارے میں بعض خبروں میں جو قرائن کے خلاف ہوتی ہیں ہم شک کرتے ہیں"

آپ ضرور شک کیجئے۔ آپ کو شک کرنے سے کون منع کرتا ہے۔ آپ اسی طرح کسی خاص حدیث کے متعلق یہ شک کر سکتے ہیں کہ ممکن ہے رسول اللہ نے نہیں فرمایا ہو یا نہیں کیا ہو لیکن اس شک کے بعد آپ کا فرض ہے کہ آپ اس حدیث کو اصول حدیث پر جانچیں۔ اگر وہ حدیث جانچنے کے بعد صحیح ثابت ہو تو آپ اس کو صحیح تسلیم کیجئے، جس طرح آپ اپنی روزانہ زندگی میں کسی مشتبہ ومشکوک الوقوع چیز کے متعلق دریافت کرنے کے بعد اگر وہ مشتبہ ومشکوک شئ صحیح ثابت ہوتی ہے تو آپ اس کو صحیح تسلیم کرتے ہیں اور آپ کو اس کا یقین ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کا دائرۂ انکار حدیث روزمرہ کے معاملات ہی کی طرح کسی خاص خبر احاد تک محدود ہوتا تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوتا لیکن آپ ستم تو یہ کرتے ہیں کہ بلا کسی دلیل کے تمام کی تمام خبر احاد وغیر احاد کو ناقابل عمل قرار دیتے ہیں۔

آگے چل کر چونکہ معجزات کے ظہور کے متعلق مولانا سے کچھ عرض کرنا ہے اور لفظ آیت کا بار بار استعمال ہو گا اس لئے مناسب ہے کہ لفظ آیت کی تشریح کر دوں۔ لفظ آیت کلام پاک میں تین معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ آیت[۱] بمعنی آیت قرآن یعنی کلام پاک کا مختصر ٹکڑا۔ آیت[۲] بمعنی علامت ونشانی۔

بمعنی آیت بمعنی معجزہ۔ لیکن یہ معلوم کرنا کہ لفظ آیت کس جگہ کس معنی میں استعمال ہوا ہے کلام پاک کے سباق و سیاق سے معلوم ہو سکتا ہے۔ زبان و لغت عربی جاننے سے زیادہ بصیرت و فہم قرآن کی ضرورت ہے۔

محترم نقاد چونکہ احادیث کو صحیح نہیں مانتے ہیں اس لئے جن معجزات کے ظہور کا ثبوت احادیث سے ہے ان کو تسلیم نہیں کرتے۔ مزید برآں محترم نقاد کا خیال ہے کہ قرآن مجید بھی پکار پکار کر یہی کہہ رہا ہے کہ رسول اللہؐ کو کوئی حسی معجزہ نہیں عطا کیا گیا۔ مندرجہ ذیل آیات قرآن کو مولانا نے استدلال میں پیش کیا ہے۔

| | |
|---|---|
| ویقول الذین کفروا لولا انزل علیہ آیۃ من ربہ ۱۳/۷ | اور کفار کہتے ہیں کہ اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہ اتاری گئی۔ |
| وقالوا لولا اوتی مثل ما اوتی موسیٰ۔ ۲۸/۴۸ | کفار نے کہا کہ کیوں نہ اس کو کوئی ایسی نشانی دی گئی جیسی موسیٰ کو دی گئی تھی۔ |
| وقالوا لولا یاتینا بایۃ من ربہ۔ ۲۰/۱۳۳ | اور کافروں نے کہا کہ وہ اپنے رب کی طرف سے ہمارے پاس کوئی نشانی نہیں لاتا۔ |

مذکورہ بالا آیات کریمہ کے متعلق مولانا کا خیال ہے کہ اگر رسول کریمؐ کا کوئی حسی معجزہ ہوتا تو کفار کا بار بار معجزہ طلب کرنے کے کیا معنی؟ اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں کہ ان تمام سوالات کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وما منعنا ان نرسل بالآیات الا ان کذب بہا الاولون"۔ ترجمہ ہمیں معجزات بھیجنے سے کسی چیز نے باز نہیں رکھا سوائے اس کے کہ گذشتہ لوگوں نے ان کو جھٹلایا۔

معجزے جو نبی اور رسول کو عطا ہوتے ہیں وہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک معجزہ متحدیٰ بہا ہوتا ہے یعنی نبی یا رسول سے شہادت نبوت کے لئے کفار کسی خارق عادات کے طلبگار ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو ساکت و خاموش کرنے کے لئے اپنے نبی و رسول کو کوئی معجزہ عطا کرتا ہے۔ دوسرے وہ معجزے جو بلا کسی طلب کے وقتاً فوقتاً نبی و رسول سے بطور نصرت و تائید الٰہی کے صادر ہوتے رہتے ہیں۔ کلام پاک کی مذکورہ بالا آیتوں میں یا ان کے علاوہ جہاں بھی کفار کے طلب معجزہ کا ذکر ہے ان سے وہی معجزہ متحدیٰ بہا مراد ہے اور بلاشبہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معجزہ متحدیٰ بہا نہیں دیا گیا جس کی وجہ مولانا بھی جانتے ہیں کہ معجزہ متحدیٰ بہا

کے ظہور کے بعد اگر امت ایمان نہیں لاتی ہے تو چونکہ اتمام حجت ہو چکا ہے اس لئے قوم کی ہلاکت لازمی ہوتی ہے لیکن معجزۂ متحدیٰ بہا کے عدم ظہور سے دوسرے ان غیر متحدیٰ بہا معجزات کے ظہور کی نفی نہیں ہوتی ہے جس کا ظہور وقتاً فوقتاً رسول کریم سے ہوتا رہا ہے۔ شاید آپ کہیں گے کہ قرآن مجید میں اس قسم کی تفریق نہیں ہے لیکن قرآن مجید کا غور سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے۔ رسول کریمؐ کو صرف معجزۂ متحدیٰ بہا عطا نہیں ہوا تھا۔ مصنف سیرت نبی ہی نے کہیں یہ لکھا ہے کہ رسول کریمؐ کو وہ معجزے عطا ہوئے تھے جن کے کفار طالب تھے۔

| | |
|---|---|
| قالوا لولا اوتی مثل ما اوتی موسیٰ | کفار نے کہا کہ کیوں نہ اس کو کوئی ایسی نشانی دی گئی تھی جیسی موسیٰ کو دی گئی۔ |

اس آیت سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ کفار خاص قسم کے معجزے کے طالب تھے اور اسی معجزۂ متحدیٰ بہا کے ظہور کی نفی اللہ تعالیٰ نے "وما منعنا ان نرسل بالآیات الا ان کذب بہا الاولون" سے کی ہے۔

آپ کہیں گے کہ "آیات" تو یہاں پر مطلق ہے تخصیص کیوں کرتے ہیں۔ ہم کہیں گے کہ مطلق آیات کے نزول کی نفی نہیں کی جا سکتی کیونکہ اگر آیات کو عام معنی میں رکھا جائے تو معجزۂ قرآن بھی اس میں آ جائے گا حالانکہ معجزۂ قرآن کے آپ بھی قائل ہیں۔ اس لئے لامحالہ آیات کی تخصیص کرنی پڑے گی۔ اس آیت کریمہ کے بعد والے ٹکڑے کو اگر ملا کر پڑھا جائے تو حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی۔

وما منعنا ان نرسل بالآیات الا ان کذب بہا الاولون وآتینا ثمود الناقۃ مبصرۃ فظلموا بہا وما نرسل بالآیات الا تخویفا۔

امام المفسرین علامہ ابن جریر طبری کی تفسیر بھی مزید تائید کے لئے نقل کرتا ہوں۔ امام المفسرین ابن جریر اس کی تفسیر اس طرح کرتے ہیں۔

وما منعنا[۱] ان نرسل بالآیات التی سالھا قومک الا من کان قبلھم من الامم المکذبۃ سالوا ذالک

---

[۱] تفسیر ابن جریر جلد ۱۵ سورۃ الاسراء

مثل ہو الم فلما اناہم ما سالوا منہ کذبو رسلہم فلم یصدقوا مع مجی الآیات ترجمۂ تفسیر "اے محمد! ان نشانیوں کے بھیجنے سے ہیں کسی چیز نے باز نہیں رکھا جن کو تیری قوم نے مانگا سوا اس بات کے کہ ان سے پہلے جھٹلانے والی قوموں نے اسی طرح کا سوال کیا تھا جب ان کی مطلوبہ نشانی ان کے پاس آگئی تو انھوں نے اپنے رسولوں کو جھٹلا دیا اور نشانیوں کے آنے کے باوجود انھوں نے تصدیق نہیں کی۔" اس کے بعد حضرت ابن عباس سے ایک حدیث نقل کی ہے۔ طوالت کے خوف سے اس کا خلاصہ نقل کرتا ہوں۔

اہل مکہ نے نبی کریمؐ سے کہا کہ آپ کوہ صفا کو سونا بنا دیں اور دوسرے پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہٹا دیں تاکہ وہ وہاں کھیتی کر سکیں۔ اس پر اللہ نے یہ آیت نازل کی چنانچہ اس تفسیر کی تصدیق خود کلام پاک کی آیت ' وآتینا ثمود الناقۃ مبصرۃ فظلموا بہا ' سے ہوتی ہے یعنی قوم ثمود نے بھی اسی طرح کا سوال کیا تھا جب ہم نے قوم ثمود کو اونٹنی کی کھلی ہوئی نشانی دی تو انھوں نے اس کے ساتھ ظلم کیا یعنی وہ ایمان نہیں لائے اور اونٹنی کی کوچیں کاٹ ڈالیں۔

وما منعنا ان نرسل الخ سے محترم نقاد کو جو غلط فہمی ہوئی ہے کہ یہ آیت کریمہ نص قطعی ہے کہ رسول اللہ کو کوئی حسی معجزہ نہیں دیا گیا۔ مجھے امید ہے کہ وہ غلط فہمی دور ہو جائے گی۔ اسی طرح " وان کان کبر علیک اعراضہم الخ میں اسی معجزۂ متحدیٰ بہا کے صدور کی نفی ہوتی ہے۔

مصنف سیرت نبی نے بخاری شریف کی مندرجہ ذیل حدیث سے معجزۂ نبی پر دلیل پیش کی ہے۔

| | |
|---|---|
| ما من نبی من الانبیا الا اعطیٰ من الآیات ما مثلہ امن علیہ البشر وانما کان الذی اوتیت وحیا اوحاہ اللہ الیّ | پیغمبروں میں سے ہر پیغمبر کو اللہ نے اس قدر معجزے دیے جن کو دیکھ کر لوگ ایمان لائے لیکن مجھے جو معجزہ دیا گیا وہ صرف وہی ہے جس کو اللہ تعالیٰ میری طرف بھیجتا ہے (صفحہ ۱۶۴) |

سید صاحب نے اس حدیث کے چند نکات بیان کیے ہیں۔ ایک "نکتہ" کا محترم نقاد نے اضافہ کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے " مگر اس حدیث میں جو سب سے ضروری نکتہ تھا یعنی یہ کہ حضور اکرمؐ نے " انما " کے لفظ سے حصر فرما دیا کہ مجھے سوائے وحی کے اور کوئی معجزہ نہیں دیا گیا ہے' اسی کو چھوڑ دیا۔"

محترم " نقاد " نے شاید غور کرنے کے بعد اس نکتہ کا اضافہ نہیں کیا۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا

کہ حدیث کو اس سے زیادہ معقولیت سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ حدیث میں ہے "من الآیات ما مثلہ امن علیہ البشر" یعنی اس قدر معجزے دئے گئے جن کو دیکھ کر لوگ ایمان لائے اور مجھے جو معجزہ دیا گیا یعنی جس کو دیکھ کر یا سن کر لوگ ایمان لائے وہ صرف وحی ہے جس کو اللہ میری طرف بھیجتا ہے۔ مقابلہ ان معجزات کا ہے جن کو دیکھ کر لوگ ایمان لائے مطلق معجزات کا ذکر نہیں ہے۔ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ رسول کریمؐ کو سوائے وحی کے کوئی دوسرا ایسا معجزہ جس پر لوگوں کو ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہو نہیں دیا گیا لیکن اس سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ دوسرے حسی معجزے وقتاً فوقتاً صادر نہیں ہوئے جبکہ کتب تاریخ پکار پکار کر اس انکار کی تردید کر رہی ہیں۔ سید صاحب نے سیرت نبی میں لکھا ہے "اگر امور غیب کی قبل از وقت اطلاع نہیں دیتے تھے اور معجزات و خوارق عادت کا صدور آپ سے نہیں ہوتا تھا تو کفار آپ کو کاہن اور ساحر کے خطابات سے کیوں یاد کرتے تھے۔"

محترم نقاد کو حیرت ہے کہ سید صاحب نے کفار کے ساحر و کاہن کے الفاظ سے رسول اللہؐ کو صاحب معجزہ قرار دینے کی کیسے جرأت کی۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں "علاوہ ازیں وہ آنحضرت کو ساحر، کاہن اور شاعر صرف قرآن ہی کی بنا پر کہتے تھے نہ کہ خوارق عادات کے صدور پر۔" کس "وحی" سے محترم نقاد کو معلوم ہوا کہ کفار آنحضرتؐ کو کاہن و ساحر صرف قرآن ہی کی بنا پر کہتے تھے نہ کہ خوارق عادات کے صدور پر، سحر کے معنی "دلکش" یا مزور کلام کس لغت میں ہے؟ کیا قابل سند عربی شعر اس پر پیش کر سکتے ہیں!

اس کے بعد مولانا نے حسی معجزات یا خوارق عادات کے عدم ظہور پر ایک آیت پیش کی ہے جس کے متعلق انتہائی بلند آہنگی سے فرماتے ہیں "اب علاوہ ان آیات کے میں ایک ایسی آیت نقل کرتا ہوں جو اس بحث کا قطعی فیصلہ کر دیتی ہے اور جس کو سید صاحب نے اپنی آٹھ سو صفحات کی طویل و عریض کتاب میں کہیں نہیں نقل کیا وہ یہ ہے۔"

| | |
|---|---|
| واذا لم تأتہم بآیۃ قالوا لولا اجتبیتہا | اور جب تو ان کے پاس کوئی نشانی نہ لایا تو انھوں نے کہا کہ تو نے کوئی نشانی کیوں نہ چنی۔ |

میں پھر وہی عرض کروں گا کہ کلام پاک کو اس سے زیادہ بصیرت سے سمجھنے کی ضرورت ہے تاکہ معلوم ہو کہ لفظ آیت یہاں پر آیت قرآن یعنی کلام پاک کا چھوٹا ٹکڑا کے معنی میں ہے یا اس کے معنی نشانی یعنی معجزہ ہیں۔ اس آیت کے بعد والی آیت کو اگر ملا کر پڑھا جائے گا تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ آیت یعنی آیت قرآن ہے یا مولانا کی "نشانی" کے معنی میں ہے۔ پوری آیت بھی ناظرین کرام کے لئے نقل کئے دیتا ہوں تاکہ اہل فہم حضرات خود فیصلہ کریں۔

واذا لم تاتہم بایۃ قالوا لولا اجتبیتہا قل انما اتبع ما یوحیٰ الی من ربی ھذا بصائر من ربکم وھدًی ورحمۃ لقوم یومنون۔

جب تو ان کے پاس کوئی آیت (قرآن) نہیں لایا تو کہا کہ تو اپنی طرف سے کوئی آیت کیوں نہیں گھڑ لیتا۔ اے محمدؐ! تو ان سے کہدے کہ میں اس کی اتباع کرتا ہوں جس کو میرا پروردگار میری طرف بذریعہ وحی بھیجتا ہے۔ یہ بصیرت اور ہدایت (کا سبب ہے) ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں۔

تفسیر فتح البیان، تفسیر ابن جریر، تفسیر بیضاوی، تفسیر مدارک سب کا اتفاق ہے کہ آیت سے آیت قرآن مراد ہے۔ صورت حال اس طرح لکھی ہے کہ جب کبھی نزول وحی میں تاخیر ہوئی تو کفار کہتے تھے کہ اے محمدؐ! تم اپنی طرف سے آیت گھڑ کیوں نہیں لیتے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ ان سے کہدیجئے کہ جو آیات قرآن میں تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں اور جن کی میں اتباع کرتا ہوں انھیں پروردگار مجھ تک وحی کے ذریعہ بھیجتا ہے۔

مفسرین نے اجتبار کے معنی اختلاق وافترار وافتعال لکھے ہیں۔ "التقاط" یعنی چن لینا کسی نے نہیں لکھا ہے۔

مولانا کی ساری استدلالی بضاعت مذکورہ بالا آیت تھی جس کے متعلق مولانا کا خیال تھا کہ حسی معجزات کے عدم ظہور پر نص قطعی ہے اور اس کے ذکر سے آٹھ سو صفحات کی "طویل وعریض" کتاب کی کمی پوری ہوگئی۔

نسجت علیک العنکبوت بنسجها      وقضیٰ علیک بہا الکتاب منزلٗ

محترم نقاد سے گذارش ہے کہ آیا دوسرے انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کو حسی معجزے دیے گئے تھے یا نہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو خاتم النبیین صلعم روحی فداہ کو جن کو تمام انبیاء پر فضیلت ہے کیا کوئی حسی معجزہ نہیں دیا گیا؟ کیا ہماری اور آپ کی عقل اس کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہے؟

اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں " پھر وہ یعنی مصنف سیرت نبی آپ کی امیت کو معجزہ قرار دیتے ہیں لیکن یہ اگر معجزہ ہے تو جملہ عرب اس میں شریک تھے کیونکہ وہ سب امی تھے"۔

محترم نقاد کو غلط فہمی ہوگئی۔ آپ کی محض امیت معجزہ نہیں قرار دی گئی ہے بلکہ آپ کی امیت کے ساتھ آپ کا علم، آپ کے اخلاق حسنہ، آپ کے فضائل کا وجود معجزہ ہے۔ کیا ان میں تمام عرب شریک وسہیم تھے۔ مولانا فرماتے ہیں:-

"ذات نبوی کی حفاظت کا وعدہ بھی معجزات ظاہری میں نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی مہربانیوں میں سے ایک مہربانی ہے"۔

صحیح ہے صالح علیہ السلام کو جو اونٹنی بطور معجزہ کے دی گئی تھی وہ بھی اللہ کی ایک مہربانی و تائید تھی۔ صالح علیہ السلام کا اس میں کیا معجزہ تھا۔ اس کے لئے مولانا فرماتے ہیں:-

"غلبۂ روم کی پیشین گوئیاں یا اخبار بالغیب جو انھوں نے قرآن سے نقل کی ہیں وہ سب کی سب اگر وجہ اعجاز ہوسکتی ہیں تو قرآن کے لئے جس نے ان امور کو بیان کیا نہ کہ رسول کے لئے۔ اسی طرح ہجرت کا موقع دکھلانا، فرشتوں سے امداد کرنا، لڑائیوں میں فتوحات دینا، میدان جنگ میں پانی برسانا وغیرہ وغیرہ جملہ امور نصرت و تائید الٰہی ہیں۔ ان کا شمار معجزات میں نہیں ہوسکتا"۔

مولانا کا ارشاد بجا ہے۔ صرف اس فہرست میں چند چیزیں اور اضافہ کردیتا ہوں اور موسیٰ علیہ السلام کا معجزۂ ید بیضا اور عصا، عیسیٰ علیہ السلام کا مریض کو شفا دینا، لوگوں کے گھر کی چیزوں کی خبر دینا کہ انھوں نے کیا کھایا ہے اور کیا جمع کیا ہے۔ اگر یہ امور وجہ اعجاز ہوسکتے ہیں تو ان معجزات کے لئے نہ کہ

موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام کے لئے۔ ساحروں کے مقابلہ میں موسیٰ علیہ السلام اپنے عصا کو چھوڑ دیتے ہیں وہ اژدہا بن کر ساحروں کے تمام دام فریب کو نگل جاتا ہے اگر یہ وجہ اعجاز ہو سکتا ہے عصائے موسیٰ علیہ السلام کے لئے نہ کہ موسیٰ علیہ السلام کے لئے' نیز ان کا شمار نصرت الٰہی اور تائید غیبی ہوگا نہ کہ معجزات میں! کیا معجزہ نصرت الٰہی اور تائید غیبی کے سوا کوئی اور چیز ہے؟

اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں "مکہ سے بیت المقدس تک ایک رات میں سفر نہ کفار نے دیکھا نہ مسلمانوں نے بلکہ ابھی تک یہی بحث ہے کہ یہ خواب میں تھا یا بیداری میں۔" کیا مولانا قرآن کے علاوہ حدیث و تاریخ کو بھی وجہ استدلال سمجھتے ہیں؟ یہ اختلاف تو کتب احادیث میں ہے قرآن تو اس سے بالکل خاموش ہے۔ کلام پاک میں صاف لفظوں میں یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو رات کے وقت مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ لے گیا۔ یہ خواب و بیداری کا اختلاف مولانا نے کس قرآن کی روشنی میں پیدا کیا؟

شق قمر کی آیت حسی معجزے کے ثبوت کے لئے کافی دلیل ہے لیکن مولانا فرماتے ہیں کہ اس کا ظہور قیامت کے قریب ہوگا۔ اقتربت الساعۃ وانشق القمر میں انشق ماضی کا صیغہ ہے لیکن مولانا کا ارشاد ہے کہ اس کے معنی "چاند پھٹ گیا" صحیح نہیں ہے بلکہ "چاند پھٹ جائے گا"۔ چونکہ محترم نقاد شق القمر کا معجزہ تسلیم نہیں کرتے اور صحیح روایات و مستند احادیث کی وقعت ان کے نزدیک پرکاہ کے برابر نہیں ہے اس لئے سیرت نبی کے مصنف کے اس استدلال سے ناراض ہیں جس میں شق القمر کے معجزے کے ظہور پر مزید دلیل صحیح روایات سے پیش کی گئی ہے چنانچہ مولانا فرماتے ہیں "بس اصلی وجہ یہی مستند اور صحیح روایات ہیں جو اس کھلی آیت کے سمجھنے سے مانع ہیں۔ اس میں کیا قباحت ہے کہ قرآن جس معنی میں ہے اس کو اسی میں رہنے دیجئے اور صاف صاف کہہ دیجئے کہ شق القمر کا معجزہ قرآن سے ثابت نہیں۔"

مولانا الٹا مصنف سیرت نبی کو الزام دیتے ہیں کہ وہ آیت کو اپنے اصلی معنی میں نہیں رکھتے حالانکہ اس جرم کے مرتکب خود مولانا ہیں۔ کلام مجید میں انشق کا صیغہ استعمال ہوا ہے جس کے معنی

پھٹ گیا' ہیں لیکن مولانا ترجمہ کرتے ہیں " چاند پھٹ جائے گا" کیا خوب! قرآن کو اپنے املی میں رکھا۔ ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا۔ اس کے بعد مولانا نے شق قمر کی سورت کی دوسری آیات کا ترجمہ کیا ہے وہ بھی اہل علم حضرات کے لئے غور طلب ہے :-

وان یروا آیۃ یعرضوا ویقولوا سحر مستمر | اگر وہ (قیامت کی) کوئی نشانی دیکھیں گے تو بھی منہ پھیر لیں گے اور کہیں گے کہ یہ جھوٹ ہے جو ہمیشہ سے چلا آرہا ہے۔

علامت قیامت کے دیکھنے کے بعد جھوٹ کہنے کے کیا معنی؟ جھوٹ تو واقعہ کے خلاف خبر کا نام ہے جس کو اپنی آنکھوں سے انسان دیکھ رہا ہو اسے جھوٹ کس طرح کہہ سکتا ہے۔ البتہ کسی علامت کو دیکھ کر انسان ہٹ دھرمی سے یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ جادو ہے سحر ہے نہ کہ جھوٹ اور کذب۔ سحر کے معنی جھوٹ کہاں اور کس لغت میں ہے؟ مولانا نے جس تلبیس و تدلیس سے کام لیا ہے اس کی مثال علمی دنیا میں مشکل سے مل سکتی ہے

**بدر میں فرشتوں کا نزول**

اللہ کے افضال و عنایات میں سے یہ امر بھی تھا کہ اس نے بدر نیز دوسرے غزوات میں بھی اپنے نبی کی امداد کے لئے فرشتے اتارے۔ ان کے اتارنے کی حقیقت اور اس کی نوعیت اور اس کے متعلق سنت اللہ ان سب امور کی قرآن میں کئی جگہ تفصیل کی گئی ہے لیکن سید صاحب نے قطعاً اس کی طرف اعتنا نہ کی۔ کاش مولانا ہی اپنے " بحر تحقیق " کے ایک قطرہ کو لے کر قلم " حقیقت نگار " سے ہم لوگوں کی خاطر جامعہ کے صفحات پھیلا دیتے کہ ناظرین جامعہ کی بصیرت کا سبب ہوتا۔

مصنف سیرت نبی نے بدر میں فرشتوں کے نزول کے متعلق لکھا ہے " اس معرکے میں سن چکے ہو کہ کافروں کی تعداد مسلمانوں سے تگنی تھی ایسی حالت میں مسلمانوں کا بددل ہونا لازمی تھا خدا نے اپنی قدرت کاملہ کا یہ تماشا دکھایا کہ مسلمانوں کی نگاہوں میں کچھ ایسا تغیر کر دیا کہ وہ مسلمانوں کو بہت تھوڑے نظر آنے لگے۔ ادھر کفار کو مسلمان تھوڑے نظر آتے تھے مقصود یہ تھا کہ رؤسائے کفار میدان سے بھاگ کر جانیں بچا کر نہ جانے پائیں۔ اس کی تدبیر یہ کی کہ مسلمان اپنی اصلی تعداد سے بھی ان کو کم نظر آنے لگے" صفحہ ۵۲۷۔

اس کے بعد صفحہ ۲۰۵ پر مصنف سیرت نبی نے یہ لکھا ہے "جب دونوں صفیں گتھ گئیں تو خدا کے حکم سے مسلمانوں کی تعداد دشمنوں کو ان کی اپنی تعداد سے دونی نظر آنے لگی۔ ..... یہ مسلمانوں کی تعداد بڑھ کیوں کر گئی تھی۔ کیا آسمان سے فرشتے اتر آئے تھے؟" مولانا نے اس پر ایک حاشیہ تحریر فرمایا ہے وہ بھی ملاحظہ ہو۔

"یعنی ایک ہی حالت میں (یہ مولانا کی طرف سے ہے) جبکہ بدر میں دونوں فوجیں گتھی ہوئی تھیں کفار مسلمانوں کو اپنی تعداد سے دونا یعنی کم وبیش دو ہزار دیکھتے تھے اور پھر ان کو ان کی اصلی تعداد یعنی ۳۱۴ سے کم دیکھتے تھے۔ کیا ان دونوں سے ایک تیسرا معجزہ جمع بین الضدین کا نہیں پیدا ہوتا جس کو سید صاحب کی طرف منسوب کرنا چاہیے۔"

ناظرین کرام سمجھ سکتے ہیں کہ یہ جمع بین الضدین کے ثابت کرنے کا معجزہ (اگر اس فعل کو معجزہ کہنا صحیح ہو) مولانا کی طرف منسوب کرنا چاہیے۔ کہاں اور کس کتاب میں ہے کہ ایک ہی وقت میں کفار مسلمانوں کو اپنے سے دونا یعنی کم وبیش دو ہزار دیکھتے تھے اور اسی وقت میں ان کو ان کی اصلی تعداد یعنی ۳۱۴ سے کم دیکھتے تھے۔ مصنف سیرت نبی نے تعداد کی کمی و زیادتی کو بیان کرتے ہوئے یہ صاف لکھ دیا کہ ابتداءً کفار کی نگاہوں میں اللہ نے کچھ ایسا تغیر کر دیا کہ مسلمان ان کی نگاہوں میں تھوڑے نظر آنے لگے تاکہ وہ میدان سے نہ بھاگیں۔ ادھر مسلمانوں کی نگاہوں میں کچھ ایسا تغیر کیا کہ کفار ان کو کم نظر آنے لگے تاکہ دشمنوں کی تگنی تعداد دیکھ کر مسلمان بددل نہ ہوں۔ اس کے بعد جب صفیں گتھ گئیں تو خدا کے حکم سے مسلمانوں کی تعداد دشمنوں کی آنکھوں میں ان کی اپنی تعداد سے بھی دونی نظر آنے لگی۔

کفار کا مسلمانوں کو تھوڑا دیکھنا ایک وقت میں ہوا۔ پھر ان کو اپنی تعداد سے بھی زیادہ دیکھنا دوسرے وقت میں ہوا۔ یہ اجتماع ضدین کس طرح ہوا۔ مولانا! اجتماع بین الضدین کے لیے اتحادِ وقت بھی ضروری ہے۔

"تسع آیات" کی تفسیر حدیثوں میں دونوں طرح سے مذکور ہے۔ مصنف سیرت نبی نے ان دو روایتوں میں سے ایک کو اختیار کیا۔ اگر مولانا کے نزدیک دوسری روایت راجح ہے تو کوئی مضائقہ

نہیں۔ مولانا نے "تسع آیات" کی جو شرح کی ہے وہ کسی "تحقیق انیق" کا نتیجہ نہیں ہے۔ حدیث کی کتابوں میں دونوں روایتیں صحیح سند سے مذکور ہیں۔

سیرت نبی میں بلاشبہ بعض مضامین کا بار بار اعادہ ہوا ہے لیکن لوگوں کی طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں بعض اشارے سے سمجھتے ہیں بعض تصریح کے بعد بھی نہیں سمجھتے بعض بار بار کہنے کے بعد بھی نہیں سمجھتے۔ خود قرآن مجید میں ایک ہی مضمون کو اللہ نے مکرر سہ کرر بیان کیا ہے۔ اس کا مقصود یہ ہے کہ ذکی و ذہین، غبی و بلید سب کے ذہن میں مضمون راسخ ہو جائے۔

اخیر میں میں یہ عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سیرت نبی جلد سوم کو شائع ہوئے کئی سال گذر گئے۔ اس عرصہ میں مولانا اسلم صاحب نے بڑی کاوش و محنت سے "لخت جگر" پیش کئے ہیں جس کے لئے وہ مستحق داد ہیں لیکن مولانا کی اس "روشن خیالی" سے جس کی اشاعت کی وہ پیہم کوششیں کر رہے ہیں مجھے شدید اختلاف ہے کیونکہ اس سے سنت رسول کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔

---

# محمد تغلق اور ضیاے برنی

## جناب اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی کا مکتوب گرامی

مجھے اس ہفتے نجیب آباد سے بجنور جانا پڑا۔ سفر میں ایک عزیز محترم نے رخصت کرتے وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے رسالہ "جامعہ" کا ماہ نومبر ۳۳ء کا پرچہ بلا طلب مرحمت فرمادیا اور میں نے شکریے کے ساتھ لے لیا۔ نگینہ اور نجیب آباد کے درمیان ریل میں اسے مطالعہ کیا۔ رسالے کا پہلا مضمون سیرۃ النبی مجلد چہارم پر محترمی مولانا اسلم جیراجپوری کا ریویو تھا۔ اس میں ایک علمی بحث تھی اسے پڑھتے ہوئے میں نے سمجھا کہ اسی مضمون کی وجہ سے رسالہ مجھے دیا گیا ہے لیکن آگے بڑھ کر اس خیال کی اصلاح ہوئی۔ دوسرا مضمون "محمد تغلق اور ضیائے برنی" کے عنوان سے جناب مولانا سید حسن صاحب برنی ایڈووکیٹ کا لکھا ہوا تھا جس کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ اس حقیر پر تقصیر کی نالائقیوں پر زجر و توبیخ کی گئی ہے ؎

بر لوح ثبت بود کہ ملعون شود کسے ۔۔۔ بردم گماں بہ ہر کس و بر خود گماں نبود

میں نے اس مضمون کو بڑی ہی دلچسپی اور مسرت کے ساتھ پڑھا۔ خدائے تعالیٰ کی جناب میں توبہ استغفار کی کہ الٰہی میرے گناہوں کو معاف فرما اور مجھے اپنی رضا کی راہوں پر چلا۔ نجیب آباد پہنچ کر حضرت سید حسن صاحب برنی کی خدمت میں شکریے کا ایک عریضہ لکھا کہ آپ نے میری اصلاح کے لئے جو کوشش فرمائی ہے میں بدل اس کا سپاس گزار اور منت پذیر ہوں۔ اگلے روز ایک محترم بزرگ کا دہلی سے بھیجا ہوا گرامی نامہ پہنچا کہ نومبر کے جامعہ میں تیری کتاب آئینۂ حقیقت نما جلد دوم کے خلاف جو تلخ مضمون شائع ہوا ہے اس کا جواب لکھنا ضروری ہے۔ اس خط کو پڑھ کر مجھے آئینۂ حقیقت نما جلد اول کے متعلق جامعہ کا وہ ریویو یاد آگیا جو غالباً ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا تھا۔ محترمی مولانا سید حسن صاحب برنی کے اس ریویو میں تو مجھے کوئی تلخی محسوس نہیں ہوئی لیکن جلد اول کے اس ریویو میں جو ادارۂ جامعہ کی طرف سے شائع ہوا تھا ضرور تلخی موجود تھی اور وہ پرچہ دفتر رسالہ جامعہ سے میرے

نام بھجوایا گیا تھا۔ میں نے اس وقت بھی جامعہ کے اڈیٹر صاحب کو شکریے کا خط لکھا تھا اور علیم وخبیر خدا خوب جانتا ہے کہ جامعہ کے ساتھ اس تلخ ریویو کی بنا پر میری محبت میں اضافہ ہی ہوا تھا کہ داروئے تلخ است دفع مرض۔ اس وقت میرے کئی دوستوں نے جواب دینے اور جامعہ کے ساتھ بیت بحثی کا ارادہ کیا لیکن میں نے باصرار اور بالحاح ان کو باز رکھا اس لئے کہ تلخ گفتار نکتہ چینوں کو اپنا مخالف یقین کرنا اور ان کی تنقید سے نفع اٹھانے کی کوشش نہ کرنا انسان کی بد نصیبی ہے ؎

من آنکس نگویم کہ بدخواہ تست — کہ گوید فلاں خار در راہ تست

آئینۂ حقیقت نما کی دونوں جلدیں ملک کے ہر حصے میں پہنچ چکی ہیں۔ پہلی جلد کے دو اڈیشن شائع ہو چکے دوسری جلد کا پہلا اڈیشن ختم ہونے کے بعد دوسرے اڈیشن کے لئے ہر طرف سے پیہم تقاضے ہو رہے ہیں۔ یہ دونوں جلدیں نفع رساں ہیں یا مضرت رساں ملک خوب محسوس کر چکا ہے۔ اب کسی کے برا یا بھلا کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ تاہم اگر ضرورت ہو تو مجھے آئندہ اڈیشنوں میں ترمیم واصلاح سے انکار اور اپنی کسی غلط رائے پر کوئی اصرار نہیں۔ آئینۂ حقیقت نما، حجۃ الاسلام، قول حق، تاریخ اسلام اور دوسرے بہت سے رسائل میں نے ہرگز ہرگز اس لئے نہیں لکھے کہ لوگوں کے دلوں پر اپنے علم وواقفیت کی کوئی دھاک بٹھاؤں اور ملک میں اپنے لئے کوئی اونچی سی جگہ تلاش کرنے کی ملعون کوشش میں شیطان کا کھلونا بنوں۔ میں جاہ پسندی وخود پرستی کو الحمد للہ نہایت نفرت وحقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ خدائے تعالیٰ بدگمانی کی پلیدی سے ہمیشہ مجھے بچائے۔ میرا خیال ہے کہ مسلمانوں میں دانش فروش اور شہرت پسند مصنفین کو اپنے علمی مرتبے کی حفاظت کے مقابلے میں اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کا خیال بہت کم ہے۔ یہ بات کچھ عہد حاضر ہی سے مختص نہیں۔ عہد قدیم میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ احیاء العلوم پر تنقید کرنے والوں میں بعض نے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کو مورد طعن وتشنیع بنانے میں کوتاہی نہیں کی لیکن ان ناقدین کی تصانیف نفع رسانی کے اعتبار سے احیاء العلوم کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکیں۔

میں نہایت ادب کے ساتھ اپنے محترم بزرگ کی خدمت میں جنھوں نے دہلی سے خط بھیجا ہے گذارش پرداز ہوں کہ محترمی سید حسن صاحب برنی نے ضیائے برنی کی حمایت میں جو کوشش فرمائی ہے

نہ ان کا حق بلکہ فرض تھا اور ان کی یہ حب الوطنی میرے نزدیک ان کی شرافت کی دلیل ہے۔ اس معاملے میں ان سے رعایت کا برتاؤ نہ کرنا ایک عیب اور جرم قرار دیا جا سکتا ہے۔

ہاں! ذیل کے چند فقرات گذارش کرنے میں کوئی ہرج معلوم نہیں ہوتا۔

(۱) ضیائے برنی نے اپنی تاریخ میں ہر ایک بادشاہ کا حال ترتیب زمانی اور بے ساختگی کے ساتھ لکھا ہے اور یہی مناسب بھی تھا اور یہی قدیم زمانے کے ہر مورخ کا شیوہ رہا ہے لیکن تنہا سلطان محمد تغلق کے حالات لکھتے ہوئے ضیائے برنی نے ترتیب زمانی کو درہم برہم کر دیا ہے اور ظاہر ہے کہ اس طرح وہ تصور جو کسی بادشاہ کے حالات پڑھ کر ہر شخص آزادانہ قائم کرتا ہے سلطان محمد تغلق کے متعلق قائم نہیں کر سکتا بلکہ وہی تصور قائم ہوتا ہے جو ضیائے برنی نے قائم کرانا چاہا ہے۔ اس کے متعلق ضیائے برنی کی معذرت بھی نہایت رکیک ہے اور محترمی سید حسین صاحب برنی کو بھی کچھ نہیں فرمانا چاہیے تھا۔

(۲) محترمی مولانا سید حسن صاحب برنی کو اس تنگ خیالی کی حمایت نہیں کرنی چاہیے تھی کہ کسی شخص کی ایک برائی کو برا کہنے کے بعد ضروری ہے کہ اس کی خوبیوں کا اقرار نہ کیا جائے اور اس کے لئے دعا بھی نہ کی جائے۔

(۳) محترمی سید حسن صاحب برنی نے پروفیسر گارڈنر براؤن آنجہانی کے اتباع کا الزام دینے میں اپنی تنقید کے مرتبے کو ناحق نقصان پہنچایا اس لئے کہ میں نے تو پروفیسر مذکور کی کج نظری کو واشگاف کر کے اس کی مخالفت کی ہے نہ اس کی تقلید۔

(۴) سفرنامہ ابن بطوطہ اور تاریخ مبارک شاہی دونوں کو میں بالاستیعاب مطالعہ کر چکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ دونوں کے ذریعے اپنے خیال کی تائید میں اور بھی بہت سے دلائل فراہم کر سکتا ہوں مگر اب اس کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

(۵) ضیائے برنی کی حمایت میں جو کچھ فرمایا گیا ہے میرا خیال ہے کہ اس پر اور بھی اضافہ ممکن تھا لیکن سلطان محمد تغلق کے گناہوں کی فہرست کو طویل بنانے میں محترم ممدوح نے جو کوشش فرمائی

ہے مجھے اس سے انکار ہے۔ چھ سات برس تک بارش کا نہ ہونا اور بقول یحییٰ بن احمد سرہندی مصنف تاریخ مبارک شاہی آسمان سے سات برس تک ایک قطرۂ آب کا نہ گرنا یقیناً اس زمانے کی عام مخلوق کی بداعمالیوں اور سخت گناہوں کا نتیجہ تھا۔ یہ بے چارے محمد تغلق کی کرتوت نہ تھی۔ اگر اس زمانے میں بداعمالیاں حد سے بڑھ گئی تھیں (جس کا تاریخوں سے بھی ثبوت ملتا ہے) تو ایسے بداعمال لوگوں پر حکومت کرنے والے فرماں روا کا مجرموں کو سزا دینا اور لوگوں کا زیادہ زیر سیاست آنا کم از کم ایک مسلمان کے لئے تو تعجب کی بات نہیں ہونی چاہیئے۔

(۶) محترم ممدوح کے مضمون میں اگر کوئی بات جواب طلب ہے تو اس کا جواب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ آئینۂ حقیقت نما جلد دوم کو دوبارہ ملاحظہ فرما لیا جائے۔

(۷) سنا ہے کہ ڈاکٹر ایشوری پرشاد صاحب لکچرر الہ آباد یونیورسٹی نے آئینۂ حقیقت نما جلد دوم کی اشاعت کے کئی سال بعد سلطان محمد تغلق پر مضمون لکھ کر ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی ہے مگر اب تک کئی سال گزرنے پر بھی انھوں نے اپنا وہ مضمون ہندوستان میں غالباً شائع نہیں فرمایا۔ محترمی سید حسن صاحب برنی اگر ڈاکٹر ممدوح کے اس مضمون کو کسی طرح ملاحظہ فرما سکیں اور اس پر کوئی ریویو ارقام فرمادیں تو ممکن ہے کہ جواب دہی کا وہ بوجھ جو تنہا مجھ پر ڈالا گیا ہے اس کا ایک حصہ ڈاکٹر صاحب بھی اُٹھا سکیں۔

حضرت محترمی سید حسن صاحب برنی کے مضمون کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کا لہجۂ تخاطب نہایت ہی شریفانہ ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر قابل اطمینان اور قابل تعریف بات یہ ہے کہ انھوں نے کتاب کی اصل روح کو کوئی صدمہ نہیں پہنچانا چاہا بلکہ انھوں نے میری تحقیق اور تفتیش کے ناقص و کمزور ہونے ضیائے برنی کے بے گناہ اور میرے خطاکار ہونے پر ہی تمامتر زور صرف فرمایا ہے۔ اس حقیقت کو جو اس کتاب کے مطالعے سے منکشف ہوتی اور قلب پر اثرانداز ہوتی ہے اس ریویو سے کوئی صدمہ نہیں پہنچا اور مجھے اپنی ذات سے زیادہ وہی محفوظ چیز عزیز ہے۔ میں ایک گنہگار

انسان ہوں۔ ہرگز اپنے آپ کو فرشتہ نہیں سمجھتا لیکن فرشتوں کی زبانی خدائے تعالیٰ کی جناب میں عاجزانہ اقرار کرتا ہوں کہ سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم اور حضرت محترمی مولانا سید حسن صاحب برنی کی خدمت عالی میں مودبانہ عرض پرداز ہوں کہ ؎

نمی خواہم کہ در عالم دمے از من غمیں باشد
زفیض دوستی آگاہ گرداں دشمنانم را

---

# تصحیح

رسالہ جامعہ ماہ نومبر ۳۳ء صفحہ ۳۰۷ سطر ۱۵ میں "بلکہ اس کی سرحدیں" کے بجائے "بلکہ موت کی سرحدیں" ہے۔ ناظرین تصحیح فرمالیں۔

# فاہیان کی تیرتھ یاترا

## باب (۱)

چھنگ آن سے روانگی۔ کوہستان لو آنگ۔ مغربی تسین۔ جنوبی لی آن ۔شمالی لیان تھن ہوانگ۔

### ریگستان

پہلے فاہیان جب چنگان میں تھا تو اسے یہ دیکھ کر کہ بدھ مت کے احکامات اور مذہبی تصانیف قریب قریب تلف ہو رہی ہیں اور بعض مسخ ہو گئی ہیں بڑی پریشانی ہوئی۔ چنانچہ ہوانگ سٹی کے دوسرے سال ۲۹۹ء میں وہ اصلیت کا پتہ لگانے کے لئے ہوئی کنگ، تاؤ چنگ، ہوئی ینگ، ہوئی وی اور بعض دوسرے اشخاص کے ساتھ ہندوستان کی طرف روانہ ہوا۔

چنگان سے روانہ ہو کر اور کوہستان لو آنگ کو عبور کرکے وہ کھیان کوئی کی حکومت میں پہنچا اور یہاں گرمیاں گذارنے کے لئے ٹھہر گیا۔ گرمیاں ختم ہونے پر اور آگے بڑھا اور نیو تھان کی حکومت میں پہنچ گیا جہاں سے کوہستان یانگ لو کو پار کرکے وہ چنگ چی کے فوجی مقام پر آ گیا۔

اس وقت چنگ چی کے ملک میں بڑی ابتری پھیلی ہوئی تھی جس کی وجہ سے سفر کرنا دشوار ہو گیا تھا۔ چنگ چی کا حاکم مسافروں کے ساتھ دلچسپی اور محبت رکھتا تھا اور ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا تھا۔ اسی زمانے میں اس کی ملاقات چیان، ہوئی کیان، سینگ شاؤ، پاؤ ین، سینگ کنگ اور دوسرے لوگوں سے ہوئی اور چونکہ وہ بھی ہم مقصد تھے اس لئے اس کے ساتھ مل جل کر رہے اور جب گرمیاں گذر گئیں تو ذرا اور آگے بڑھے اور تھن ہوانگ جا پہنچے جہاں فوجی استحکامات بڑے زوروں پر تھے۔ مشرق سے مغرب تک اسی میل اور شمال سے جنوب تک چالیس میل تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس جگہ وہ ایک مہینے اور چند دن ٹھہرے۔ پھر فاہیان اور پانچ دوسرے آدمی ایک سفارت کی معیت میں پاؤ ین اور اس کے ساتھیوں سے جدا ہو کر روانہ ہوئے۔ تھن ہوانگ کے حاکم لی ہاؤ

نے ریگستان کو عبور کرنے کے لئے ان سب کے لئے بڑی سہولتیں مہیا کیں۔ اس دریائے ریگ میں ایسی جھلسنے والی آندھیاں چلتی ہیں کہ جس کے لگ جائیں وہ "آناً فاناً" مرجائے۔ نہ تو ہوا میں پرند نظر آتے ہیں اور نہ زمین پر دوسرے جانور۔ ہر طرف جہاں تک آنکھ کام کرتی ہے اگر عبور کرنے کا صحیح راستہ تلاش کیا جائے تو سوائے ان لوگوں کے ڈھانچ کے اور کچھ نظر نہیں آتا جنھوں اس کو پار کرنے کی کوشش میں اپنی جان دے دی اور انھیں سے راستے کا کچھ سراغ لگتا ہے۔

سترہ دن سفر کرنے اور پندرہ سو میل کی مسافت طے کرنے کے بعد وہ شین شین کے ملک میں آپہنچے۔

## باب (۲)

شین شین کا ملک نہایت اونچا نیچا اور ناہموار ہے۔ اس کی زمین کمزور اور بنجر ہے۔ یہاں کے باشندوں کے اطوار ولباس ہان کے باشندوں کے اطوار ولباس کی طرح بھونڈے اور بھدے ہیں۔ فرق فقط نمدے اور کپڑے کے استعمال ہی میں ہے۔

اس ملک کا مالک بدھ مت کا حامی ہے۔ اس کے راج میں کوئی چار ہزار سنگ ہیں اور یہ سب کے سب سیاؤ چنگ کے اصول کے پیرو ہیں۔ ان ممالک کے سجن تو سجن سامن تک ہیان تو مت کو کم و بیش کثافت و نفاست کے فرق سے مانتے ہیں۔

مغرب کی طرف سفر کرتے وقت جتنی حکومتوں سے آپ گذریں گے اس لحاظ سے کم و بیش سب کو ملتا ہوا پائیں گے۔ فرق صرف اتنا ہی ہوگا کہ ہر جگہ کی ایک خاص جنگلی زبان ہے لیکن تمام سجن اور سامن ہان[1] تو شاستر اور ہانتو زبان کے مطالعے میں لگے رہتے ہیں۔

فاہیان نے مع اپنے ساتھیوں کے یہاں ایک مہینہ اور کچھ دن گرمیوں کا زمانہ کاٹا۔ پھر چل کھڑا ہوا اور شمال و مغربی سمت پندرہ دن کے سفر کے بعد وہ اوئی کے ملک میں جا پہنچا۔

---

[1] ہندو زبان یعنی پالی، ماگھی یا سنسکرت۔

اوئی کے ملک کے سنگ بھی کوئی چار ہزار کے قریب ہیں اور سب کے سب سیاؤ چنگ اصول کو مانتے ہیں اور بڑے راسخ العقیدہ ہیں۔ تھبین کے ملک کے شامن جو اس ملک میں آنکلتے ہیں ان سنگوں کی رسوم پر چلنے کو تیار ہیں۔ فاہیان کو جب پروانۂ راہداری مل گیا تو وہ حاکم وقت کوانگ سن کی چھاؤنی کی طرف چل پڑا جس نے اسے کچھ دن اوپر دو مہینے روک کے رکھا۔ وہ پھر پاؤین اور باقیماندہ ساتھیوں کے پاس واپس چلا آیا۔ ان سب نے معلوم کیا کہ ملک اوئی کے باشندے اخلاق اور انصاف سے بے بہرہ ہیں اور مسافروں کے ساتھ بھی کچھ بھلا برتاؤ نہیں کرتے۔ اس لئے چیان، ہوئی کیان، اور ہوئی وی نے کاؤ چھنگ کے ملک کی سیدھی راہ لی تاکہ وہاں سے اپنے سفر کے لئے مدد حاصل کریں۔ فاہیان اور دیگر ہمراہیوں کو پروانہ مل گیا۔ کوانگ سن نے رسد کا انتظام کر دیا۔ اب وہ اس قابل ہو گئے کہ فوراً چل دیں۔ چنانچہ جنوب مغربی سمت کو روانہ ہوئے۔

جس ملک میں سے وہ گذر رہے تھے وہ صحرا اور غیر آباد تھا، دریا پار کرنا الگ مصیبت تھی۔ جو تکلیف انھوں نے اٹھائی دنیا میں اس کا ثانی نہیں۔ ایک مہینہ پانچ دن کے سفر کے بعد وہ کہیں یوتھیان جا کر پہنچے۔

## باب (۳)

### حکومت یوتھیان

یوتھیان کا ملک شاد و آباد ہے، باشندے خوش حال ہیں۔ سارے کے سارے بدھ مت کے پیرو ہیں اور یہی دھرم ہے جس کی بدولت انھیں فراغ اور اطمینان حاصل ہے۔ بیسیوں ہزار سنگ ان میں موجود ہیں جن میں سے بہت سے مہایان (تاچنگ) اصول پر کاربند ہیں۔ سب کے سب مل جل کر ساتھ ہی کھاتے ہیں۔ ملک کے باشندے تاروں کی طرح دور دور بکھرے ہوئے مکان بناتے ہیں اور دروازے کے سامنے ایک ستھوپا (ٹوپ؟) کھڑا کرتے ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹا ستھوپا کوئی ساڑھے چھ ہاتھ کا ہوتا ہے۔ وہ مربع شکل کے وہارے بناتے ہیں جس میں مسافروں کو

ٹھہرایا جاتا ہے اور ان کی اچھی طرح خاطر و مدارات کی جاتی ہے۔

اس ملک کے حاکم نے فاہیان اور اس کے ساتھیوں کو سنگ کیالن دنگ دھارا میں ٹھہرایا۔ اس سنگ کیالن (دھرم شالہ، خانقاہ) کا نام گوماتی ہے۔ اس میں تین ہزار سنگ رہتے ہیں جو مہایان (ماچنگ) اصول پر چلتے ہیں۔ گھنٹے کی آواز پر سب جمع ہو کر ساتھ کھاتے ہیں۔ بھوجن کرنے کی جگہ پر جب وہ آتے ہیں تو ان کے چہرے متین اور سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ ہر ایک اپنے مرتبے کے مطابق ترتیب وار چپ چاپ بیٹھ جاتا ہے۔ کیا مجال جو ان کے کٹوروں یا تھالوں کی آواز تو آئے۔ یہ بھلے مانس کھانے میں ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے، ہاں انگلیوں سے اشارے کر لیتے ہیں

ہوئی کنگ، تاؤچنگ اور ہوئی تھا پہلے ہی سے چل پڑے اور اپنے قدم کی چھا (کاشغر) کے ملک کی طرف بڑھائے۔ فاہیان اور اس کے دوسرے رفیق جو مورتیوں کے جلوس دیکھنے کو بے قرار تھے کچھ دن اور تین مہینے وہیں پیچھے رہ گئے۔ اس ملک میں جو وہ بڑے بڑے سنگ کیالن ہیں اور چھوٹے کا شمار تو نا ممکنات سے ہے۔ چوتھے مہینے کی پہلی تاریخ کو شہر کے تمام بازاروں میں جھاڑو دی جاتی اور چھڑکاؤ کیا جاتا ہے۔ سڑکوں اور چوکوں کی آئینہ بندی کی جاتی ہے۔ شہر کے دروازے کے سامنے شامیانے تان دئے جاتے اور پردے لٹکا دئے جاتے ہیں اور خوب شان کے ساتھ سجاوٹ کی جاتی ہے۔ راجہ، رانی اور دوسری ذی عزت عورتیں یہاں آکر ٹھہرتی ہیں۔ گوماتی دھارے کے شامن کی جو مہایان اصول پر چلتے ہیں راجہ بہت عزت کرتا ہے اور یہی مورتیوں کے جلوس میں نمایاں حصہ لیتے ہیں۔ شہر سے تین چار لی کے فاصلے پر مورتی کے لئے ایک چار پہیوں کا رتھ بنایا گیا ہے جو بیس اکیس ہاتھ اونچا ہے اور چلتی ہوئی نولکنڈی کی نولکنڈی ہے۔ سات بیش قیمت چیزوں، شامیانوں اور پردوں اور ریشمی غلافوں سے سجا ہوا ہے۔ بیچوں بیچ بدھ کی مورتی براجمان ہے۔ دونوں طرف دو فوسا ہیں اگر دا گرد اور عقب میں دوسرے دیوتاؤں کی مورتیاں ہیں۔ یہ سب کی سب سونے چاندی کی بنی ہیں اور جواہرات جڑے ہیں۔ جب مورتی شہر کے دروازے سے سو قدم پر آ پہنچتی ہے تو راجہ اپنا راج مکٹ اتار کر، نیا جوڑا پہن کر ننگے

پاؤں آگے بڑھتا ہے اور اپنے ہاتھ میں "دھوپ" اور پھول لئے اپنے حشم و خدم کے ساتھ شہر کے باہر نکل کر مورتی کے سامنے ہولیتا ہے۔ اپنے تئیں مورتی کے چرنوں میں گرا دیتا ہے، اس کی پوجا کرتا ہے۔ دھوپ دیتا اور پھول چڑھاتا ہے۔ جوں ہی مورتی شہر کے دروازے میں داخل ہوتی ہے استریاں اور جوان بالیاں پھاٹک کے کوٹھوں سے ہر چہار طرف سے طرح طرح کے پھولوں کی بوچھار کر دیتی ہیں یہاں تک کہ سارا رتھ پھولوں سے ڈھک جاتا ہے۔ ہر رسم کے لئے قسم قسم کے رتھ ہیں اور ہر ایک سنگ کیالن کا مورتی کے جلوس کے لئے ایک خاص دن ہے۔ یہ رسم چوتھے مہینے کی پہلی تاریخ کو شروع ہوتی ہے اور مورتیوں کا جلوس چودھویں تاریخ کو ختم ہوتا ہے اور راجہ اور رانی رنواس کو رخصت ہوتے ہیں۔

شہر سے کوئی سات آٹھ لی کے فاصلے پر ایک سنگ کیالن ہے جو "راجہ کا نیا تسوالہ" کے نام سے مشہور ہے اس کے بننے میں اسّی برس لگے اور تین راجہ یکے بعد دیگرے اس کے تمام کرنے میں تمام ہوئے۔ یہ کوئی تراسی چو راسی گز اونچا ہے، سونے چاندی کی گل کاریاں اور مورتیاں بنی ہوئی ہیں۔ سنفوپا بنانے کے لئے بہت بیش قیمت مسالہ مہیا کیا گیا ہے۔ فو (بدھ) کے لئے ایک گھوڑا بنایا گیا ہے اور اس کو بڑی خوبی سے آراستہ کیا ہے۔ کڑیاں، کھمبے، نہ ہونے والے کیواڑ، جالیاں سب کی سب سونے سے منڈھی ہیں۔ سنگوں کے لئے الگ الگ کوٹھریاں ہیں اور ایسی خوبصورتی سے اعلیٰ پیمانے پر آراستہ کی گئی ہیں کہ الفاظ اس کو ادا نہیں کر سکتے۔ چھ راجوں کے راجہ جن کی حکومتیں سلسلۂ کوہستان کے مشرق میں واقع ہیں ہر قیمتی چیز جو ان کے قبضے میں ہے بطور نذر یہاں بھیجتے ہیں اور ایسی دریا دلی سے دان دیتے ہیں کہ اپنے پاس نام ہی کو کچھ رہ جاتا ہے۔

## باب (۴)

تسو ہو کا ملک۔ کوہستان تسونگ لنگ۔ یو ہوئی کا ملک۔

چوتھے مہینے مورتیوں کے جلوس کی رسم ختم ہو گئی رسینگ شاؤ تنہا ایک تاؤجن کے ہمراہ

کینین کو چلا۔ فاہیان بقیہ ہمراہیوں کے ساتھ تسوہو کے ملک کی جانب روانہ ہوا۔ وہ پچیس دن تک سفر کرتے رہے اور آخر کو اس ملک میں پہنچ گئے۔ بادشاہ عقیدے کا پکا ہے۔ اس ملک میں تقریباً ایک ہزار سنگ ہیں جو زیادہ تر مہایان کے پیرو ہیں۔ مسافروں نے وہاں پندرہ دن آرام لیا اور پھر جنوب کی طرف روانہ ہوئے۔ چار دن چلنے کے بعد تسونگ لنگ کے پہاڑوں میں داخل ہوئے اور یوہوئی کے ملک میں پہنچے۔ یہاں وہ ٹھہر گئے۔ ذرا تازہ دم ہو کر انھوں نے پھر چلنا شروع کیا اور پچیس دن میں کیھچا کے ملک میں پہنچ گئے۔ یہاں وہ ہوئی لنگ اور دوسرے لوگوں سے پھر آملے۔

## باب (۵)

### کیھچا کا ملک

کیھچا کا راجہ پنجی یوسی (پنج ورش) منا رہا تھا۔ پنجی یوسی کے معنی چینی زبان میں پنج سالہ مہاسبھا کے ہیں۔ اس سبھا کے زمانے میں شامن تمام اطراف واکناف سے مدعو کئے جاتے ہیں۔ وہ خوب دھوم دھام سے بادلوں کی طرح امنڈ کر آتے ہیں۔ شامن جہاں بیٹھتے ہیں وہاں پردے، جھنڈیاں اور شامیانے لگائے جاتے ہیں۔ ایک سنگھاسن تیار کیا جاتا ہے اور اس کو سونے چاندی کے کنول کے پھولوں سے سجایا جاتا ہے۔ اس کے نیچے شاندار نشستیں ترتیب دی جاتی ہیں۔ وہاں راجہ اور اس کے منتری بدھ دھرم کے مطابق پوجا کرتے جاتے ہیں۔ یہ تقریب دو تین مہینے تک رہتی ہے اور عام طور پر بہار کے موسم میں ہوا کرتی ہے۔ جب راجہ سبھا سے اٹھتا ہے تو اپنے منتریوں کو حکم دیتا ہے کہ اب پوجا کرنے کی ان کی باری ہے۔ ان میں سے بعض کو ایک دن لگتا ہے، بعض کو دو دن، بعض کو تین دن اور اکثر کو پانچ دن بھی لگتے ہیں۔ جب سب پوجا سے فارغ ہو جاتے ہیں تو راجہ اپنی سواری کا گھوڑا مع اس کی زین اور لگام کے اور اپنی ریاست کے سب بڑے بڑے کارباریوں اور دوسرے بڑے لوگوں کے گھوڑے، تمام قسم کا پشمینہ، بڑھیا چیزیں اور جو جو چیزیں شامنوں کو مطلوب ہوتی ہیں ان کے حوالے کرتا ہے۔ تمام منتری عہد کرتے ہیں اور دان دیتے ہیں۔ پھر سنگھوں سے وہ تمام چیزیں دام دے کر خرید لیتے ہیں۔

یہ ملک ٹھنڈا اور پہاڑی ہے۔ سوائے گیہوں کے دوسرے غلے پیدا نہیں ہوتے۔ جیسے ہی شامنوں کو ان کے سالانہ سنگ کا اناج مل جاتا ہے مطلع چاہے کیسا ہی صاف کیوں نہ ہو ابر آلود ہو جاتا ہے اس لئے راجہ ان سے التجا کرتا ہے کہ جب تک فصل پک کر تیار نہ ہو جائے وہ اپنا اناج کا سالانہ حق نہ لیں۔ اس ملک میں بدھ کا اگالدان ہے۔ یہ پتھر کا بنا ہے اور اسی رنگ کا ہے جس رنگ کا بدھ کا کمنڈل۔ یہاں بدھ کا دانت بھی ہے۔ اس ملک کے باشندوں نے اس کی تعظیم و حرمت کے لئے ایک ٹوپ بنوایا ہے۔ یہاں ایک ہزار سے زیادہ سنگ ہیں جو سب کے سب ہین یان اصول پر چلتے ہیں۔

ان پہاڑوں کے پورب میں لوگ موٹے جھوٹے کپڑے پہنتے ہیں جو چین کے باشندوں کی وضع کے ہوتے ہیں۔ فرق صرف نمدے اور اون کی بناوٹ کا ہوتا ہے۔ شامن دھرم کے مطابق دعا کے گردوں کا استعمال کرتے ہیں اور یہ گردے اتنی قسم کے ہوتے ہیں کہ ان کا بیان کرنا محال ہے۔

یہ ملک کوہستان تسونگ لنگ میں ہے۔ ان پہاڑوں سے جنوب کی طرف کے درخت اور میوے یہاں سے بالکل مختلف ہیں۔ بانس، انار اور گنا یہ تین ایسے پودے ہیں جو مثل چین کے پودوں کے ہوتے ہیں۔

## باب (۶)

کوہستان تسونگ لنگ۔ دائمی برف۔ شمالی ہند۔ تھولی راج۔ می لی نوسا کا بت

کیچھا سے مغرب کی طرف شمالی ہند ہے۔ کوہستان تسونگ لنگ پار کرنے میں ایک مہینہ لگتا ہے۔ ان پہاڑوں پر تمام سال برف پڑتی ہے اور یہاں ایسے زہریلے اژدہے پائے جاتے ہیں کہ اگر ان کا شکار چھٹ جائے تو اس کو پھنکار سے فنا کر دیتے ہیں۔ ہوا، مینہ، برف، آندھی اور پہاڑ مسافروں کا راستہ روکتے ہیں۔ یہ ایسی دشواریاں ہیں کہ اگر دس ہزار مسافر ادھر آنے کی ہمت کریں تو مشکل سے ایک زندہ بچ سکتا ہے۔ اس ملک کے باشندے برفستانی کہلاتے ہیں۔

اس سلسلۂ کوہ کو عبور کرنے کے بعد شمالی ہند پہنچتے ہیں۔ اس ملک کی سرحد پر پہنچتے ہی تھولی راج ملتا ہے جہاں کے تمام سنگ ہن یان کے اصول پر چلتے ہیں۔ اگلے زمانے میں یہاں ایک لوہان (بزبان سنسکرت ارہان) رہتا تھا۔ وہ اپنے کشف و کرامات سے ایک صناع کو تیوشو (توشیتا) آسمان پر لے گیا کہ وہاں جاکر (بدھی ستوا میترپا[1]) کا قد و قامت، ناک و نقشہ اچھی طرح دیکھے اور پھر واپس آکر اس کا ہم شکل کاٹھ کا پتلا بنائے۔ صناع تین مرتبہ اس کا مطالعہ کرنے آسمان پر گیا اور پھر واپس آکر اس نے چھبیس گز اونچا پتلا بنایا جس کا پاؤں چار کعب کز تھا۔ تہوار کے دن اس پتلے میں سے روشنی نمودار ہوتی ہے۔ اس ملک کے راجا اس کی سچے دل سے پرستش کرتے ہیں۔ یہ اس نواح میں اب تک موجود ہے۔

## باب (۷)

### دریائے سن تھو (سندھ)

وہ اس سلسلۂ کوہ کے جنوب کی جانب پندرہ دن تک چلتے رہے۔ راستہ کٹھن ہے۔ جگہ جگہ اوگھٹ گھاٹیاں ہیں۔ ان پہاڑوں میں سیدھی دیوار نما ڈھائی تین ہزار اونچی چٹانیں ہیں ان پر پہنچنے سے آنکھیں تیوا جاتی ہیں۔ ان پہاڑوں کو عبور کرنے میں اگر مسافر کا پاؤں پھسل جائے تو دنیا میں اسے کوئی نہیں بچا سکتا۔

ان پہاڑوں کے دامن میں ایک دریا ہے جسے سن تھو (سندھ) کہتے ہیں۔ اگلے وقتوں میں لوگوں نے ان چٹانوں کو کاٹ کر راستہ نکالا ہے اور سات سو سیڑھیوں کا ایک زینہ تراشا ہے۔ اس زینے سے اتر کر دریا کو رسّوں کے پل سے پار کرتے ہیں۔ اور دریا کی چوڑائی اسّی قدم ہے۔ ہن خاندان کے زمانے میں اپنی سیاحت میں نہ تو چنگ کھیان نہ کان ہنگ اس جگہ پہنچے جس کا حال دفتر خارجیہ کے مترجموں نے دیا ہے۔

---

[1] میترپا کے معنی ابن حسن۔

سنگوں نے فاہیان سے پوچھا کہ بدھ مت مشرق میں کب سے شروع ہوا۔ فاہیان نے جواب دیا کہ میں نے اس ملک کے باشندوں سے معلوم کیا ہے اور انھوں نے مجھے باور کرایا ہے کہ قدیم رِوایات کے بموجب می لی فوسا کا بت تیار کئے جانے کے بعد ہند کے شامنوں نے اس دریا کو عبور کیا اور اپنے ساتھ مقدس کتابوں اور جمیع احکامات کو لیتے گئے۔ یہ بت فو (بدھ) کے نی ہوان (نروان) کے تین سو برس بعد کھڑا کیا گیا تھا۔ اگر اس زمانے کا حساب لگایا جائے تو جیو خاندان کے فنگ ونگ کے عہد حکومت کے قریب ہوتا ہے۔ اس لئے ہم کو ماننا پڑتا ہے کہ بدھ دھرم کی تبلیغ اس بت کی تیاری کے وقت سے شروع ہوئی۔ اس مہا تما میتریا کی مدد کے بغیر کون شاکی کیا (ساکھیامنی) کی تپسیا کو سپھل اور اس کے دھرم پر عمل کرا سکتا تھا اور تر رتن کا گیان سنسار کے اس سرے تک کے باشندوں میں کون پھیلا سکتا تھا؟ اور کون ان کو بدھ مت صدق و یقین کے ساتھ بتلا سکتا تھا؟ یہ انسان کے بس کی بات نہ تھی اور ہن خاندان کے منگتی کا خواب ایسا نہ تھا۔

## باب (۸)

### (اوڈیانا) اوچنگ راج ۔ فو کا نشان قدم

اس دریا کو عبور کر کے اوچنگ راج میں داخل ہوتے ہیں۔ اوچنگ راج ہندوستان کا سب سے شمالی حصہ ہے۔ یہاں متوسط ہند کی بولی بولی جاتی ہے۔ متوسط ہند مدھ دیش رج کہلاتا ہے۔ یہاں لوگوں کے لباس اور طریقۂ زندگی مدھ دیش والوں کے سے ہیں۔ مدھ دیش رونق پر ہے۔ جہاں جہاں سنگ ٹھہرتے ہیں سنگ کیالن موجود ہیں۔ یہاں کوئی پانسو سنگ کیالن ہیں سب کے سب ہین یان طریقے کے ماننے ماننے والے ہیں۔ اگر کوئی مسافر یا پی کیو (بھکشو) یہاں پہنچتا ہے تو اس کی بہت آؤ بھگت کرتے ہیں اور اس کو تین دن مہمان رکھتے ہیں اور تین دن بعد اس سے کہہ دیا جاتا ہے کہ کوئی اور ٹھکانا تلاش کرے۔

روایات جن میں فو کے شمالی ہند کے سفر کا حال مذکور ہے ان میں اسی حصۂ ملک کا ذکر کیا گیا ہے۔ بدھ نے اپنے قدم کا نشان یہیں چھوڑا ہے۔ اس نقش قدم کی لمبائی چوڑائی ان لوگوں کے خیال کی وسعت کے مطابق ہے جنھوں نے اس کے متعلق کچھ سوچا ہے اور یہ بات اب تک قائم ہے۔ وہ پتھر جس پر بدھ نے

اپنے کپڑے سکھائے تھے اور وہ جگہ جہاں اژدہوں کی صورت تبدیل کر دی تھی اب تک موجود ہیں۔ یہ پتھر وئی چار گز اونچا اور سات گز چوڑا ہے اور ایک طرف سے چکنا ہے۔ ہوئی کنگ، تاؤ چنگ اور ہوئی تھا یہ تینوں سنگ ناکی ڈنگو، راج کی طرف جہاں بدھ کی پرچھائیں ہے پہلے سے روانہ ہوئے۔ فاہیان اور دوسرے ساتھی اس ریاست میں کچھ دنوں ٹھہرے اور جب ان کا زمانۂ قیام ختم ہوا تو وہ جنوب کی طرف سوہونو کی جانب چل پڑے۔

## باب (۹)

### سوہوتو راج

سوہوتو راج میں بھی بدھ دھرم رونق پر ہے۔ قدیم زمانے میں آسمانی شہنشاہ شائی (اندر) نے نوسا (بدھ ستوا) کا امتحان لیا۔ اپنے تئیں ایک باز اور فاختہ کے روپ میں ظاہر کیا۔ نوسا نے فاختہ کو چھڑانے کے لئے اپنا گوشت کاٹ کر حوالے کیا۔ جب بدھ نے دھرم کو کامل کر لیا وہ اپنے چیلوں کے ساتھ اس مقام سے گذرا اور ان سے کہا کہ اس جگہ کو دیکھ لو جہاں میں نے اپنا گوشت فاختہ کو چھڑانے کے لئے کاٹ کر دیا تھا۔ ملک کے باشندوں نے اس واقعے کو اس طرح جانا اور اس جگہ ایک ٹوپ تیار کیا اور اس کو سونے چاندی سے سجایا۔

## باب (۱۰)

### کھیان تو وی راج

سوہوتو سے پورب کی جانب چلے۔ پانچ دن تک رستہ چلتے رہے تب کھیان تو وی راج میں جا کر پہنچے۔ یہاں آیو داشو کا بیٹا فائی راج کرتا تھا۔ جب بدھ بدھستوا تھا تو اس نے اپنی آنکھیں اس جگہ دان میں دی تھیں۔ یہاں بھی لوگوں نے ایک ٹوپ بنا دیا ہے اور اس کو سونے چاندی سے آراستہ کیا ہے۔ اس ملک کے بہت سے باشندے ہین یان پر چلتے ہیں۔

# باب (۱۱)

## چوشاشی لوراج (ٹیکشاسلا ٹیکسلا راج) فاقہ زدہ شیر

کیان تھی لوراج سے مشرق کی طرف سات دن کے راستے پر چوشاشی لوراج ہے چینی زبان میں اس لفظ کے معنی سر بریدہ کے ہیں۔ بدھ جب بدھستوا تھا تو اس نے اس مقام پر اپنا سر کاٹ کر خیرات میں دیا تھا اس لئے اس ملک کا یہ نام پڑ گیا۔ ذرا اور پورب کی طرف چل کر ایک مقام ہے جہاں بدھ نے اپنا جسم ایک بھوکے شیر کے حوالے کر دیا تھا۔ ان دونوں جگہوں پر بڑے بڑے ٹوپ بنائے گئے ہیں اور ان کو بیش قیمت اشیا سے سجایا گیا ہے۔ ان ریاستوں کے راجا، منتری اور دوسرے آدمی اس جگہ پر نذر و نیاز چڑھانے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھول چڑھانا اور خوشبوئیں جلانا کسی وقت بند نہیں ہوتا۔ اس ٹوپ اور دوسرے دو ٹوپوں کو جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اس ملک کے باشندے چار مہا ستھوپا کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

---

# غزل

از مصورِ جذبات حضرت ثاقبؔ لکھنوی مدظلہٗ

(بہ تقلید حضرت ذوقؔ دہلوی)

اس کے در سے روک کر مجھ کو کوئی کیا پائے ہے
نامرادوں کو بھی اک دن مدعا مل جائے ہے

لاکھ میں اس کو سنبھالوں پھر بھی تڑپا جائے ہے
کیا کہوں اس سے دلِ ایسوں کو کوئی بہلائے ہے

اک نہ اک دن آ ہی جائے گا ترس ظالم کو بھی
دل کی صورت اب تماشہ بھی پلٹتا جائے ہے

شوقِ دیدار تجلی دل سے دیکھیں کیا کرے
آنکھ یہ کھولے ہے اور وا دیکھ کر غش آئے ہے

دید کے قابل نہیں ہے صورت انجام کار
تم سے کیوں کر زخم میرے دل کا دیکھا جائے ہے

خاطرِ غم تا کجا یہ میہماں تو رات دن
یا لہو دل کا پیے ہے یا کلیجا کھائے ہے

وادیِ پرخار الفت سے گزرنا ہے محال
لاکھ ہمت باندھیے دل ہے کہ بیٹھا جائے ہے

میں نہ روؤں کس لئے اور وہ نہ تڑپے کس لئے
جتنی طاقت دل میں ہے اتنا مجھے بہلائے ہے

بزم کی راحت دہی ہیں شمع کی محنت کو دیکھ
کیا یونہی سر کا پسینا پاؤں تک آ جائے ہے

سب شریک دور ہیں ثاقبؔ مگر تقدیر سے
ایک ساغر کے لئے ساقی مجھے ترسائے ہے

---

# غزل

ہوئی صبح کیا شام غم کٹ گئی ہے
خلش درد دل کی بہت گھٹ گئی ہے

نظارہ دم ذبح کرلے تو مرنا
کہ زلف ان کے چہرے سے کچھ ہٹ گئی ہے

وہی رات میری وہی رات ان کی
کہیں بڑھ گئی ہے کہیں گھٹ گئی ہے

کدھر میں رہوں گا کدھر دل رہے گا
لحد ظلم احباب سے پٹ گئی ہے

جدائی میں جس کو مٹاتی ہے فرقت
وہ عمر رواں پہلے ہی کٹ گئی ہے

میں بیدار ہوں سو رہا ہے مقدر
وہ نینداب نہ آئے گی جو بٹ گئی ہے

غم دل کی روداد پوچھو نہ ثاقب
اسی حال میں زندگی کٹ گئی ہے

---

# مسلمانوں کی علمی ترقی پر ایک نظر

خلیفہ ماموں رشید کا زمانہ اسلامی تاریخ میں سب سے زیادہ شاندار زمانہ مانا جاتا ہے اور ہر قسم کی علمی ترقیات کا گہوارہ سمجھا جاتا ہے۔ خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے میں جو بیت الحکمۃ قائم کیا گیا تھا وہ خلیفہ ماموں رشید کے زمانے میں علمی کمالات کا سرچشمہ بن گیا۔ اسی بیدار مغز خلیفہ کے زمانے میں محمد ابن موسیٰ نے زمین کی پیمائش کی۔ الفیدی نے یونانی فارسی اور سنسکرت کی فلسفہ طب اور ریاضی کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا اور ان پر حواشی لکھے۔ بغداد کی علمی تحقیقات کی یہ خصوصیت تھی کہ ابتدا ہی سے معقول کے اصول پر تنقید شروع کی گئی یعنی وہ کسی چیز کو بغیر مشاہدے اور تجربے کے صحیح تسلیم نہیں کرتے تھے اور کلام مجید کی اس تعلیم کی کہ مناظر فطرت اور مظاہر قدرت کی تحقیقات معرفت الٰہی کا وسیلہ ہے اور پیغمبر خدا صلعم کے اس ارشاد کی کہ خدا نے قوت ممیزہ سے بہتر کوئی چیز پیدا نہیں کی پورے طور پر تعمیل کرتے تھے چنانچہ انھوں نے کلام مجید کی تفاسیر بھی انھیں اصول پر تحریر کیں۔ علمی تحقیقات کا ایک علیحدہ محکمہ تھا جو "اخوان الصفا" کہلاتا تھا اور جس کے چالیس ممبر تھے۔ قانون کشش اجسام جس کا سہرہ "نیوٹن" کے سر پر باندھا گیا وہ بقول فاضل ڈریپر عرب والے صدیوں پہلے دریافت کر چکے تھے مگر متاخرین کی تنگ نظری اور تعصب کی وجہ سے وہ اس قابل قدر دریافت کی عزت سے محروم ہو گئے۔ الفارابی اور ابوبکر الرازی فلسفے اور طب کے بڑے رکن مانے جاتے ہیں اور حسن ابن حسین نے علم ساحت میں جو باتیں دریافت کیں وہ آج یورپ میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جا رہی ہیں مگر ہم مسلمانوں کو ان کے نام تک معلوم نہیں۔ علامہ ابن خلدون کے نام سے اکثر تعلیم یافتہ مسلمان واقف ہونگے۔ وہ لکھتے ہیں کہ فخر الدین الرازی اور الغزالی نے علم دینیات میں اول مرتبہ منطق کا استعمال کیا اور الغزالی نے مذاہب کی سائنس پر ایک بیش بہا کتاب لکھی جس کا مضمون حکیم ڈیکارٹ کی کتاب "ڈسکورس سولا میتھوڈے" سے جو کہ بعد میں لکھی گئی اس قدر ملتا جلتا ہے کہ حکیم موصوف کی

کتاب الغزالی کا ترجمہ معلوم ہوتی ہے۔ مسٹر ایسکیلنگر کے خیال کے مطابق علم طب کے سیکھنے کے لئے ابی سینا کی کتابوں کا مطالعہ کرنا لازمی ہے۔ حاجی خلیفہ نے مسلمانوں کی تاریخی تصانیف کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی تعداد سو سے بھی زیادہ تھی۔ جغرافیے کے علم میں بھی مسلمانوں نے کمی نہیں کی۔ قدامہ نے علم جغرافیہ پر اول اول کتابیں لکھیں۔ جرمن فاضل محقق وان کریمر کا بیان ہے کہ قدامہ کو زمین کے گول ہونے کا بھی علم تھا اور قطبین کے لیل و نہار کی لمبائی بھی معلوم تھی۔ اسی فاضل محقق نے مقدسی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ جغرافیے کے علم میں سب پر سبقت لے گیا تھا۔ خلفائے مصر و اندلس کے یہاں بھی علم و ہنر کا ایسا ہی چرچا تھا اور خاص کر اندلس میں علم کی گرم بازاری بغداد سے کسی طرح کم نہ تھی۔ زہراوی نے جو علم جراحی پر کتاب لکھی وہ اب تک موجود ہے اور یورپ کے طبیب اس سے بے شمار فائدے اٹھا رہے ہیں۔ علامہ ابن رشد کو طب فلسفہ اور فقہ میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ جزیرۂ سسلی بھی مسلمانوں نے فتح کر لیا تھا اور وہاں کے حاکم کے دربار میں ادریسی ایک بہت بڑا جغرافیہ داں تھا جس نے بادشاہ کے استعمال کے لئے ایک چاندی کا کرہ بنایا تھا جس میں سونے کے حروف میں اس زمانے کے ممالک کے نام درج کئے گئے تھے۔ اس زمانے کے علمی ذوق کا اندازہ محض اس بات سے ہو سکتا ہے کہ صرف شہر بغداد میں تیس سے زیادہ کالج قائم تھے جن میں دار الاقامہ بنے ہوئے تھے اور معلمین و متعلمین کو کالج ہی کی طرف سے علاوہ تنخواہ و وظائف کے کھانا اور کپڑا وغیرہ بھی ملتا تھا۔ اندلس میں کم و بیش ستر کتب خانے اس وقت میں تھے جبکہ چھاپا ایجاد نہیں ہوا تھا اور زر کثیر صرف کر کے برسوں کی محنت میں ایک کتاب تیار ہوتی تھی۔ خلیفہ الحاکم ثانی کے کتب خانے کی نامکمل فہرست چالیس جلدوں میں تیار ہوئی تھی اور اکثر رؤسا کے کتب خانے ان کے مکانوں پر علیحدہ ہوتے تھے اور یہی نہیں کہ مسلمانوں کی ان علمی سرگرمیوں سے صرف مسلمان ہی فائدہ اٹھاتے ہوں بلکہ ان کے چشمۂ فیض سے تمام دنیا کی قومیں مستفیض ہوتی تھیں جن میں قوم یہود خاص طور پر قابل ذکر ہے کیونکہ اولاً مسلمانوں نے اس قوم کو مسیحیت کے جور و تشدد سے رہائی دلائی اور ثانیاً مسلمانوں کے زوال کے بعد اسی قوم کے ذریعے سے اسلامی تہذیب علوم اور فلسفہ یورپ کی مسیحی اقوام کو پہنچے۔ مسٹر ڈبلیو۔ جی۔ ڈے برگ نے اپنی کتاب

"دی لگیسی آف دی اینشینٹ ورلڈ" کے صفحات ۳۷۶,۳۷۷ پر لکھا ہے کہ "عربی فلسفے کی تخلیق خلفائے بغداد کے آغوش میں آٹھویں صدی میں ہوئی جو بارھویں صدی میں خلفائے قرطبہ کے زیر سایہٴ عاطفت اپنے عہدِ شباب کو پہنچ گیا...... لیکن قرطبہ میں خلفائے بنی امیہ کے زوال کے بعد مسلمانوں کی تنگ خیال جماعت کی مخاصمت نے اس کو عین شباب میں زندہ درگور کر دیا، مگر پیشتر اس کے کہ اسلامی فلسفے کا لہلہاتا باغ باد سموم کے جھونکوں سے پنجۂ خزاں کا شکار ہو اس کے سرسبز اور شاداب پودے دوسری قوم کے ہاتھ لگ گئے۔ عربوں نے یہودیوں کو فلسفے کا سبق سکھایا جس کو وہ کبھی نہیں بھولے اور انھوں نے اسی اسلامی فلسفے کے نونہالانِ چمن کو نشو ونما دے کر ان کے خوشبودار پھولوں سے بہارستانِ مسیحیت کو مہکا دیا کیونکہ عہدِ وسطیٰ میں یہودی نہ صرف مالیات اور تجارت ہی میں وساطت کا کام کرتے تھے بلکہ انھوں نے علم و تہذیب کے توسل و انتقال کے کام میں بھی بہت بڑا حصہ لیا ہے۔"

مسٹر برکس آدم نے اپنی کتاب "دی لا آف سویلیزیشن اینڈ ڈِکے" کے باب ۴ "پہلی صلیبی جنگ" میں تحریر کیا ہے کہ "گیارھویں صدی میں جبکہ پیرس دریائے سین کے جزیروں پر چند جھونپڑیوں کا مجموعہ تھا اور ڈیوک آف نارمنڈی اور شاہ انگلستان کا محل ایک ادنیٰ درجے کا سفید مینار تھا، قاہرہ ایسے اعجوبہ کمالات سے مزین کیا جا رہا تھا جن کو دنیا اب تک قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ جس وقت اسقف اعظم گربرٹ پر بسبب علم مساحت کے جاننے کے جو اس نے بارسلونا اور قرطبہ کے عربی مدرسوں میں حاصل کیا تھا، سحر و ساحری کا الزام لگایا جا رہا تھا، خلیفہ عزیز باللہ نے قاہرہ کی جامع قائم کی جو مسلمانوں کی سب سے بڑی درسگاہ تھی اور جو جامع پیرس کی تعمیر سے دو سو برس قبل جاری ہو چکی تھی اور جس میں بارہ ہزار طالب علم درس پاتے تھے۔ مسٹر منک کی یہ رائے ہے کہ ابن رشد نے عربی فلسفے میں چار چاند لگا دیئے...... خلیفہ ہارون رشید کی عظمت و شان اس وقت تک ضرب المثل چلی آتی ہے..... اس کے زمانے میں بھی صنعت و حرفت میں اس قدر ترقی ہو گئی تھی کہ اس نے شارلین کو ایک گھڑی تحفے میں بھیجی تھی۔ ہمبالٹ نے موجودہ عملی علوم منحصر بہ تجربہ (امپیریکل مینٹل سائنس) کا بانی عرب والوں کو بتلایا ہے۔ وہ نہایت ہوشیار کیمیا داں تھے کیونکہ وہ پارے اور دوسری دھاتوں کی کیمیاوی

ترکیب کے علاوہ گندھک اور شورے کے تیزابوں کی کیمیاوی ترکیب سے بھی واقف تھے بحیثیت طبیب
ہونے کے وہ یورپ کے مقابلے میں بدرجہا ترقی یافتہ تھے۔ جبکہ کلیسائے روم تعویذ گنڈے سے علاج کر رہا
تھا اور مجرب طریقوں کو خلاف مذہب سمجھتا تھا الرازی بغداد کے شفاخانوں کو چلا رہا تھا جس نے
دسویں صدی میں دس جلدوں میں ایک کتاب لکھی جو وینس میں ۱۵۱۰ء میں شائع ہوئی اور تمام
روئے زمین کے اطبا نے اس کی کتاب کا جو کھسرا اور چیچک کے متعلق ہے استعمال کیا...... وہ
نہایت مشہور ماہر تشریح تھا۔ جنگ صلیبیہ میں بہت سی مہلک متعدی بیماریاں پھیل گئی تھیں،
لیکن جس وقت مسیحی سپاہی مصری طبی سررشتے کے حفظان صحت کے قوانین کے پابند ہو گئے تو بیماریاں
دور ہو گئیں۔ عربوں کو علم ریاضی سے بہت زیادہ دلچسپی تھی اور بہت سی ان تحقیقات و ایجادات سے
بخوبی واقف تھے جو پندرھویں اور سولھویں صدی کے ماہر فلکیات سے منسوب کی جاتی ہیں۔
۱۰۰۰ء میں علم مثلث کروی (اسفیریکل ٹرگنامیٹری) کا استعمال ہوتا تھا اور ابوالحسن نے
مخروطات (کانک سکیشن) پر نہایت بیش قیمت کتاب لکھی ہے۔ ۸۳۳ء میں خلیفہ ماموں رشید نے بغداد
اور دمشق میں رصد گاہیں بنوا کر پلمیرا کے میدان میں ایک درجہ عرض البلد کو نپوایا تھا۔ تیرھویں صدی
تک عربی آلات سائنس مقابلتاً مکمل ہو چکے تھے۔ ان کے پاس اصطرلاب (ایسٹرولیب) ؟ (زامین)
سدس (سیکسٹینٹ) اور قطب نما (میرینرس کمپاس) موجود تھے اور ابوالوفا نے تیسرا قمری اختلاف
(تھرڈ لیونر ویریشن) ٹائکوبراہے سے چھ سو برس قبل دریافت کر لیا تھا۔ ان تمام صنعتی اور زراعتی ترقیات
کا مفصل حال بیان کرنے کے لئے جو عہد وسطیٰ کی صلیبی جنگوں کی وساطت سے حاصل ہوئیں ایک
علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔ مختصراً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مغرب نے جو کچھ علم و ہنر میں سیکھا وہ روضۂ مسیح کی راہ
میں سیکھا۔ دمشق کا فولاد ایک ضرب المثل تھا اور دمشق کے ظروف ساز فرانس کے ظروف سازوں کے
استاد تھے۔ بارھویں صدی میں شام اور فارس کے پشمینے، کمخواب اور قالین مغربی باشندوں کے
لئے ویسے ہی باعث رشک و مایوسی تھے جیسے آج ہیں۔"

مسٹر آربیوتھ ناٹ اپنی کتاب "اے مینوئل آف عریبک ہسٹری اینڈ لٹریچر" کے صفحات ۹ و ۱۰

پر لکھتے ہیں کہ "ہسپانوی عرب علوم و فنون کے بے حد شوقین تھے۔ وحشی اقوام کے حملے کے بعد یورپ میں علم و سائنس کا قائم رہنا ایک بڑی حد تک انھیں کی بدولت ہے۔ محض عربوں ہی کے باعث اس زمانے میں جو "عہد تاریک" کے نام سے مشہور ہے روشنی قائم رہی ...... یورپ میں علوم و فنون کا دوبارہ زندہ ہونا عربی علما اور حکما کی تصانیف سے اور نیز ان مدرسوں سے جو انھوں نے ہسپانیہ اور اطالیہ کے مختلف حصوں میں قائم کئے خاص طور پر منسوب کیا جاتا ہے۔ بارھویں صدی عیسوی میں یورپ کے مختلف مقامات سے ان بیوت العلوم میں طالب علم درس کی خاطر آتے اور اپنے مقامات پر واپس جا کر ان علوم کو اپنے یہاں پھیلاتے تھے۔ اس وقت میں بہت سی عربی کتابوں کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا جس کے باعث سائنس کی ترقی میں آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ یورپ اور بہت سی سائنس کی شاخوں کے لئے بھی عربوں کا ممنون احسان ہے جس میں علم کیمیا (کیمسٹری) خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یورپ میں اول مرتبہ ان ہی نے کاغذ بنایا اور قالین اور فولادی و چرمی مصنوعات میں کوئی ان کا مد مقابل نہ تھا اور جبکہ قرطبہ کے عربی مدرسوں میں ریاضی، ہیئت، فلسفہ، علم النباتات اور طب نہایت کامیابی کے ساتھ سکھلائے جاتے تھے۔"

مسٹر بریفالٹ اپنی کتاب "میکنگ آف ہیومینٹی" کے صفحات ۱۹۰ تا ۲۰۲ پر یوں رقمطراز ہیں کہ "آکسفورڈ یونیورسٹی میں روجر بیکن نے عربی ادب اور عربی سائنس کی تعلیم انھیں لوگوں سے حاصل کی جو عربوں کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کر چکے تھے۔ تجربی طریقوں (ایکسپیریمنٹل متھڈس) کی ایجاد کا فخر نہ تو روجر بیکن کو حاصل ہے اور نہ اسکے بعد آنے والے ہمنام کو۔ روجر بیکن کی شخصیت مسیحی یورپ کے لئے اسلامی سائنس اور طریق عمل کے ایک پیغامبر سے زیادہ نہیں اور اس نے ہمیشہ اس بات کا بانگ دہل اعلان کیا کہ عربی زبان اور عربی سائنس کی تعلیم ہی اس کے ہمعصروں کے واسطے حقیقی علم حاصل کرنے کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ اس بات کی تحقیقات کے مباحثے کہ تجربی طریقوں کا موجد کون تھا ان معرکۃ الآرا غلط بیانیوں میں سے ایک غلط بیانی تھی جو یورپ کی تہذیب کے مبدا کے متعلق کی گئیں۔ عربوں کا ایجاد کردہ تجربی طریقہ بیکن کے زمانے سے پہلے ہی یورپ کے طول و عرض میں اپنا

سکہ جما چکا تھا جس کو لوگ انتہائی ذوق کے ساتھ سیکھتے تھے۔"

"اسلامی تہذیب کا سب سے زیادہ شاندار تر کہ جو دورِ حاضرہ کو ملا ہے وہ سائنس ہے مگر اس کے ثمرات دیر میں ظاہر ہوئے۔ موروں کی تہذیب کے قعرِ گمنامی میں پڑ جانے کے بہت عرصے بعد وہی خورشید تاباں جس نے ان کی شائستگی کو نشو و نما دی تھی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ یورپ کی سرزمین پر شعاع ریز ہوا۔ یورپ کی مردہ رگوں میں جان ڈالنے والی صرف ایک اسلامی سائنس ہی نہیں تھی بلکہ اسلامی تہذیب کی اور دوسری لاتعداد خوبیوں نے یورپ کے جسم میں زندگی کے ابتدائی آثار پیدا کئے۔"

"یوں تو یورپ کی ترقی کا کوئی بھی ایسا پہلو نہیں جس میں اسلامی تہذیب کے آثار نہ پائے جاتے ہوں لیکن اس کا سب سے زیادہ بیّن اور شاندار اثر اس طاقت کی پیدائش میں نمایاں ہے جو دورِ حاضرہ کا مستقل طرّۂ امتیاز ہے اور اس کی کامیابی کا اعلیٰ ترین ذریعہ ہے یعنی علوم فطرت اور جذبہ تحقیق (نیچرل سائنس اینڈ سائنٹفک اسپرٹ)۔"

عربی سائنس کا ہماری سائنس پر محض یہی احسان نہیں ہے کہ اس کی بدولت انقلاب انگیز نظریات کی تعجب خیز ایجادیں ہوئیں بلکہ عربی تہذیب کا سائنس پر اس سے بدرجہا زیادہ یہ احسان ہے کہ سائنس کی ہستی ہی اس کی بدولت قائم ہے۔ زمانۂ قدیم کے لوگ سائنس سے قطعی نابلد تھے۔ یونانیوں نے علوم ہیئت و ہندسہ بیرونی اقوام سے حاصل کئے جو یونانی تہذیب کے ساتھ قطعی مطابقت پیدا نہ کر سکے۔ یونانیوں نے علوم کی تنظیم کی ان کو ترتیب دیا اور نظریات قائم کئے لیکن ان کی طبائع تفتیش کے متحملانہ طریقوں سے مفید علوم کی تحصیل سے طبیعیات کے ادق طریقوں اور تفصیلی اور طویل مشاہدات سے کلیتاً ناآشنا تھیں البتہ زمانۂ قدیم میں "یونانی اسکندریہ" میں جو تجربات ہوتے تھے وہ ضرور کسی قدر محققانہ ہوتے تھے۔ جس کو ہم سائنس کہتے ہیں اس کا سرزمین یورپ میں بارآور ہونا مندرجہ ذیل باتوں کے متعلق نیا ذوق پیدا ہو جانے کا نتیجہ ہے یعنی تحقیقات تفتیش و تفحص کے نئے طریقے "آزمائش و تجربات کے قاعدے اور مشاہدات پیمائش و ریاضیات کا وہ طریقہ جس سے یونانی قطعی ناواقف تھے۔ یہ نیا ذوق اور طریقے دنیائے یورپ میں عربوں نے جاری کئے۔" (ماخوذ از "لکچرز آن اسلام" مصنفہ ڈاکٹر سر اقبال)

بے شمار یورپین مستشرقین نے مسلمانوں کی علمی ترقی اور دنیا پر احسانات کے متعلق اپنی تحقیق و تفتیش کے نتائج شائع کئے ہیں جن میں سے مشتے از خروارے بطور نمونے کے اس مقام پر پیش کئے گئے ہیں اور جن کے مطالعے سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ یورپ کو آج جس ترقی پر ناز ہے اس کی بنیاد مسلمانوں ہی نے قائم کی تھی اگرچہ ان کے اصلی وارث اپنی تنگ خیالی کی وجہ سے اس گراں مایہ ترکے سے محروم ہو گئے۔ مسلمانوں کے یہ احسانات صرف یورپ ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہندوستان بھی اس فیض عام سے محروم نہیں رہا۔ مسٹر مرے ٹی ٹائیٹس۔ پی ایچ۔ ڈی، ڈی۔ ڈی اپنی کتاب "انڈین اسلام" کے صفحہ ۶۰ پر لکھتے ہیں کہ "ڈاکٹر ٹی۔ این سرکار نے اپنے ایک لکچر کے دوران میں جو انھوں نے "اسلام اِن انڈیا" پر حال ہی میں دیا تھا ان فواید کی حسب ذیل فہرست پیش کی جو ہندوستان کو اسلام اور اسلامی حکومت سے حاصل ہوئے۔

۱۔ بیرونی ممالک سے باہمی تعلقات کا از سر نو قائم کیا جانا جس میں ہندوستانی بحری بیڑہ اور بحری تجارت بھی شامل ہیں جو چولا قوم کے زوال کے بعد سے قطعی تباہ ہو چکے تھے۔

۲۔ ملک کے بہت بڑے حصے میں خاص کر وندھیاچل پہاڑ سے شمال کی جانب اندرونی امن و سکون۔

۳۔ ایک مشترک حکومت کے باعث ملک میں یک رنگی اور ہم آہنگی کا پیدا ہونا۔

۴۔ عمائدین میں بلا امتیاز مشرب و ملت معاشرت، آداب و پوشاک میں مطابقت۔

۵۔ "سندی۔ عربی" آرٹ کی تخلیق جس میں عہد وسطےٰ کے ہندی اور چینی وضع و طرز متصل ہو گئے۔ اس کے علاوہ فن تعمیر کی ایک نئی وضع ایجاد ہوئی اور صنعت و حرفت کے اقسام نفیسہ میں ترقی ہوئی مثلاً شال، ململ اور قالین بافی اور پچی کاری وغیرہ۔

۶۔ ایک مشترک زبان کی ترویج جس کو ہندوستانی یا "ریختہ" کہتے ہیں اور نثر لکھنے کا ایک سرکاری ضابطہ جو ہندو منشیوں کے فارسی لکھنے سے پیدا ہوا۔

۷۔ مذہب وحدانیت اور مشرب صوفی کا تعارف۔

۸۔ تاریخی کتابیں (لٹریچر)
۹۔ فن حرب اور عام تہذیب میں ترقی ؟

# سواری اور سوار

صاحب عالم حضرت لبیب دہلوی۔ حیدرآباد دکن

اشک مسلسل ہوں اور سوز نہاں پہ سوار
خاک کا پتلا ہوں اور مرکب جاں پر سوار

جان گئی تو گئی آن نہ جائے کہیں
میت عاشق اٹھے تیغ و سناں پہ سوار

اک طپش شوق ہوں باطن خاموش میں
اک خلش درد ہوں ذوق بیاں پر سوار

آتی ہے منزل نظر نام و نشاں سے پرے
اور بھٹکتا ہوں میں نام و نشاں پر سوار

دیکھا جہاں کو تو واں دل کے سوا کچھ نہیں
دل کو جو دیکھا تو ہے سارے جہاں پر سوار

ایک تماشا ہوں میں عبرت آئندگاں
ایک تصور ہوں میں وہم و گماں پہ سوار

یوں تو جہاں کے نہاں ایک ہی گریہ میں
دیکھیے جس کو وہ ہے عمر رواں پہ سوار

غنچۂ نورس کو ہے اپنی جوانی پہ ناز
بلبل دیوانہ ہے آہ و فغاں پر سوار

ثبت ہے میری فنا ہستی جاوید پر
اٹھتی ہیں موجیں مری بحر رواں پہ سوار

لاکھ بھنور ہوں لبیب ڈوبنے والا نہیں
خس ہوں مگر بحر کی تاب و تواں پر سوار

# حالی کے حال میں

۱۹۰۵ء کا ذکر ہے۔ اٹھائیس سال کا زمانہ بھی کچھ کم مدت نہیں ہے۔ صرف دو سال کی کسر باقی ہے ورنہ کہا جاتا کہ ایک نسل گذر گئی جب کہ پہلے پہل مجھے مولانا حالی مرحوم کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا۔ میں اس وقت دسویں کلاس میں میرٹھ تعلیم پاتا تھا اور خواجہ غلام الثقلین مرحوم کے یہاں بھی آتا جاتا تھا۔ وہ خیر نگر دروازے رہتے تھے۔ ڈپٹی محمد صدیق کا مکان کرائے پر تھا جس کو کوٹھی کہتے تھے۔ مولانا حالی مرحوم خواجہ صاحب کے یہاں تشریف لائے اور اس کوٹھی میں فروکش ہوئے۔ شام ہونے والی تھی کہ میں اتفاقاً خواجہ صاحب مرحوم کے یہاں پہنچا۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں کہ کوٹھی کے شرقی برآمدے میں کچھ اصحاب کرسیوں پر متمکن ہیں۔ ایک صاحب سفید پوش (از سرتا پا) درمیانی کرسی پر جلوہ افروز ہیں اور باقی اصحاب کرسیوں کی دو رویہ قطاروں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ معمولی سلام کے بعد میں بھی ایک کرسی پر جا بیٹھا اور حاضرین میں سے سب کو پہچان لینے کے بعد ان سفید پوش صاحب پر بار بار نظر ڈالی لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کون بزرگ ہیں طرز لباس سے مجھے اس وقت یہ خیال ہوا کہ یہ صاحب کوئی بڑے زمیندار ہیں اور اب تک ان کو زمانے کی ہوا نہیں لگی ورنہ لباس میں یہ سادگی نہ ہوتی اور تھوڑا بہت طمطراق ضرور ہوتا۔ میرے قریب مولانا گرامی میرٹھی کے چھوٹے بھائی پروفیسر محمد علی نامی (الہ آباد یونیورسٹی) تشریف رکھتے تھے جو اس زمانے میں بہت دبلے پتلے تھے اور جن سے مجھے اس وقت کوئی سروکار نہ تھا لیکن بعد ازاں ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۱ء تک بی۔ اے کلاس میں فارسی انھیں سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ میں نے نامی صاحب سے دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں؟

نامی صاحب۔ "مولانا حالی!"

میں۔ "کیا یہ مولانا حالی ہیں؟"

نامی صاحب: "جی ہاں!"

ں۔ "کیا واقعی یہ مولانا حالی ہیں؟"

ں صاحب (بگڑ کر)۔ "جی ہاں یہ مولانا حالی ہیں میں نے کہہ دیا مجھے جھوٹ بولنے سے کیا حاصل؟"

نامی صاحب کی خفگی نے اس استعجاب کو دور کر دیا جو مولانا حالی کا نام سن کر میرے دل و دماغ

مایہ انگن ہو گیا تھا اور مجھ کو یقین ہو گیا کہ وہی حالی جس کی نظمیں اردو کورس میں پڑھی تھیں اور جس کو

ر و غالب سے کم نہ سمجھتے تھے اپنی نظر کے سامنے ہے۔ اب کیا تھا خاموش بیٹھے ہوئے ہیں اور منتظر ہیں

ب لوگ چلے جائیں تو مولانا حالی سے علیحدہ باتیں ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد سب صاحبان ایک

یک کر کے رخصت ہو گئے اور مولانا حالی شرقی برآمدے سے اٹھ کر شمالی برآمدے میں ٹہلنے لگے میں بھی

ٹھ کر پیچھے پیچھے ہو لیا اور مولانا حالی سے عرض کیا کہ مجھے ایک خبط ہے اور اسی بات کو اس قدر طول دیا کہ

ب مولانا حالی مرحوم نے مجھ پر تعجب انگیز نگاہ ڈالی تو مجھے اپنی طول کلامی بلکہ فضول کلامی کا احساس

وا اور میں نے فوراً کہا "مجھے شاعری کا خبط ہے اور میں شاعری ترک کرنا چاہتا ہوں لیکن یہ عادت

ہیں جاتی"

ولانا حالی۔ "اچھا! آپ کو شاعری کا شوق ہے۔ آئیے ادھر روشنی میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

چنانچہ اب غربی برآمدے میں دو تین کرسیاں بچھوا کر بیٹھ گئے۔ اس زمانے میں فی الواقع مجھے

ماعری کا بے حد شوق تھا اور مقدمۂ شعر و شاعری پڑھنے کے بعد تغزل سے نفرت شروع ہو گئی تھی لیکن

وئی نظم بھی نہ لکھی تھی۔ مجبوراً مولانا حالی کو اپنے ٹوٹے پھوٹے دو چار شعر غزل کے سنائے۔ وہ خاموش

ہے اور میں نے سمجھ لیا کہ

صائب دو چیز می شکند قدر شعر را    تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس

پھر ایک قطعہ سنایا جس کی زبان کی تعریف مولانا حالی نے فرمائی اور میں نے یہ غنیمت سمجھ کر اردو

غزل گوئی کو ختم کیا۔ بعد ازاں عرفی کے اس شعر پر

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال    صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

جو چند شعر لکھے تھے اپنی فارسی دانی کے ثبوت میں سنائے۔ مولانا حالی نے فرمایا کہ اب فارسی کا زمانہ

نہیں رہا۔ جو کچھ لکھئے اردو ہی میں لکھئے۔ پھر فرمایا کہ میں نے سرسید احمد خاں مرحوم کی وفات پر ایک مرثیہ فارسی میں لکھا تھا وہ علیحدہ چھپ گیا ہے اس کے نکات کو نہیں سمجھا گیا مجھ کو ایک خط یاد دہانی کے طور پر بھیج دینا میں تم کو پانی پت سے بھیج دوں گا اور یہ نصیحت فرمائی کہ "اس وقت شاعری بالکل ترک کر دو۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد شوق سے شاعری کرنا میرے ایک دوست ہیں میں نے ان کو بھی یہی نصیحت کی تھی۔ چنانچہ انھوں نے زمانہ طالب علمی میں اس شوق کو چھوڑ دیا۔ اب بی۔ اے ہیں اور شاعری بھی کرتے ہیں۔ اس گفتگو کے بعد میں بھی رخصت ہو کر چلا آیا اور اگلے دن پھر پہنچا۔ اتفاق سے مولانا شوکت میرٹھی (مجد والسنۂ مشرقیہ) بھی تشریف لائے اور کچھ دیر تک مولانا حالی سے شعر و شاعری کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ میں بھی خاموش سنتا رہا۔ اس وقت مولانا شوکت مرحوم ایک رسالہ جس کا نام "پروانہ" تھا نکالتے تھے اور اس میں جہاں قصائد خاقانی کی شرح ہوتی تھی غالب و مومن کے مشکل اشعار کی بھی تشریح کی جاتی تھی۔ غالب و مومن کی جہاں تعریف ہوتی تھی وہاں ان کے اشعار پر اصلاح بھی دی جاتی تھی اور اس وجہ سے میں مولانا شوکت کا کچھ زیادہ قائل نہ تھا جب مولانا شوکت مرحوم تشریف لے گئے تو مولانا حالی نے ان کے علم کی وسعت کی تعریف فرمائی لیکن مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے عرض کیا کہ واقعی مولانا کی علمیت میں کسی کو کلام نہیں مگر مولانا بڑے سے بڑے شاعر کے کلام پر اصلاح دیتے ہیں اور کسی کو اپنی برابر نہیں سمجھتے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو فی الواقع مولانا شوکت زیادہ قابل قدر و احترام ہوتے۔ مولانا حالی نے میری اس رائے سے اتفاق کیا اور کہا کہ تم سچ کہتے ہو۔

اس کے بعد کچھ یاد نہیں کہ کب مولانا حالی میرٹھ سے تشریف لے گئے اور کب خواجہ غلام الثقلین مرحوم وکالت چھوڑ کر ریاست مالیر کوٹلہ کی ججی پر چلے گئے۔ میں تو انٹرنس کا امتحان پاس کر کے میرٹھ سے چلا گیا تھا اور دو سال تک اِدھر اُدھر پھرتا رہا یہاں تک کہ ۱۹۰۷ء میں علی گڑھ پہنچا اور ۱۹۰۹ء میں وہاں سے ایف۔ اے پاس کرنے کے بعد میرٹھ کالج میں داخل ہو گیا۔ خواجہ صاحب مرحوم بھی ریاست مالیر کوٹلہ کی ججی ترک کرنے کے بعد کچھ دنوں لکھنؤ میں وکالت کرتے رہے اور بعد ازاں

میرٹھ تشریف لے آئے۔

جب میں میرٹھ کالج میں داخل ہوا تو خواجہ صاحب مرحوم میرٹھ ہی میں وکالت کرتے تھے اور اندر کوٹ میں ایک مفتی صاحب کے مکان میں رہتے تھے۔ میری آمدورفت خواجہ صاحب مرحوم کے یہاں پھر شروع ہوگئی تھی اور چونکہ میں بھی اندر کوٹ میں رہتا تھا اس لئے قرب کی وجہ سے ان کے یہاں روزانہ آنا جانا تھا۔ اب خواجہ صاحب اور مجھ میں ایک قسم کی بے تکلفی ہوگئی تھی۔ اکثر وقتی مسائل پر بحث ومباحثہ بھی ہوتا رہتا تھا تین چار ماہ کے بعد خواجہ صاحب کی بیوی اور بچے بھی پانی پت سے میرٹھ چلے آئے تھے۔ میاں سیدین بہت چھوٹے تھے اور "ا۔ب۔ت" پڑھتے تھے۔ مولانا حالی مرحوم کو خواجہ صاحب کے بچوں سے بہت محبت تھی۔ کچھ دنوں کے بعد وہ ان بچوں کو دیکھنے کے لئے پانی پت سے میرٹھ تشریف لائے اور اس مرتبہ مولانا حالی سے زیادہ بہتر طور پر شناسائی ہوئی۔ کبھی کبھی شعروسخن کا بھی ذکر آتا رہتا تھا۔ میں نے بھی اپنی دوچار رباعیاں اس دوران میں مولانا کو سنائی تھیں۔ ازاں جملہ جب یہ رباعی سنائی

فریاد کو بیکس کی پہنچتا ہے تو ۔۔۔ تکلیف میں اک پوچھنے والا ہے تو
لے دے کے ہی تیرا ہی سہارا ہم کو ۔۔۔ دنیا میں جو کچھ ہے سو خدایا ہے تو

تو مولانا نے فرمایا کہ بجائے 'ہے تو' کے 'تو ہے' کردو یعنی اس طرح پڑھو:۔

فریاد کو بیکس کی پہنچتا تو ہے ۔۔۔ تکلیف میں اک پوچھنے والا تو ہے
لے دے کے ہے تیرا ہی سہارا ہم کو ۔۔۔ دنیا میں جو کچھ ہے سو خدایا تو ہے

'ہے' اور 'تو' کی تقدیم وتاخیر سے کس قدر فرق ہوگیا اور زور پیدا ہوگیا۔ میری باقی رباعیاں سن کر فرمایا کہ تمھاری سب رباعیوں کا وزن درست ہے۔ رباعی کا وزن درست ہونا بھی ایک تعریف کی بات ہے۔ بڑے بڑے استاد دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اور تو اور نواب مرزا خاں داغ کی ایک رباعی ہے جس کے تین مصرعے ایک وزن کے ہیں اور چوتھا مصرع دوسرے وزن میں ہے۔ غالباً وہ رباعی بھی پڑھی تھی لیکن مجھے وہ یاد نہیں رہی۔

ایک روز خواجہ صاحب مرحوم اور راقم وکالت کے کمرے میں بیٹھے ہوئے سر سید احمد خاں کے متعلق باتیں کر رہے تھے اور مولانا حالی اندر کے کمرے میں کوچ پر بیٹھے تھے۔ میں سر سید مرحوم کی تعریف کر رہا تھا اور ان کے کاموں کی عظمت ثابت کر رہا تھا۔ اُدھر خواجہ صاحب مرحوم میری تردید کر رہے تھے اور سید کے کارناموں کو بالکل معمولی ظاہر کر رہے تھے کہ مولانا حالی نے فرمایا "میاں محمد یحییٰ! تم یہاں میرے پاس آ جاؤ۔ غلام الثقلین کی تو عادت ہے کہ جب کسی شخص کی تعریف کرتا ہے تو اس کو آسمان پر چڑھا دیتا ہے اور جب کسی شخص کی مذمت کرتا ہے تو اسے تحت الثریٰ میں پہنچا دیتا ہے۔ اس کی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ گویا سید سے بدتر کوئی آدمی ہی نہ تھا۔" میری تو کیا مجال تھی کہ یہ الفاظ سن کر مولانا حالی کے پاس نہ جا بیٹھتا لیکن خواجہ صاحب مرحوم کا چہرہ بھی شرمندگی سے سرخ ہو گیا تھا اور بیحد خفیف معلوم ہوتے تھے چنانچہ وہ فوراً وہاں سے اٹھ کر زنانے مکان میں چلے گئے اور دو تین روز تک میں نے یہ کیفیت دیکھی کہ مولانا حالی زنانے مکان میں گئے تو خواجہ صاحب فوراً باہر چلے آئے اور اگر وہ باہر تشریف لائے تو خواجہ صاحب زنانے مکان میں داخل ہو گئے۔ میرا خیال ہے کہ مولانا حالی مرحوم بحید غصے کی حالت میں اس قسم کے الفاظ سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکتے تھے لیکن ان کے ان ملائم الفاظ ہی میں وہ اثر پنہاں ہوتا تھا کہ سننے والے کانپ جاتے تھے۔

ایک مرتبہ مولوی سید وحید الدین سلیم مرحوم فرماتے تھے کہ عبد الولی نے جو مولانا کا نواسا ہے اور مرض صرع میں مبتلا ہے ایک روز خدا جانے کس خیال میں پانی پت کے امام باڑے کے سامنے مولانا حالی کو زمین پر دے پٹکا اور چھاتی پر سوار ہو گیا۔ لوگوں نے دوڑ کر مولانا کو اس کے قبضے سے چھڑایا۔ مولانا کے چھوٹے صاحبزادے خواجہ سجاد حسین صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ بھی موجود تھے۔ انھوں نے عبد الولی کو خوب مارا۔ اب مولانا حالی ہیں کہ اپنے بیٹے سے سخت ناراض ہیں اور ان سے کلام نہیں کرتے۔ بیحد خوشامد و لجاجت کے بعد اپنے بیٹے کا قصور معاف کیا اور کہا کہ عبد الولی کا کوئی قصور نہ تھا۔ وہ تو دیوانہ ہے۔ اگر وہ اپنے ہوش میں ہوتا تو مجھ سے ہرگز اس طرح پیش نہ آتا لیکن تم کو خدا نے عقل دی ہے۔ تم کیوں دیوانے بن گئے کہ اس کو بلا وجہ زد و کوب کیا۔

یہ تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ عبد الولی کو مولانا بہت عزیز رکھتے تھے اور وہ اکثر

ان کے پاس رہتا تھا۔ وہ ان سے ایسے سوالات کرتا تھا اور بار بار پوچھتا تھا کہ مجھے بھی اکثر غصہ آیا لیکن مولانا کی وجہ سے میں کچھ نہ کہتا تھا۔ ایک مرتبہ فرہنگ آصفیہ کی ایک جلد مولانا حالی کے پاس بغرض ریویو آئی تھی۔ میاں عبدالولی اس کو پڑھتے تھے اور کہیں کہیں مولانا سے سوالات کرتے جاتے تھے اور ہندی کی چندی نکالتے تھے۔ مولانا نہایت تحمل سے جواب دیتے تھے اور نہایت عمدہ طریقے سے سمجھاتے تھے۔ ایک آدھ جگہ مولانا نے فرہنگ آصفیہ سے اختلاف بھی کیا اور مجھ سے کہنے لگے کہ مؤلف کا اصرار ہے کہ میں اس پر ریویو کروں۔ میں کیا لکھوں۔ اگر صحیح رائے ظاہر کروں تو مؤلف ناراض ہو جائیں گے اور تعریف ہی تعریف میرے بس کی چیز نہیں۔ مجبوراً یہ کروں گا کہ ان کے اخلاق و عادات اور ان کی ذاتی صفات کو پھیلا کر دو ایک سطر کتاب کی تعریف میں لکھ دوں گا۔

میں غالباً ۱۹۱۱ء میں میرٹھ سے مولانا حالی کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے غازی آباد جا رہا تھا کہ غازی آباد مولوی ظہور الحسن صاحب سے ملنے کے لئے اتر گیا۔ مولوی صاحب موصوف کی چھوٹی لڑکی سے میرا رشتہ ہو چکا تھا اور اسی وجہ سے مولوی صاحب کی خدمت میں ایک دو گھنٹے کے لئے حاضر ہونا ضروری سمجھا گیا تھا۔ مولوی صاحب پرانے خیال کے آدمی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ نہایت بزرگ، نہایت دیندار ہیں اور سب رجسٹراری کے زمانے میں نہایت متدین رہے اور حق العباد کا بیحد خیال رکھتے تھے لیکن وہ سرسید مرحوم کی وجہ سے مولانا حالی کو بھی نیچری کہتے تھے۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا۔ ان کے استفسار پر میں نے صاف کہہ دیا کہ میں مولانا حالی سے ملنے کے لئے پانی پت جا رہا ہوں۔ مولوی صاحب نے فوراً کہا کہ میاں کسی بزرگ کی خدمت میں جایا کرو۔ حالی تو نیچری ہیں۔ ان کی ملاقات سے کیا حاصل! میں اقرار کرتا ہوں کہ مولوی صاحب کے یہ الفاظ مجھے سخت ناگوار گذرے لیکن وہ موقع کچھ ایسا تھا کہ میں چوں نہیں کر سکتا تھا۔ مجبوراً میں نے خاموشی اختیار کی اور کچھ دیر توقف کرنے کے بعد میں مولوی صاحب سے رخصت ہو کر پانی پت چلا گیا۔ خدا کی شان دیکھئے کہ ہمارے مولوی صاحب ایک ہی سال بعد مولانا حالی کے قائل ہو گئے۔ جبکہ آخر الذکر میری شادی میں شرکت کی غرض سے غازی آباد تشریف لائے۔ واقعہ یہ ہوا کہ بارات کے پہنچنے کے تین گھنٹے بعد مولانا حالی پانی پت سے پانچ

بجے شام کو غازی آباد پہنچے۔ اس روز اتفاق سے رام لیلا تھی۔ شہر کے ہندو اور مسلمان رؤسا کی تمام گاڑیاں رام لیلا میں چلی گئی تھیں اور اسٹیشن پر سوائے یکے کے اور کوئی سواری نہ تھی۔ سڑک کی ناہمواری اور یکے کی سواری دونوں ناقابل برداشت ثابت ہوئیں۔ اس لئے مولانا پاپیادہ روانہ ہوئے اور جوں توں جہاں بارات قیام پذیر تھی پہنچے۔ مولانا ہانپ رہے تھے اور سانس پیٹ میں نہیں سماتا تھا۔ لوگ تعظیم کے لئے کھڑے ہوگئے اور ہر چند کہا گیا کہ وہ مسند پر آرام سے بیٹھیں لیکن انھوں نے منظور نہ کیا اور اس خاکسار ہی کو مسند پر بٹھایا گیا۔ مشکل سے پانچ منٹ گذرے ہوں گے کہ مکان کے دروازے سے حضرات علما جو شادی میں شرکت کرنے کے لئے تشریف لائے تھے ایک ایک کرکے داخل ہونے لگے۔ ان حضرات میں جن کی تعداد بیس پچیس سے کم نہ ہوگی شیخ الہند مولوی محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری اور دیگر علمائے دیوبند بھی تھے۔ مولوی ظہور الحسن صاحب ان کا بیحد احترام کرتے ہوئے جہاں ہم لوگ بیٹھے تھے ان کو لے آتے تھے۔ مولانا حالی نے تعظیماً اٹھنا چاہا تو خواجہ غلام الثقلین صاحب نے کہا کہ آپ بیٹھے رہئے! آپ تھکے ہوئے ہیں لیکن مولانا حالی نے خواجہ صاحب کو جھڑک دیا اور ہر ایک کی کھڑے ہوکر تعظیم کی۔ یہ بات ہمارے مولوی صاحب دیکھ رہے تھے۔ شادی کے ایک دو ماہ بعد خود مولوی صاحب نے مجھ سے اعتراف کیا کہ مولانا حالی بہت بزرگ آدمی ہیں۔ وہ علماء کی قدر و منزلت سمجھتے ہیں اور ان کی عزت کرنا جانتے ہیں اور یہی واقعہ مجھ سے بیان کیا۔

ایک بار جو میں مولانا حالی کی خدمت میں پانی پت پہنچا تو مولانائے مرحوم نے خاص طور پر ایک کنوئیں سے پانی منگوایا تھا جس کا مجھ کو علم نہ تھا۔ میں نے پانی پیا تو مولانا سے عرض کیا کہ یہ پانی تو کھاری ہے۔ مولانا ہنس پڑے اور فرمایا کہ ناحق آپ کو ایک گلاس پانی دے کر ضائع کیا۔ ہمارے نزدیک تو یہ شیریں اور عمدہ پانی ہے اور خاص طور پر ایک میل سے منگایا جاتا ہے۔ ہم نے ناحق تکلیف کی۔ قریب ہی کے کنوئیں سے پانی منگا کر پلا دیتے۔ آپ اسے بھی کھاری کہتے اور اسے بھی کھاری کہتے ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مولانا حالی زنانخانے سے ایک بچے کو گود میں لئے ہوئے آئے جس کا نام اطہر عباس ہے اور مجھ سے کہا کہ بتلاؤ یہ کس کا بچہ ہے۔ میں نے بلا تامل کہا کہ خواجہ غلام الثقلین صاحب کا

ہے۔ فرمانے لگے تم نے کچھ بھی تامل نہ کیا اور فوراً بتلا دیا۔ یہاں سب لوگ کہتے ہیں کہ یہ بچہ اپنے باپ کی شکل و صورت پر نہیں ہے حالانکہ مجھے خود بھی غلام الثقلین کے مشابہ معلوم ہوتا ہے۔

مولانا حالی کا ایک پرانا ملازم تھا جو بہرا بھی تھا اور لنگڑا بھی اور بقول سلیم مرحوم مولانا حالی کے نقطۂ نظر سے اگر وہ اندھا بھی ہوتا تو ایک اور خوبی کا اضافہ ہو جاتا۔ مولانا حالی نے کبھی اس کو علیحدہ کرنا گوارا نہیں کیا حالانکہ ظاہر ہے کہ اس سے بہتر ملازم ان کو مل سکتا تھا اور وہ خدمت کے لائق بھی نہ تھا چنانچہ ایک اور نوکر رہتا بھی تھا عجیب بات ہے کہ یہ بڈھا ملازم اور مولانا حالی کے پوتے اخلاق حسین اور گاگر مرحوم کچھ پیسے یا روپے جب مولانا سے مانگتے تھے تو زبان سے کچھ نہ کہتے تھے بلکہ مولانا کی صندوقچی جس میں روپے اور پیسے رہتے تھے لاکر مولانا کے سامنے رکھ دیتے تھے اور اس وقت اپنی ضرورت بیان کرتے تھے اور مولانا صندوقچی کھول کر کچھ نہ کچھ دے دیتے تھے۔

ایک مرتبہ مولانا حالی نے مجھ سے ایک کتاب کا ذکر کیا جو گم ہو گئی تھی اور اس کی نہایت تعریف کی۔ پھر یہ بھی فرمایا کہ وہ کتاب اب کمیاب بلکہ نایاب ہے۔ میں نے افسوس ظاہر کیا اور کہا کہ اس کتاب کے گم ہو جانے سے بے حد نقصان ہوا۔ فرمانے لگے کہ میں خود دماغ پر زور دوں گا تو وہ سب باتیں پیدا کر لوں گا جو اس کتاب کے مصنف نے تحریر کی تھیں اس لئے اس کے گم ہونے کا کچھ زیادہ غم بھی نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا نہایت طباع تھے لیکن افسوس ہے کہ ان کے خانگی امور نے اور ان کے اعزہ کی محبت نے انھیں تحریر و تصنیف کا اتنا کام نہ کرنے دیا جو وہ ان رکاوٹوں کے بغیر کر سکتے۔ ان کو عزلت نشینی کبھی نصیب نہ ہوئی اور وہ علیحدہ رہ کر کبھی تصنیف و تالیف نہ کر سکے۔ وہ ہمیشہ پانی پت سے دور رہنا چاہتے تھے اور پانی پت سے دور رہنا بھی ان کے لئے ممکن نہ تھا۔

مولانا حالی مجھ سے عزیزانہ اور بزرگانہ برتاؤ کرتے تھے۔ کبھی کبھی کسی کتاب یا کسی چیز کے بھیجنے کے لئے انھوں نے مجھے لکھا تو میں نے چاہا کہ ان سے قیمت نہ لوں لیکن وہ ناخوش ہوئے اور مجبوراً مجھ کو قیمت لینی پڑی۔ جب وہ میری شادی میں تشریف لائے تو میں نے ہر چند چاہا کہ کرایہ آمد و رفت قبول فرمالیں لیکن انھوں نے منظور نہ کیا۔

ایک بات مجھے ہمیشہ عجیب معلوم ہوئی کہ میں جب کبھی مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا، مجھے اطمینان قلب میسر ہو جاتا تھا اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا تھا۔ غرض ایک عجیب سماں ہوتا تھا۔ یہ بات آج کل کے صوفی مشرب بزرگوں کے یہاں بھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ میں جب ۱۹۲۵ء میں پانی پت گیا تو مولانا کی قبر پر جو قلندر صاحب کے احاطے میں ہے فاتحہ پڑھنے کی غرض سے پہنچا۔ سچ کہتا ہوں کہ مولانا کی قبر پر بھی وہی سکون قلب مجھے حاصل ہوا جو ان کی صحبت میں حاصل ہوتا تھا۔ مجھ کو مولانا کے انتقال کی خبر بذریعہ اخبارات ہوئی تھی جبکہ میں لکھنؤ میں تھا۔ بیحد رنج ہوا کہ آخری وقت میں زیارت سے محروم رہا۔ آہ! اب اس شعر کے پڑھنے میں کیا لطف ہے؟

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر    ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

---

# شیر شاہ اور کسان

شیر شاہ سوری خداداد ذہانت، تدبر، اولوالعزمی، بہادری اور حکمرانی کی عجیب و غریب قوت لے کر اس عالم آب و گل میں آیا۔ ابتدائے عمر میں دنیا نے اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا اور وہ زمانہ جو آرزوؤں اور امنگوں کا زمانہ ہوتا ہے اس کے لئے رنج و مصیبت کا زمانہ ثابت ہوا لیکن باوجود اس کے شیر شاہ جیسے جواں مرد کے پائے استقلال کو ذرا بھی لغزش نہ ہوئی۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ وہ نوجوان جسے اپنے باپ کے مکان کی دیواریں پناہ نہ دے سکی تھیں کس طرح ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیادیں قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔

ہمیں اس سے بحث نہیں کہ وقائع نویسوں نے اسے کس قسم کی حیثیت دی اور نہ ہمیں یہ گلہ ہے کہ اس سے بعد میں آنے والے حکمرانوں نے اس کے گراں بہا کارناموں کو کس قدر برا رنگ دے کر دنیا کے سامنے پیش کیا اس لئے کہ سچائی ایسی چیز ہے کہ وہ جتنی زیادہ دبائی جائے اتنی ہی زیادہ ابھرتی ہے۔ چنانچہ شیر شاہ کے صحیح کارناموں سے ارباب خبر ناواقف ہیں۔

شیر شاہ کی قابلیت اور خداداد استعداد میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ پانچ سال کے زمانۂ حکومت میں اس نے جو کارہائے نمایاں انجام دئے انھیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

اس وقت اس کے نظام حکومت سے بحث کرنا مقصود نہیں بلکہ اس کی سوانح حیات کے ان چند اوراق کو الٹنا ہے جن میں وہ اپنے باپ کے نائب کی حیثیت سے ایک چھوٹی سی جاگیر میں کام کرتا نظر آتا ہے۔

چھوٹا کام اکثر پیش خیمہ ہوتا ہے کسی بڑے کام کا۔ اچھی زندگی کی ابتدا ہمیشہ چھوٹے چھوٹے کاموں کے کامیاب طریق پر انجام پانے سے ہوتی ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ شیر شاہ کو آگے چل کر جو کامیابی نصیب ہوئی وہ محض اس چند سالہ سرگرمی کا نتیجہ تھی جو اس نے باپ کی جاگیر کے انتظام میں دکھائی تو کچھ

بے جا نہیں۔

شیر خاں کو جب اس کا باپ جلال خاں سے کہہ سن کر اپنے ساتھ گھر واپس لایا تو شیر خاں نے التجا کی کہ وہ اسے پرگنے کا منتظم بنا دے۔ اس کا خیال تھا کہ اسے اگر پورے اختیارات دے کر پرگنے کا منتظم بنا دیا جائے تو وہ نظم ونسق کی اصلاح اور ترقی میں ضرور کامیاب ہو گا۔ باپ نے اس درخواست کو قبول کر لیا اس لئے کہ وہ اپنے بیٹے کی ذہانت اور قابلیت سے بہت متاثر تھا۔

**شیر خاں کے انتظام سے پہلے جاگیر کی حالت**

حسن خاں (شیر خاں کا باپ) کی ریاست کا صحیح رقبہ معلوم نہیں۔ غالباً موجودہ ضلع شاہ آباد کے رقبے کے مساوی ہو گا۔ اس کے دو طرف پہاڑی علاقہ تھا، جنوب میں رہتاس کی پہاڑیاں اور اس کے ساتھ ہی چند نیم آزاد باشندگان کی بستیاں تھیں۔ اس سے کچھ آگے ہندو راجہ رہتاس کی ریاست تھی۔ مشرقی جانب دریائے سون اور مغرب میں جونند کا علاقہ جو محمد خاں سور کی ریاست تھا واقع تھا۔ اس علاقے کے باشندے بداخلاق، رہزن اور لٹیرے تھے۔ آپس میں بات بات پر لڑنا ان کا شیوہ تھا۔ اگر ایک کمزور ہوتا تو دوسرا اپنی طاقت سے اسے نیچا دکھانے کا آرزو مند رہتا۔ یہ حالت متوسط طبقے کی تھی۔ اچھے اچھے زمیندار بھی سفاک اور ظالم تھے۔ رحم دلی اور حسن اخلاق سے انھیں لگاؤ بھی نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں کے کسانوں کی جماعتی اور معاشی حالت بہت ہی خراب تھی۔

اس علاقے میں زیادہ تر سپاہی آباد تھے اور وہی با اقتدار بھی تھے۔ سپاہیوں کی فطرت میں درشتی ہوتی ہے۔ وہ نرمی سے کام نکالنا نہیں جانتے۔ اسی لئے وہ جب کسی پٹواری یا مقدم کو مجرم پاتے تو اسے بہت سخت سزائیں دیتے۔ انھیں ایسا کرنے کی جرأت محض اس لئے ہوتی کہ جاگیردار حسن کی ملازمت میں یہ لوگ تھے ان کی اس روش کو برا نہیں سمجھتے تھے۔ انھیں تو مطلب لگان کے حصول سے تھا خواہ وہ نرمی سے حاصل کیا جائے یا سختی سے۔ کسانوں کی حالت بھیڑوں کے ایک ایسے گلے کی سی تھی جو بغیر کسی نگہبان کے درندوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا ہو۔

صرف یہی نہیں بلکہ کسانوں کے لئے ایک مصیبت اور تھی۔ وہ مقدموں اور پٹواریوں کا وجود

تھا جن کا کام زمینداروں اور کسانوں دونوں کو اپنی خباثتِ نفس سے دھوکا دینا تھا۔ زمینداروں کو اپنی نااہلی کی وجہ سے یہ معلوم نہ تھا کہ ان کی جاگیر کی حقیقی آمدنی کیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مقدم زمینداروں کو لگان کا بہت کم حصہ دیتے اور کسانوں سے بہت زیادہ وصول کرتے۔ زمیندار سمجھتا کہ اسے اتنا ہی لگان ملنا چاہئے تھا جتنا انھوں نے اسے دیا ہے اور کسان یہ سمجھتے کہ زمیندار نے ان پر بھاری لگان لگایا ہے جس کے ادا کرنے پر وہ مجبور ہیں۔

کسانوں کی جماعت ایک ایسی بدقسمت جماعت تھی جسے باوجود محنت و مشقت کے نہ پیٹ بھر کھانا نصیب ہوتا اور نہ تن ڈھکنے کو کپڑا ملتا۔ وہ سال بھر محنت کرتے، تپتی دھوپ اور تیز آندھیاں انھیں ان کے کام سے غافل نہ کرسکتیں۔ وہ محنت کرنا جانتے تھے اور بغیر کسی قسم کا آرام لئے اپنے اس کام میں محو رہتے اس لئے کہ ان کا ماحول ہی اس قسم کا تھا لیکن انھیں اس مشقت اور محنت کا صلہ جو ملتا وہ صرف یہ تھا کہ فصل جب تیار ہو جاتی تو مقدم آتا اپنے سامنے کٹوا کر گٹھے بندھواتا اور انھیں کے سر پر لادکر اپنے ہاں لے جاتا اور ان کے لئے صرف اتنا چھوڑتا جو بمشکل ان کا پیٹ بھرنے کو کافی ہوتا۔

نہ تو مقدم ان پر رحم کرتے اور نہ زمیندار اور سپاہی ان کی حفاظت کا کچھ سامان کرتے۔ بادشاہ تک فریاد لے کر پہنچنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ جو کسان ذرا سمجھدار طاقتور ہوتے وہ دوسروں کو جو کمزور اور ناسمجھ تھے خوب لوٹتے اور اس طرح اپنی بسر اوقات کا سامان کرتے۔ غریب کسان تو کسی کام کے نہ تھے۔ مقدموں کی سختیاں، سپاہیوں کی ڈانٹ ڈپٹ اور اپنے طاقتور بھائیوں کے ظلم و ستم سہنے کے سوا انھیں کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔

جب شیر خاں یہاں پہنچا تو کسانوں کو اس ابتر حالت میں پاکر بہت زیادہ متاثر ہوا۔ اس نے کسانوں کو اس بری حالت سے نکالنے کے لئے تدابیر سوچیں اور انھیں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ شیر خاں کا خیال تھا کہ دنیا کی معاشی حالت کا درست ہونا صرف کسانوں کی حالت کے بہتر ہونے پر منحصر ہے۔ دولت کا بیشتر حصہ انھیں لوگوں کی محنت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ اگر محنت سے کام نہ لیں تو دنیا کی معاشی حالت درست نہیں رہ سکتی اور یہ اس وقت تک صحیح طور پر کام نہیں کرسکتے جب تک

ان کی حالت قابلِ اطمینان نہ ہو اور انھیں آسائش و آرام سے زندگی بسر کرنے کے مواقع ہاتھ نہ آئیں۔ اس کے خود اپنے الفاظ جو اس نے اس موقع پر استعمال کیے اس کے خیالات کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔ اس نے کہا "میں کسان کو بہتر حالت میں دیکھنا چاہتا ہوں اور ایسا کرنے میں اگر میری زندگی کے تمام قیمتی لمحات بھی صرف ہو جائیں تو اس میں دریغ نہیں کروں گا اور اس وقت تک دم نہیں لوں گا جب تک ان کی حالت اس حد تک نہ سنبھل جائے کہ انھیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔" اس نے کہا کہ "وہ جاگیردار جو اپنے کسانوں کی حالت درست نہیں کر سکتا کیا حق رکھتا ہے کہ ان کی پیداوار میں سے حصہ لے۔ کیا محض اس لیے کہ وہ اس بیکار زمین کا مالک ہے جس کو کسان اپنی محنت سے قابلِ پیداوار بناتے ہیں؟"

عباس شروانی کا بیان ہے کہ جب شیر خاں اپنے پرگنے میں آیا تو اس نے مقدموں، سپاہیوں اور کسانوں کو جمع کر کے اپنے ارادوں سے مطلع کیا۔ سب سے پہلے اس نے سب سے زیادہ بدنظم اور ظالم سپاہیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ میاں حسن (شیر خاں کے والد) نے مجھے یہ پرگنہ پورے اختیارات کے ساتھ سونپ دیا ہے۔ تمھارا عزل و نصب میرے ہاتھ میں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ریاست کے نظام کو بہتر صورت میں لاؤں اور اگر تم میں سے کوئی شخص میرے ارادوں میں ذرا بھی حائل ہوا تو تمھارے لیے بہتر نہ ہوگا۔ تم نے آیندہ اگر کسی کسان کو تکلیف دی یا اس پر ظلم کیا تو میں تمھیں سخت سے سخت سزائیں دوں گا۔ جو لگان تم کسان سے کھیت بوتے وقت مقرر کر لو اس میں اضافے کا تمھیں کوئی حق نہ ہوگا۔ تمھاری سب پچھلی خطائیں معاف کی جاتی ہیں لیکن اگر آئندہ تم نے کسی کسان کو تکلیف دی تو اس کی پاداش میں تمھیں سخت سے سخت مصائب برداشت کرنا ہوں گے۔ اگر میرے کانوں تک یہ بات پہنچی کہ تم نے مقررہ لگان سے گھاس کا ایک تنکا بھی زیادہ وصول کیا ہے تو میں تمھیں ایسی سزا دوں گا جو دوسروں کے لیے باعث عبرت ہو۔ میرے احکام کی نافرمانی کا کسی کو حق نہ ہوگا۔ میں اپنے رشتے داروں اور سپاہیوں کو بھی ان کے جرموں پر ایسی ہی بلکہ ان سے زیادہ سزائیں دوں گا۔ اس معاملے میں میرے نزدیک کسی رشتے، علاقے،

مرتبے اور کارگذاری کی کوئی اہمیت نہیں۔ مجرم ہر حال میں مجرم ہے خواہ وہ میں ہوں یا کوئی اور، اس لئے رعیت کو چاہیے کہ وہ کھیتی باڑی کا کام پوری دلچسپی اور محنت سے کرے۔ ان سے مقررہ لگان سے ایک ٹنکا بھی زیادہ وصول نہ کیا جائے گا اور سپاہیوں کو مطمئن رہنا چاہیے کہ ان سے صرف وہی رقم لی جائے گی جو انھوں نے لگان میں حاصل کی ہے۔"

سپاہیوں سے خطاب کرنے کے بعد اس نے کسانوں سے دریافت کیا کہ وہ کس قسم کا لگان پسند کرتے ہیں جنس کی صورت میں یا زر کی اور انھیں اختیار دیا کہ وہ جسے چاہیں پسند کرلیں اور یہ اسی وقت بتادیں تاکہ انتظام میں خرابی پیدا ہونے کا امکان نہ رہے۔ اس سے اس کا مقصد یہ تھا کہ رعیت سے بلاواسطہ معاملات طے کرے اور مقدموں کو ان پر ظلم کرنے کا کوئی موقع نہ مل سکے۔ یہ اس کی انتہائی دانشمندی اور معاملہ فہمی تھی۔ گو ابھی وہ جوان تھا لیکن اس کا دماغ بوڑھوں اور تجربہ کاروں کا سا تھا۔ آخر میں اس نے مقدموں سے خطاب کرتے ہوئے کہا جو کسانوں کے لئے سب سے زیادہ باعث تکلیف تھے کہ "میرے کان ظلم وستم کی ان داستانوں کو سن کر پک گئے ہیں جو تم نے اب تک غریب کسانوں پر کئے ہیں۔ میں اب ان داستانوں کو دہرانا نہیں چاہتا۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم نے آیندہ مقررہ لگان سے اگر ایک دانہ بھی زیادہ وصول کرنے کی کوشش کی تو اس کا نتیجہ تمھاری تباہی ہوگی۔ تمھارا فرض ہے کہ تم لگان مقرر کرتے وقت نرمی سے کام لو اور وصول کرتے وقت تمھیں سختی کا اختیار ہے، زیادتی کا نہیں۔"

پھر اس نے دوبارہ کسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اگر انھیں کسی قسم کی شکایت کرنا ہو تو ان کو چاہیے کہ وہ اس سے بذات خود آکر ملیں۔ وہ ان کی باتیں سنے گا اور کسی شخص کو ان پر ظلم نہ کرنے دے گا۔

یہ شیر خاں کی بہترین تدبیر تھی جسے اس نے کسانوں کی حالت درست کرنے کے لئے عملی جامہ پہنایا اور وہ اتنی کامیاب ہوئی کہ شاید ہی آجتک کوئی ایسی تدبیر کسانوں کی حالت درست کرنے کے لئے عمل میں لائی گئی ہو۔

شیر خاں صرف اسی سے مطمئن نہیں ہوا اس لئے کہ ابھی اسے ایک اور مصیبت سے دوچار ہونا تھا۔ یہ نافرمان اور باغی زمینداروں کا معاملہ تھا۔ سوال یہ تھا کہ وہ اتنی فوج کہاں سے لائے جو ان زمینداروں کا سر کچلنے کے لئے کافی ہو۔ اس کی ریاست کی تمام سپاہ اس کے باپ کے ساتھ کہیں باہر تھی۔ اس لئے شیر خاں کے باپ کے مشیروں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنے باپ کے آنے تک اپنے اس ارادے کو ملتوی کر دے۔ لیکن شیر خاں جیسا باہمت نوجوان ان کے مشوروں پر کب کان دھرتا تھا۔ اس نے انھیں حکم دیا کہ تمام ان پٹھانوں کی تلاش کی جائے جو اس کے علاقے میں بے کار ہوں اور ان کی سواری کے لئے دو سو گھوڑے مع ضروری سامان کے بہت جلد فراہم کئے جائیں۔ اس طرح تھوڑی سی مدت میں اس کے گرد بہت سے پٹھان جمع ہو گئے جنھیں اس نے بہت کچھ فائدے کی امید دلا کر اپنے ساتھ شریک کر لیا۔

تمام ضروری سامان مہیا کرنے کے بعد شیر خاں ان پٹھانوں کی سپاہ کو ساتھ لے کر باغی زمینداروں اور مقدموں کی پناہ گاہوں کی طرف چلا۔ ان دیہاتوں پر چھاپے مارے جہاں یہ چھپے ہوئے تھے۔ انھیں اور ان کی عورتوں بچوں کو گرفتار کر لیا اور ان کا سامان ضبط کر لیا۔ عورتوں اور بچوں کے سوا تمام مال غنیمت سپاہیوں میں حسب وعدہ تقسیم کر دیا۔ شیر خاں نے ان باغی زمینداروں کو سخت سے سخت سزائیں دیں، بعض کو قتل کروا دیا اور اکثر کو جو اطاعت قبول کر چکے تھے معمولی سی سزائیں دے کر چھوڑ دیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ شیر خاں نے زمینداروں پر بہت سختی کی لیکن ہم اس سختی کو ظلم سے تعبیر نہیں کر سکتے اس لئے کہ شیر خاں کے دل میں غریب کسانوں پر ظلم ہوتے دیکھ کر بہت ناسور پڑ چکے تھے جن کا مرہم اس سختی کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔ زمینداروں نے اس سے پہلے جو سختی غریب رعیت پر کی تھی اور ریاست میں جس بدنظمی کا باعث وہ بنے تھے اس کی وجہ سے شیر خاں مجبور تھا کہ ان کے ساتھ اسی قسم کی سختی کا سلوک کرتا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو کسانوں کی حالت جسے سدھارنے کا وہ قطعی ارادہ کر چکا تھا سدھر نہ سکتی۔ زمینداروں کی پچھلی تاریخ بتاتی ہے کہ انھوں نے کسانوں

یہ رحم کرنا بھی نہیں سیکھا۔ وہ تو انھیں صرف گوشت دپوست کا ڈھانچا گنتے رہے ہیں جو صرف ان کی آسایش و آرام کی خاطر بنایا گیا ہے۔ اس لیے شیر خاں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ جب تک یہ ظالم گروہ زیر نہ ہوگا اس وقت تک اس کی ریاست کی معاشی حالت اچھی نہ ہوگی اور نہ غریب کسان پنپنے پائیں گے

شیر خاں ایک احساس دل رکھتا تھا جس پر علم و عرفان نے جلا کر دی تھی۔ اسے یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ وہ ایک ایسی جماعت کو اپنے سامنے دم توڑتے دیکھے جس کی محنت پر دنیا کی زندگی کی بقا کا انحصار ہی۔ سچ تو یہ ہے کہ صرف کسان ہی حیات انسانی کی بقا کا اصلی باعث ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو دنیا میں اس قدر دلچسپی اور حرارت نہ ہوتی جو اب اس کی موجودگی میں ہے گو خود اسے کبھی اپنی اس ذات کی اہمیت کا احساس نہیں۔

شیر خاں نے کسانوں کی بہتری کے لیے وہ کچھ کیا جو اس سے پہلے کوئی نہ کر سکا۔ فیروز تغلق نے بھی کسانوں کی حالت درست کرنا چاہی تھی لیکن ساتھ ساتھ اس کا ایک مقصد اور بھی تھا اور وہ سرمایہ داری کی ذہنیت تھی جس کی وجہ سے وہ اتنا کامیاب نہ ہوا جتنا شیر خاں ایک معمولی جاگیردار کی حیثیت سے۔

---

# غزل

ہجر میں اب یہ حال ہے پیارے ‏ ‏ زندگی اک وبال ہے پیارے

تم کو میرا خیال ہے پیارے ‏ ‏ کیا یہ سچ ہے؟ یہ حال ہے پیارے

اس جہانِ خراب میں تجھ بن ‏ ‏ زندگانی محال ہے پیارے

ہم سے تم سے تھی رسم و راہ کبھی ‏ ‏ کچھ تمہیں بھی خیال ہے پیارے؟

تم نے میری وفا کی قدر نہ کی ‏ ‏ سخت دل کو ملال ہے پیارے

مجھ سے اور خوف بے وفائی کا ‏ ‏ یہ تمہارا خیال ہے پیارے

ساری دنیا کی فکر ہے تم کو ‏ ‏ کچھ ہمارا خیال ہے پیارے؟

میں نظر بھر کے تم کو دیکھ سکوں ‏ ‏ کب یہ میری مجال ہے پیارے

دیکھو چھیڑو نہ ہم کو تم اس وقت ‏ ‏ کچھ طبیعت نڈھال ہے پیارے

نام سے ہو وفا کے تم بیزار ‏ ‏ یہ وفا کا مآل ہے پیارے

امتحاں گاہِ دہر میں انساں ‏ ‏ ہمہ تن اک سوال ہے پیارے

کاش کوئی بتا سکے کہ یہ زیست ‏ ‏ اصل ہے یا خیال ہے پیارے؟

فرصتِ عیش ہے یہاں اک رات ‏ ‏ یہ ہمارا خیال ہے پیارے

رات بھر جو گلے کا ہار رہا ‏ ‏ صبح کو پائمال ہے پیارے

فیض ہے تیرے عشق کا کہ جلیل
شاعرِ بے مثال ہے پیارے

---

# غزل

تمام خلق سے دل بے نیاز ہو جائے
اگر تری نگہِ دل نواز ہو جائے

طلب سے دل جو کہیں بے نیاز ہو جائے
جہاں کو ہستیِ انساں پہ ناز ہو جائے

ادھر بھی اک نگہ دل نواز ہو جائے
برائے خاطرِ اہلِ نیاز ہو جائے

قدم نہ راہ محبت میں پھر کوئی رکھے
اگر خیالِ نشیب و فراز ہو جائے

خیال کاکلِ مشکیں کا یہ تقاضا ہے
خدا کرے شبِ فرقت دراز ہو جائے

اثر طراز ہر اک بات ہو تری ناصح
مگر جو دل بھی ترا پاک باز ہو جائے

سمجھ رہے ہو جسے ایک بے حقیقت شے
اگر یہ نالۂ غم جاں گداز ہو جائے

نہ پوچھو حال تم اس خانماں خراب کا جو
فریب خوردۂ رنگِ مجاز ہو جائے

خطا کسی سے نہ سرزد ہو پھر زمانے میں
برے بھلے کا اگر امتیاز ہو جائے

خیالِ زلفِ پریشاں میں اس قدر نہ الجھ
شبِ غم اور نہ اے دل دراز ہو جائے

پھر اس کو رنج و غمِ دہر سے تعلق کیا
کہ جس کا دل ہمہ تن سوز و ساز ہو جائے

جبینِ شوق کو تو سجدہ ریز رہنے دے
عجب نہیں ہے کہ یہ سرفراز ہو جائے

قصور اپنے ہی جذبات دل کا ہے ورنہ
قفس کا در ابھی صیاد باز ہو جائے

حمید گریہ و زاری نہ کیجیے اتنی
ان آنسوؤں سے نہ افشائے راز ہو جائے

---

# تنقید و تبصرہ

**شعرستان** | از سید محمود اعظم صاحب فہمی ترمذی ۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۲۰ صفحے ۔ چھپائی اچھی لکھائی اور کاغذ اوسط درجے کا ۔ قیمت عمر

ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ قرول باغ دہلی

---

یہ حضرت فہمیؔ کے کلام کا پہلا مجموعہ ہے جو ۴۰ مسلسل نظموں اور ۳۰ غزلوں پر مشتمل ہے ۔ اس کے ساتھ ناصر اٹاوی کا مختصر اور جامع مقدمہ اور حضرت جگر مرادآبادی کے پر معنی "اشارات" بھی ہیں ۔

حضرت فہمیؔ اخباری شاعر نہیں ہیں ۔ اس لئے انھیں ابھی تک عام شہرت حاصل نہیں ہوئی مگر جن ارباب ذوق تک موصوف کا کلام پہنچا ہے وہ اس بات پر متفق ہیں کہ ان کا درجہ اردو کے جدید طرز کے شاعروں میں بہت اونچا ہے اور انھیں امید ہے کہ ابھی آپ ترقی کے بلند تر مدارج طے کر سکتے ہیں اور کریں گے ۔

حضرت فہمی کے کلام کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپ کا طائر فکر شاعری کی اس نئی ہوا میں جو مغرب کی طرف سے چلی ہے گرد راہ کی طرح بے بس ہو کر نہیں اڑتا ۔ بلکہ توازن کے ساتھ ۔ منزل مقصود کو نظر میں رکھ کر سمت کو دیکھ بھال کر آزادی کے شان سے محو پرواز ہے ۔ آپ نے پرانے طرز کے شعرا کی تنگ نظری کو چھوڑ کر شعر کو صرف چند انفرادی جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنانے کی جگہ اس کے وسیع تر اور بلند تر مقصد کو اختیار کیا ہے یعنی اس سے حیات اجتماعی کی ترجمانی اور عالم فطرت کی تفسیر کا کام لیا ہے ۔ لیکن اس حقیقت کو یاد رکھا ہے کہ شاعری آرٹ ہے علم نہیں ہے اس کی جان احساس و تخیل ہے ۔ ادراک اور استدلال نہیں ہے ، اس کی روح آب و رنگ صورت ہے معنی بے رنگ و بے صورت نہیں ۔

شاعر کا مفہوم اور شاعری کی ماہیت آپ کی کئی نظموں کا موضوع ہے اور ہمارے خیال میں یہ نظمیں اصابتِ فکر اور حسن بیان کے لحاظ سے آپ کے کلام میں خاص امتیاز رکھتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے آپ کی شاعری کا خاص پیام ہی یہی ہے کہ شاعر کو اس کی حقیقت سے آگاہ کرے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اس مجموعے کو ادب و شعر کے خوش مذاق شائقین بہت قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

---

**گلبانگ** | یہ اسی تقطیع کے ۸۰ صفحوں پر حضرت فہمی کی قومی اور وطنی نظموں کا مجموعہ ہے جس کی قیمت ۸؍ ہے۔ یہ بھی مکتبہ جامعہ ملیہ سے مل سکتی ہے۔ ابتدا میں تعارف کے طور پر مولینا سروش بھوپالی کا سنجیدہ تبصرہ ہے۔ اس میدان میں بھی حضرت فہمی کے مذاقِ سلیم نے انھیں عام روش کی پیروی سے الگ رکھا ہے اور ان کی نظموں میں ہنگامہ خیز سطحی جوش کی جگہ خاموش گہرے سچے جذبات کا رنگ نظر آتا ہے اور خطابت کی رو میں حقیقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پاتا۔ ہمارے خیال میں گلبانگ کی مقبولیت کا حلقہ بہت وسیع ہوگا۔ اس لئے کہ اس کی تاثیر ذوقِ شعر رکھنے والوں تک محدود نہیں بلکہ ہر شخص جس کے دل میں دردِ ملت اور حبِ وطن کا جذبہ ہے اس کے مطالعے سے لطف اور بصیرت حاصل کرسکتا ہے۔

---

**مثنوی تغلق نامہ** | شائع کردہ مجلس مخطوطات فارسیہ لال ٹیکری حیدرآباد دکن۔ بہ تہذیب و تحشیہ مولوی سید ہاشمی صاحب فریدآبادی۔ حجم ۱۵۱ صفحے دیباچہ و مقدمہ ۲۴ صفحے۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۸۔ چھپائی ٹائپ کی۔ کاغذ چکنا نفیس۔ قیمت للعہ

---

سرکار نظام کے حکم سے ایک مجلس اس غرض سے قائم ہوئی ہے کہ فارسی کی مستند غیر مطبوعہ کتابوں کو فراہم کرکے صحت کے ساتھ چھپوائے۔ اس کے صدر سر اکبر حیدری اور معتمد اعزازی مولوی سید ہاشمی صاحب فریدآبادی ہیں۔ مثنوی تغلق نامہ کی اشاعت اس مجلس کا پہلا کارنامہ

نہیے اور جس شان سے یہ کتاب چھپی ہے۔ اس سے امید ہوتی ہے کہ فارسی ادب کے بیش بہا خزانوں کو ڈھونڈ کر نکالنے اور اہل ذوق سے روشناس کرانے میں یہ مجلس وہی قابل قدر خدمت انجام دے گی جو حیدرآباد کا مشہور و معروف دائرۃ المعارف عربی مخطوطات کی اشاعت میں انجام دے رہا ہے۔

تغلق نامے کا نام امیر خسرو کی تصانیف کی ذیل میں سننے میں آتا تھا مگر کتاب کا کہیں پتہ نہیں چلتا تھا۔ جب نواب اسحٰق خاں صاحب مرحوم کی علم دوستی اور فیاضی کی بدولت امیر خسرو کی تصانیف بڑے اہتمام سے چھپنے لگیں تو یہ پتہ چلا کہ مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی کے کتب خانے میں ایک نسخہ جہانگیر نامے کے نام سے ہے جس کے متعلق موصوف کا خیال ہے کہ یہ امیر خسرو کا تغلق نامہ ہے مگر ان کو یقین نہیں ہے۔ مولوی رشید احمد صاحب انصاری مرحوم نے بڑی کاوش سے اس مسئلے کی تحقیق کی اور یہ ثابت کر دیا کہ شیروانی صاحب کا خیال بالکل صحیح ہے یہ کتاب تغلق نامہ ہی ہے۔ حیاتی نے اس میں کچھ تھوڑا سا اضافہ کیا اور محض اس بنا پر کتاب کا نام بدل گیا اور وہ حیاتی کی طرف منسوب کر دی گئی۔

مولوی رشید احمد صاحب مرحوم نے مثنوی کا مقدمہ لکھنا شروع کیا تھا۔ جو افسوس ہے کہ ناتمام رہا۔ پھر بھی جو کچھ موصوف نے لکھا ہے اسے پڑھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب درحقیقت امیر خسرو کا تغلق نامہ ہے۔ مولوی سید ہاشمی صاحب نے اپنے دیباچے میں اس کی تائید میں مزید ثبوت پیش کیا ہے۔ ان دونوں حضرات کی بحث ادبی تحقیق کا نہایت عمدہ اور دلچسپ نمونہ ہے۔

سید ہاشمی صاحب نے اپنے دیباچے میں کتاب کی اصلیت کے علاوہ اس کے مضامین پر مختلف پہلوؤں سے ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور ایک علیحدہ باب میں اس کا مکمل خلاصہ درج فرمایا ہے۔ مثنوی میں قطب الدین خلجی کے قتل سے لے کر غیاث الدین تغلق کی تخت نشینی تک کے واقعات صحت ترتیب اور شاعرانہ فصاحت و بلاغت سے بیان کئے گئے ہیں۔ اس میں وہ رنگینی اور وہ زور نظر نہیں آتا جو امیر خسرو کی دوسری مثنویوں میں ہے۔ لیکن پختگی اور روانی، سادگی اور سلاست کا وہی لطف موجود ہے۔

تاریخی نظمیں ہر ملک میں اور ہر زبان میں عموماً مورخوں کے نزدیک پوری طرح اعتبار کے قابل

نہیں سمجھی جاتیں۔ مگر امیر خسرو کی ان مثنویوں کی جس میں انھوں نے اپنے زمانے کا ذکر کیا ہے یہ خصوصیت ہے کہ وہ رنگ آمیزی اور مبالغے سے پاک ہیں اور واقعات کی سچی اور جیتی جاگتی تصویر دکھاتی ہیں۔ اس لئے تعلق نامے کی اشاعت سے جو کھوئی ہوئی دولت ملی ہے اس سے ارباب ادب اور ارباب تاریخ دونوں کو بے حد مسرت ہوگی۔ اور وہ مولوی رشید احمد صاحب مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کریں گے۔ اور سید ہاشمی صاحب کے شکر گذار ہوں گے۔

---

**نقد الادب** | از حامد اللہ صاحب افسر میرٹھی۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶۔ حجم ۲۰۲ صفحے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قیمت عٰمہ/ مطبع نولکشور لکھنؤ میں چھپی ہے۔ ملنے کا پتہ درج نہیں۔ غالباً مطبع سے یا خود مولف سے گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ کے پتے سے مل سکتی ہے۔

---

اس کتاب میں حضرت افسر نے فنون لطیفہ خصوصاً ادب کی تنقید کے اصول جو قدیم زمانے میں اہل یوناں اور اہل ہند نے اور عہد جدید میں یورپ والوں نے قائم کئے سمجھائے ہیں۔ اور انھیں معیار قرار دے کر اردو شاعری کی مختلف اصناف پر تبصرہ کیا ہے اور ممتاز شعرا کے کلام کی مجموعی قدر و قیمت مقرر کی ہے کتاب کے ابواب حسب ذیل ہیں۔

باب ہفتم ۔ اصولِ تنقید کی تشکیل ۔

باب ہشتم ۔ تنقید کا مقصد اور عمل ۔

باب نہم ۔ ادب کا مطالعہ ۔

باب دہم ۔ اردو کی چند اصناف سخن ۔

ظاہر ہے کہ اتنے وسیع اور متنوع موضوع کا ایک مختصر سی کتاب پوری طرح احاطہ نہیں کر سکتی، اس لئے ہر چیز کی بحث سرسری اور نامکمل ہے اور مختلف ابواب میں باہمی ربط بھی بہت کم ہے ۔لیکن تنقید کے اہم ترین اصولوں کو مولف نے اچھی طرح سمجھا اور سمجھایا ہے اور اردو شاعری کے سرسری تبصرے میں ان سے دقتِ نظر اور حسنِ ذوق کے ساتھ کام لیا ہے ۔ یقین ہے کہ اردو ادب کے قدر دانوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ دلچسپ ہوگا اور اگر یہ کالجوں کے کورس میں داخل کردی جائے تو بہت مفید ثابت ہوگی ۔

---

تریاقِ مشرق | مجموعہ کلام حضرت سید احمد صاحب اُفق کاظمی امروہوی تقطیع خورد ضخامت ۲۳۲ صفحات ۔قیمت درج نہیں ہے ۔مصنف سے درگاہ حنفیہ ۔محلہ کٹلوئی امروہہ کے پتے سے مل سکتی ہے ۔

اس مجموعہ میں افق صاحب کی قومی اور اسلامی نظمیں ۱۰۰ سے زائد ہیں ۔پھر ارمغان ظرافت ہے ۔جس میں ظریفانہ غزلیں اور نظمیں ۔ شروع میں ایک دیباچہ ہے جس میں اردو کی موجودہ شاعری سے بحث ہے اور اپنے لئے خاص راستہ نکالنے کے وجوہات ہیں ۔ پھر ایک مختصر سا مقدمہ ہے

ان تمام نظموں میں جو اس مجموعہ میں درج ہیں قوم کی بیداری اور ترقی کی تلقین ہے معنوی لحاظ سے کل نظمیں مسلمانوں کے لئے عمل کا پیغام ہیں ۔ شاعرانہ حیثیت سے بھی یہ نظمیں اچھی ہیں ۔اشعار صاف اور بندشیں چست ہیں ۔ نمونتاً چند اشعار درج ہیں ۔

مسلماں مبتلائے خواب ہستی ہوتے جاتے ہیں
اسی باعث تو ننگ بزم ہستی ہوتے جاتے ہیں

بھرا ہے سر میں سودا سر بسر تقلید مغرب کا
حریف بادۂ یورپ پرستی ہوتے جاتے ہیں

گریزاں ہیں جواں مردی و استقلال و ہمت سے
مگر دن رات مائل سوئے پستی ہوتے جاتے ہیں

فلاح و عیش و خوش حالی تو رخصت ہو گئی ان سے
شکار مفلسی و ننگ دستی ہوتے جاتے ہیں

قیامت ہے جگاتا ہوں اقبال جس قدر ان کو
یہ اسلئے اور محو خواب ہستی ہوتے جاتے ہیں
(ا - ج)

---

Ten gems From Ghalib از شہاب الدین رحمت اللہ صاحب۔

یہ کتاب بارہ اوراق کی ہے۔ ابتدائی دو اوراق میں غالب اور مولف کی تصاویر دی گئی ہیں۔ اس کے بعد غالب کے دس اشعار کا انگریزی نظم میں ترجمہ پیش کیا گیا ہے اور ہر شعر کے متعلق ایک تصویر بھی دی ہے۔

کسی زبان کے اشعار کا ترجمہ نظم میں کرنا ہی اصولی غلطی ہے۔ لیکن اگر یہ ضروری بھی تھا تو جناب مولف کاش لفظی ترجمے پر اکتفا کرتے۔ موجودہ حالت میں تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب موصوف یا تو ان اشعار کے سمجھنے ہی سے قاصر رہے یا ضروریات نظم سے مجبور ہو کر صحیح ترجمہ کرنے پر قادر نہ ہو سکے۔

مثلاً غالب کا شعر ہے۔

وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوائے بادۂ گلفام مشک بو کیا ہے

ترجمہ کا مفہوم ملاحظہ ہو

وہ چیز جس کی ہمیں سخت تمنا ہے
یعنی بہشت۔ اے میرے دوست

اور جو ہمیں نہایت ہی عزیز ہے
بجز بادۂ گلفام مشک بو کچھ نہیں ہے۔

یعنی بادہ گلفام مشکبو خود بہشت ہے۔
غالب کا دوسرا شعر ہے۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

ترجمہ کا مفہوم یہ ہے

ہماری زندگی گویا ایک زنداں ہے
جہاں ہم مقید رہا کرتے ہیں
یہاں تک کہ مسرت کے ساتھ وہ آواز جرس سنیں
جو ہمیں اس کرب طویل سے نجات دیتا ہے

اس طرح ہر شعر کو مسخ کیا ہے اور مستزاد یہ کہ تصاویر بھی مفہوم شعر سے قطعی غیر متعلق ہیں اور ان میں بھی بدمذاقی کا ثبوت دیا ہے جس سے ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ مولف نے اشعار مذکور سمجھنے میں واقعی غلطی کی ہے۔

یہ کتاب آرٹ پیپر پر چھپی ہے اور بجز کاغذ اور طباعت کے بظاہر اس میں کوئی خوبی نہیں ہے۔ قیمت عہ بہت زیادہ ہے۔ مولف سے یوسف روڈ فریزر بلڈنگ پٹنہ سے مل سکتی ہے۔

---

**رسالہ حسب نسب** | مرتبہ حکیم محمد عثمان صاحب ندوی۔ صفحات ۵۰۔ قیمت ۵ر

اس رسالے میں آیات قرآنی اور احادیث سے حسب نسب کی فضیلت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ نیز دلائل اور جدید تحقیقات کی بنا پر یہ بتلایا گیا ہے کہ جسم اور روح پر بھی حسب

نسب کا اثر ہوتا ہے ۔ حسب نسب یعنی ماحول کا اثر جسم اور روح پر جو کچھ مرتب ہوتا ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ۔ لیکن محض حسب نسب کو وجہِ فضیلت قرار دینا اور اس پر فخر و مباہات جائز رکھنا قوموں کے لئے کچھ زیادہ مفید نتائج پیدا نہیں کرتا ہے ۔ کیونکہ اس سے ان کی قوتِ عمل مضمحل ہو جاتی ہے ۔

یہ رسالہ مصنف سے محلہ بیگہ شیخو پورہ ضلع مونگیر کے پتے سے مل سکتا ہے ۔

---

**بہاء اللہ اور میرزا** از مولٰینا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری ۔ قیمت ۶؍ صفحات ۶۰

مولٰینا موصوف نے اس رسالے میں شیخ بہاء اللہ ایرانی اور میرزا غلام احمد قادیانی کے دعاوی بالمقابل دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ میرزا غلام احمد قادیانی نے کوئی نیا دعویٰ نہیں کیا ۔ بلکہ شیخ بہاء اللہ ایرانی کی پیروی کی ہے رسالہ مذکور دفترِ اہلِ حدیث امرتسر سے مل سکتا ہے ۔

---

**حیات بعد الممات** از حکیم نذیر احمد صاحب قیمت صرف ۲؍

اس مختصر سے رسالہ میں یہ امر ثابت کیا گیا ہے کہ انسان کے لئے موت کے بعد ایک اور حیات ابدی بھی ہے ۔ اور وجہِ تالیف یہ بیان کی گئی ہے کہ اس فتنہ و فساد کے زمانے اور اس مادیت کے دور میں مسلم قوم کے ادبار و انحطاط کے اسباب ایک دو نہیں بلکہ متعدد ہیں ......

ان تمام چھوٹے مرضوں کی پیدائش ایک بڑے اور مہلک مرض سے ہے اور وہ حیات بعد الموت پر یقین کا نہ ہونا ہے ۔"

کتاب میں اولاً قرآن کریم کی آیات حیات ابدی کے ثبوت میں درج کی گئی ہیں ۔ اس کے بعد عقلی دلائل و براہین دی گئی ہیں ۔ کتاب کے شروع میں علامہ سید سلیمان ندوی کا دیباچہ ہے ۔

---

**فطرت** | راجگیر (پٹنہ) قیمت سالانہ عہ

یہ ماہانہ رسالہ جناب رشیدی بی اے کی زیرادارت اکتوبر ۳۳ء سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اس وقت اس کا پہلا نمبر ہمارے پیش نظر ہے جس میں حسب دستور مقصد اشاعت "ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ "فطرت کے سامنے صرف ایک ہی مقصد ہے اور وہی اس کا حاصل حیات ہے۔ زبان کی خدمت اس کا مقصد ہے۔ اسی لئے وہ معرض وجود میں آیا۔ اسی لئے اور محض اسی لئے وہ زندہ رہنے کا آرزومند ہے"

اس ادعا کو ملحوظ رکھتے ہوئے اگر مضامین پر نظر ڈالی جائے تو سخت مایوسی ہوتی ہے۔ جناب مدیر نے معلوم ہوتا ہے۔ علامہ راشد الخیری کی اکثر کتابوں کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہے اور ان پر علامہ موصوف کی طرز تحریر کا رنگ اتنا گہرا ہے کہ وہ ہر مضمون خواہ فلسفہ سے متعلق ہو یا تنقید شعری سے۔ خواہ معاشرتی ہو یا ڈرامہ اسی انداز میں لکھنے کی ناکام کوشش فرماتے ہیں۔

عام مضامین کا معیار بہت پست ہے۔ اور زبان کے اکثر اسقام موجود ہیں۔ بہار کے تاریخی مقامات کا سلسلہ نہایت دلچسپ ہے۔

---

**دلبستاں** | وزیرآباد۔ قیمت سالانہ سے ر

اس وقت ہمارے سامنے اکتوبر کا رسالہ ہے اس نمبر سے رسالہ مذکور نے گویا اپنی زندگی کے دوسرے سال میں قدم رکھا ہے اور اس سلسلہ میں ادارتی عملے میں کافی تبدیلیاں بھی کی گئیں ہیں۔ اور اب رسالہ غلام سرور صاحب فگار کی زیرادارت میں شائع ہونا شروع ہوا ہے رسالے کے مضامین نہ بلحاظ ادب اور نہ بلحاظ تحقیق ہی بلند ہیں۔

رسالے کے آخر میں چند صفحات بچوں کے لئے بھی مخصوص ہیں اور یہ شاید اس ضرورت سے بڑھائے گئے ہیں کہ رسالہ لاہور اور ملتان کے مدارس کے لئے بھی منظور کیا گیا ہے۔ لیکن ایک ادبی رسالے میں بچوں کے لئے چند صفحات دینا اصولاً مناسب نہیں ہے۔

**بانو بھوپال** | اڈیٹر خاتون ارشد تھانوی ۔ قیمت سالانہ عا

خواتین بھوپال کا یہ مقامی رسالہ ہے ۔ پہلے دو پرچے اس وقت ہمارے سامنے ہیں بعض مضامین واقعی مفید ہیں لیکن طباعت و کتابت اچھی نہیں ۔

---

**سندھ اخبار کراچی** | اڈیٹر محمد مجتبیٰ جامعی ۔ قیمت سالانہ للعہ

ہمیں افسوس ہے کہ یوم تاسیس کی مصروفیتوں کی وجہ سے ہم اخبارات پر بدیر ریویو شائع کر رہے ہیں ۔ لیکن یہ واقعہ بھی ہے کہ جب تک اخبارات کے کافی پرچے نظر سے نہ گذر جائیں ان کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا بھی مناسب نہیں ہوتا ہے ۔

یہ ہفتہ وار اخبار جامعہ کے سابق طالب علم محمد مجتبیٰ صاحب نے کراچی سے شائع کرنا شروع کیا ہے اور اس کی پالیسی مزدوروں اور کاشتکاروں کے مفاد کا تحفظ اور حمایت قرار دی گئی ہے اور اس کے دامن کو ذاتیات اور سیاسی و مذہبی تعصب سے پاک رکھنے کا اعلان کیا گیا ہے اگر جناب مدیر نے روایات جامعہ کو قائم رکھا اور استقلال سے کام لیا تو اخبار یقیناً کامیاب ہوگا ۔

---

**جلیل دہلی** | اڈیٹر منظور احمد صاحب عثمانی بی اے جامعہ ۔ قیمت سالانہ ہے ر

یہ ہفت روزہ بھی حال ہی میں دہلی سے شائع ہوا ہے ۔ سیاسی معاملات پر نہایت آزادی سے رائے زنی کرتا ہے ۔ اور مفید معلومات سے پر ہے ۔ پرچہ نہایت سلیقے سے ترتیب دیا جاتا ہے اس لئے امید ہے کہ مقبول ہوگا ۔

---

**مجاہد ۔ سہارنپور** | اڈیٹر سید ایزد حسن ۔ قیمت سالانہ عا ر

اس ہفت روزہ کے نو پرچے اب تک نکلے ہیں ۔ نواں پرچہ معراج نمبر ہے جو اس وقت پیش نظر ہے اس میں واقعہ معراج پر متعدد مضامین اور نظمیں درج ہیں ۔ عقیدت مند مسلمانوں کے لئے ایک اچھا تحفہ ہے ۔

(م ، ع ، خ)

# دنیا کی رفتار

## ممالکِ غیر

روس | اس وقت جب کہ ہر ملک کو اپنی زرعی اور صنعتی پیداوار کے لئے منڈیوں کی تلاش ہے اور محاصل تامینی اور عام کساد بازاری نے ہر طرف تجارت کی راہیں بند کر رکھی ہیں۔ روس باوجود اپنی اندرونی مشکلات کے دنیا میں اکیلا ملک ہے جو سرمایہ داری نظام کے نہ ہونے کی وجہ سے کساد بازاری سے محفوظ ہے چنانچہ سب کی للچائی نظریں اس پر ہیں کہ اس سے تعلقات استوار ہو جائیں تو اپنے مال کی نکاسی کی شاید کوئی صورت نکلے چنانچہ دو مہینے کی روٹھا روٹھی کے بعد برطانیہ اور روس میں تجارتی تعلق قائم ہو ہی گئے اور کیوں نہ ہوتے کوئی ۲۰ کروڑ روپے سالانہ کی تجارت کا معاملہ تھا۔ محض جذباتی وجوہ سے اسے کوئی کس طرح چھوڑ دیتا۔

ادھر امریکہ جو ہر ممکن طریقے سے اپنی معاشی زندگی کو ابھارنے کی فکر میں ہے۔ باوجود سابقہ اعلانات کے اب روس کی انقلابی حکومت کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہے۔ امریکن حکومت نے روس کو ۴۰ لاکھ ڈالر کا قرضہ بھی دیا جس سے روس امریکہ سے کوئی ۸۰ ہزار روئی کے گٹھے خرید سکے گا اور اس سے بہت بڑے قرضے کی بات چیت ہو رہی ہے۔ روس کو اگر یہ قرضے مل جائیں تو وہ امریکا سے بہت بڑی مقدار گیہوں اور تانبے کی خریدنے کو تیار ہے۔ اور اس خریداری کی قیمت بالآخر ادا کرنے کے لئے اگر روس یہ ترکیب کرے کہ اپنا مال برطانیہ کو بھیجے تو امریکا اور بھی خوش ہوگا اس لئے کہ اس سے عہد نامہ اوٹاوا میں رخنہ پڑنے کی امید ہے اور یہ امریکا کا عین منشاء ہے۔

جب بڑے بڑے یوں جھک رہے ہیں تو پھر چھوٹوں کا کیا ذکر۔ چنانچہ روس نے اس

موافق فضا سے فائدہ اٹھا کر اپنے یورپی ہمسایوں سے معاہدے کر لیے ہیں۔ پہلے جو معاہدے تھے ان میں یہ نقص تھا کہ رومانیا شریک نہ تھا اور اس کی شرکت ازبس ضروری تھی۔ ایک تو اس لئے کہ اس کی سرحد دور تک روس سے ملی ہوئی ہے دوسرے اس لئے کہ یہ فرانس اور پولینڈ کا حلیف ہے۔

اب پولینڈ کی وساطت سے روس اور رومانیا میں بھی معاہدہ ہو گیا کہ ایک دوسرے پر حملہ آور نہ ہوں گے۔ اس معاہدے نے یورپ میں جنگ کے ایک امکان کو توکم کیا یعنی بسارابیا کے علاقے کا مسئلہ طے ہو گیا جو روس سے لے کر رومانیا کو دیا گیا تھا۔

اسی کے ساتھ روس نے ایران، افغانستان، ٹرکی، پولینڈ، رومانیا، لیٹویا، ایسٹھونیا سب سے یہ بات بھی صاف کر لی کہ حملہ آور ہونے سے کیا مراد ہے اور اس طرح سابقہ عہد ناموں کو واضح اور پختہ کر لیا۔

لتھوینیا جو پولینڈ کی وجہ سے کچھ اکھڑا اکھڑا سا تھا وہ بھی اس معاہدے کے لئے آمادہ ہو گیا۔ اور خیال ہے کہ فن لینڈ اور چین بھی عنقریب روس سے اس مضمون کا معاہدہ کریں گے۔

لیکن ہم اس سے قبل بتا چکے ہیں کہ مشرقی یورپ کے ممالک میں فرانس اور اٹلی کے اثر کو بہت دخل ہے۔ چنانچہ اپنے قریبی ہمسایوں سے معاہدوں کے ساتھ ساتھ روس نے فرانس اور اٹلی سے بھی اپنے تعلقات استوار کئے کہ ان مذکورہ معاہدوں میں ان کے اثر سے کوئی رخنہ نہ پڑے اور ان دونوں دول سے بھی دوستی کے معاہدے ہو گئے۔

فرانس سے تو رفتہ رفتہ تعلقات بہت گہرے ہوتے جاتے ہیں اس لئے کہ جرمنی کے انقلاب نے صورت حال میں بڑا تغیر پیدا کر دیا ہے۔ پہلے ۱۹۲۶ء میں روس اور جرمنی میں جو معاہدہ ہوا تھا اس کی رو سے روس برابر اپنا سیاسی اثر جرمنی کے ساتھ اس غرض سے استعمال کرتا تھا کہ یورپ کی موجودہ سیاسی حالت میں تغیر پیدا کرے اور صلح نامہ ورسائی کے قائم کردہ نظام کو جلد سے جلد بدلے۔ اس نظام کے قیام کے سب سے بڑے حامی فرانس اور پولینڈ

تھے۔ اب روس نے رخ بدل دیا ہے اور کھلم کھلا فرانس کے ساتھ ہے۔ اطلاعیں آئی ہیں کہ روس سے جرمن انجنیروں اور ماہرین فن کو علیحدہ کر دیا گیا۔ اور ان کی جگہ فرانسیسی ماہر بلائے گئے ہیں۔ اس طرح فرانس اور روس میں تعلقات سیاسی و تجارتی برابر ترقی کر رہے ہیں۔ ان تمام معاہدوں سے روس کو سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ مشرق میں اس کے ہاتھ بالکل کھلے ہیں۔ اگر کبھی مشرق میں جاپان سے ان بن ہو جائے تو روس اطمینان کے ساتھ پوری قوت ادھر لگا سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ مشرق میں روس کے لئے خاصی مشکلات موجود ہیں۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ کس وقت جاپان سے تعلقات بگڑ جائیں۔ چینی مشرقی ریلوے پر اس وقت بھی کافی بدمزگی موجود ہے جاپان کی پٹھو ریاست منچوکو برابر روسی آمد و رفت میں رکاوٹیں ڈال رہی ہے۔ دونوں ملکوں کے اخبارات نے بھی باہمی منافرت پھیلانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے' اس لئے یورپی اور ایشیائی سرحد کے سب پڑوسیوں سے معاہدہ روس کی مشرقی سیاست کے لئے بہت کارآمد ہے۔

---

**تخفیف اسلحہ** | تخفیف اسلحہ کی جو کانفرنس مدتوں سے ہو رہی ہے اس کا کچھ عجب حال ہے نہ آگے بڑھتی ہے نہ ختم ہوتی ہے۔ پچھلے دنوں اس کے کام کو ایک بڑا دھکا لگا۔ یعنی جرمنی نے اپنے نمائندوں کو اس کانفرنس سے واپس بلا لیا اور اس کانفرنس ہی سے نہیں بلکہ جمعیۃ اقوام سے بھی قطع تعلق کر لیا۔ یہ انقطاع تعلقات دراصل جرمنی کا اعلان ہے کہ جنگ کے بعد کا وہ عہد جس میں جرمنی مفتوح ملک کی حیثیت سے بین الاقوامی معاملات میں دب کر شریک ہونے پر مجبور تھا ختم ہو گیا۔ وہ اب مفتوح ملک بن کر کسی مشورے میں شریک نہیں ہونا چاہتا۔ بلکہ مساوات کا طالب ہے۔ پچھلے پندرہ سال کی تمام جرمن سیاست اس اعلان کی تیاری تھی۔

جرمن کے مخالف ممالک میں یہ شبہ بہت عام تھا کہ یہ قوم برابر آئندہ جنگ کی تیاری کر رہی ہے۔ خود ملک کے اندر اور ادھر روس میں یہ برابر سامان جنگ کے دفاتر بڑھا رہی ہے تاکہ

جب وقت آئے تو بالکل بے بس تو نہ ہو۔ لیکن باوجود ان شبہات کے جمہوری اشتراکی جرمنی کو سمجھا بجھا کر اچھا ہمسایہ بنا لینے کی توقع تھی۔ اسی توقع کا نتیجہ تھا عہد نامہ لوکارنو۔ جرمنوں نے اس میں جو کچھ ہو سکا منوایا۔ پھر انگریزوں کی اس خواہش سے فائدہ اٹھایا کہ براعظم یورپ میں فرانس کا اقتدار کہیں اتنا نہ بڑھے کہ قابو سے باہر ہو جائے۔ چنانچہ انگریزوں کی مدد سے مساوات اسلحہ کے معاملے میں کچھ رعائتیں حاصل ہوئیں اور عہد نامہ ورسائی کی قطعیت میں کچھ امکانات تغیر پیدا ہوئے، بے چارہ فرانس جو باوجود فتح کے جرمن انتقام کے ڈر سے لرزتا ہے یہ سمجھ کر یہ سب تلخ گھونٹ پیتا رہا کہ قوم پرستی کے اٹھتے ہوئے طوفان کو دبانے کی اگر کچھ توقع ہو سکتی تھی تو اس طرح۔ انگریزوں کے اس خیال سے کہ جرمنی کو اتنا نہ دباؤ کہ کھسیا کر لڑ پڑے بلکہ رعائتیں دے کر اسے ٹھنڈا کرو اٹلی بھی متفق تھا۔

چنانچہ جب کوئی سال بھر پہلے جرمنی تخفیف اسلحہ کی کانفرنس سے کنارہ کش ہوا تو اٹلی اور انگلستان اسے سمجھا بجھا کر واپس لائے کہ تمہارے مطالبات پر ہمدردانہ غور ہوگا۔ اتنی جلدی نہ کرو اس کا نتیجہ "معاہدہ دول اربعہ" کی شکل میں رونما ہوا۔ جس نے عہد نامہ ورسائی میں بنیادی تبدیلیوں کے امکانات کا راستہ کھولا۔ فرانس اس میں خوشی سے کیسے شریک ہوتا۔ لیکن مجبوری تھی انگلستان، اٹلی اور فرانس کو متحد کرنا اور خود اس سے الگ رہنا بھی دانشمندی نہ تھی، ناچار و ناچار فرانس شریک ہوا لیکن اس ساری کارروائی کو جمعیۃ اقوام کے زیر نگرانی لانے پر اصرار کے ساتھ۔

لیکن اس کے بعد حالات بدلے۔ جرمنی کے خلاف ساری دنیا میں ناراضی پھیلائی گئی۔ روس نے جرمنی کو چھوڑ کر فرانس سے دوستی کی، اپنے تمام ہمسایوں سے اپنے معاملات استوار کر لئے۔ لہٰذا کانفرنس کے سامنے یعنی انگریزوں کے سامنے اب یہ مسئلہ نہ تھا کہ رعائتیں دے کر جرمنی کو راضی رکھیں بلکہ ہو سکے تو اس کی گستاخ، قوم پرست اور یہودی دشمن حکومت کو ایسا سبق دیا جائے جو یہ آسانی سے نہ بھولے اور ممکن ہو تو اس ایک دھکے سے ہٹلر کی خطرناک

قیادت کے بت کو توڑ دیا جائے۔ اس فیصلے کی تہ میں یہودیوں کا بین الاقوامی اثر بھی تھا اور فرانس کا یہ مستقل خوف بھی کہ جرمن ہتوا اسے کسی نہ کسی دن آ دبوچے گا۔ اور انگلستان کا یہ مستقل اصول بھی کہ براعظم پر کسی کو فیصلہ کن قوت نہ حاصل ہو۔

فرانس یوں تو ہمیشہ سے اس خوف سے کانپتا رہا ہے۔ لیکن صلح نامہ ورسائی کے بعد لوگ سمجھتے تھے اب واقعی خوف کی کوئی معقول وجہ باقی نہیں بلکہ فرانس صرف جرمنی کو دبائے رکھنے کے لئے اس کا اظہار کرتا ہے۔ مگر اب کچھ عرصے سے اس خوف کے لئے بہت قوی وجوہ پیدا ہو چلے تھے۔ اگرچہ فرانس نے اپنی سرحد کو قلعوں سے بہت کچھ مضبوط کر لیا ہے لیکن یہ قلعے ہیں تو سکھوں کے ہاتھ میں اس کی فوج کی حیثیت ایک ملیشیا کی سی ہے۔ جسے کوئی چھ ہفتے فوجی تعلیم دی گئی ہو اور بس۔ برخلاف اس کے جرمنی کے پاس صلح نامہ ورسائی کی اس دفعہ کی وجہ سے کہ جرمنی فوجی خدمت سب شہریوں کے لئے لازمی نہیں کر سکتا، ایک لاکھ آدمیوں کی مقابلتہ چھوٹی مگر نہایت منظم پیشہ ور سپاہیوں کی فوج ہے جس کی کمک کے لئے فوجی تعلیم پائی ہوئی پولیس بھی ہے اور قومی اشتراکی جماعت کی نیم فوجی تنظیم بھی۔ چھ مہینے کے اندر اندر جرمن اتنے آلات جنگ تیار کر سکتے ہیں کہ یہ فوجی قوت اس سامان کے ساتھ فرانس کی قوت کا مقابلہ کر سکے اور اگر پہلووں پر سے حملہ کرے تو شاید فرانس کو دبا بھی لے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بلجیم کی حکومت نے یکایک فیصلہ کیا ہے کہ دیلئے میوز کے ساتھ ساتھ قلعوں کا ایک سلسلہ بنائے جس پر خیال ہے کہ ۰، کروڑ فرانک خرچ ہوں گے، ادھر سوئیزرلینڈ میں سے جرمن فوجوں کے فرانس پر حملہ آور ہونے کے خوف نے اس ملک کی حکومت کو اس پر مجبور کیا ہے کہ کوئی دس کروڑ فرانک اسلحہ پر صرف کرے!

غرض صورت یہ ہے کہ جرمنی کے پاس پیشہ ور سپاہیوں کی عرصے تک سکھائی ہوئی فوج ہے۔ جو اگرچہ تعداد میں کم ہے مگر دوسری نیم فوجی جمعیتوں کے ساتھ مل کر بہت قوی ہو سکتی ہے، صرف اس وقت جنگ کے مہلک آلات جرمن کے پاس نہیں ہیں۔

فرانس کے پاس ان آلات تباہی کی کوئی کمی نہیں۔ فوج بھی بہت ہے۔ مگر تھوڑے سے

تھوڑے دن سیکھی ہوئی۔ برطانیہ، فرانس، اور امریکا کا خیال یہ ہے کہ جرمنی کی طاقت اور نہ بڑھنے پائے۔ اس کی تدبیر یہ نکالی گئی اور اس کے سوچ کر نکالنے کا سہرا برطانیہ کے سر ہے کہ جرمنی سے کہا جائے کہ تم بھی اپنی فوج کو ملیشیا بنا دو، یعنی مستقل رکھنے کی جگہ تھوڑے عرصے تک سپاہیوں سے فوجی خدمت لو، نیم فوجی جمعیتوں کو ختم کر دو تو ہم اجازت دیتے ہیں کہ فوج کی تعداد دوچند کر لو۔ لیکن نئے آلات اب نہ بنانا۔ ادھر فرانس کو بھی ہم راضی کئے لیتے ہیں کہ تم بھی فوج کی تعداد جرمنی کے برابر کرلو۔ سامان حرب تمہارا تمہارے پاس رہے!

اس طرح کچھ عرصہ گذر جائے اور جرمنی کا رویہ درست رہے، یہ چھپ کر آلات حرب نہ بنائے تو فرانس بھی اپنی توپوں، جنگی ہوائی جہازوں، اور دوسرے آلات حرب کو کم کر دے گا۔

اس میں چال یہ تھی کہ اگر جرمنی اس تجویز کو مان لے تو اس کی فوجی قوت باوجود تعداد کے اضافہ کے اس وقت کے مقابلے میں بھی کم ہو جائے گی، اور فرانس کی قوت میں کوئی معتد بہ کمی نہ ہوگی کہ اس کا انحصار آدمیوں سے زیادہ اسلحہ پر ہے۔ اگر جرمنی نہ مانے گا تو ساری دنیا کے سامنے پھر امن عالم کا دشمن قرار پائے گا۔ بساط سیاست پر دنیا کی رائے عامہ بھی ایک مہرہ ہے لیکن جرمنی نے نہ مانا۔ وہ جانتا تھا کہ اس معاملے کو منوانے کے لئے اب انگلستان اور امریکا پھر جنگ کرنے پر تو آمادہ ہو نہ سکیں گے۔ اکیلا فرانس اس کا کچھ بگاڑ نہ سکے گا۔ چنانچہ اس نے تخفیف اسلحہ کی کانفرنس ہی کو نہیں چھوڑا بلکہ جمعیت اقوام کو بھی الوداع کہا۔ اور اس جدائی کے فوراً بعد دنیا کو جتا دیا کہ وہ اپنے اسلحہ میں کوئی اضافہ نہیں کرے گا اور نہ امن عالم کو کوئی نقصان پہنچائے گا۔ اس کا مطالبہ تو بس یہ ہے کہ اسے دوسری فاتح اقوام کے مساوی سمجھا جائے۔ اس نے نہ اپنی فوجی قوت کو کم ہونے دیا، نہ اسے دنیا کے سامنے امن کا مخالف ثابت کیا جا سکے گا۔ اور ابھی اس واقعہ کو بہت دن نہیں گذرے تھے کہ امریکا نے کہہ دیا کہ ہمارا کسی یورپی طاقت سے کوئی سیاسی ساز باز نہیں ہے اور ہم اس مسئلے میں مزید بحث و گفتگو میں شریک نہ ہوں گے۔ انگریزوں نے بھی کہہ دیا کہ ہم ہر ممکن کوشش کریں گے کہ جرمنی سے معاملہ صاف ہو جائے۔ ہٹلر کو اور اس کے پردے میں اٹلی کی سیاست

کو جو فرانس کو ذرا نیچا دکھانا چاہتا ہے یہ بڑی کامیابی ہوئی۔ لیکن اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا
کہ تخفیف اسلحہ کے منصوبوں کا کیا حشر ہوگا۔ تخفیف ہوگی یا اسلحہ میں اضافہ کی ایک سرپٹ دوڑ
جس میں ترقی کے ساتھ تباہی کی منزل قریب تر آتی جائے گی۔

---

# ممالک اسلام

**افغانستان** بعض ممالک اپنی فطری ساخت اور اپنے باشندوں کے طبائع کے لحاظ سے مرکزی حکومت کے لئے موزوں نہیں ہوتے۔ افغانستان کا شمار بھی غالباً انھیں میں ہے۔ اس ملک کی تاریخ میں بہت کم مدتیں ایسی گذری ہیں جن میں تمام قبائل نے ایک بادشاہ کو بطیب خاطر تسلیم کیا ہو۔ طاقت اور تدبر شاذو نادر ایک انسان میں جمع ہوتے ہیں۔ سلاطین عموماً مدبر نہیں ہوتے۔ اگر کوئی بادشاہ بہ زور بازو تخت سلطنت کو حاصل کرتا ہے تو وہ بجائے اس کے کہ لوگوں کے دلوں کو ہاتھ میں لے ان کے سروں کو خاک وخوں آلودہ اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب تک اس کے ہاتھ میں طاقت رہتی ہے ملک میں امن رہتا ہے اور جہاں اس میں ضعف یا غفلت پیدا ہوئی مقتولین کے ہمدرد آمادہ بہ قصاص نظر آتے ہیں۔ پھر خوں ریزی شروع ہوتی ہے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کوئی طاقت ور انسان رونما ہوکر دوبارہ زور بازو سے تخت پر قبضہ نہیں کرلیتا۔ ملوک وسلاطین کی تاریخ میں اس قاعدۂ کلیہ سے بہت کم افراد مستثنیٰ کئے جاسکتے ہیں۔ عبدالرحمٰن خان غالباً ان مستثنیٰ افراد میں سے تھے۔ امان اللہ خان میں خلوص، جذبہ اصلاح اور اپنے قوم کا درد عام سلاطین سے بہت زیادہ ہے لیکن تدبر کی کمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عرصے تک حکومت نہ کرسکے اور تغیرات کی رو میں خود بھی بہ گئے۔

نادر شاہ سے جو ایک جہاں دیدہ آدمی تھے یہ توقع تھی کہ وہ افغانستان کے پریشان عناصر کو جمع کرکے اس کے جسم میں امن و امان کی روح پھونک سکیں گے لیکن غالباً واقعات نے انھیں کچھ اس طرح مجبور کیا کہ زمام تدبر ان کے ہاتھ سے بھی چھوٹ گئی اور بجز اپنے مخالفین کو قتل کرنے کے اور کوئی تدبیر انھوں نے بھی اختیار نہ کی۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا یعنی مقتولین کے طرفداروں میں سے ایک نے موقع پاکر ان کو قتل کردیا۔ اب پھر افغانستان کی قسمت کا ستارہ گردش میں ہے، یوں تو نادر شاہ کے فرزند ظاہر شاہ تخت افغانستان پر متمکن ہیں۔ اور

خبریں یہی آرہی ہیں کہ لوگوں نے ان کو بادشاہ تسلیم کر لیا ہے لیکن جو لوگ افغانستان کی دیرینہ تاریخ سے واقف ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ابھی حالت بالکل قابلِ اطمینان نہیں ہے ۔ ایک طرف اگر اس کا امکان ہے کہ نوجوان ظاہر شاہ اپنے چچا ہاشم خان کی مدد سے فوری خطروں کا مقابلہ کر سکیں تو دوسری طرف یہ بھی بعید نہیں کہ امان اللہ کے طرفدار جو جنرل غلام نبی خان اور دیگر سرداران قبائل کے قتل کی وجہ سے نادر شاہ کے خاندان سے برہم ہیں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیں اور سلطنت کی باگ کو ظاہر شاہ کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کریں ۔ اگر ایسا ہوا اور اس کے آثار ناپید نہیں ہیں، تو افغانستان کی بدقسمت سرزمین پھر خون سے رنگین ہوگی ۔

ابھی افغانستان میں اتحاد قومی کا احساس پیدا نہیں ہوا ہے ۔ وفاداری اور عصبیت کا جذبہ قبیلے تک محدود ہے ۔ اگر کبھی کوئی بادشاہ ایسا پیدا ہو گیا جو قبائل کے نظام کو توڑ کر قوم کی عمارت کھڑی کر سکا تو شاید یہ خانہ جنگی کچھ عرصے کے لئے بند ہو جائے ۔ ممکن ہے کہ قومیت کا پودا خون ہی کی آبیاری چاہتا ہو اور جب کافی خوں ریزی ہو چکے تو یک جہتی کا ثمر بار آور ہو ۔ موجودہ سردارانِ قبائل اور امیدوارانِ شاہی سے یہ توقع بے کار ہے ۔ کاش نوجوانانِ افغانستان اس طرف توجہ کریں اور اپنی قوم کی قسمت کو خود پرست یا قبیلہ پرست افراد کے ہاتھوں سے نکال کر کسی قوم پرست مدبر کے ہاتھوں میں دیں ۔

---

**فلسطین** | نومبر کے رسالے میں مسئلہ فلسطین پر اظہار خیال کرتے وقت جو اندیشہ تھا وہ بہت جلد پورا ہوا ۔ جرمنی میں یہودیوں پر جو مظالم کئے گئے ہیں ان کی وجہ سے وہاں سے بہت سے یہودی ہجرت کر کے فلسطین میں آباد ہونا چاہتے ہیں ۔ اگست میں جو صیہونی کانفرنس پراگ میں منعقد ہوئی تھی اس میں شد و مد سے یہ تجویز منظور ہوئی تھی کہ حکومت برطانیہ سے یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت کا مطالبہ کیا جائے ۔ حکومت برطانیہ نے ایک محدود تعداد منظور کی ۔ ایک طرف تو یہودی اس سے مطمئن نہ ہوئے اور دوسری طرف فلسطین کے عرب

اِس نئی اجازت سے بہت ناراض ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیت المقدس میں عربوں نے حکومت کے خلاف ایک بہت بڑا مظاہرہ کیا۔ حکومت بھلا بغاوت کو کس طرح برداشت کر سکتی تھی پولیس اور فوج نے لوگوں پر مظالم شروع کئے۔ بے چینی میں اور اضافہ ہوا اور بالآخر فوج اور عرب مظاہرین کے درمیان سخت آویزش ہوئی جس میں عربوں کی کثیر تعداد مقتول اور زخمی ہوئی۔ اسی سلسلے میں غالباً کچھ یہودی بھی مارے گئے اور ایک غریب ہندوستانی طالب علم بھی جس کو شوق سیاحت اس بدقسمت ملک میں لے گیا تھا۔ اس خوں ریزی سے مظاہروں میں کمی نہ ہوئی بلکہ قرب و جوار میں بھی یہ آگ بھڑک اٹھی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب بندرگاہ یافا کے افتتاح کی رسم دھوم سے ادا کی جانے والی تھی۔ وہاں بھی مظاہرے ہوئے اور یہ رسم ادا تو کی گئی مگر بہت بے رونقی سے اور چپکے چپکے۔

عربوں کا یہ مظاہرہ یہودیوں کے خلاف نہیں تھا بلکہ حکومت فلسطین کے خلاف تھا۔ اعلان بالفورسے جس مقصد کے حصول کی امید تھی اس کا پورا ہونا تو درکنار اب تو حکومت کو اپنی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ عربوں کا خون رنگ لائے بغیر نہیں رہ سکتا ایک طرف تو یہ حال ہے اور دوسری طرف دنیا بھر کے یہودیوں کا تقاضا ہے کہ فلسطین کا دروازہ یہودیوں کے لئے کھول دیا جائے اب حکومت برطانیہ دوگونہ رنج و عذاب میں مبتلا ہے نہ یہودیوں کو خوش کر سکتی ہے نہ عربوں کو۔

# شذرات

ادارت رسالہ جامعہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جنوری سنہ ۳۴ء سے رسالہ نئی ترتیب سے شائع ہوا کرے یعنی سال کے بارہ پرچوں میں سے چار چار پرچے اسلامیات، اجتماعیات اور ادبیات کے لئے مخصوص کر دئے جائیں۔

اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر کے پرچوں میں کل مضامین مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن کے متعلق ہوا کریں گے۔ "دنیا کی رفتار" کے عنوان سے جو تبصرہ واقعاتِ حاضرہ کے متعلق ہوتا رہتا ہے وہ بھی ان پرچوں میں اسلامی ممالک اور ہندوستانی مسلمانوں کے مخصوص مسائل تک محدود رکھا جائے گا۔ تنقید بھی اسلامیات کی کتابوں پر ہوگی۔ ان پرچوں کی ترتیب میں مشورہ اور مدد دینے کے لئے ڈاکٹر عبد العلیم صاحب اعزازی ارکانِ ادارت میں شامل ہوں گے۔

فروری، مئی، اگست اور نومبر کے پرچوں میں تاریخ، معاشیات، سیاسیات عمرانیات کے مضامین شائع ہوں گے، ان علوم کی کتابوں پر تنقید کی جائے گی۔ اور "دنیا کی رفتار" کے عنوان سے ہندوستان اور ممالکِ غیر کے اہم واقعات پر نظر ڈالی جائے گی۔ ان پرچوں کی ترتیب میں امداد دینے کے لئے جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور پروفیسر محمد مجیب صاحب شریکِ مجلسِ ادارت ہوں گے۔

مارچ، جون، ستمبر اور دسمبر کے پرچے ادب اور آرٹ کے مضامین، افسانوں اور نظموں اور ادبی کتابوں کی تنقید پر مشتمل ہوں گے فلسفہ اور تعلیم کے مضامین اور اس قسم کی کتابوں کی تنقید کو بھی انھیں پرچوں میں جگہ ملے گی۔

رسالے کا حجم بدستور ۹۶ صفحے اور سالانہ چندہ صہ ر رہے گا، البتہ جو حضرات صرف

چار پرچے خریدیں گے ان سے عہ/ اور جو آٹھ پرچے خریدیں گے ان سے للعہ/ لئے جائیں گے۔ ایک پرچے کی قیمت ۱۰/ ہوگی۔ قدیم خریداروں سے التجا ہے کہ اگر وہ اپنا چندہ ختم ہونے کے بعد بجائے بارہ پرچوں کے صرف آٹھ پرچے یا چار پرچے لینا چاہیں تو منیجر صاحب رسالہ جامعہ کو اطلاع دے دیں۔ اطلاع نہ آنے کی صورت میں یہ سمجھا جائے گا کہ انھیں بدستور کل پرچوں کی خریداری منظور ہے۔

---

جامعہ ملیہ کا تیرھواں یوم تاسیس ۲۹ر اکتوبر ۳۳ء کو منایا گیا۔ اس سال نئی بات یہ ہوئی کہ اس جشن کے سلسلے میں کئی جلسے منعقد ہوئے جو تین دن تک جاری رہے اور ان میں شرکت کے لئے قدیم طلبہ اور ہمدردانِ جامعہ بڑی تعداد میں باہر سے تشریف لائے۔

پہلا جلسہ ۲۸ر اکتوبر ۷½ بجے شام کو جناب آصف علی صاحب بیرسٹر کی صدارت میں ہوا۔ جناب صدر کی پرمغز تقریر کے بعد حامد علی صاحب ندوی طالب علم جامعہ نے اس کام کی رپورٹ سنائی جو جامعہ نے تعلیم بالغان کے متعلق ایک سال کے عرصے میں کیا۔ رپورٹ کا خلاصہ یہ تھا کہ قرول باغ کا ایک حصہ کام کرنے کے لئے منتخب کیا گیا اس کی مردم شماری کی گئی۔ مدرسہ شبینہ کے ذریعے سے کچھ لوگوں کو لکھنا پڑھنا اور حساب سکھایا گیا۔ ایک چھوٹا سا کتب خانہ اور دار المطالعہ کھولا گیا جس سے بہت لوگوں نے فائدہ اٹھایا۔ اس حلقے کے باشندوں کو حفظانِ صحت اور صفائی کے متعلق ہدایتیں کی گئیں اور مریضوں کو دوا تقسیم ہوئی۔ ان کی تفریح اور ورزش کے لئے کشتی کبڈی وغیرہ کے مقابلے کئے گئے۔ غرض کارکنوں نے اپنی طرف سے ہر طرح کی کوشش کی لیکن اس سے جتنے لوگ متاثر ہوئے ان کی تعداد قابلِ اطمینان نہیں اور کام میں بہت سی دقتیں ہیں جنھیں دور کرنے کے لئے مزید اہتمام کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر ظفریاب حسین صاحب نے حفظانِ صحت کے اصولوں پر لکچر دیا اور ایک فلم ملیریا کے اسباب اور علاج کے متعلق دکھایا گیا۔

۲۹ر اکتوبر کی صبح کو یادگارِ تاسیس کا جلسہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ پہلے جناب اسد ملتانی اور لسان القوم حضرت صفی لکھنوی نے اپنی نظموں سے حاضرین کو محظوظ اور مستفید فرمایا۔ اس کے بعد جناب شیخ الجامعہ نے ایک پرخلوص اور پرجوش تقریر میں جامعہ کے کام کی مختصر رپورٹ پیش کی جس کو ہم یہاں اس وجہ سے نقل نہیں کرتے کہ پچھلے مہینے کے شذرات میں اس قسم کا تبصرہ ہو چکا ہے پھر اسکول کے ایک چھوٹے سے بچے نے اسکول کے کام کی روداد پڑھ کر سنائی۔ آخر میں جناب شیخ الجامعہ نے کئی گراں قدر عطیوں کا اعلان کیا جن میں خاص طور پر قابل ذکر خواجہ عبدالحمید صاحب کا عطیہ ہے جس سے جامعہ کی مجوزہ بستی میں آب رسانی کے مصارف ادا کئے جائیں گے۔ سب سے بڑی خوش خبری جناب موصوف نے یہ سنائی کہ دولت آصفیہ کی ایک ہزار کی امداد جو کچھ دن سے بند تھی پھر جاری ہوگئی تعلیمی نمائش کا افتتاح کرنے کے بعد جناب صدر نے جلسے کو ختم کر دیا۔ اور حاضرین دو گھنٹے سے زیادہ نمائش کے دیکھنے میں مصروف رہے۔ اس میں جامعہ کے طلبہ کی صناعی اور دستکاری کے نمونے بہت سلیقے سے رکھے گئے تھے اور تعلیم اور حفظانِ صحت کے متعلق بہت سی مفید اور سبق آموز چیزیں جمع کی گئی تھیں۔

اسی روز شام کو اردو اکادمی کا عظیم الشان مشاعرہ منعقد ہوا جس میں حاضرین کی اس قدر کثرت تھی کہ اسکول کا حال اور گیلری کھچا کھچ بھر گئی اور دروازوں کے باہر لوگوں کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے، علاوہ دہلی کے شعرا کے جن میں اس مرتبہ حضرت بیخود بھی تھے باہر سے حضرت صفی، حضرت ثاقب اور حضرت ظریف لکھنوی، مولینا حسرت موہانی، حضرت جگر مرادآبادی، حضرت بیدل بیکانیری اور حضرت فہمی بھوپالی تشریف لائے تھے۔ اتنے باکمال سخنوروں کا ایک جگہ جمع ہو جانا وہ نعمت ہے جو اب ہندوستان میں بہت کم میسر آتی ہے۔ کوئی چار ساڑھے چار گھنٹے یہ پاکیزہ صحبت رہی جس سے حاضرین نے بے اندازہ لطف اٹھایا۔

۳۰ر اکتوبر کی صبح کو جامعہ کے قدیم طلبہ کا جلسہ ہوا جس میں انھوں نے اپنی انجمن کے

استحکام اور فروغ کی تدابیر پر غور کیا۔ سہ پہر کو شہر کی خواتین جامعہ کی تعلیمی نمائش دیکھنے کے لئے تشریف لائیں اور ان کا ایک جلسہ بیگم انصاری صاحبہ کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں مسز آصف علی نے جامعہ کے مقاصد پر تقریر فرمائی اور ایک فلم بچوں کی پرورش کے متعلق دکھایا گیا۔ معلوم ہوا ہے کہ حاضرات کی تعداد چار پانچ سو کے درمیان تھی اور چوں کہ ان میں نوے فیصدی مسلم خواتین تھیں جو جلسوں میں بہت کم شریک ہوتی ہیں اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اس پہلی کوشش میں حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوئی۔

دوسری طرف اسی وقت اہل جامعہ اور ہمدردانِ جامعہ اوکھلے میں اس زمین پر جمع ہوئے جو جامعہ نے اپنی عمارات کے لئے خریدی ہے۔ جامعہ کے مہمانوں کے علاوہ شہر کے بہت سے معززین تشریف لائے تھے۔ پہلے جناب شیخ الجامعہ نے ان حضرات کو جنھوں نے اب تک زمین کا معائنہ نہیں کیا تھا اپنے ساتھ لے جا کر اس کی حدود دکھائیں۔ پھر چائے پینے کے بعد تھوڑی دیر شعر و سخن کی صحبت گرم رہی جس میں ڈاکٹر سعید صاحب اور حضرت ظریف نے اپنے کلام سے محظوظ کیا اور حضرت صفی اور حضرت ثاقب نے وہ شعر سنائے جو خاص اس موقع کے لئے کہے تھے۔ جناب شیخ الجامعہ نے مہمانوں کا شکریہ ادا فرمایا اور یہ اعلان کیا کہ جب جامعہ کی بستی اس جگہ بس جائے گی تو شہر سے طلبا کو لانے کے لئے لالہ نندن سرن صاحب ایک موٹر لاری اپنے کارخانے کی طرف سے عطا فرمائیں گے۔ نماز مغرب کے بعد لوگوں نے چاندنی رات میں نہر کی سیر کی اور سات بجے شہر کی طرف واپس آئے۔ ۸½ بجے رات کو جناب مولانا احمد سعید صاحب نے جامعہ میں اس موضوع پر تقریر فرمائی۔ "مسلمانوں کی دنیاوی فلاح و بہبود کا دارومدار مذہب کی پابندی پر ہے" اور اس پر یہ مبارک سلسلہ ختم ہوا۔

۱۳ اکتوبر کو سودیشی نمائش دہلی کے منتظمین نے نمائش میں یوم جامعہ منایا اور اس روز کی کل آمدنی اپنا خرچ نکال لینے کے بعد جامعہ کے نذر کی۔

---

# نقشِ آخر (ڈراما)

مصنفہ

## پروفیسر اشتیاق حسین قریشی ایم۔اے

✣

اس ڈرامے میں غدرِ دہلی کے حالات، قدیم مغلیہ تہذیب کا مٹنا، انگریزوں کا تسلط، اور اہلِ دہلی پر ہولناک مظالم اس انداز میں بیان کئے ہیں کہ پڑھنے والے بے اختیار ہو جاتے ہیں۔ آخری تاجدارِ دہلی کی بے بسی اور اہلِ فن و کمال کے مصائب خون کے آنسو رلاتے ہیں۔ اور ۵۷ء کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

غدر کے زمانے میں جو لوگ دہلی چھوڑ کر ادھر ادھر چلے گئے تھے پھر واپس لوٹتے ہیں۔ اور اپنے آباد محلے ویران اور بستیاں کھنڈر پاتے ہیں۔

اس وقت قوم کو کسی طرف سے کوئی شعاعِ امید نظر نہیں آتی اور تمام دماغوں پر مایوسی کی تاریکی مستولی ہو جاتی ہے۔ ... عین اسی تاریکی میں سرسید احمد خاں پیدا ہوتے ہیں جن کا تعلیمی پروگرام قومی دماغ میں ایک بڑا ہیجان پیدا کر دیتا ہے۔

ڈراما یہیں پر ختم ہو جاتا ہے۔ اور مطالعہ کرنے والے کو ایک گہرے غور و فکر میں چھوڑ جاتا ہے۔

قیمت صرف دس آنے (۱۰ر)

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

# تصانیف پروفیسر سجاد مرزا بیگ صاحب

## الاستدلال

اس کتاب میں علم منطق کے اصولوں کو سلیس زبان میں سہل طریقہ سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب عقل و معلومات کو بڑھاتی اور صحیح دلیل کرنا سکھاتی ہے۔ قیمت ۵؎

## الانسان

یہ کتاب انسان اور اس کے کوائف قلبی خیالات جسمانی اور اس کے گرد و پیش کے واقعات کا ایک جامع و مانع نقشہ ہے۔ قیمت ۴؎

## الفہرست

اس میں اردو کی تصنیف شدہ کتابوں کے ناموں کے علاوہ اُن کے مصنفین کے نام۔ ان کے ملنے کے پتے اور ان کی جائے طبع سب تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔ قیمت دس روپیہ

## حکمت عملی

یہ کتاب فلسفۂ عملی پر ایک مبسوط اور جامع کتاب ہے۔ فلسفۂ عملی کی ہر شاخ کو لیا ہے اور ایک ایک کا مستقل عنوان قائم کر کے اس پر نہایت تفصیل سے بحث کی ہے۔ قیمت ۳؎

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

# مصفیٰ

## طبِ یونانی کا تازہ کرشمہ

انسان کی زندگی کا مدار خون پر ہے۔ خون اگر خراب ہو گیا ہے تو آدمی کی تندرستی قائم نہیں رہ سکتی، **ہندوستانی دواخانہ دہلی "مصفیٰ"** ایجاد کر کے تمام ملک کو مقابلے کی دعوت دیتا ہے اور بلا خوف تردید دعویٰ کرتا ہے کہ صفائی خون کے لئے "مصفیٰ" سے بہتر دوا آج تک نہ ایشیا پیش کر سکا ہے اور نہ یورپ۔

**"مصفیٰ"** ہندوستان کی جڑی بوٹیوں کا خلاصہ ہے **اور مسیح الملک ثانی حکیم حاجی محمد احمد خاں صاحب** کے مشورے سے جدید سائنٹفک طریق پر تیار کیا گیا ہے۔ خون کی خرابی سے پیدا ہونے والے ہر مرض کی تیر بہدف دوا ہے، کھجلی، داد، پھنسیاں وغیرہ حتیٰ کہ سوزاک، آتشک، جذام کا زہریلا مادہ بھی اس کے استعمال سے ہمیشہ کے لئے نابود ہو جاتا ہے۔ اس کی ایک خوراک چائے کا ایک چمچہ ہے، اور بلحاظ نفع مصفیٰ درحقیقت اکسیری چیز ہے۔

قیمت ۴۲ خوراک صرف عہ علاوہ محصولڈاک

---

**ترکیب استعمال۔** ایک خوراک صبح، ایک شام تھوڑے پانی میں ملا کر اور اگر مرض کا جوش زیادہ ہو تو دن میں تین مرتبہ استعمال کیا جائے

ملنے کا پتہ

**ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس ۲۲ دہلی سے طلب کیجئے**

# مسلمان وہی ہے جو قرآن پر عمل کرے

حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے جب لوگوں کو قرآن کی تعلیم سے آگاہ کیا۔ تو ہر شخص نے اس کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے دیکھا کہ قرآن پر عمل کرنا نہایت آسان اور اصلاح حال کیلئے بیحد ضروری ہے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اسلام آناً فاناً دنیا کے ہر گوشہ میں پہنچ گیا۔ اور مسلمانوں کی حکومتیں تمام ممالک میں جال کی طرح پھیل گئیں۔

آہستہ آہستہ مسلمانوں کی توجہ قرآن سے ہٹ کر دوسرے مشاغل کی طرف بٹنے لگی منطق و فلسفہ اور کلام و بلاغت کی گتھیوں میں الجھنے لگے تا آنکہ یہ دور بد آیا جس میں سے ہم گذر رہے ہیں کہ قرآن حروف میں لکھا ہوا تو موجود ہے مگر اس کی تعلیم کا اثر کسی کے سینے میں نہیں وجہ صرف یہ ہے کہ مسلمان اور تمام علوم حاصل کر سکتا ہے۔ مگر قرآن کو باترجمہ پڑھنے، سیکھنے اور سمجھنے کی اسے فرصت نہیں پس جب پڑھنے والے نہ رہے تو ایک ایک کر کے پڑھانے والے بھی اٹھ گئے۔

آج قرآن پاک نہ کوئی سمجھتا ہے نہ سمجھاتا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ ہماری موجودہ پستی، زوال، اور قابل رحم حالت ہے۔ افسوس اگر کوئی قرآن کو سمجھتا بھی ہے تو اس پر عامل نہیں۔ کیونکہ آج اسکے سامنے ناموس شریعت کی خاطر حد لگانے والا نہ کوئی ابوبکرؓ ہے نہ عمرؓ!

پس آؤ قرآن پڑھو۔ اور پڑھاؤ۔ کہ یہی سرمایہ دین و دنیا ہے۔ ہمارے ہاں جو قرآن پاک مترجم چھپ رہا ہے وہ اس قدر آسان فہم اور مقبول ہے کہ پہلے پاروں کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ ختم ہو کر دوسرا ایڈیشن زیر طبع ہے۔

قرآن مجید قسم اول ششش رنگہ معہ ترجمہ موسومہ بہ مطالب الفرقان فی ترجمۃ القرآن ہدیہ بجلد فی پارہ عہ مجلد فی پارہ عمہ

قسم دوم سہ رنگہ " " " " " " " ۱۲ر " عہ

مفصل حالات اور نمونے کے صفحات مفت طلب فرمائیں

نیاز مند

منیجر پیکو آرٹ پریس بیرون موچی دروازہ لاہور

# اتحاد کا بہار نمبر

صوبہ بہار کو عہد قدیم سے ہندوستان میں جو تاریخی اہمیت حاصل رہی ہے وہ ہر شخص پر روشن ہے یہاں ہر صنف کے باکمال صحاب کی کی ہر زمانہ میں کثرت رہی ہے اور انکے ذریعہ اس نے دنیا کے تمدن میں بیش از اضافہ کیا ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ بہار کی کوئی صحیح و مبسوط تاریخ سعرض تحریر میں نہ آئیکی وجہ سے اس کے تمام بیش بہا کارنامے پردہ خفا میں مستور ہیں۔ بہار کے ان خصوصیات و کمالات کو واضح کرنے کیلیے کارکنان اتحاد نے طے کیا ہے کہ آئندہ ماہ جنوری سنہ ۴۲ء تک "بہار نمبر" کے نام سے ایک مخصوص نمبر نکالا جائے۔ مضمون نگار کیلئے بہاری ہونے کی کوئی قید نہیں۔ البتہ اس کا موضوع تحریر صوبہ بہار ہونا ضروری۔ اس کی قیمت ایک روپیہ کے قریب ہوگی۔ لیکن جو لوگ اتحاد کا سالانہ چندہ مبلغ ۶ روپیہ ادا کرکے اب سے خریدار ہوں گے۔ اور ساتھ ہی اس نمبر کیلئے درخواست بھی کریں گے۔ ان کی خدمت میں یہ نمبر مفت ارسال کیا جائیگا۔

## مشتہرین کیلئے نادر موقع

چونکہ یہ پرچہ کثیر تعداد میں شائع ہوگا اور اس کی مقبولیت اور مانگ بہت زیادہ ہو رہی ہے اسلئے جو حضرات اپنی تجارت کو فروغ دینا چاہتے ہوں انہیں ضرور اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے — اجرت بذریعہ خط و کتابت طے ہو سکتی ہے۔ (اخبار اتحاد بانکی پور پٹنہ)